دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۳۱ ویں جلد

ماہ جنوری سنہ ۱۹۸۳ء تا جون سنہ ۱۹۸۳ء

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست

مضمون نگارانِ معارف

(جلد ۱۳۱)

ماہ جنوری ۱۹۸۳ء تا ماہ جون ۱۹۸۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شعراء

فہرست مضامین معارف

(جلد ۱۳۱)

ماہ جنوری ۱۹۸۳ء تا ماہ جون ۱۹۸۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد نمبر ۱۰۵ جنوری ۱۹۷۰ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت بیس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

(دارالمصنفین کی دو نئی کتابیں)

سیرۃ النبی جلد ہفتم

سیرۃ النبی جلد ششم کے بعد سید صاحب سیرۃ
جلد ہفتم بھی جو معاملات سے متعلق تھی لکھنی شروع
کردی تھی، اور اسی پر یہ مقدس سلسلہ ختم بھی
ہوجاتا لیکن ابھی اس موضوع پر چند ہی مضامین
لکھے تھے کہ آپ کا انتقال ہوگیا، اور یہ پایہ تکمیل
کو نہیں پہنچ سکی، یہ ان ہی متفرق مضامین اور
مباحث کا مجموعہ ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں،
اسلام میں حکومت کی حیثیت، عہد نبوی میں
نظامِ حکومت و فرماں روائی، سلطنت اور
دین کا تعلق وغیرہ، شروع
میں مولٰنا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم
سے پیش لفظ ہے، قیمت: ۱۲ روپیہ
مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندویؒ

صوفی امیر خسرو

اس میں ہندوستان کے شہرۂ آفاق محد
فارسی شاعرانہ سپہر شیریں خسرو، لیلیٰ
دولرانی خضرخاں اور وسط الحیواۃ جد
شاہکار مثنویوں کے مصنف اور حضرت م
الٰہی نظام الدین اولیاؒ کے جان نثار م
امیر خسرو کو معاصر تذکرہ و تاریخ کی کتا
خود ان کے کلام کے مجموعوں اور مثنویو
میں ایک صاحبِ دل صوفی کی حیثیت
کیا گیا ہے، بزمِ صوفیہ کے بعد سلوک و
کے مباحث و مسائل پر دوسری اہم
قیمت ۰۰ -
مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن
منیجر

جلد ۱۳۱ ماہ ربیع الاول ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۸۳ء عدد ۱

مضامین

مقالات

ادبیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ہندوستانی مسلمانوں میں اس وقت کوئی ایسا رہنما نہیں جو ہندوستان کے ہر خطہ میں غیر معمولی اثر اور مقبولیت رکھتا ہو، اس کی وجہ پر غور کرنا ہے۔

اس کی ظاہری وجہ تو قحط الرجال بتائی جائے گی، لیکن انفرادی قیادت اگر حاصل نہ ہو تو اجتماعی قیادت موثر ہو سکتی ہے، اجتماعی قیادت ایک اچھی تنظیم ہی کے ذریعہ بروئے کار آسکتی ہے، اچھی تنظیم اسی وقت ممکن ہے جب اجتماعی شعور کا امالہ صحیح معنوں میں ہو، یہ امالہ کیسے ہو اور کون کرے؟ عام طور سے یہ خیال ہے کہ مسلمان مذہب کے نام پر مٹتا ہے، اور یہ صحیح ہے، مذہبی جوش ابھار کر وہ کام لیا جا سکتا ہے جو مہلک اسلحہ سے نہیں ہو سکتا، قرونِ اولیٰ میں مذہب ہی کے نام پر مسلمان عرب کے ریگستان سے نکل کر دنیا کے ہر گوشہ میں پہونچ گئے، مسلمان فرماں رواؤں نے جہاں جہاں اپنی حکومتیں قائم کیں، وہاں اپنے نام کا جزو یا "اللہ" یا "دین" ہی قرار دیا، اور گو ان کی حکومتیں خاندانی رہیں، لیکن انھوں نے ظل الٰہی یا اللہ کے مستنصر، اللہ کے آمر، اللہ کے قاہر یا دین کے قطب، دین کے شمس، دین کے ظہیر، دین کے ناصر، دین کے معین اور دین کی صلاح بن کر حکومت کرنا پسند کیا، گو ایسے القاب رسمی اور ظاہری ہی سہی لیکن ان ہی القاب سے مسلمان عوام بلکہ خواص بھی خوش اور مجموعی حیثیت سے مطمئن رہے۔

ہندوستانی مسلمان بھی مذہب کے نام پر امنڈتے رہے ہیں، اگر کہیں مسجد شہید ہو رہی ہو تو خدا جانے کتنے مسلمان جامِ شہادت نوش کرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں، اگر کوئی ان کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس پر حملہ آور ہو تو وہ سربکف ہو کر میدانِ کارزار میں اتر آتے ہیں، یا اگر ان کے مذہبی عقائد میں دخل اندازی ہو تو ان کا خون ابل پڑتا ہے، اور وہ ایسے اقدام کر بیٹھتے ہیں جو احتیاط اور تدبر کے منافی ہوتے ہیں۔

مگر یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ وہ مذہب کے نام پر تو مرمٹنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ ایک مذہبی عالم کو اپنا سیاسی قائد بھی تسلیم کر لیں، ہندوستان میں گذشتہ سو سال کی تاریخ بتاتی ہے کہ سیاست میں علماء مسلمانوں کے ذہن پر چھا نہ سکے، سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک کی مخالفت علماء کی طرف سے بڑے زور و شور سے ہوئی، مگر سرسید احمد خان اس مخالفت کے باوجود مسلمانوں کے ہیرو بن کر نمودار ہوئے، اور ان ہی کے نظر و فکر کے حامی سیاست پر چھائے رہے،

مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ مسلمانوں کی ایمانی حرارت، مذہبی غیرت اور دینی بصیرت کو ایسی جلا دی کہ مسلمانوں میں ازسرنو ذہنی تازگی پیدا ہوگئی، مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد جلا وطن ہوکر مالٹا میں قید کیے گئے، اور مولانا عبید اللہ سندھی طرح طرح کی صعوبتیں اٹھاکر یورپ میں پناہ لیے رہے، مولانا عبد الباری فرنگی محلی تو غیر علماء لیڈروں کے مرشد بنے رہے، مگر مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، ان میں سے کسی کو نہیں ہوئی۔

مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا سجاد بہاری، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی اور مولانا حسین احمد کے وجود سے ہندوستان کی سرزمین کو بڑی برکت حاصل ہوتی رہی، مفتی کفایت اللہ کے فتاویٰ کے آگے سارے مسلمان جھکتے رہے، مولانا سجاد بہاری کی مساعی جمیلہ سے بہار کی مذہبی زندگی کو امارت شرعیہ کے ذریعے بڑا سہارا ملا، مولانا احمد سعید کی شیریں بیانی اور شیوا بیانی کو سننے کے لیے مسلمان جوق در جوق جمع ہوتے، مولانا حسین احمد کے عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کا حلقہ دیوبند سے آسام تک پھیلا ہوا تھا، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی کے بہادرانہ اور دلیرانہ کارناموں کی یاد بھلائی نہیں جاسکتی، مگر پاکستان کی تحریک کے قائد اعظم محمد علی جناح ہی تسلیم کیے گئے، ان کی غیر مذہبی زندگی سے متعلق علماء کے سارے دلائل و براہین فضا میں گونج کر رہ گئے۔

اور پھر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ غیر علماء مسلمان لیڈروں میں مسلمانوں کا اپنا ذوق انتخاب کارفرما رہا، طیب جی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم محمد اجمل خان، تصدق احمد شروانی، نثار احمد شروانی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر ذاکر حسین، خان عبد الغفار خان نے سیاست میں اپنی زندگی کو بڑے ایثار اور قربانی کا نمونہ بنایا، مگر وہ ہندوؤں کے حلقوں میں تو ضرور مقبول رہے لیکن مسلمانوں کی اکثریت نے ان کو اپنے سر آنکھوں پر نہیں بٹھایا، آخر کیوں؟

محمد علی جناح نے میرے ایک عزیز دوست سے جو نجی گفتگو کی تھی، اس کو یہاں پر دہرانا برمحل ہوگا،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ہندوستانی مسلمانوں میں اس وقت کوئی ایسا رہنما نہیں جو ہندوستان کے ہر خطہ میں غیر معمولی اثر اور مقبولیت رکھتا ہو، اس کی وجہ پر غور کرنا ہے۔

اس کی ظاہری وجہ تو قحط الرجال بتائی جائے گی، لیکن انفرادی قیادت اگر حاصل نہ ہو تو اجتماعی قیادت موثر ہو سکتی ہے، اجتماعی قیادت ایک اچھی تنظیم ہی کے ذریعہ بروئے کار آسکتی ہے، اچھی تنظیم اسی وقت ممکن ہے جب اجتماعی شعور کا ازالہ صحیح معنوں میں ہو، یہ ازالہ کیسے ہو اور کون کرے؟ عام طور سے یہ خیال ہے کہ مسلمان مذہب کے نام پر مٹتا ہے، اور یہ صحیح ہے، مذہبی جوش ابھار کر وہ کام لیا جا سکتا ہے جو مہلک اسلحہ سے نہیں ہو سکتا، قرون اولیٰ میں مذہب ہی کے نام پر مسلمان عرب کے ریگستان سے نکل کر دنیا کے ہر گوشہ میں پہونچ گئے، مسلمان فرماں رواؤں نے جہاں جہاں اپنی حکومتیں قائم کیں، وہاں اپنے نام کا جز یا "اللہ" یا "دین" ہی قرار دیا، اور گو ان کی حکومتیں خاندانی رہیں، لیکن انھوں نے ظل الٰہی یا اللہ کے مستنصر، اللہ کے آمر، اللہ کے قاہر یا دین کے قطب، دین کے شمس، دین کے ظہیر، دین کے ناصر، دین کے محی اور دین کی صلاح بن کر حکومت کرنا پسند کیا، گو ایسے القاب رسمی اور ظاہری ہی سہی لیکن ان ہی القاب سے مسلمان عوام بلکہ خواص بھی خوش اور مجموعی حیثیت سے مطمئن رہے۔

ہندوستانی مسلمان بھی مذہب کے نام پر مٹتے رہے ہیں، اگر کہیں مسجد شہید ہو رہی ہو تو خدا جانے کتنے مسلمان جام شہادت نوش کرنے کیلئے تیار ہو جاتے ہیں، اگر کوئی ان کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس پر حملہ آور ہو تو وہ سر کف ہو کر میدان کارزار میں اتر آتے ہیں، یا اگر ان کے مذہبی عقائد میں دخل اندازی ہو تو ان کا خون ابل پڑتا ہے، اور وہ ایسے اقدام کر بیٹھتے ہیں جو احتیاط اور تدبر کے منافی ہوتے ہیں۔

مگر یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ وہ مذہب کے نام پر تو مرمٹنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ ایک مذہبی عالم کو اپنا سیاسی قائد بھی تسلیم کر لیں، ہندوستان میں گذشتہ سو سال کی تاریخ بتاتی ہے کہ سیاست میں علماء مسلمانوں کے ذہن پر چھا نہ سکے، سر سید احمد خاں کی علی گڈھ تحریک کی مخالفت علماء کی طرف سے بڑے زور و شور سے ہوئی، مگر سر سید احمد خاں اس مخالفت کے باوجود مسلمانوں کے ہیرو بن کر نمودار ہوئے، اور ان ہی کے نظر و فکر کے حامی سیاست پر چھائے رہے،

مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ مسلمانوں کی ایمانی حرارت، مذہبی غیرت اور دینی بصیرت کو ایسی جلا دی کہ مسلمانوں میں از سر نو ذہنی تازگی پیدا ہوگئی، مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد جلا وطن ہو کر مالٹا میں قید کیے گئے اور مولانا عبید اللہ سندھی طرح طرح کی صعوبتیں اٹھا کر یورپ میں پناہ لیے رہے، مولانا عبدالباری فرنگی محلی تو غیر علماء لیڈروں کے مرشد بنے رہے، مگر مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، ان میں سے کسی کو نہیں ہوئی۔

مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا سجاد بہاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور مولانا حسین احمد کے وجود سے ہندوستان کی سرزمین کو بڑی برکت حاصل ہوتی رہی، مفتی کفایت اللہ کے فتاویٰ کے آگے سارے مسلمان جھکتے رہے، مولانا سجاد بہاری کی مساعی جمیلہ سے بہار کی مذہبی زندگی کو امارت شرعیہ کے ذریعے بڑا سہارا ملا، مولانا احمد سعید کی شیریں بیانی اور شیوا بیانی کو سننے کے لیے مسلمان جوق در جوق جمع ہوتے، مولانا حسین احمد کے عقیدت مندوں اور ارادت مندوں کا حلقہ دیوبند سے آسام تک پھیلا ہوا تھا، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے بہادرانہ اور دلیرانہ کارناموں کی یاد بھلائی نہیں جا سکتی، مگر پاکستان کی تحریک کے قائد اعظم محمد علی جناح ہی تسلیم کیے گئے، ان کی غیر مذہبی زندگی سے متعلق علماء کے سارے دلائل و براہین فضا میں گونج کر رہ گئے۔

اور پھر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ غیر علماء مسلمان لیڈروں میں مسلمانوں کا اپنا ذوقِ انتخاب کارفرما رہا، طیب جی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم محمد اجمل خان، تصدق احمد شروانی، نثار احمد شروانی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر ذاکر حسین، خان عبدالغفار خان نے سیاست میں اپنی زندگی کو بڑے ایثار اور قربانی کا نمونہ بنایا، مگر وہ ہندوؤں کے حلقوں میں تو ضرور مقبول رہے لیکن مسلمانوں کی اکثریت نے ان کو اپنے سر آنکھوں پر نہیں بٹھایا، آخر کیوں؟

محمد علی جناح نے میرے ایک عزیز دوست سے جو نجی گفتگو کی تھی، اس کو یہاں پر دہرانا برمحل ہوگا،

پاکستان کی تحریک کے زمانہ میں جب انھوں نے گاندھی جی سے بمبئی میں بارہ روز تک گفتگو کی تو ایک روز
گاندھی جی نے ان سے کہا کہ قائد اعظم! وہ کون سی بات ہے جس سے آپ نے مسلمانوں پر مسمریزم کر دیا ہے!
محمد علی جناح نے جواب دیا: ہاں! میں نے ضرور ان پر مسمریزم کر دیا ہے، آپ جانتے ہیں کہ میں پنج وقتہ
نماز کا پابند نہیں ہوں، روزے بھی نہیں رکھتا ہوں، میرے گلے میں تصوف کا کوئی مالا بھی نہیں،
پھر بھی ان مسلمانوں نے مجھ کو اپنا قائد اعظم تسلیم کر لیا ہے، جانتے ہیں کیوں؟ یہ مسلمان اپنے جذبات
کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے، میں ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہا ہوں، اس لیے وہ مجھ کو اپنا قائد اعظم
تسلیم کیے ہوئے ہیں، لیکن جس روز ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرنا چھوڑ دوں گا، میں جانتا ہوں کہ یہی
قائد اعظم تسلیم کرنے والے مسلمان مجھ کو KICK کر دیں گے۔

اصلی قیادت کی یہی شان ہوتی ہے کہ قائد اپنے معتقدین کے جذبات کی ترجمانی صحیح وقت پر صحیح طریقہ سے
کرے اور اگر اس کے معتقدین کے جذبات غلط طریقہ پر ابھریں تو ان کا صحیح امالہ بھی کرے، اور اگر وہ صحیح
امالہ نہیں کرتا ہے تو اپنے ساتھ اپنے معتقدین کو بھی ذلت، تباہی اور بربادی کے غار میں جا گراتا ہے جس کی
مثال نظام حیدرآباد کی ریاست کے سقوط کے زمانہ میں قاسم رضوی کی ذات اور قیادت میں ملتی ہے۔

ہمارے علماء، اسلام کے پشتیبان ہیں، اس کے ناموس کے نگہبان ہیں، اس کی روایت کے حدی خواں ہیں، اور اس کے
مستقبل کے رجز خوان ہیں، وہ سوچیں کہ آخر یہ کیا بات ہے کہ مولانا مودودی اور مولانا نورانی کی موجودگی میں
ذوالفقار علی بھٹو اور مجیب الرحمٰن پاکستانی سیاست پر چھا گئے، جناب مولانا مفتی محمود سرحد کے وزیر اعلیٰ
بنے تو زیادہ دنوں تک اس عہدہ پر نہیں رہ سکے، ہندوستان میں جماعت اسلامی اپنے جذبۂ خدمت و
ایثار اور جمعیۃ العلماء اپنی مقدس آبی کے باوجود کبھی مسلمانوں میں وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکیں جو پاکستان کی
تحریک کے زمانہ میں مسلم لیگ کو حاصل ہوئی، اس کی وجہ پر سنجیدگی سے غور کرنا ہے، مسلمانوں کی محض بدبختی پر
محمول کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

ولفریڈ کینٹویل اسمتھ
تعارف اور تجزیہ

از

ڈاکٹر مشیر الحق پروفیسر مطالعات اسلامی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

یہ مقالہ دارالمصنفین کے اسلام اور مستشرقین پر بین الاقوامی سیمینار میں پڑھا گیا، اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسے اس حیثیت سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مستشرقین کس طرح دور دراز قیاسات اور احتمالات بلکہ اپنی ذہنی دوڑ دھوپ سے سلسلۂ معلومات پیدا کرتے ہیں جس میں بہت کچھ ان کے خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے، اسی کو محور بنا کر اپنے مقصد اور مطلب کی ترویج کرتے ہیں۔ "معارف"

ولفریڈ کینٹویل اسمتھ کی پیدائش کناڈا کے مشہور شہر ٹورانٹو کے ایک مذہبی عیسائی گھرانے میں ۲۱ جولائی سنہ ۱۹۱۶ء کو ہوئی، ان کے والد مشہور پارکر قلم بنانے والی کمپنی کے ڈائرکٹر تھے، اس حقیقت واقعہ اور اسمتھ کے مسلسل تصنیفی شغف کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ منھ میں چاندی کا چمچہ تو نہیں لیکن ہاتھ میں قلم لیکر ضرور اس دنیا میں آئے، وہ تقریباً سو تحقیقی اور علمی مقالات، اور لگ بھگ دس اہم کتابوں کے مصنف ہیں، ان کے بعض مضامین اور کتابوں کے ترجمے عربی، ترکی، اردو، فرانسیسی، جرمن، انڈونیشی، جاپانی، اسپینی اور سویڈش زبانوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

پاکستان کی تحریک کے زمانہ میں جب انھوں نے گاندھی جی سے بمبئی میں بارہ روز تک گفتگو جاری رکھی تو ایک روز گاندھی جی نے ان سے کہا کہ قائد اعظم! وہ کون سی بات ہے جس سے آپ نے مسلمانوں پر مسمریزم کر دیا ہے' محمد علی جناح نے جواب دیا: ہاں! میں نے ضرور ان پر مسمریزم کر دیا ہے، آپ جانتے ہیں کہ میں پنج وقتہ نماز کا پابند نہیں ہوں، روزے بھی نہیں رکھتا ہوں، میرے گلے میں تصوف کا کوئی مالہ بھی نہیں! پھر بھی ان مسلمانوں نے مجھ کو اپنا قائد اعظم تسلیم کر لیا ہے، جانتے ہیں کیوں؟ یہ مسلمان اپنے جذبات کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے، میں ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہا ہوں' اس لیے وہ مجھ کو اپنا قائد اعظم تسلیم کیے ہوئے ہیں، لیکن جس روز ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرنا چھوڑ دوں گا، میں جانتا ہوں کہ یہی قائد اعظم تسلیم کرنے والے مسلمان مجھ کو Kick کر دیں گے۔

اصلی قیادت کی یہی شان ہوتی ہے کہ قائد اپنے مقتدیوں کے جذبات کی ترجمانی صحیح وقت پر صحیح طریقے سے کرے اور اگر اس کے مقتدیوں کے جذبات غلط طریقہ پر ابھریں تو ان کا صحیح امالہ بھی کرے، اور اگر وہ صحیح امالہ نہیں کرتا ہے تو اپنے ساتھ اپنے مقتدیوں کو بھی ذلت، تباہی اور بربادی کے غار میں جا گراتا ہے جس کی مثال نظام حیدر آباد کی ریاست کے سقوط کے زمانہ میں قاسم رضوی کی ذات اور قیادت میں ملتی ہے۔

ہمارے علماء اسلام کے پشتیبان ہیں، اس کے ناموس کے نگہبان ہیں، اس کی روایت کے حدی خواں ہیں' اور اس کے مستقبل کے رجز خوان ہیں' وہ سوچیں کہ آخر یہ کیا بات ہے کہ مولانا مودودی اور مولانا نورانی کی موجودگی میں ذوالفقار علی بھٹو اور مجیب الرحمٰن پاکستانی سیاست پر چھا گئے، جناب مولانا مفتی محمود سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے تو زیادہ دنوں تک اس عہدہ پر نہیں رہ سکے، ہندوستان میں جماعت اسلامی اپنے جذبۂ خدمت و ایثار اور جمعیۃ العلماء اپنی تقدس مآبی کے باوجود کبھی مسلمانوں میں وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکیں، جو پاکستان کی تحریک کے زمانہ میں مسلم لیگ کو حاصل ہوئی، اس کی وجہ پر سنجیدگی سے غور کرنا ہے۔ مسلمانوں کی محض بدبختی پر محمول کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

مقالات

ولفریڈ کینٹویل اسمتھ
تعارف اور تجزیہ

از

ڈاکٹر مشیرالحق پروفیسر مطالعات اسلامی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

یہ مقالہ دارالمصنفین کے اسلام اور مستشرقین پر بین الاقوامی سیمینار میں پڑھا گیا، اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پہ اس حیثیت سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مستشرقین کس طرح دور دراز قیاسات اور احتمالات بلکہ اپنی ذہنی ورزش سے سلسلۂ معلومات پیدا کرتے ہیں جس میں بہت کچھ ان کے خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے، اسی کو محور بناکر اپنے مقصد اور مطلب کی ترویج کرتے ہیں۔

"معارف"

ولفریڈ کینٹویل اسمتھ کی پیدائش کناڈا کے مشہور شہر ٹورانٹو کے ایک مذہبی عیسائی گھرانے میں ۲۱ جولائی ۱۹۱۶ء کو ہوئی، ان کے والد مشہور پارکر قلم بنانے والی کمپنی کے ڈائرکٹر تھے، اس حقیقت واقعہ اور اسمتھ کے مسلسل تصنیفی شغف کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ منہ میں چاندی کا چمچہ تو نہیں لیکن ہاتھ میں قلم لیکر ضرور اس دنیا میں آئے، وہ تقریباً سو تحقیقی اور علمی مقالات، اور لگ بھگ دس اہم کتابوں کے مصنف ہیں، ان کے بعض مضامین اور کتابوں کے ترجمے عربی، ترکی، اردو، فرانسیسی، جرمن، انڈونیشی، جاپانی، اسپینی اور سویڈش زبانوں میں بھی شایع ہو چکے ہیں۔

اسمتھ نے جس ٹورانٹو میں آنکھیں کھولی تھیں وہ اپنے تہذیبی اور مذہبی روایات میں آج کے
ٹورانٹو سے بہت مختلف تھا، اس وقت وہاں کی عام شہری زندگی پر مذہب کی اتنی گہری چھاپ تھی
کہ اتوار کے دن بازار میں چائے کی ایک پیالی مل جائے تو لوگ خوش نصیبی سمجھتے تھے، ٹورانٹو بدل گیا
لیکن اسمتھ کی مذہبیت میں تبدیلی نہیں آئی، مذہبی اقدار کی عملی پابندی کے معاملہ میں وہ آج بھی امریکہ
میں رہتے ہوئے انیسویں صدی کی دنیا میں نہ صرف زندہ ہیں بلکہ خوش ہیں، اسمتھ بے عمل اشخاص کے
ساتھ رہ تو سکتے ہیں، لیکن زندگی نہیں گذار سکتے، انھیں دوسروں کی لا مذہبیت سے اذیت ضرور
پہونچتی ہے، لیکن ان کی مذہبی زندگی کو ناپنے کا معیار اسمتھ اپنے مذہب کو نہیں بلکہ اس مذہب کو قرار
دیتے ہیں جس کی پیروی کے وہ دعویدار ہوتے ہیں۔

اسمتھ نے اپنی طالبعلمانہ زندگی ٹورانٹو، پرنسٹن اور کیمبرج کی تعلیم گاہوں میں گذاری، لیکن وہ
وہاں بھی رہے، ایک ممتاز طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں کے طالب علموں کی مذہب پسند
تحریکوں میں بھی جوش وخروش سے حصہ لیتے رہے، ان تحریکوں میں ان کا ساتھ جن دوسرے طلبہ
و طالبات سے رہا، وہ بالعموم عیسائی مشنریوں کی اولادیں تھیں، اپنے انہی ساتھیوں میں سے
ایک خاتون میوریل میکنزی اسٹروتھرز کو انھوں نے ۱۹۳۹ء میں اپنی شریک حیات بنالیا، ۱۹۴۱ء
میں ان کا تقرر "فارمین کرسچین کالج لاہور" میں استاد کی حیثیت سے ہوا، جہاں وہ ۱۹۴۷ء تک
مقیم رہے، ان کی علمی زندگی میں ہندوستان کا یہ چھ سالہ قیام بڑی اہمیت رکھتا ہے، "ہندوستانی اسلام"
کا قریب سے مطالعہ کرنے کے بعد انھیں اپنے اس خیال کی صداقت کا پورا یقین ہوگیا کہ اسلام
صرف مشرق وسطی کی سرحدوں میں محدود نہیں ہے، اور برصغیر کو نظر انداز کر کے اسلام کا مکمل مطالعہ
ممکن نہیں ہے، انھوں نے اپنی سب سے پہلی کتاب "ماڈرن اسلام ان انڈیا" یہیں کے دوران قیام
۱۹۴۳ء میں شائع کی جس کا شمار آج بھی قدیم کلاسکی ادب میں کیا جاتا ہے۔ وہ اس وقت تک تاریخ

تجزیاتی مطالعہ میں مارکسی معیارات کو بنیادی جگہ دیتے تھے، جس کی جھلک اس کتاب میں صاف نظر آتی ہے، اس کی اشاعت کے بعد مارکسی نقطۂ نظر کی وجہ سے انھیں مذہبی عیسائی دنیا کی تنقیدوں کا ہدف بھی بننا پڑا۔

ہندوستان آنے سے پہلے وہ کیمبرج میں ہملٹن گب کی نگرانی میں دو سال تک عربی اور اسلامیات کا مطالعہ کر چکے تھے، یہاں سے واپسی پر انھوں نے پرنسٹن میں فلپ کے حتی کی نگرانی میں "مجلۃ الازہر تجزیہ و تنقید" کے موضوع پر مقالہ پیش کر کے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۱۹۴۹ء میں وہ کیمبرج ٹیولیجن کے پروفیسر ہو کر مکگل یونیورسٹی چلے آئے، جہاں دو ہی سال کے عرصہ میں انھوں نے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی بنیاد ڈالی، مکگل آنے کے پانچ چھ برس کے اندر ہی ان کی دوسری معرکۃ الآرا کتاب "اسلام ان ماڈرن ہسٹری" شائع ہوئی جس نے ان کو پورے عالم اسلام میں متعارف کرادیا لیکن اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد وہ صرف اسلام کو اپنا موضوع مطالعہ بنانے کے بجائے دنیا کے مختلف مذاہب، بلکہ نفس مذہب کا مطالعہ کرنے میں مشغول ہو گئے، انھوں نے ماٹریال ریڈیو سے "دوسروں کا مذہب" کے عنوان سے تعارفی تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا جو ۱۹۶۲ء میں "THE FAITH OF OTHER MEN" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا، ۱۹۶۳ء میں انھوں نے مختلف مذاہب پر اپنی تحقیقات کا نچوڑ "مذہب کا مطلب و منتہیٰ" ("THE MEANING AND END OF RELIGION") کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی، جب انھوں نے محسوس کیا کہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا میدان ان کے ذہنی سفر کے لیے تنگ ہو گیا ہے تو ۱۹۶۴ء میں وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں مذہب کے تقابلی مطالعہ کے مرکز کے ڈائرکٹر ہو کر چلے گئے، مکگل انسٹی ٹیوٹ چونکہ اسلام کے مطالعہ کے لیے قائم کیا گیا تھا، اس لیے انھوں نے اپنے دورانِ قیام اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ اساتذہ اور طلبہ دونوں ہی کی تعداد میں مسلم اور غیر مسلم کی نسبت نصف نصف رہے،

کیونکہ ان کے خیال میں کسی بھی مذہب کا مطالعہ اس مذہب کے ماننے والوں کی غیر موجودگی میں نہیں کیا جا سکتا۔ ہارورڈ میں چونکہ ایک سے زیادہ مذاہب کا مطالعہ مقصود تھا، اس لیے وہاں پر انھوں نے سنٹر کو اتفاقی بنیادوں پر قائم کیا، تاکہ مختلف مذاہب کے لوگ ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

سنہ ۱۹۷۳ء میں وہ ہارورڈ سے کناڈا کی ڈلہوزی یونیورسٹی میں ریلیجن کے پروفیسر ہو کر چلے گئے۔ وہاں سے پانچ چھ برس کے بعد دوبارہ ہارورڈ واپس آئے، اور تا دم تحریر وہیں ہیں۔

اسمتھ اپنے فکر اور عمل دونوں کے اعتبار سے خود بھی مذہبی ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے مذاہب پر عمل پیرا دیکھنا چاہتے ہیں۔ تقویٰ ان کے خیال میں کسی مخصوص مذہب کی ملکیت نہیں ہے، یہ دراصل انسان اور خدا کے باہمی تعلق کے نتیجہ میں وجود میں آتا ہے، یہ تعلق جتنا مضبوط ہوگا، فرد کی مذہبی زندگی اتنی ہی قابل رشک ہوگی۔ اسمتھ کے نقطۂ نظر سے مذہب کی دو جہتیں ہوتی ہیں، ایک کو وہ انفرادی کیفیت کہتے ہیں اور دوسری کو اجتماعی روایات۔ انفرادی کیفیت کو اسمتھ اپنی زبان میں FAITH اور ہماری زبان میں "ایمان" کہتے ہیں۔ اگرچہ ایمان کی دولت کے بغیر کوئی شخص مذہبی نہیں ہو سکتا، لیکن ایمان کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ یہ چونکہ ایک اندرونی کیفیت ہے، اس لیے ضروری نہیں ہے کہ ایمان میں حالات کے تحت تغیر و تبدل نہ ہو سکے، اور ہر شخص کے ایمان کا پلہ بھی برابر نہیں ہو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسمتھ "ایمان ہر کس بقدر ہمت اوست" کے قائل ہیں، افراد کی سطح پر کمیت اور کیفیت کے فرق کے باوجود مذہب کی دوسری جہت یعنی کسی مذہب کے پیروؤں کی اجتماعی روایات کا نام اسمتھ CUMULATIVE TRADITION دیتے ہیں، ظاہر میں ان کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اگرچہ ان میں زمان و مکان کے فرق کی وجہ سے تغیر اور تبدل ہوتا رہتا ہے، تاہم ان روایات میں چونکہ ایک تسلسل ہوتا ہے، اس لیے وہ کسی مذہب کا مطالعہ کرنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، اور چونکہ روایات زمان و مکان کے

وقت سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں اس لیے اگر اس جہت سے دیکھا جائے تو ایک سے زیادہ مذاہب کا
وجود ثابت ہو جاتا ہے لیکن اگر اندرونی کیفیت یا ایمان کو مذہب کا معیار مانا جائے تو پھر یہ نہیں
کہا جا سکتا کہ ایک سے زیادہ ایمان کا وجود ممکن ہے، ایمان کی اجتماعی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن
ایمان ہمیشہ واحد ہی رہے گا، اسے جمع کے صیغے میں استعمال نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ اسمتھ
اپنی تحریروں میں FAITH کو ہمیشہ واحد کے صیغے میں لکھتے ہیں، اپنی پرانی تحریروں میں انھوں نے
جہاں کہیں اسے ضرورۃً جمع کے صیغے میں لکھا تھا اسے دوبارہ اشاعت کے وقت "FORMS
OF FAITH" (ایمان کی مختلف شکلوں) میں بدل دیا ہے۔

ایمان اسمتھ کے نزدیک ایک انفعالی کیفیت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک معاہدہ ہے جو بندہ
اپنے خدا سے کرتا ہے، جس کی رو سے وہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے
جہاں ایمان کا اظہار ہوتا ہے اور وہ ایک شکل اختیار کر لیتا ہے، خدا پر ہمارا ایمان جتنا زیادہ مکمل ہوگا
اتنا ہی ہم اس کے تابع اور فرماں بردار بندے ہوں گے، اسی اتباع اور فرماں برداری کو اسمتھ "اسلام"
کہتے ہیں، اسلام ان کے نزدیک دراصل ایمان کے اظہار کا نام ہے۔ اس نتیجہ پر پہونچ جانے کے بعد
وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ان الدین عند اللہ الاسلام۔ لیکن اس کی تشریح میں وہ ہم سے اختلاف کرتے
ہیں، ہم یہاں اسلام کو اسم معرفہ سمجھ کر اس سے اپنا مذہب اسلام مراد لیتے ہیں، اور اسمتھ اسے "اطاعت
خداوندی" کے معنوں میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اسلام کے اسم فاعل "مسلم" کی تشریح بھی وہ لغوی
اور اصطلاحی دونوں طرح سے کرتے ہیں، لغوی حیثیت سے تو مسلم کا مطلب ہے "فرماں بردار بندہ"
لیکن اب اصطلاحاً مسلم ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو تاریخی مذہب اسلام کی پیروی کو ذریعۂ نجات
سمجھتے ہیں، اگر ہم بات کو واضح کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے دو الگ الگ ہم معنی لفظ "مسلم"
اور "مسلمان" استعمال کریں جن میں اول الذکر کو لغوی معنوں میں اور آخر الذکر کو اصطلاحی معنوں میں

تو پھر اسمتھ یا کسی جھجک کے انگریزی میں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ "میں مسلمان نہیں ہوں" لیکن اسی بات کو وہ عربی میں "مسلم" کے لغوی معنی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے بارے میں "لست بمسلم" کہنے پر کبھی تیار نہ ہوں گے کیونکہ اس اعلان کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خدا کے فرمانبردار بندے نہیں ہیں، اور یہ بات ان کے عقیدے اور عمل کے مطابق درست نہیں ہے، خدا کی مرضی کو وہ جس حد تک اپنی صلاحیتوں کے مطابق سمجھ پائے ہیں، اس کے تحت ان کی پوری زندگی ایک بندۂ مسلم کی زندگی ہے، اپنے کو بندۂ مسلم سمجھنے لیکن اصطلاحی معنوں میں مسلم نہ کہنے کی ایک وجہ تو ان کے خیال میں یہ ہے کہ وہ اتفاق سے کسی مسلم گھرانے میں نہیں پیدا ہوئے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے اس دعوے سے متفق نہیں ہیں کہ اصطلاحی طور سے مسلمان ہوئے بغیر خدا کی مرضی کے آگے سر نہیں جھکایا جا سکتا انھوں نے جس طریقہ سے اپنے کو خدا کے سپرد کیا ہے وہی سپردگی ان کے نزدیک "الاسلام" ہے کیتھولک انسائیکلوپیڈیا کی تشریح کے مطابق دین یا "ریلیجن" خدا کے حضور بندوں کی اختیاری سپردگی کو کہتے ہیں۔" پروفیسر اسمتھ کا اصرار ہے کہ اگر ہم کیتھولک پادریوں یا دوسرے عیسائی علماء کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھ لیں گے کہ وہ ریلیجن کی مذکورۂ بالا تعریف کے پیش نظر صبح و شام اپنی زبان میں "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" کا ورد کر رہے ہیں، اس کے باوجود انھیں اس پر بھی اصرار ہے وہ مسلمان نہیں ہیں، گویا اسلام ان کا دین تو ہے لیکن وہ مسلمان نہیں ہیں، یہ ظاہری تضاد بیانی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب یہ واضح کر دیا جائے کہ عیسائی علماء اور پادری اور خود اسمتھ جس اسلام کو اپنا دین کہتے ہیں، وہ اس اسلام سے قطعاً مختلف ہے جو صدہا برس کے تاریخی اور سماجی عوامل کے نتیجے میں ایک خاص مذہبی طرز فکر کا مرادف بن گیا ہے۔

اسمتھ کو یقین ہے کہ اسلام کا جو مفہوم وہ سمجھ رہے ہیں، وہ قرن اول کے مسلمانوں کی تشریحات سے مختلف نہیں ہے، مثلاً طبری اور ان کے ہمعصر مسلمانوں کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ

کا مفہوم اطاعت اور بندگی ہی لیتے ہیں۔ یہ تصور کہ اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے ایک
جامع اور متعین نظام ہے، ان کے خیال میں کم از کم قرن اول کے مسلمانوں کے لیے اجنبی
مثلاً قرآنی آیات "وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ" اور "رَضِيتُ لَكُمُ
الْإِسْلَامَ دِينًا" کی تشریح کرتے وقت طبری اسلام کا مطلب بتاتے ہیں: الاستسلام لامری
والانقیاد بالطاعۃ علی ما شرعت لکم من حدودہ و فرائضہ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمان
طبری کی اس تشریح سے اختلاف نہیں کرتے، کیونکہ وہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اسلام اللہ کی مقرر کردہ
حدود و فرائض کی پابندی کا نام ہے، اور اسمتھ بھی یہی کہتے ہیں، لیکن جب ہم اس سے آگے بڑھ کر
تفصیلات میں داخل ہوتے ہیں تو ہم اور اسمتھ الگ الگ راہوں پر چل پڑتے ہیں، ہمارے نزدیک
اللہ کی مقرر کردہ حدود و فرائض من وعن وہی ہیں جنھیں ہم شریعت اسلامیہ کہتے ہیں، اس لیے مسلمان
ہونے کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ انسان شریعت اسلامیہ کی بالادستی کو بھی قبول کر لے،
اسمتھ کو ہماری تشریح سے اتفاق نہیں ہے وہ اطاعتِ الٰہی کو شریعتِ اسلامیہ میں محدود نہیں
کرتے۔ شریعت اسلامیہ، اسمتھ کے نزدیک دراصل مذہب کے اس رخ سے تعلق رکھتی ہے جسے وہ
مذہبی روایات کہتے ہیں، جس کا وجود ایک سے زیادہ شکلوں میں ممکن ہے، یہاں پر اسمتھ تقریباً
وہی بات کہتے ہیں جو مولانا ابوالکلام آزاد نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے ذیل میں یا پاکستان کے عالم
مولانا جعفر شاہ پھلواری ندوی نے اپنی کتاب الدین یسر میں دین اور شریعت کی بحث میں کہی ہے،
دین ایک ہے، ایک رہا ہے اور ہمیشہ ایک رہے گا، ہاں شریعتیں بدلتی رہتی ہیں۔" اسی کے
ساتھ مولانا آزاد یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسرے مذاہب کے لوگ اگر اپنی اپنی اصل شریعتوں پر
ایمانداری اور ایمانداری کے ساتھ عمل کریں تو انھیں محسوس ہوگا کہ ان کی شریعتوں کی دعوت بھی
وہی ہے جس کی طرف اسلام لوگوں کو بلا رہا ہے، اگر بات اسی اجمال میں چھوڑ دی جائے تو

شاید اسمتھ کو بھی مولانا آزاد کے اس نکالے ہوئے نتیجہ سے اختلاف نہ ہوگا، ہاں ان میں اختلاف اس وقت ہوگا جب شریعت اسلامیہ کو ایمان کا مرادف قرار دیا جائے اور اس کے بغیر تکمیل ایمان کو ناممکن کہا جائے،

(اسمتھ کو "شماریات" سے بھی کافی دلچسپی ہے اور نتائج نکالنے میں اس سے مدد لیتے رہتے ہیں، ایمان اور اسلام کی بحث میں یہ دکھانے کے لیے کہ اصل چیز ایمان ہے اور قرآن نے اسی پر زور دیا تھا، لیکن جیسے جیسے مسلم سماج منظم ہوتا گیا اور دوسرے مذاہب کی طرح ایک مخصوص مذہب کی شکل اختیار کرتا گیا، ایمان کے بجائے اسلام پر زور دیا جانے لگا، قرآن میں ایمان اور اسلام نیز ان کے مختلف مشتقات کی تعداد کی بنیاد پر اسمتھ نے ۸۵ (۸۵ء۱ ٪) اور ۱۵ (۱۴۰۹ ٪) کی نسبت دکھائی ہے، اس کے بعد انھوں نے قرن اول اور زمانہ وسطیٰ کی عربی کتابوں کے ناموں کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ۳۰۰ھ تک یہ نسبت ۸۵ اور ۱۵ کے بجائے ۴۰ اور ۶۰ کی ہو جاتی ہے، عہد جدید یا چودھویں صدی میں ایمان اور اسلام کا تناسب بالکل بدل جاتا ہے، اور دونوں میں سات (۷۰۱ ٪) اور ۹۳ (۹۲۰۹ ٪) کی نسبت رہ جاتی ہے) ان اعداد و شمار کی روشنی میں اسمتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آج اسلام کو جو ایک جامع نظام کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور یہ تصور پیش کیا جا رہا ہے کہ نزول قرآن کا بنیادی مقصد ایک مسلم کمیونٹی کا قیام تھا، وہ عہد جدید کی پیداوار ہے، اسمتھ کے خیال میں اگر قرآن کا یہی مقصد رہا ہوتا تو پھر وہ ان یہودیوں اور عیسائیوں پر تنقید نہ کرتا جو جنت کو اپنے مذہبی دائرہ میں محدود سمجھتے تھے۔

اسمتھ ایک طرف خدا پر ایمان رکھنے کے باعث اپنے کو "مسلم" بھی کہتے ہیں، اور دوسری طرف وہ اس تاریخی حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے کہ "مسلم" ایک اسم معرفہ ہے، اس کا اطلاق اُن لوگوں پر ہوتا ہے جنھوں نے محمد صلعم کے ذریعہ ایمان کی دولت پائی ہے، اسی لیے وہ مسلمانوں

اور ان کے مذہب کو صرف "مسلم" اور "اسلام" کے الفاظ سے متعارف کراتے ہیں، یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے مختلف زمانوں میں جو نام رائج رہے ہیں، ان کے بارے میں اسمتھ کا یہ خیال ہے کہ وہ کسی بدنیتی یا توہین کے باعث نہیں تھے، یورپ جن جن طریقوں سے اسلام سے واقف ہوا اسی قسم کے نام وہ اسے دیتا گیا، کسی زمانہ میں اسے "گروہ سارسین" کہا گیا، پھر جب رینیساں اور ریفارمیشن کے دور میں ریلیجن (مذہب) کی اصطلاح یورپ میں رائج ہوئی تو اسلام کو "مذہب سارسین" بتایا گیا، پھر اسے "تاتاریوں اور ترکوں کا مذہب" نام دیا گیا، حیرت یہ ہے کہ سترہویں صدی میں پہلی بار جب یورپ نے لفظ اسلام کا استعمال کیا تو اس وقت بھی اسے مذہب کیا نہیں بلکہ اہل مذہب کے واسطے بولا گیا، اور اسلام کی تعریف "کیتھولک یا صحیح العقیدہ (RIGHT BELIEVING) مسلمان" کے الفاظ سے کی گئی، انیسویں صدی تک یورپ کی تحریروں میں اس قسم کے جملے مل جاتے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ "اپنے عقیدہ کے اعتبار سے تم ایک اسلام ہو" جب تک اسلام بمعنی مسلم مستعمل رہا اس وقت تک مذہب اسلام کے لیئے اسلام ازم "کا لفظ رائج رہا، انیسویں صدی سے محڈن اور محڈن ازم کے الفاظ مختلف ہجے کے ساتھ رائج ہوئے اس صدی کے نصف اول سے بالعموم اسلام اور مسلم بولا جانے لگا۔

خود اسمتھ نے اپنی تحریروں میں ہمیشہ یہی دو الفاظ استعمال کیے ہیں بلکہ ان الفاظ کو رواج دینے کے لیے وہ پچھلے چالیس پینتالیس برسوں سے قلمی اور زبانی جہاد بھی کر رہے ہیں، اس معاملہ میں وہ اس حد تک زود حس ہیں کہ ۱۹۴۹ء میں جب ان کے استاد سر ہملٹن گب کی مشہور زمانہ کتاب محڈن ازم شایع ہوئی تو اسمتھ نے کتاب کے نام کو پسند نہیں کیا اور نہ ہی وہ گب کی اس معذرت سے متاثر ہوئے کہ یہ نام ان کی اپنی پسند سے نہیں بلکہ ناشر کی تاجرانہ پالیسی کی وجہ سے رکھنا پڑا، لیکن اب اسمتھ آہستہ آہستہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اس معاملہ میں خود ان کا بے لچک اصرار شاید ضرورت سے کچھ زیادہ

شاید اسمتھ کو بھی مولانا آزاد کے اس نکالے ہوئے نتیجہ سے اختلاف نہ ہوگا، ہاں ان میں اختلاف اس وقت ہوگا جب شریعت اسلامیہ کو ایمان کا مرادف قرار دیا جائے اور اس کے بغیر تکمیل ایمان کو ناممکن کہا جائے،

(اسمتھ کو "شماریات" سے بھی کافی دلچسپی ہے اور نتائج نکالنے میں اس سے مدد لیتے رہتے ہیں، ایمان اور اسلام کی بحث میں یہ دکھانے کے لیے کہ اصل چیز ایمان ہے اور قرآن نے اسی پر زور دیا تھا، لیکن جیسے جیسے مسلم سماج منظم ہوتا گیا اور دوسرے مذاہب کی طرح ایک مخصوص مذہب کی شکل اختیار کرتا گیا، ایمان کے بجائے اسلام پر زور دیا جانے لگا، قرآن میں ایمان اور اسلام نیز ان کے مختلف مشتقات کی تعداد کی بنیاد پر اسمتھ نے ۸۵ (۸۵ء۱۷٪) اور ۱۵ (۱۴ء۰۹٪) کی نسبت دکھائی ہے، اس کے بعد انھوں نے قرن اول اور زمانہ وسطیٰ کی عربی کتابوں کے ناموں کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ۱۳۰۰ھ تک یہ نسبت ۸۵ اور ۱۵ کے بجائے ۴۰ اور ۶۰ کی ہوتی ہے، عہد جدید یا چودھویں صدی میں ایمان اور اسلام کا تناسب بالکل بدل جاتا ہے، اور دونوں میں سات (۷ء۰۱٪) اور ۹۳ (۹۲ء۰۹٪) کی نسبت رہ جاتی ہے) ان اعداد و شمار کی روشنی میں اسمتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آج اسلام کو جو ایک جامع نظام کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ تصور پیش کیا جا رہا ہے کہ نزول قرآن کا بنیادی مقصد ایک مسلم کمیونٹی کا قیام تھا، وہ عہد جدید کی پیداوار ہے، اسمتھ کے خیال میں اگر قرآن کا یہی مقصد رہا ہوتا تو پھر وہ ان یہودیوں اور عیسائیوں پر تنقید نہ کرتا جو جنت کو اپنے مذہبی دائرہ میں محدود سمجھتے تھے۔

اسمتھ ایک طرف خدا پر ایمان رکھنے کے باعث اپنے کو "مسلم" بھی کہتے ہیں، اور دوسری طرف وہ اس تاریخی حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے کہ "مسلم" ایک اسم معرفہ ہے، اس کا اطلاق اُن لوگوں پر ہوتا ہے جنھوں نے محمد صلعم کے ذریعہ ایمان کی دولت پائی ہے، اسی لیے وہ مسلمانوں

اور ان کے مذہب کو صرف "مسلم" اور "اسلام" کے الفاظ سے متعارف کراتے ہیں، یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے مختلف زمانوں میں جو نام رائج رہے ہیں، ان کے بارے میں اسمتھ کا یہ خیال ہے کہ وہ کسی بدنیتی یا توہین کے باعث نہیں تھے۔ یورپ جن جن طریقوں سے اسلام سے واقف ہوا اسی قسم کے نام وہ اسے دیتا گیا، کسی زمانہ میں اسے "گروہ سارسین" کہا گیا، پھر جب رینساں اور ریفارمیشن کے دور میں ریلیجن (مذہب) کی اصطلاح یورپ میں رائج ہوئی تو اسلام کو "مذہب سارسین" بتایا گیا، پھر اسے "تاتاریوں اور ترکوں کا مذہب" نام دیا گیا، حیرت یہ ہے کہ سترہویں صدی میں پہلی بار جب یورپ نے لفظ اسلام کا استعمال کیا تو اس وقت بھی اسے مذہب کیلیے نہیں، بلکہ اہل مذہب کے واسطے بولا گیا، اور اسلام کی تعریف "کیتھولک یا صحیح العقیدہ (RIGHT BELIEVING) مسلمان" کے الفاظ سے کی گئی، انیسویں صدی تک یورپ کی تحریروں میں ہمیں اس قسم کے جملے مل جاتے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ "اپنے عقیدہ کے اعتبار سے تم ایک اسلام ہو۔" جب تک اسلام بمعنی مسلم مستعمل رہا اس وقت تک مذہب اسلام کے لیے "اسلام ازم" کا لفظ رائج رہا، انیسویں صدی سے محڈن اور محڈن ازم کے الفاظ مختلف ہجے کے ساتھ رائج ہوئے، اس صدی کے نصف اول سے بالعموم اسلام اور مسلم بولا جانے لگا۔

خود اسمتھ نے اپنی تحریروں میں ہمیشہ یہی دو الفاظ استعمال کیے ہیں، بلکہ ان الفاظ کو رواج عام دینے کے لیے وہ پچھلے چالیس پینتالیس برسوں سے قلمی اور زبانی جہاد بھی کر رہے ہیں، اس معاملہ میں وہ اس حد تک زود حس ہیں کہ ۱۹۴۹ء میں جب ان کے استاد سر ہملٹن گب کی مشہور زمانہ کتاب محڈن ازم شایع ہوئی تو اسمتھ نے کتاب کے نام کو پسند نہیں کیا اور نہ ہی وہ گب کی اس معذرت سے متاثر ہوئے کہ یہ نام ان کی اپنی پسند سے نہیں بلکہ ناشر کی تاجرانہ پالیسی کی وجہ سے رکھنا پڑا، لیکن اب اسمتھ آہستہ آہستہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اس معاملہ میں خود ان کا بے لچک اصرار شاید ضرورت سے کچھ زیادہ ہے۔

اور گب کی کتاب کے عنوان کو بالکل ہی بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا، اسمتھ نے کھل کر تو یہ بات نہیں کہی ہے کہ وہ اب اسلام کے بجائے محمڈن ازم کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اگر کوئی شخص اسلام کے بجائے محمڈن ازم پر اصرار کرے تو اسمتھ کا ردعمل اتنا سخت نہ ہوگا جتنا گب کی محمڈن ازم شایع ہونے کے وقت تھا، اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے ہمیں اسمتھ کے ایک اور خیال کا جائزہ لینا پڑے گا۔

اسمتھ کے خیال میں کسی بھی مذہب کا صحیح اور مکمل مطالعہ اس مذہب کے ماننے والوں کے احساسات اور جذبات، ان کے افکار و اعمال، نیز مذہب کے تاریخی تسلسل اور شعائر (SYMBOL) کو نظر انداز کر کے صرف ان کی کتابی الٰہیات کی روشنی میں نہیں کیا جا سکتا، اسلام میں رسول اللہ صلعم کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہے اسے ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے، اپنی کتاب "THE FAITH OF OTHER MEN" میں انھوں نے دنیا کے چند بڑے مذہبی طریقوں کا تعارف کراتے ہوئے مذہبی شعار یا 'RELIGIOUS SYMBOL' کی بحث اٹھائی ہے اور بتایا ہے کہ ہر مذہب کا ایک نہ ایک شعار ہوتا ہے کسی مذہب میں یہ شعار صوری ہوتا ہے، جیسے عیسائیوں کی صلیب اور کہیں معنوی ہوتا ہے جیسے اسلام کا کلمۂ شہادت، کلمۂ شہادت سے ایک مسلمان اگر ایک طرف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے تو ساتھ ہی ساتھ اس کی بھی شہادت دیتا ہے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، کلمۂ شہادت کی تشریح کرتے ہوئے اسمتھ یہ بتاتے ہیں کہ کلمہ کے دوسرے جزو محمد رسول اللہ کے ذریعہ آنحضرت صلعم کے رتبہ کا تعین مقصود نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد آپ کے منصب کا اظہار ہے، اس منصب کی رو سے رسول اللہؐ حقیقتاً انسانوں تک مرضئ الٰہی کی ترسیل کا ایک ذریعہ تھے، اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے مسلمانوں کے ان باہمی مناظروں کو یاد کریں جو ذات نبویؐ کے تعین کے سلسلہ میں ہوتی رہی ہیں اور آج بھی ان کا سلسلہ جاری ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ

اسمتھ ایک طرح سے ان مسلمان علماء کے ہمنوا ہیں جنھیں خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت کے در
واضح خط کھینچنے کے الزام میں مختلف خطابات سے نوازا جاتا رہا ہے لیکن مسلمانوں کو اپنے رسول سے جو جذ
محبت ہے اسے کس طرح نظر انداز کر دیا جائے "با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ م
اللہ کے ساتھ تو بے تکلفی برتنے کی جرأت کر لیتا ہے لیکن رسول کے معاملہ میں اسے محتاط رہنا پڑتا ہے، ایک مسلما
توحید خالص پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے کسی رسول یا نبی کو اللہ کی الوہیت میں شریک تو نہیں مانتا، لیکن اس کے
باوجود وہ عشق رسول کا مظاہرہ ان الفاظ میں بھی کرتا ہے ؎

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر		اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

اس موقع پر بحث "نور محمدی" اور "امتناع نظیر" کی بحثوں کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے جس نے اس عقیدہ کو جنم
"الوہیت نے جب تعین اختیار کیا تو وہی حقیقت محمدیہ ہوگئی" اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ مسلمان آنحضر
کو صرف خدا کا قاصد نہیں بلکہ شارع بھی مانتے ہیں، آپ کے فرمودات کا درجہ اگرچہ قرآن کے بعد آتا ہ
لیکن اسے "ناسخ قرآن" کہنے والے لوگ بھی اسی دنیا میں موجود ہیں، مسلمانوں کی یہ کلامی بحثیں بھلے ہی عمومی
لیکن اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق اسلام کی تکمیل (خواہ ا
لغوی معنوں میں بولیں یا اصطلاحی معنوں میں) ذات اقدس کے بغیر ممکن نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں ہ
ہیں کہ صحیح اسلام (یا اسمتھ کے لفظوں میں صحیح طریق سپردگی) مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق وہ ہے جس ک
رسول اکرم نے اپنے قول و عمل سے پیش کیا، اس پس منظر میں جب ہم اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسمتھ
اس خیال میں بہت حد تک حق بجانب نظر آتے ہیں کہ اسلام کو اگر کوئی شخص محمڈن ازم (یا محمدیت) کے عنوان سے پیش
کرتا ہے تو اس کے پاس اس کے لیے کچھ نہ کچھ بنیادیں ہوتی ہیں۔

آپ نے ایسے مضامین پڑھے ہوں گے جن میں ایک شاعر یا افسانہ نگار یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے
افسانہ کیوں لکھتا ہے، یا شعر کیوں کہتا ہے، اسمتھ نے اس قسم کا کوئی مضمون نہیں لکھا ہے، یا کم از کم میری

نہیں گذرا ہے کہ وہ اسلامی موضوعات پر کیوں لکھتے ہیں، لیکن اگر اس سوال کا جواب ہم ان کی مختلف تحریروں میں تلاش کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہ تو اتنے بددیانت ہیں کہ دنیا کے سامنے اسلام کی غلط تصویر پیش کرنے کی خاطر اس میدان میں آئے ہیں، اور نہ ہی اتنے خوش فہم ہیں کہ سمجھتے ہوں کہ وہ کچھ چند مسلمانوں کے دلوں میں گھس کر انھیں اسلام سے برگشتہ کر سکیں گے، اور یوں عیسائیوں کی تعداد میں اضافہ کا سبب بنیں گے، اسمتھ کو اس بات پر انشراح صدر ہے کہ یہ دور بڑے پیمانہ پر اجتماعی تبدیل مذہب کا نہیں ہے اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالمی سطح پر انسانی معاشرہ اتنا کاسموپولیٹن ہوتا جارہا ہے کہ اب ایک عیسائی یا ایک یہودی، یا ایک "لاادریا" (AGNOSTIC) خود اپنے گھر میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ اس کا پڑوسی ایک ذہین، باعمل، متقی، پرہیزگار بدھسٹ ہو یا ہندو ہو یا مسلمان ہو، اب ان سب کو اگر ایک ساتھ رہنا ہے تو انھیں ایک دوسرے کے مذہب سے بھی پوری واقفیت رکھنی چاہیے۔

یہاں ایک مسئلہ اور چھیڑنے کو جی چاہتا ہے، اکثر لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر مستشرقین اپنے اس دعوے میں صادق ہیں کہ وہ اسلام کا مطالعہ خلوص نیت کے ساتھ کرتے ہیں تو پھر وہ مسلمان کیوں نہیں ہوجاتے، یہ سوال خاصا اہم ہے، اور چند لفظوں میں اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا، ممکن ہے کہ کسی دوسرے پرچہ میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہو، لیکن جہاں تک اسمتھ کا سوال ہے، ان سے اگر خود انکی کے بارے میں یہ بات پوچھی جائے تو ممکن ہے وہ پلٹ کر جواب دیں کہ کیوں، آخر میں مسلمان کیوں ہوجاؤں؟ جب میں خود ایمان کی دولت سے سرفراز ہوں اور عیسائی رہتے ہوئے مجھے قلب کا اطمینان حاصل ہے تو پھر میں اپنا مذہب کیوں چھوڑوں، جی نہیں شکریہ! لکم دینکم ولی دین۔

ہندوستان میں فقہ اسلامی کے نظام اور علوم فقہیہ کے رواج میں ٹونک کا حصہ

از حکیم محمد عمران خان صاحب عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک

علم فقہ ایسا جامع علم ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، کتاب وسنت دین
اسلام کے دلائل میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں ہدایات
دیتے ہیں، ان ہی دلائل کو سمجھنے اور زندگی کے تمام شعبوں پر منطبق کرنے کا نام علم فقہ ہے، مسائل
عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات اور لین دین سے، نکاح وطلاق، رہن سہن یا دوسرے معاشرتی
و سماجی مسائل ہوں، یا دیگر اقوام و ممالک کے تعلقات سے متعلق امور، معاملات ملکی ہوں یا قومی،
غرض یہ ایسا جامع علم ہے، جس کی ضرورت قدم قدم پر موجود ہے، اور ہر معاملہ میں رہنمائی اس علم
کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اور ہر موقع پر فہم و فراست کی ضرورت ہے، اس وجہ سے صاحب کشاف
الاصطلاح نے اس علم کو "علم الدرایہ" کہا ہے، اور اس علم کی تعریف اس طرح کی ہے،

"ہو معرفۃ النفس مالہا وما علیہا، ہکذا نقل عن ابی حنیفہ رحمہ اللہ"۔

سبحان اللہ کیا جامع تعریف ہے، ایسا علم جس کے ذریعہ انسان کو ان تمام باتوں کا علم
ہو جائے، جو اس کے لیے مفید ہو سکتی ہیں یا اس کو نقصان پہنچا سکتی ہیں یا اس کے خلاف ہو سکتی ہیں،

اس علم کا نام علم فقہ ہے، اس وجہ سے امام غزالیؒ نے اس علم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لوگوں نے علم فقہ کو بہت محدود کر دیا ہے، اور علم فتاوی اور اس کے دلائل و علل کے سمجھنے کو علم فقہ کا نام دیدیا ہے حالانکہ عصر اول میں یہ علم اپنی معنویت کے لحاظ سے بڑی جامعیت رکھتا تھا، اس کا اطلاق علم آخرت پر اس حیثیت سے ہوا کرتا تھا کہ اس علم کے ذریعہ آفات نفس کی تمام باریکیوں کا علم ہوتا ہے، اس علم کے ذریعہ دنیا کی حقیقت اور آخرت کی معرفت حاصل ہوتی ہے، غرض علم فقہ ایسا جامع علم ہے کہ حیات انسانی کا کوئی پہلو اس علم سے آزاد نہیں ہو پاتا ہے، عملی زندگی سے متعلق جس قدر احکام ہیں ان کے جس قدر تفصیلی دلائل ہیں وہ اس علم سے حاصل ہوتے ہیں، گھریلو زندگی سے لیکر ملکی مسائل تک اور شہری زندگی سے لیکر بین الاقوامی معاملات انٹرنیشنل مسائل تک جو ہدایات ہیں حاصل ہوتی ہیں وہ اسی علم کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں، اس وجہ سے ابتداء سے اس علم کی بڑی اہمیت رہی۔

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں کتاب اللہ کی ترتیب و حفاظت اور سنت رسول اللہ و احادیث کی تدوین و حفاظت کا کام بڑی تیزی اور مستعدی سے ہوا ہے، اس وجہ سے اس علم کی ضرورت اس وقت سے بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ قرآن مجید ہو یا احادیث کے ذخیرے، قرآن مجید اپنے اختصار اور جامعیت کی وجہ سے اور احادیث اپنی وسعت اور کثرت روایت کی وجہ سے، دونوں اس بات کے متقاضی تھے کہ تحقیق و تنقیح اور حسب ضرورت استنباط و اجتہاد کے ذریعہ اصول کا استخراج کیا جائے، اور بمصداق آیت "فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون (سورہ توبہ) امت مسلمہ کے ذمہ دار جن نے جنھیں اللہ نے یہ صلاحیت دی تھی، اس ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے کچھ اصول مرتب کئے جو اصول فقہ کہلائے اور اس کے مطابق مسائل کی

تدوین و ترتیب شروع ہوئی، اور اجماع و قیاس کے اصول مرتب ہوئے، جن مسائل میں صراحت نہیں ملی، وہاں ان اصول کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد کی ضرورت پیش آئی، آج پوری امت مسلمہ پر بلکہ پوری انسانیت پر ان لوگوں کا بڑا احسان ہے جنھوں نے اللہ کی دی ہوئی اُن صلاحیتوں کے ذریعہ بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے بڑی بڑی زحمتیں برداشت کیں، اور حتی المقدور جد و جہد و تحقیق و تنقید کے بعد، علوم کے وہ ذخیرے تیار کئے جو ہمارے لئے مشعل راہ کا کام انجام دے رہے ہیں۔

ہندوستان میں علم فقہ اور اس کے متعلقات پر زیادہ تصنیفات فراہم ہونے کی اصل وجہ ہی یہ ہے کہ جب اسلام براہ راست ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں پہنچا، پھر صوفیہ و بزرگان دین کے ذریعہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیلا، پھر مختلف حملوں کے بعد جب یہاں کا اقتدار بھی مسلمانوں کے ہاتھوں میں آگیا، اور وہ بھی تھوڑی مدت کے لیے نہیں بلکہ تقریباً آٹھ سو سال تک مسلسل انھیں اقتدار حاصل رہا، اور یہ پوری مدت اس طرح گذری کہ ملکی پیمانے پر بھی اور عملی زندگی کے مطابق بھی ہر روز نئے مسائل کا سامنا تھا، اور ہر مرحلہ پر دین کی رہنمائی کی ضرورت تھی، ـــــــ ایسی ہی ضرورتوں کی بناء پر ہر دور میں عملی زندگی کے لیے ہر روز پیش آنے والی ضرورت کے مطابق، عوام و خواص کو ہدایت ملتی رہے، مسائل میں کسی طرح کی پیچیدگی پیدا نہو ـــــــ یہی داعیہ ہر دور میں اہل ہند کے لئے جدید تصنیفات کا باعث بنا، لہذا جس طرح ابتدائی صدیوں میں تفاسیر و مسانید کے مجموعے ملتے ہیں اسی طرح اسکے بعد کی صدیوں میں فقہی مجموعے اور مسائل کے ذخیرے کثرت سے جمع ہوتے رہے۔

ابتدائی دور میں جب کوئی مہم کسی ملک کے لیے روانہ کی جاتی تھی، تو اس وقت اول تو اس مہم کا ذمہ دار کوئی صحابی تابعی، تبع تابعی یا عالم دین ہوا کرتا تھا، لیکن اس کے بعد کے ادوار میں بھی

ہر مہم کے ساتھ افتاء و قضاء یا احتساب و نگرانی کے لئے کوئی ذمہ دار ضرور بھیجا جایا کرتا تھا ــــــ ہندوستان کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سندھ پر جس قدر مہمات ہوتی رہیں، ان میں فوج کے ساتھ قاضی یا مفتی کی حیثیت سے کسی ذمہ دار کو ضرور بھیجا جاتا تھا، چنانچہ حضرت ربیع بن زیاد حارثیؓ نے جب ۳۱ھ میں سجستان اور سندھ کے علاقے میں فوج کو فتح کیا ہے اور ڈھائی سال تک ان کا قیام یہاں رہا، اسوقت حضرت حسن بصریؒ (تابعی) مفتی اور میر منشی کی حیثیت سے ان کے ساتھ برابر رہے، اس درمیان میں اگر حضرت حسن بصریؒ کسی دوسری مہم پر جاتے تو ان کی غیر موجودگی میں حضرت جابر بن یزید افتاء کی خدمت انجام دیا کرتے تھے، طبقات ابن سعد میں اس سلسلہ میں ہے،

کان الحسن یغزو وکان مفتی	جب حسن بصریؒ جہاد میں چلے جاتے تھے،
الناس ھٰھنا جابر بن یزید	سجستان میں جابر بن یزید لوگوں کے مفتی
قال ثم جاء الحسن	تھے، اور جب حسن بصری آجاتے تھے تو وہ
فکان ہو۔	فتوی دیتے تھے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں سندھ میں محکمۂ قضا کا مستقل انتظام ہو گیا تھا اس لئے ان کی جانب سے سندھ میں مستقل قاضی مقرر کئے جاتے رہے ــــــ خلیفہ ابن خیاط نے اپنی تاریخ میں مختلف علاقوں کے قضات کی تفصیل بیان کی ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے حضرت عثمانؓ کے دور میں سندھ کا مستقل قاضی حضرت حکیم بن جبلہ عبدی کو لکھا ہے۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں یکے بعد دیگرے سندھ کے تین امیر مقرر ہوئے۔

(۱) حضرت عبداللہ بن معمر قریشی تیمی جو فاتح مکران بھی ہیں اور فارس کے امیر بھی رہے ہیں،

(۲) حضرت عمیر بن عثمان بن سعد،

[illegible]

(۳) ابن کندیہ قشیری۔

ان امراء ثلثہ کے ادوار میں حضرت حکیم بن جبلہ عبدی ہی سندھ و مکران کے مستقل قاضی و مفتی رہے ہیں ـــــ یہ وہی حکیم بن جبلہ عبدی ہیں جنہیں حضرت عثمانؓ نے ثغر ہند کے حالات معلوم کرنے کے لئے ابتداء ہی میں سندھ بھیجا تھا۔

۹۳ھ میں محمد بن قاسم نے موسیٰ بن یعقوب ثقفی کو اروڑ (سندھ) کا قاضی بنایا اور زمانۂ دراز تک ان کی اولاد بھی وہاں قضا اور خطابت کی خدمت انجام دیتی رہی[1]

منصورہ کے قاضی ابو العباس احمد بن محمد بن صالح منصوری سندھی تھے، حاکم نے اپنی معجم میں ان کا ذکر کیا ہے، یہ اگرچہ داؤد ظاہری کے متبع تھے لیکن اپنے مذہب کے بڑے امام گذرے ہیں۔ درس و تدریس کا سلسلہ بھی بہت کافی تھا، اور متعدد تصانیف کے بھی مالک ہیں، ابن ندیم نے اپنی "الفہرست" میں ان کی تصنیفات کی تفصیل بتائی ہے،[2]

۲۸۳ھ میں خلیفۂ بغداد کی جانب سے محمد بن ابی الشوارب کو سندھ کا قاضی بنا کر بھیجا گیا، چند ماہ بعد سندھ میں ان کا انتقال ہو گیا، اور ان کے بعد ان کی اولاد زمانہ دراز تک یہ خدمت انجام دیتی رہی[3]

غزنوی سلاطین کے عہد میں الشیخ ابو المنصور بن علی غزنوی ممتاز اہل علم میں سے تھے۔ لاہور میں دیوان الانشاء کے افسر اعلیٰ تھے، ابو الریحان البیرونی صاحب کتاب الہند اسی دور کے ماہرین فنون میں سے ہیں، سندھ کے رہنے والے تھے، ہندوستان کے موضوع پر کتاب الہند ان کی مشہور کتاب ہے، شیخ بو علی سینا کے ہم عصر بھی تھے، اور ان میں باہمی مراسم بھی تھے، محمود محمود غزنوی علوم میں بڑا ماہر اور علم فقہ میں بڑی دستگاہ رکھتا تھا، اور صاحب تصنیف بھی تھا۔

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۱، ص ۴۴ [2] ایضاً ص ۲۵ [3] ابن اثیر ج ۷، ص ۳۴۳۔

اس کی کتاب کتاب التفرید جو فقہ حنفی میں ہے، ممالک غزنی میں عام شہرت رکھتی ہے۔

اسی طرح علی بن عثمان الہجویری المتوفی سن ۴۶۵ھ جو کشف المحجوب کے مصنف ہیں، احمد بن محمد التمیمی قاضی منصور، عمرو بن سعید لاہوری الفقیہ المتوفی سن ۵۵۰ھ/۱۱۵۵ء، محمد بن عثمان جوزجانی المتوفی بعد از سن ۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء جو فقہ اور اصول فقہ اور علوم عربیہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، ان ادوار کے مشہور فقیہ و محدث اور باکمال گذرے ہیں۔

سلطان شہاب الدین غوری کا دور ہندوستان میں بڑا اہم دور ہے، اس لیے کہ اس کے دور میں یہاں مستحکم حکومت کی بنیاد پڑی، اس دور کے فضلاء میں سید کمال الدین عثمانی ترمذی، سراج الدین محمد بن عثمان جوزجانی، حضرت خواجہ اجمیری، اور دوسرے ممتاز مشائخ اسی دور میں ہندوستان تشریف لائے اور ان کی وجہ سے اس ملک کو بڑا فیض پہنچا۔

التمش کے دور میں شیخ الاسلام کا منصب مولانا جلال الدین، مولانا نجم الدین صغری اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے سپرد رہا، اس دور کے قضاۃ میں قاضی سعد الدین کردی، قاضی حمید الدین ناگوری، قاضی کبیر الدین، قاضی قطب الدین کاشانی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اس کے بعد بلبن کا دور بھی علم و فضل کا دور تھا، اور نامور فقہاء اور اہل علم اس دور میں خدمات انجام دیتے رہے، جن میں سے بعض کا ذکر ہو چکا۔

ملوک سلاطین کے دور میں بھی قانون شریعت ہی بنیادی آئین سمجھا جاتا تھا، غیر مسلموں کے لیے ہندو کوڈ کے مطابق عمل ہوتا تھا، اور انھیں آزادی حاصل تھی۔ صدر جہاں اسی دور میں بہت اونچا منصب تھا، اس کے علاوہ قاضی قضاۃ، قاضی ممالک یا شیخ الاسلام کے عہدے مقرر تھے، جن کے مطابق عدالتی نظام چلایا جاتا تھا، ذیلی عہدیدار علیحدہ ہوا کرتے تھے

پرانی مقدمات قاضی کے سپرد ہوا کرتے تھے، فوجداری مقدمات کے لیے ایک امیر داد مقرر
ہوتا تھا، اسی طرح حسب معمول کوتوال و محتسب مقرر ہوا کرتے تھے، زکوٰۃ و عشر کا انتظام
دور میں بہت پختہ رہا کرتا تھا۔

بہرحال بعد کے ادوار میں مولانا برہان الدین النسفی، قاضی جلال الدین کاشانی
متوفی سنہ ۶۴۳ھ جنھیں معز الدین بہرام شاہ نے دہلی میں قاضی الممالک کے عہدے پر
سرفراز کیا تھا، اور وہ اوچھ کے بھی قاضی رہے ہیں، الشیخ حسین بن محمد الصغانی لاہوری صاحب
شارق الانوار المتوفی سنہ ۶۵۰ھ حسن بن علی البخاری المتوفی سنہ ۶۹۵ھ۔ قاضی رکن الدین حماد
سامانوی، مولانا سدید الدین الدہلوی وغیرہ یہاں ممتاز رہے ہیں۔

سلاطین مغلیہ کے ادوار میں تو ہندوستان میں اہل علم و اہل فن و کمال کی اس قدر کثرت
ہوگئی تھی کہ ہر صوبہ اور ہر علاقہ میں ہنرمندان باکمال کا گویا ایک جال بچھا ہوا تھا، اور تصنیف
و تالیف کی بھی اس قدر کثرت تھی کہ کوئی موضوع اور کوئی فن ایسا نہیں ملتا جس میں اہل ہنر نے
اپنے کمالات نہ دکھائے ہوں۔

بہرحال یہ بات مسلّم ہے کہ دوسرے علوم کے مقابلہ میں علم فقہ اور اصول فقہ پر اہل ہند
کی تصنیفات زائد ہیں، اگر عمومی اندازہ لگایا جائے تو صرف فقہ و اصول فقہ میں ہندوستانی
مصنفین کی کتابیں تقریباً ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار تک ہونگی، فقہ کی مشہور کتابیں ہدایہ،
شرح وقایہ، کنز الدقائق وغیرہ جو شب و روز داخل درس رہا کرتی ہیں ان کے شروح،
حواشی اور تراجم ہندوستانی مصنفین کے اس قدر ہیں کہ جن کا شمار شاید مشکل ہے، صرف
ہدایہ کی شروح و حواشی غالباً تین درجن سے کم نہیں ہیں، یہی حال شرح وقایہ وغیرہ کا ہے،
اصول فقہ پر بھی اسی وجہ سے ہندوستان میں کافی کتابیں تصنیف ہوئیں، منار الانوار، الانوار،

مسلم الثبوت، حسامی اور توضیح وتلویح،ان کتابوں کے شروح وحواشی اگر صرف ہندوستانی مصنفوں کے جمع کئے جائیں تو خود ایک مستقل تصنیف بن جائے۔

فن فقہ کا ایک اہم عنوان علم الفتاویٰ ہے، اس عنوان پر بھی اہل ہند کی کافی اہم تصانیف ملتی ہیں، فتاویٰ فیروزشاہی اور فتاویٰ تاتارخانیہ فیروزشاہ تغلق کے دور کی یادگار ہیں فوائد فیروزشاہی کے مرتب ملا محمد اتاری ہیں اور فتاویٰ تاتارخانیہ کے مرتب شیخ عالم ابن علاء دہلوی ہیں، جو انھوں نے فیروز تغلق کے وزیر تاتارخاں کے لئے ترتیب دیا تھا، اس طرح مجموع خانی الغ قتلق بہرام خاں کے لیے اور فتاویٰ ابراہیم شاہی سلطان ابراہیم شاہ کے لیے تصنیف ہوئیں، اس طرح فتاویٰ حمادیہ ازابوالفتح مفتی رکن الدین ناگوری، فتاویٰ برہنہ از شیخ نصیر الدین لاہوری، خزانۃ الروایات از قاضی جگن حنفی گجراتی، فتاویٰ نقشبندیہ از معین بن محمود کشمیری، فتاویٰ تورانیہ از میرک محمد سندھی، فتاویٰ محمود شاہی، اور اس جیسے بیسیوں فقہی مجموعے اور فتاویٰ کے ذخیرے ہیں جو ہندوستانی علماء نے ہر دور میں ترتیب دئے اور اہل علم کے درمیان متداول رہے اور اب بھی ہیں۔

سب سے بڑھکر فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب اہل ہند کا وہ بڑا کارنامہ ہے، جو سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی ادنیٰ توجہ سے مرتب ہوگیا۔ اسے اگر فقہی مسائل کی انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو زیادہ نہیں ہوگا، اسکی جدید ترتیب کی ضرورت ہے، اسی طرح فتاویٰ شامی، فتاویٰ عالمگیری اور فقہ کی دوسری اہم تصنیفات کے وہ اردو تراجم جو اہل ہند نے یہاں کی ضرورت کے پیش نظر تیار کئے، آج یہ چیزیں ان حضرات کے بڑے کارنامے نظر آتے ہیں۔

یہی حال اصول فقہ اور فقہ کے دوسرے شعبوں فرائض، فقہ وحدیث، استنباط واجتہاد وغیرہ دوسرے ذیلی موضوعات کا ہے، جن میں اہل ہند کی کافی تصانیف مرتب ہوئی ہیں

ہندوستان میں چونکہ اکثریت حنفی مسلک کی رہی ہے، اس لئے مذکورہ بالا اکثر تصانیف اس مسلک سے متعلق ہیں لیکن مدراس، مالابار یا کوکن ایسے علاقے ہیں جہاں فقہ شافعی بھی رائج ہے، اس لئے ہندوستان میں فقہ شافعی پر بھی کافی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں، پھر سنی فقہ کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں شیعی فقہ کی بھی کمی نہیں رہی ہے، اس لئے سنی فقہ کے ساتھ شیعی مسلک پر بھی یہاں کافی تصنیفات ہیں، پھر ان سب چیزوں کے علاوہ مختلف موضوعات پر جو رسائل ہر دور میں ترتیب دیئے جاتے رہے ان کی تعداد تو شمار سے باہر ہے۔

مختلف علوم و فنون پر ہندوستان کے ہر علاقے میں جس قدر ذخائر خود اہل ہند کے تصنیف کردہ پھیلے پڑے ہیں ان کے متعلق تحقیق و تنقید اور ریسرچ کے شعبوں اور اس کی تحقیقات کے اس قدر عام ہو جانے کے باوجود بھی یہ موضوع ہمیشہ تشنہ رہتا ہے۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد مرکزیت بالکل فوت ہو چکی تھی، اور پورے ملک کے حالات ابتر اور زبوں تھے، اس انتشار اور ابتری کے نتیجہ میں ملک میں متعدد مسلم و غیر مسلم ریاستیں وجود میں آئیں، ان میں ریاست حیدرآباد کا نام سر فہرست آتا ہے، جو اپنی وسعت، اپنی قدامت اپنے تہذیب و تمدن اور اپنے نظام حکومت کے معاملہ میں سب سے ممتاز اور نمایاں رہی ہے، اسی طرح بنگال، مدراس (ارکاٹ) اودھ، روہیلکھنڈ، بھاول پور، بھوپال، رامپور، اور جاورہ وغیرہ ایسے مراکز تھے، جو مسلم تہذیب و تمدن کا مرکز بنے رہے، اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی خصوصیت کے لحاظ سے اپنا ایک نظام حکومت چلاتا رہا، مگر اسی کے ساتھ بدیشی حکومت، انتشار کے اس دور میں آہستہ آہستہ اپنے اثرات قائم کر رہی تھی، یہاں تک کہ اس کی حکومت یہاں قائم ہو گئی۔

اس انتشاری دور میں راجپوتانہ میں، راجپوتوں کی حکومتیں اپنا بڑا اثر رکھتی تھیں،

سلاطینِ مغلیہ کے دور میں بھی ان کے اثرات کم نہیں تھے، لیکن مغلیہ دور ختم ہوجانے کے بعد یہ ریاستیں بڑی طاقت ور اور باثر نظر آتی تھیں، جو کسی طرح دوسری ریاستوں کے سامنے جھکنے اور زیر دست ہونے کو تیار نہیں تھیں ——— انیسویں صدی شروع ہورہی تھی کہ روہیلکھنڈ کے علاقے سے "میر خان" کے نام سے ایک طاقت ابھری اور چند برسوں میں راجپوتانہ کا پورا علاقہ اس طاقت سے متاثر ہوتا نظر آنے لگا، دور دور سے اس کی شہرت ہوئی، مرہٹہ طاقتوں نے اس میں مزید اضافہ کردیا، اس وجہ سے دس پندرہ سال کی مدت میں یہ حالات دیکھ کر برطانوی گروپ کو بڑی فکر لاحق ہوئی، اس لئے فوری طور پر اس نے اس طاقت سے مصالحت کرکے اس فتنہ کو آگے بڑھنے سے روکا، اور ۱۸۱۷ء میں راجپوت ریاستوں کے بالکل وسط میں ریاست ٹونک کے نام سے ایک مسلم ریاست کا وجود عمل میں آگیا۔

نواب خان جو اس ریاست کے بانی اور پہلے فرمانروا تھے، ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ء میں پیدا ہوئے، ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۸ء میں جنگی مہمات پر روانہ ہوئے، ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۸ء سے ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء تک یہ مہمات جاری رہیں، ۱۸۱۷ء میں یہ ریاست قائم ہوگئی، اور سترہ سال حکومت کرنے کے بعد وہ ۱۸۳۴ء / ۱۲۵۱ھ میں ٹونک میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اس نومولود اور نوخیز ریاست نے اس قلیل مدت میں اپنے وجود، اپنے قیام، اپنے نفاذ، بلکہ اپنے نظم ونسق ریاست ونظام عدالت کا ایک اچھا نمونہ قائم کرنے میں کیا ترقی کی، تاریخ داں حضرات ہی اس کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں، ملکوں اور ریاستوں کے لیے دس بیس سال کی مدت کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی، مگر نواب کے اس سترہ سالہ دورِ حکومت میں نہ معلوم کیا صلاحیتیں پوشیدہ تھیں کہ دس بیس سال کی اس مدت میں یہ ریاست ایک نمونہ کی ریاست بن گئی، اس مختصر سی مدت میں علم وفضل، تصنیف وتالیف اور فن وکمال کا بڑا مرکز بن گئی، نظم ریاست درست ہونے کے ساتھ ساتھ نظامِ عدالت میں بھی بڑی ترقیاں ہوئیں

اس ترقی کے بھی کچھ اسباب وعوامل تھے، اس موقع پر ان اسباب پر بھی غور کرنا ضروری ہے، نواب میر خان اور ان کے ساتھی جنگ جوئی جفاکشی اور فوجی مزاج کے حامل تھے، ایسے حالات میں علمی ترقیوں کا حصول بظاہر آسان نظر نہیں آتا، اس لیے کہ دونوں میں ایک طرح کا تضاد ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا ——— اس موضوع پر کافی غور و خوض اور مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ نواب میر خان اور ان کے ساتھی اگرچہ فوجی ذہن رکھتے تھے لیکن ان میں اور ان کے ساتھیوں میں دین پسندی بھی ابتداء سے تھی یہی وجہ ہے کہ راجپوتانہ کی جنگی مہمات میں مصروف ہونے سے قبل شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور دہلی وغیرہ کے دوسرے بزرگوں سے انھیں اس وقت سے عقیدت تھی، پھر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے مشورے کے مطابق سید احمد شہید رحمہ اللہ کا نواب میر خان کے لشکر سے سات سال تک تعلق رکھنا اور ان کے علاوہ بھی مولوی محمد حسن، مولوی نظام الدین اور مولانا خلیل الرحمن وغیرہ دوسرے اہل علم حضرات کا لشکری زندگی میں پورے لشکر کے ساتھ رہنا بڑی خوش آیند بات تھی، پھر تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ مولانا بحر العلوم لکھنوی کے بیٹے مولوی محمد نافع، جنگ وجدل ہی کے دور میں نواب کے ساتھ لشکر میں رہے،

اس بعد سب سے بڑھ کر بات یہ ہوئی کہ ۱۲۲۴ھ/۱۸۰۹ء میں نواب میر خان کی شادی بھی ایک علمی گھرانے میں ہوگئی، یعنی اخوند محمد ایاز خان کی بیٹی سے نواب کا رشتہ ہوا، اور صرف ایک رشتہ کی وجہ سے نہ معلوم کتنے علمی رشتے تازہ اور پختہ ہوگئے، راجپوتانہ اور دوسری سیاسی مہمات میں نواب اپنی فوج کے ساتھ جہاں جاتے اپنے گرد دینی ماحول سے قریب پاتے، یہی وجہ ہے کہ ہر علاقے کے بزرگان دین اور باکمال لوگوں سے فطرۃً ان کا تعلق بڑھتا چلا گیا، چنانچہ ناگور، اجمیر، دہلی اور رگوالیار وغیرہ کے واقعات میں ایسے تعلقات کا برابر ذکر ملتا ہے،

سلاطینِ مغلیہ کے دور میں بھی ان کے اثرات کم نہیں تھے، لیکن مغلیہ مملکت کے بعد یہ ریاستیں بڑی طاقت ور اور با اثر نظر آتی تھیں، جو کسی طرح دوسری ریاستوں کے سامنے جھکنے اور زیر دست ہونے کو تیار نہیں تھیں ـــــــ انیسویں صدی شروع ہو رہی تھی کہ روہیلکھنڈ کے علاقے سے "امیر خان" کے نام سے ایک طاقت ابھری اور چند برسوں میں راجپوتانہ کا پورا علاقہ اس طاقت سے متاثر ہوتا نظر آنے لگا، دور دور سے اس کی شہرت ہوئی، مرہٹہ طاقتوں نے اس میں مزید اضافہ کر دیا، اس وجہ سے دس پندرہ سال کی مدت میں یہ حالات دیکھ کر برطانوی گروپ کو بڑی فکر لاحق ہوئی، اس لئے فوری طور پر اس نے اس طاقت سے مصالحت کر کے اس فتنہ کو آگے بڑھنے سے روکا، اور ۱۸۱۷ء میں راجپوت ریاستوں کے بالکل وسط میں ریاست ٹونک کے نام سے ایک مسلم ریاست کا وجود عمل میں آگیا۔

نواب خان جو اس ریاست کے بانی اور پہلے فرمانروا تھے، ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۵ء میں پیدا ہوئے ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۸ء میں جنگی مہمات پر روانہ ہوئے، ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۸ء سے ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء تک یہ مہمات جاری رہیں، ۱۸۱۷ء میں یہ ریاست قائم ہو گئی، اور سترہ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۸۳۴ء / ۱۲۵۰ھ میں ٹونک میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اس نو مولود اور نو خیز ریاست نے اس قلیل مدت میں اپنے وجود، اپنے قیام، اپنے نفاذ بلکہ اپنے نظم و نسق ریاست و نظام عدالت کا ایک اچھا نمونہ قائم کرنے میں کیا ترقی کی، تاریخ داں حضرات ہی اس کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں، ملکوں اور ریاستوں کے لئے دس بیس سال کی مدت کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی، مگر نواب کے اس سترہ سالہ دور حکومت میں نہ معلوم کیا اصلاحات پوشیدہ تھیں کہ دس بیس سال کی اس مدت میں یہ ریاست ایک نمونہ کی ریاست بن گئی، اس مختصر سی مدت میں علم و فضل، تصنیف و تالیف اور فن و کمال کا بڑا مرکز بن گئی، نظم ریاست درست ہونے کے ساتھ ساتھ نظام عدالت میں بھی بڑی ترقی

اس ترقی کے بھی کچھ اسباب وعوامل تھے، اس موقع پر ان اسباب پر بھی غور کرنا ضروری ہے، نواب میر خان اور ان کے ساتھی جنگ جوئی جفاکشی اور فوجی مزاج کے حامل تھے ایسے حالات میں علمی ترقیوں کا حصول بظاہر آسان نظر نہیں آتا، اس لیے کہ دونوں میں ایک طرح کا تضاد ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا ـــــــ اس موضوع پر کافی غور وخوض اور مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ نواب میر خان اور ان کے ساتھی اگرچہ فوجی ذہن رکھتے تھے لیکن ان میں اور ان کے ساتھیوں میں دین پسندی بھی ابتداء سے تھی یہی وجہ ہے کہ راجپوتانہ کی جنگی مہمات میں مصروف ہونے سے قبل شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ اور دہلی وغیرہ کے دوسرے بزرگوں سے انھیں اس وقت سے عقیدت تھی، پھر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے مشورے کے مطابق سید احمد شہید رحمہ اللہ کا نواب میر خان کے لشکر سے سات سال تک تعلق رکھنا اور ان کے علاوہ بھی مولوی محمد حسن، مولوی نظام الدین اور مولانا خلیل الرحمن وغیرہ دوسرے اہل علم حضرات کا لشکری زندگی میں پورے لشکر کے ساتھ رہنا بڑی خوش آیند بات تھی، پھر تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ مولانا بحر العلوم لکھنوی کے بیٹے مولوی محمد نافع، جنگ وجدل ہی کے دور میں نواب کے ساتھ لشکر میں رہے،

اس بعد سب سے بڑھ کر بات یہ ہوئی کہ ۱۲۲۱ھ؍۱۸۰۹ء میں نواب میر خان کی شادی بھی ایک علمی گھرانے میں ہو گئی، یعنی اخوند محمد باز خان کی بیٹی سے نواب کا رشتہ ہوا، اور صرف ایک رشتہ کی وجہ سے نہ معلوم کتنے علمی رشتے تازہ اور پختہ ہو گئے، راجپوتانہ اور دوسری ریاستوں میں نواب اپنی فوج کے ساتھ جہاں جاتے اپنے کو دینی ماحول سے قریب پاتے یہی وجہ ہے کہ ہر علاقے کے بزرگان دین اور باکمال لوگوں سے فطرۃً ان کا تعلق بڑھتا چلا گیا، چنانچہ ناگور، اجمیر، دہلی اور رگوالیار وغیرہ کے واقعات میں ایسے تعلقات کا برابر ذکر ملتا ہے۔

نواب کی شادی اور نواب وزیر الدولہ کی پیدائش کے بعد سے مولوی حکیم انور علی صاحب ساکن رامپور کا تعلق بھی نواب کے لشکر سے ہو گیا، اور فاتحہ خوانی کے بعد وہ نواب وزیر الدولہ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ نواب صاحب کی طرح متعدد جرنیل فوج اور رسالہ دار بھی علم دوست اور علماء نواز تھے، چنانچہ مختار الدولہ محمد شاہ خان، مختار الدولہ محمود خان، میاں اکبر محمد خان، جناب فیض محمد خان گویا جیسے قابل اور علم دوست افراد ان کے مشیر اور وزیر تھے، جن کی معیت نواب کے لیے سونے پر سہاگا ثابت ہوئی اور جن کے نیک مشوروں سے انھیں بڑا فائدہ پہنچا،

اس دینی ماحول سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ریاست ٹونک کے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ ہی نواب اور ان کے امرا کے ساتھ جس قدر علمی خانوادے فوراً ٹونک منتقل ہونا شروع ہو گئے، اور دو چار سال کی مدت میں یہ علاقہ رشک چمن بنتا نظر آنے لگا، نواب کے خسر اخوند ایاز خان کے بڑے ساتھی ملا عرفان رامپوری تھے، ان کے لڑکے مولوی محمد مفتی اور مولانا خلیل الرحمن کی مسند ہائے درس محلہ راج دارہ اور گوئیا تالاب رامپور میں قائم تھی،[1] انھیں ٹونک بلا لیا گیا، مولانا محمد صاحب مفتی کو افتاء و قضاء کی ذمہ داری سپرد کی گئی، اور مولانا خلیل الرحمن نے مسند درس بچھائی، ان کے بھائی مولوی سعد اللہ صاحب جامع مسجد کے خطیب و امام مقرر ہوئے، شہر میں درس و تدریس کے کئی مرکز کھولے گئے، اور قابل افراد کو ان کا ذمہ دار بنایا گیا۔

نواب کی فوج کے ساتھ پورا دیوان خانہ بھی رہا کرتا تھا، اور اس کے ذمہ دار بھی بڑے قابل اور تجربہ کار حضرات ہی ہوا کرتے تھے، رائے دتا رام، رائے ہمت رام، منشی بساون لال شاداں مرتب امیر نامہ جیسے قابل اور میر منشی ان کے دفتر کو چلایا کرتے تھے، اس لئے ریاست کا وجود عمل میں آنے کے بعد ہی یہ تمام حضرات یہاں کے کلیدی عہدوں پر فائز کر دیے گئے۔

---

[1] تذکرہ کاملانِ رامپور ص ۲۲ و ۵۵۳ ۔

آزاد اور خود مختار ریاست قائم ہونے کے بعد نظام ریاست کا قیام اس قدر مشکل نہیں تھا جس قدر کہ سماج اور معاشرہ کی اصلاح اور معاشی اور معاشرتی سدھار کے لیے نظام عدلیہ کا قائم کرنا مشکل تھا، اس معاملہ میں بھی نواب کو پوری طرح کامیابی ہوتی، ریاست قائم ہونے کے بعد ابتدائی چند برسوں کی تاریخ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے، یہاں کا فوجی نظام مختار الدولہ محمود خاں کے سپرد کیا گیا تھا، رائے ہمت رائے دیوان کل ملک و مال تھے، اور داخلی تمام ذمہ داریاں ان کے سپرد تھیں، رائے دتارام خارجی امور اور مختلف ریاستوں کے ذمہ دار تھے۔

ریاست کے قیام کے بعد سب سے زیادہ اہم کام عدلیہ کا قائم کرنا تھا، اس لئے فوراً ہی قاضیِ شرع کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ اور تمام امور کا فیصلہ اسی شرعی عدالت کے سپرد کیا گیا معاملات فوجداری ہوں کہ دیوانی، حقوق کا معاملہ ہو یا ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کا، قتل و قصاص کا مسلہ ہو یا جرائم کی سزا کا، مال و منال کی وراثت کا معاملہ ہو یا تعزیرات کا قضیہ، باہمی نزاع یا نکاح و طلاق یا بداعمالیوں کی سزا، مسلموں کے حقوق ہوں یا غیر مسلموں کی ذمہ داریاں غرض لک کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس دور میں ہندوستان کی بڑی سے بڑی ریاستوں اور حکومتوں مقابلہ میں ریاست ٹونک وہ واحد نمونہ کی ریاست تھی جس میں شرعی نظام کے تحت راسے نظامِ عدل قائم کیا گیا، اور فقہی نظام، اسلام کے بنیادی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے نداء سے یہاں جاری کیا گیا، اس سلسلہ میں سب سے بڑھکر خوشی کی بات یہ ہے کہ اسوقت کا رارکارڈ ابھی تک الحمدللہ محفوظ ہے، جس کے مطالعہ سے نظام عدلیہ کی پوری تاریخ مرتب سکتی ہے، جس کا کچھ اندازہ اس مقالہ کے آخری حصوں سے لگایا جا سکتا ہے، جس میں مختصراً ، نظام کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

غرض ریاست کا وجود عمل میں آنے کے ساتھ ساتھ یہاں کے نظم ریاست کو بڑے اچھے

پیمانہ پر قائم کیا گیا، محکمۂ قضاء اور نظام عدلیہ کا قیام بھی بہت اونچے پیمانہ پر ہوا، شہر میں درس وتدریس دینی واخلاقی سدھار، محتسبوں کا تقرر اور امامت وخطابت کا بہترین نظم کیا گیا، اور ان تمام امور کی تکمیل کے لیے لائق افراد کا انتخاب عمل میں لایا گیا، ادھر اس نو بہار ریاست کے قیام کا شہرہ ملک میں ہوا جس کے نتیجہ میں نجیب آباد، نگینہ، امروہہ، رامپور، سنبھل اور جلال آباد وغیرہ دوسرے علاقوں سے اہلِ علم اور اہلِ فن حضرات نے اس علمی مرکز پر پہنچنا شروع کر دیا۔

ہر کجا چشمۂ بود شیریں　　مردم و مرغ و مور گرد آیند

نتیجہ یہ ہوا کہ دس بیس سال کی مدت میں یہ جدید ریاست علم وفضل اور فن وکمال کا گہوارہ نظر آنے لگی۔

اس وقت مقصود چونکہ یہاں کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ یہاں کے نظام عدالت اور یہاں کے فقہی نظام کی خصوصیت پر تبصرہ کرنا ہے، اس لیے دوسرے تمام پہلوؤں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اسی ایک پہلو پر اس وقت بحث کی جائے گی،

ریاست کے قیام کے بعد جونہی علمی خاندان یہاں منتقل ہونا شروع ہوئے اور شرعی نظام جاری کرنے کے لیے عدالت عالیہ شرعیہ قائم ہوئی، اس کا قدیم ریکارڈ دیکھنے سے اندازا ہوتا ہے کہ ہر معاملہ شرعی عدالت کے سپرد کیا جاتا تھا، وہاں سے جو فیصلہ اور جو تجویز ہوا کرتی تھی اس کا اجراء رئیسِ وقت کی جانب سے ہوا کرتا تھا، چونکہ وہ ابتدائی دور تھا، اس لیے اس وقت ان کارروائیوں میں بھی زیادہ وقت نہیں لگتا تھا، دعویٰ جوابِ دعویٰ ثبوت اور بحث یا حلف اگر کسی پر آتا تھا تو اس کی تکمیل ساتھ ہی ساتھ ہو جایا کرتی تھی، یا بس دو ایک نشستوں میں سب تکمیلات ہو کر اجراء کے لیے معاملہ چلا جاتا تھا، حاکم عدالت کی تجویز یا فیصلہ بالکل ڈگری کی حیثیت رکھتا تھا، جس کا اجراء رئیسِ وقت کے ذریعہ ہوا کرتا تھا، مسلم اور غیر مسلم حقوق میں

برابر تھے، البتہ انھیں اپنے مذہبی معاملات میں آزادی تھی، لیکن جو چیزیں سب پر اثر انداز ہو سکتی تھیں وہ غیر مسلموں کے لیے بھی ممنوع تھیں، مثلاً ایک بار ایک معاملہ پیش ہوا جب کہ ایک غیر مسلم شراب فروخت کرتے پکڑا گیا، تحقیق کی گئی، غیر مسلم نے جواب پیش کیا کہ ہمارے مذہب میں چونکہ شراب جائز ہے، اس لئے میں نے اس کا کاروبار کیا ہے اب جب یہ معلوم ہو گیا کہ شراب کا کاروبار سب کے لیے ممنوع ہے اس لیے آیندہ ایسا نہیں کرونگا، اس کو اسی ہدایت کے ساتھ چھوڑ دیا گیا کہ وہ آیندہ ایسی غلطی نہ کریگا، مسلمانوں کے لیے محتسب مقرر تھے، اعمال اور افعال میں فرائض کی پابندی اور محرمات سے باز رہنے میں جہاں کوتاہی نظر آئی فوراً محتسب کی جانب سے رپورٹ پیش ہوتی اور فوراً اس کا تدارک کیا جاتا، غیر مسلموں کو ان کے مذہبی معاملات میں مکمل آزادی تھی البتہ حقوق میں سب برابر تھے، فوجداری معاملات میں مجرم کو شرعی قانون کے مطابق پوری سزا دی جاتی تھی، اور یہ معاملات بھی شرعی عدالت کے سپرد تھے، قتل و قصاص اور دیت کے معاملات بھی شرعی عدالت کی نگرانی میں طے ہوا کرتے تھے۔

قیام ریاست کے بعد کون کون حضرات اس شرعی عدالت کے ذمہ دار رہے ذیل میں بالاختصار اسکی تفصیل بیان کی جا رہی ہے،

جیسا کہ اس سے پہلے گذرا شرعی عدالت کے پہلے ذمہ دار مولوی محمد مفتی تھے، جو قیام ریاست کے فوراً بعد اس ذمہ داری کو سنبھال چکے تھے، ۱۲۵۹ھ تک ان کے فیصلے رکارڈ میں ملتے ہیں اسی طرح ان کے ساتھ ان کے برادر حقیقی مولانا خلیل الرحمن صاحب رامپوری ثم التونکی ثم گلشن آبادی کے فیصلے ملتے ہیں، چونکہ نواب میر خان کے ساتھ کچھ مدت فوج میں بھی رہے، اور قضاء کی خدمت انجام دی اسی طرح ٹونک منتقل ہونے کے بعد وہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ افتاء و قضاء کی خدمت

انجام دیا کرتے تھے، اور درس و تدریس کی بھی پوری ذمہ داری نبھاتے ہوئے تھے۔ رامپور میں انکی مسند درس پہلے سے قائم تھی، صاحب تصانیفِ کثیرہ ہیں، مختلف فنون میں انکی ۱۵ تصانیف ہیں فقہ اور اصول فقہ میں انکے فتاوی، شرح ہدایہ، حاشیہ دائرۃ الوصول، شرح خطبہ، دائرۃ الوصول وغیرہ خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں، ان کے والد ملا عرفان رام پوری، مولانا بحر العلوم لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں تھے، اصول فقہ میں ان کی شرح دوار اور مدار اگرچہ طبع نہیں ہوئی ہیں لیکن ان کی حیات میں اہل علم میں متداول رہیں، چنانچہ نور الانوار کے حاشیہ قمر الاقمار میں ملا عرفان رامپوری کے حواشی کا متعدد جگہ ذکر ہے، اسی طرح ان کا جنگ (مجموعۃ الفتاوی یا تالیف عرفانی) مسائل پر بڑا اچھا مجموعہ ہے،

مولوی محمد صاحب المتوفی ۱۲۶۵ھ ۱۸۴۹ء کے سبکدوش ہونے کے بعد مولوی عبد اللہ بن محمد جعفر صاحب نے کچھ مدت یہ خدمات انجام دیں، اسوقت نواب وزیر الدولہ کی جانب سے ناظم عدالت کے نام سے ایک عہدہ اور قائم کر دیا گیا تھا، جو عدالت کے ان فیصلوں کو جاری کرتا تھا، اسوقت نواب وزیر الدولہ کے بھائی صاحبزادہ محمد جمال خان صاحب جو نہایت نیک مزاج اور پابند شریعت انسان تھے، عدالت کے ناظم تھے، کچھ مدت کے بعد ہی نواب وزیر الدولہ کی جانب سے ہندوستان کے مشہور عالم مولوی بزرگ علی مارہروی کو مارہرہ سے بلا کر عدالت کا ذمہ دار بنایا گیا، اور قاضی القضاۃ کا عہدہ انھیں دیا گیا لیکن ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء میں جلد ہی انکا ٹونک میں انتقال ہو گیا۔

ان کے بعد ان کے فرزند قاضی صدیق صاحب کو اس عہدہ پر مقرر کیا گیا، ۱۲۷۰ھ کا ایک فیصلہ دیکھنے میں آیا اس پر صاحبزادہ محمد جمال خان کے دستخط بحیثیت ناظم عدالت اور قاضی صاحب مارہروی کے دستخط بحیثیت قاضی القضاۃ تھے، قاضی صدیق صاحب کے بعد مولانا

امام الدین المتوفی سنہ ۱۹۱۰ء بھی قاضی القضاۃ رہے، ان کے بعد مندرجہ ذیل حضرات اس عہدہ پر فائز رہے۔

مولوی عبدالغفار صاحب المتوفی سنہ ۱۸۹۰ء، صاحبزادہ عبدالوہاب خاں صاحب المتوفی سنہ ۱۹۲۹ء، مولوی دوست محمد صاحب المتوفی سنہ ۱۳۲۹ھ، مولوی جان محمد صاحب سنہ ۱۹۲۹ء، حکیم ظہیرالدین صاحب المتوفی سنہ ۱۹۳۹ء، مولوی بدرالدین صاحب، مولوی قاضی محمد عرفان صاحب المتوفی سنہ ۱۳۸۱ھ سنہ ۱۹۶۲ء۔)

قاضی القضاۃ اور ناظم عدالت کی نگرانی میں، بعد کے ادوار میں مزید برآں کچھ مفتی صاحبان بھی ضابطہ میں مقرر رہتے تھے، اس طویل مدت میں تقریباً بیس پچیس حضرات نے یہ خدمت انجام دی، اسوقت مزید تفصیلات کا موقع نہیں۔

نواب امیرخان اور نواب وزیرالدولہ کے زمانہ تک ہر طرح کے نزاعات و معاملات کا فیصلہ عدالت شریعت ہی کے ذریعہ ہوتا رہا، نواب محمد علی خان نے فوجداری معاملات کے لیے ـــــ محکمہ نگرانی کے نام سے علٰحدہ محکمہ قائم کر دیا تھا، اس طرح بعد میں عدالت دیوانی کے معاملات ہر دو عدالتوں میں تقسیم ہوتے رہے، عدالت شریعت کے اختیارات اور مقدمات کی نوعیت محدود ہوتی رہی، جن کی وجہ سے ٹونک کی وہ خصوصیات جو دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں شرعی نظام کے تحت باقی تھیں، مفقود ہوتی رہیں، پھر بھی اپنے نظام، اپنے قانون، اپنی ہمہ گیری اور افتاء کے اہم شعبوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ٹونک میں اس عدالت کی جو خصوصیات تھیں، وہ دوسری ریاستوں میں نظر نہیں آتیں۔

اب ٹونک کے کچھ اہل علم حضرات کی وہ تصنیفات جو فقہ اور اصول فقہ میں لکھی گئی ہیں ان کا ذکر بھی اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ فتاویٰ مولوی حیدر علی صاحب رامپوری۔

۲۔ بیاض فقہیہ (جنگ) از مولوی سعد اللہ خطیب وغیرہ از ملا عرفان رامپوری۔

۳۔ شمع الفرائض اور مفتاح المشکلات از قاضی نقیب اللہ صاحب لابتی۔

۴۔ توضیح الاحکام از حکیم امیر حسن صاحب۔

۵۔ رسالہ رفع الیدین از مولانا حیدر علی صاحب۔

۶۔ عین الاصابہ فی رفع السبابہ از مولوی دوست محمد صاحب۔

۷۔ رسالۃ الصید از مولوی محمود حسن خان صاحب صاحب معجم المصنفین۔

۸۔ ضیاء البصائر للاشباہ والنظائر از قاضی نقیب اللہ صاحب۔

۹۔ کشف الحال علی المتنزیہ بالمال، از مولوی عبداللہ خان صاحب۔

۱۰۔ نجم منیر نظم منار، از مولوی عبدالکریم صاحب ٹونکی۔

۱۱۔ احکام الصلوٰۃ منظوم مع کاشف الروایات شرح احکام الصلوٰۃ، از قاضی عبدالحلیم صاحب متجر۔

۱۲۔ فتح الرحمٰن فی مس مصحف عثمان از حکیم عبدالعلی صاحب ٹونکی۔

۱۳۔ زکاۃ الہدایہ از مولوی محمد علی صدر پوری۔

۱۴۔ زبدۃ المقاصد از مولوی سراج الرحمٰن صاحب۔

۱۵۔ فتاویٰ سعیدیہ، از مفتیان عدالت شرعیہ۔

۱۶۔ فتاویٰ مولانا خلیل الرحمٰن صاحب۔

۱۷۔ حاشیہ دائر الوصول مولانا خلیل الرحمٰن صاحب۔

۱۸۔ مدار الاصول و مدار حاشیتان دائر الوصول از ملا عرفان رامپوری۔ وغیرہ وغیرہ۔

چونکہ یہ علاقہ جو نہیں علم وفضل کا مرکز بنا، یہاں علمی ذخائر کا غیر معمولی جمع ہو جانا بھی ایک فطری امر تھا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا ــــــــــ سرکاری کتب خانے ہوں یا اہل علم کے ذاتی ذخیرے، امراء کے
ہوں یا مدارس کے مخزن ہر حیثیت سے مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے ذخائر اس ریاست
میں جمع ہوئے، یہی وجہ ہے کہ یہاں گھر گھر میں کتب خانے نظر آتے تھے، یہ علیحدہ بات ہے کہ
اکثر ذخائر انقلاب کی نذر ہو گئے، پھر جو ذخیرے محفوظ ہیں وہ ایک قومی اور ملکی سرمایہ ہیں
اور اہل علم و ارباب تحقیق کے لیے بیش بہا مجموعہ۔

ذیل میں ٹونک کے مشہور و معروف ادارے عربی و فارسی ریسرچ انسٹیٹیوٹ راجستھان
کے صرف فقہ و اصول فقہ کے چند نوادرات کا ذکر کر کے اس مقالہ کو ختم کیا جاتا ہے۔

۱۔ الاختیار لتعلیل المختار، مصنفہ مجدالدین عبداللہ بن محمود الموصلی المتوفی ۶۸۳ھ/۱۲۸۴ء
جو کوفہ کے قاضی رہے ہیں، اور بغداد میں درس و تدریس و افتاء کی خدمت میں عمر کا
زیادہ حصہ گذارا ہے، اس کتاب کا ایک نہایت قدیم نسخہ یہاں محفوظ ہے، جو رجب
۶۲۲ھ/۱۲۲۴ء کا لکھا ہوا ہے، محمود بن جعفر اس کے کاتب ہیں۔

۲۔ بحر الرائق شرح کنز الدقائق ابن نجم نجیم مصری المتوفی ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء کی مشہور شرح
ہے، اس کا ایک نسخہ یکم ذی الحجہ ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء کا لکھا ہوا ہے جو شارح سے بہت قریب زمانہ
کا ہے،

۳۔ تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، علامہ زیلعی المتوفی ۷۴۳ھ/۱۳۴۲ء کی مشہور شرح ہے،
مکتوبہ ۹۰۳ھ/۱۴۹۷ء کاتب محمد بن علی بن محمد بن سلیمان المدنی ہیں۔
اس طرح کنز اور مختصر الوقایہ کے فارسی ترجمے جو ۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء اور ۱۰۶۷ھ/۱۶۵۶ء کے مکتوبہ ہیں،
اس ذخیرہ میں محفوظ ہیں۔

۵۔ ترغیب الصلوٰۃ محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں تصنیف ہوئی تھی، جس کے مرتب

محمد بن منصور بن احمد بن زاہد ہیں، اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ جو ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۶ء کا مکتوبہ ہے، یہاں محفوظ ہے۔

۶۔ جواہر اخلاطی، جو ایک مشہور اور اہم کتاب ہے، اور برہان الدین ابراہیم بن ابی بکر بن محمد بن حسین اخلاطی کی مرتبہ ہے، اس کا ایک نسخہ یہاں محفوظ ہے، جو عالمگیر کے زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔

۷۔ جامع الصغار، مصنفہ مجد الدین ابو الفتح الاستروشنی، المتوفی ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء۔ مکتوبہ رجب ۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء کا ہے، اس کتاب میں صغار اور بچوں کے تمام مسائل جمع کئے گئے ہیں۔

۸۔ منیۃ المصلی، کی شرح حلیۃ المحلی، مصنفہ میر حاج حلبی المتوفی ۸۷۹ھ/۱۴۷۴ء، اس کا ایک قدیم نسخہ محفوظ ہے، جو ۱۰۸۰ھ/۱۶۶۹ء کا مکتوبہ ہے۔

۹۔ اسی طرح خزانۃ المفتیین کے یہاں دو ایک نسخے بڑے نادر اور اہم ہیں، ان میں ایک نسخہ ۹۶۹ھ/۱۵۶۱ء کا مکتوبہ ہے۔

۱۰۔ خلاصۃ الفتاوی، افتخار الدین، طاہر بن احمد بن عبد الرشید البخاری المتوفی ۵۹۲ھ/۱۱۹۵ء کی مشہور اور قدیم تصنیف ہے، اس کا ایک قدیم نسخہ ۸۱۹ھ کا لکھا ہوا یہاں موجود ہے، دو جلدوں میں ہے، اور بہت اچھا نسخہ ہے۔

۱۱۔ دستور القضاۃ، مصنفہ قاضی صدر تبریزی جو ۷۷۲ھ/۱۳۷۰ء کی مرتبہ ہے، اس کا ایک بہت اچھا نسخہ یہاں محفوظ ہے، جو ۱۰۷۴ھ/۱۶۶۳ء کا لکھا ہوا ہے۔

۱۲۔ شرح مجمع البحرین و ملتقی النہرین جس کے شارح ابن فرشتہ حنفی ہیں، اس کا ایک نسخہ ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء کا لکھا ہوا یہاں موجود ہے۔

۱۳۔ شرعۃ الاسلام مصنفہ امام زادہ حنفی المتوفی ۵۷۳ھ/۱۱۷۷ء مکتوبہ شعبان ۶۳۰ھ/۱۲۳۲ء، اس طرح فتاوی سراجیہ، فتاوی زینیہ، فتاوی حمادیہ، فتاوی برہنہ، فتاوی قراخانیہ، فصول عمادی، فوائد

فیروز شاہی، مکتوبہ سنہ ۸۶۴ھ/۱۴۶۱ء، فتاوی بزازیہ، منیۃ المنیہ مکتوبہ سنہ ۸۲۱ھ/۱۴۱۸ء، کافی شرح وافی مکتوبہ سنہ ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء، مجمع الاختلافات مکتوبہ سنہ ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء، مختار الفتاوی، منظومہ النسفی مکتوبہ سنہ ۷۸۳ھ/۱۳۸۱ء یہاں کے خاص خاص اور اہم نسخے ہیں۔

اصول فقہ کا ذخیرہ بھی یہاں الحمد اللہ بہت اچھا ہے، مسلّم الثبوت، اصول الشاشی، منار الانوار، حسامی اور توضیح و تلویح اور ان تمام متنوں کی شرح و حواشی کے نادر اور اچھے نسخے یہاں موجود ہیں، ان میں مندرجۂ ذیل مخطوطے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۔ کشف الاسرار شرح اصول بزدوی مکتوبہ سنہ ۷۸۶ھ/۱۳۸۵ء۔

۲۔ القواطع فی اصول الفقہ مکتوبہ قدیم۔

۳۔ حاشیہ التحقیق فی اصول الفقہ مکتوبہ قبل از سنہ ۷۹۲ھ/۱۳۸۹ء۔

۴۔ حسامی مکتوبہ سنہ ۸۴۵ھ/۱۴۴۱ء۔

تفسیر بالرائے اور اُس کی حیثیت

از

جناب عبد الرحمن پرواز اصلاحی رفیق دار المصنفین

قرآن مجید جہاں تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر صحیفۂ ہدایت اور دستورِ زندگی ہو وہاں مضامین و معانی اور اسرار و حکم کا بحرِ زخار بھی ہے، جس طرح قدرت کی بنائی ہوئی تمام چیزوں میں غور کرنے سے جدید انکشافات اور نت نئے منافع اور فائدے حاصل ہوتے رہتے ہیں، اسی طرح قرآن میں غور و فکر کرنے سے بھی نئے نئے حقائق معلوم ہوتے رہیں گے، زمانہ علم و عقل کی خواہ کیسی ہی بلندیوں تک پہونچ جائے مگر یہ ہر مقام اور ہر بلندی پر زندگی کے پیدا شدہ مسائل میں قیامت تک انسان کی رہنمائی کرتا رہے گا یہی وجہ ہے کہ قرآن میں تفکر و تدبر کی تاکید فرمائی گئی ہے، چنانچہ ارشاد ہے،

کتابٌ انزلناہ الیک مبارکٌ	مبارک کتاب ہم نے تمہاری طرف نازل
لیدبروا آیاتہٖ (سورۂ ص ۲۹)	کی ہو تاکہ لوگ اُس کی آیتوں پر غور کریں
افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ	کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا ان
قلوب اقفالھا (سورۂ محمد ۳۴)	کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں،
انا انزلناہ قرآناً عربیاً لعلکم	ہم نے یہ قرآن عربی زبان میں اتارا ہے
تعقلون (سورۂ نحل ۲۴)	تاکہ تم لوگ سمجھو،

وانزلنا الیک الذکر لتبین | اور ہم نے تمہاری طرف قرآن اتارا تاکہ جو
للناس ما نزل الیہم ولعلہم | لوگوں کیلئے اتارا گیا ہے بیان کردو، ہ
یتفکرون (سورہ نحل ۴۴) | تاکہ لوگ اس میں تفکر کریں،

جس طرح تمام آسمانی کتابوں میں قرآن کو یہ شرف حاصل ہے کہ جوں ہی نازل ہوا ترتیب و تدوین اور حفظ و صیانت کے تمام مراحل طے کر لئے اسی طرح اسے یہ امتیاز بھی حاصل ہو کہ اس کے نزول کے ساتھ ہی اس کی تشریح و توضیح کا بھی آغاز ہو گیا، خود مہبط وحی الٰہی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک ارشاد اور قول و عمل اور آپ کے سنن و تقریرات قرآن کی تفسیر بن گئے، اور تفسیر کے اصطلاحی مفہوم کو اگر سامنے رکھا جائے تو اس اعتبار سے بھی آپ نے قرآنی کلمات و الفاظ کی وضاحت فرمائی،

صحابہ کرام نے جہاں اپنی زندگیوں کو قرآن کی روشنی میں سنوارا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت میں تزکیہ و تطہیر کی منزلیں طے کیں وہاں وہ قرآن کے فہم و ادراک میں بھی دن رات کوشاں رہتے، قرآن کے معارف و حکم پر غور کرنے کے لئے صحابہ کرام کے حلقے قائم تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے حلقوں کے قیام کے لئے موثر الفاظ میں لوگوں کو شوق دلایا کرتے تھے، سنن ابی داؤد میں روایت ہے،

جو لوگ کسی جگہ جمع ہو کر اللہ کی کتاب پڑھتے اور باہم درس و مذاکرہ قرآن کی مجلیس قائم کرتے ہیں، ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسکین اور رحمت کی بارش ہوتی ہے، اور ملائکہ ان کو ہر طرف سے گھیرے کھڑے رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے مقربین کے حلقہ میں ان کا ذکر فرماتا ہے،[۱]

قرآن فصیح عربی زبان میں نازل ہوا، صحابہ کرام کی زبان عربی تھی، وہ اس کی فصاحت و بلاغت

---

[۱] سنن ابی داؤد، باب فی ثواب قرأۃ القرآن،

کے رموز سے اچھی طرح آشنا تھے جن حالات اور واقعات میں قرآن نازل ہوا، وہ اس سے بھی بخوبی واقف تھے جن خیالات وعقائد، اعمال وافعال پر قرآن نے بحث کی ہے، وہ زیادہ تر ان کے اپنے تھے، پچھلی قوموں کے احوال سے بھی وہ بے خبر نہ تھے، یہود و نصاریٰ کے عقائد و اطوار کی طرف قرآن نے جو اشارے کئے ہیں، ان سے بھی وہ گوناگوں تعلقات کی بنا پر اچھی طرح آگاہ تھے، لیکن اس کے باوجود ہم اُن کے حالات میں پڑھتے ہیں، کہ وہ برسوں قرآن حکیم پر غور و تدبر کرتے تھے، موطا امام مالک میں ایک روایت ہے، کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ مسلسل آٹھ برس تک سورۂ بقرہ پر تدبر فرماتے رہے[53]

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس کی شرح مسوّیٰ میں لکھا ہے کہ :-

"یہ اس لئے کہ وہ چاہتے تھے کہ قرآن میں تبحر حاصل کریں، اسبابِ نزول اور احکام میں نئے نئے استخراج کریں"

فہمِ قرآن میں ممتاز صحابہؓ

قرآن کے رموز و نکات اور اُس کے اسرار و حقائق کے سمجھنے میں تمام صحابۂ کرام یکساں نہ تھے، کچھ وہ لوگ تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے زیادہ استفادہ کیا، اور کچھ ایسے تھے جن کے استفادے کی مدت مختصر تھی، کچھ ایسی ہستیاں بھی تھیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے فہم و بصیرت اور تفسیر و تاویل میں مخصوص صلاحیتوں سے نوازا، صحابۂ کرام میں جن حضرات سے تفسیری نکات منقول ہیں، علامہ جلال الدین سیوطی نے دس کے نام لئے ہیں یعنی خلفائے اربعہؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ،[54]

لیکن اس سلسلے میں کچھ اور صحابۂ کرام کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جیسے حضرت انس بن مالکؓ

---

[53] باب سیر جماعۃ من الصحابہ رضی اللہ عنہم [54] الاتقان جلد ۲ ص ۱۸۷

حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہم مگر ان میں سے جن حضرات نے تفسیر کے باب میں شہرت دوام حاصل کی، اور ذخیرۂ تفسیر میں معتدبہ اضافہ کیا، اور اپنے تلامذہ کا مستقل حلقہ چھوڑا، وہ صرف چار ہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ۔[۵۱]

دور رسالت کے بعد اسلامی حکومت کے حدود وسیع ہوئے، تو صحابہ کرام کے تلامذہ مختلف مرکزوں میں پھیل گئے، علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:-

"اہل مکہ علم تفسیر میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں، کیونکہ وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اصحاب و تلامذہ ہیں، جیسے مجاہد بن جبیرؒ، عطا بن ابی رباحؒ، اور عکرمہؒ مولی ابن عباسؓ، اسی طرح حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد دوسروں کے شاگرد علم تفسیر میں پیش پیش ہیں، جیسے طاؤس بن کیسانؒ، جابر بن زید ازدیؒ، سعید بن جبیرؒ وغیرہ اسی طرح کوفہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب کو تفسیر میں دوسروں پر فوقیت حاصل ہے، یہی حال مدینہ میں زید بن اسلمؒ جیسے بزرگوں کا ہے، امام مالکؒ نے انہی زید بن اسلم سے تفسیر کا علم حاصل کیا، نیز اُن کے بیٹے عبدالرحمن نے، اور عبداللہ بن وہب نے بھی۔"[۵۲]

ان کے علاوہ مدینہ میں ابوالعالیہ، محمد بن کعب القرظی، اور عراق میں علقمہ بن قیس، مسروق الاسود بن یزید، مرۃ الہمدانی، عامر الشعبی، حسن بصری، قتادہ وغیرہ وہ ممتاز تابعین ہیں جنھوں نے صحابۂ کرام سے استفادہ کے بعد تفسیریں بیان کیں، اور اُن کے ذریعہ تفسیری واقعیا

---

۵۱ التفسیر والمفسرون محمد حسین الذہبی جلد ۱ ص ۱۸ تا ۹۸

۵۲ مقدمہ ابن تیمیہ فی اصول التفسیر ص ۱۵،

کے رموز سے اچھی طرح آشنا تھے جن حالات اور واقعات میں قرآن نازل ہوا، وہ اس سے بھی بخوبی واقف تھے جن خیالات وعقائد، اعمال وافعال پر قرآن نے بحث کی ہے، وہ زیادہ تر اُن کے اپنے تھے، پچھلی قوموں کے احوال سے بھی وہ بے خبر نہ تھے، یہود ونصاریٰ کے عقائد واطوار کی طرف قرآن نے جو اشارے کئے ہیں، ان سے بھی وہ گوناگوں تعلقات کی بنا پر اچھی طرح آگاہ تھے، لیکن اس کے باوجود ہم اُن کے حالات میں پڑھتے ہیں، کہ وہ برسوں قرآن حکیم پر غور وتدبر کرتے تھے، موطا امام مالک میں ایک روایت ہے، کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ مسلسل آٹھ برس تک سورۂ بقرہ پر تدبر فرماتے رہے[۱]

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس کی شرح مسوّیٰ میں لکھا ہے کہ:۔

"یہ اس لئے کہ وہ چاہتے تھے کہ قرآن میں تبحر حاصل کریں، اسباب نزول اور احکام میں نئے نئے استخراج کریں"

فہم قرآن میں ممتاز صحابہ

قرآن کے رموز ونکات اور اُس کے اسرار وحقائق کے سمجھنے میں تمام صحابۂ کرام یکساں نہ تھے، کچھ وہ لوگ تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے زیادہ استفادہ کیا، اور کچھ ایسے تھے جن کے استفادے کی مدت مختصر تھی، کچھ ایسی ہستیاں بھی تھیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے فہم وبصیرت اور تفسیر وتاویل میں مخصوص صلاحیتوں سے نوازا، صحابۂ کرام میں جن حضرات سے تفسیری نکات منقول ہیں، علامہ جلال الدین سیوطی نے دس کے نام لئے ہیں یعنی خلفائے اربعہؓ، عبد اللہ بن مسعودؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ،[۲]

لیکن اس سلسلے میں کچھ اور صحابۂ کرام کا نام بھی لیا جا سکتا ہے، جیسے حضرت انس بن مالکؓ

---

[۱] باب سنن جمع من الصحابہ رضی اللہ عنہم [۲] الاتقان جلد ۲ ص ۱۸۷

حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہم مگر ان میں سے جن حضرات نے تفسیر کے باب میں شہرت دوام حاصل کی، اور ذخیرۂ تفسیر میں معتد بہ اضافہ کیا، اور اپنے تلامذہ کا مستقل حلقہ چھوڑا، وہ صرف چار ہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ،[1]

دور رسالت کے بعد اسلامی حکومت کے حدود وسیع ہوئے، تو صحابہ کرام کے تلامذہ مختلف مرکزوں میں پھیل گئے، علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:-

"اہل مکہ علم تفسیر میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں، کیونکہ وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اصحاب و تلامذہ ہیں، جیسے مجاہد بن جبیرؒ، عطاء بن ابی رباحؒ، اور عکرمہؒ مولی ابن عباسؓ، اسی طرح حضرت ابن عباسؓ کے شاگردوں کے شاگرد بھی علم تفسیر میں پیش پیش ہیں، جیسے طاؤس بن کیسانؒ، جابر بن زید ازدیؒ، سعید بن جبیرؒ وغیرہ، اسی طرح کوفہ میں عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب کو تفسیر میں دوسروں پر فوقیت حاصل ہے، یہی حال مدینہ میں زید بن اسلمؒ جیسے بزرگوں کا ہے، امام مالکؒ نے انہی زید بن اسلم سے تفسیر کا علم حاصل کیا، نیز ان کے بیٹے عبدالرحمن نے اور عبداللہ بن وہب نے بھی!"[2]

ان کے علاوہ مدینہ میں ابوالعالیہ، محمد بن کعب القرظی، اور عراق میں علقمہ بن قیس، مسروق الاسود بن یزید، مرۃ الہمدانی، عامر الشعبی، حسن بصری، قتادہ وغیرہ وہ ممتاز تابعین ہیں جنھوں نے صحابۂ کرام سے استفادہ کے بعد تفسیریں بیان کیں، اور ان کے ذریعہ تفسیری روایتیں

---

[1] التفسیر والمفسرون محمد حسین الذہبی جلد ۱ ص ۱۰۸ تا ۹۸

[2] مقدمہ ابن تیمیہ فی اصول التفسیر ص ۱۵،

کا سلسلہ شروع ہوا،

ابتدا میں تفسیروں کی نوعیت

ابتدا میں احادیث کے انداز پر تفسیری اقوال نقل ہوتے رہے، پھر تبع تابعین کے دور میں حدیث کی کتابوں میں تفسیر کے ابواب قائم ہوئے، ہر سورہ اور ہر آیت کے متعلق جو روایت ملی، وہ حدیث کی کتابوں میں درج کی گئی، یزید بن ہارون (متوفی ۲۰۶ھ) شعبہ بن الحجاج (متوفی ۱۶۰ھ) وکیع بن الجراح (متوفی ۱۹۷ھ) سفیان بن عیینہ (متوفی ۱۹۸ھ)، روح بن عبادہ (متوفی ۲۰۵ھ) عبدالرزاق بن ہمام (متوفی ۲۱۱ھ) آدم بن ابی ایاس (متوفی ۲۲۰ھ) عبد بن حمید (متوفی ۲۳۹ھ) وغیرہ، ائمہ حدیث کی بدولت احادیث کی کتابوں میں تفسیری روایات کا اچھا خاصہ حصہ تفسیر کے ابواب کے تحت جمع ہوگیا، پھر اس کے بعد باقاعدہ تفسیر کا فن وجود میں آگیا اور ہر آیت کی تشریح قرآنی ترتیب کے مطابق کتابی صورت میں مرتب ہوئی،

اس مرحلے میں امام ابن ماجہ (متوفی ۲۷۳ھ) امام ابن جریر الطبری (متوفی ۳۱۰ھ) امام ابوبکر بن المنذر نیشاپوری (المتوفی ۳۱۸ھ) امام ابن ابی حاتم (متوفی ۳۲۷ھ) ابوالشیخ بن حبان (متوفی ۳۶۹ھ) حاکم (متوفی ۴۰۵ھ) ابوبکر بن مردویہ (متوفی ۴۱۰ھ) جیسے ائمہ کرام رحمہم اللہ نے صحابہ، تابعین، اور ان کے بعد کے علما سے روایات درج کی ہیں اور اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھی، سوائے ابن جریر الطبری کے جو ہر آیت کی تشریح کے بعد متقدمین کے اختلافات بھی درج کرتے ہیں، پھر خود ان میں سے ایک کو ترجیح دے کر اس کے وجوہ بھی لکھ دیتے ہیں کہیں استنباط مسائل اور وجوہ اعراب سے بھی بحث کرتے ہیں،[1]

تفسیروں میں اختلاف و تنوع

انسانی ذہن و فکر میں ہمیشہ ارتقا ہوتا رہتا ہے، اور تاریخ

---

[1] التفسیر والمفسرون ص ۱۴۰ تا ۱۴۲، ۱

کے ہر موڑ پر ذہنی اور فکری تغیرات ہوتے رہے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عہد صحابہؓ میں
ہر شخص کے غور و فکر کے انداز میں کچھ نہ کچھ فرق رہا، اختلافِ طبائع اور صلاحیتوں کے اعتبار
سے قرآن حکیم میں جب انھوں نے غور و فکر کرنا شروع کیا، تو اختلاف و تنوع کا پیدا ہونا
ناگزیر تھا بعض صحابہ کرام نے قرآن کی آیت کا مطلب سُن کر یا آپ سے سُنے بغیر بیان کر دیا،
اور بعض نے دو قول سنے یا کوئی عمل دیکھا، اسے روایت کر دیا، یا ان دونوں کو بیان کر دیا،
پھر جب نئے مسائل و معاملات پیدا ہوئے، اور ان کے لئے استنباط و استخراج کی ضرورت پیش
آئی تو جس صحابی کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کا جو سرمایہ محفوظ تھا، اور اس نے
جیسا کچھ سمجھا تھا، اس کی روشنی میں اس نے جدید امور و معاملات کی نسبت اپنی رائے ظاہر
کر دی، اس طرح اب اختلاف رونما ہونے لگا، اور احکام و مسائل میں تنوع اور مختلف
نقطۂ نظر سامنے آنے لگے، اس سلسلے میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا ارشاد حقیقت پر مبنی ہے،

"میں نہیں چاہتا کہ صحابہ میں اختلاف رونما نہ ہوتا، کیونکہ اگر فروعی مسائل
میں صحابہ کا ایک ہی قول ہوتا، تو لوگوں کو بڑی دشواری ہوتی، صحابہ کرام
ائمہ دین تھے، جن کی پیروی موجب خیر و برکت اور باعث فلاح و نجاح ہے اس
بنا پر کسی بھی صحابی کے قول پر عمل کو سنت تصور کیا جائے گا"[1]

عہد تابعین میں اختلاف کا دائرہ اور وسیع ہوا، دوسری قوموں کے افراد حلقہ بگوش
اسلام ہوئے معیشت و معاشرت میں تبدیلیاں ہوئیں، سیاسی و سماجی تغیرات رونما ہوئے
نئے نئے میلانات و رجحانات پیدا ہوئے، ان حالات میں اسلامی وحدت فکر اور بے لوث ذہنی
اجتہاد و استنباط کی فضا اپنی اصلی شکل میں قائم نہ رہ سکی اور فکر و نظر میں انتشار کے باعث متعدد

---

[1] الاعتصام للشاطبی جلد ۳ ص ۱۱،

مکاتبِ فکر کا ظہور ہوا، ان مکاتب فکر کا دامن اتنا بڑھا کہ جزئی اور فروعی مسائل کے علاوہ اصولی اور بنیادی عقائد مثلاً صفاتِ باری، خلقِ قرآن، جبر و قدر، ایمان و عمل کا تعلق، خیر و شر کی حقیقت، مرتکب کبیرہ کا حکم وغیرہ بھی تفسیروں میں موضوعِ بحث بن گئے، اور اس بحث و جدال نے متعدد فرقوں کی صورت اختیار کر لی، نتیجہ یہ ہوا کہ قرآنی آیات کی تشریح و توضیح ہر فرقہ اپنے میلان و رجحان کے مطابق کرنے لگا،

چوتھی صدی ہجری کے بعد مسلمانوں میں مختلف علمی تحریکیں بھی پیدا ہوئیں، صرف و نحو، بلاغت و معانی، فقہ و اصولِ فقہ، منطق و فلسفہ، کلام اور تصوف کا رواج ہوا، ان علوم کے حاملین نے اپنے اپنے فنی زاویہ نظر سے الفاظ و آیات کی تشریح میں بحثیں شروع کیں، علم و ادراک کے گوشوں میں جلا آئی، اور ارتقاء و تفکیر کے تقاضے بروے کار آئے، اور روایات کے ساتھ اجتہاد کا بھی دروازہ کھل گیا، تفسیروں میں جہاں تنوع، رنگا رنگی آئی، وہاں قرآن مجید کی تفسیر میں تاویل و توجیہ کا ایسا باب کھل گیا جس سے قرآن مجید فقہی، کلامی اور فلسفیانہ بحثوں کا میدان بن گیا۔ ہر مفسر کوشش کرنے لگا کہ وہ جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے اس کو قرآن کی آیت سے ثابت کرے، اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں ان سے استدلال کرے،

تفسیر بالرائے کی ممانعت، ارتقاء کے اس موڑ پر قدرۃً یہ سوال پیدا ہوا کہ تفسیر کے صحیح حدود کیا ہیں، اور قرآن میں غور و فکر اور استخراج معانی کا دائرہ کتنا وسیع ہے، ؟ اس سلسلے میں دو گروہ ہو گئے، ایک فریق تو اس بات کا حامی تھا کہ تفسیر میں ماثور و منقول ہی پر اکتفا کیا جائے، اور اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہی جائے، کیونکہ اس سے غیر ضروری بحثوں کا دروازہ کھلتا ہے، اور ایمان کے داعیوں اور تقاضوں کو نقصان پہنچتا ہے، اس فریق کے نزدیک

سیر میں صرف ماثور کا اعتبار کیا جائے گا، اور مجرد رائے کو حرام سمجھا جائے گا، کیونکہ
ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

مَنْ قَالَ فِی الْقُرْاٰنِ بِغَیْرِ عِلْمٍ	قرآن مجید کے بارے میں بغیر علم کے
فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ [۵۲]	جس نے کچھ کہا اسے چاہیے کہ اپنی

ایک اور حدیث میں فرمایا کہ

من قال فی القرآن برائہ	جس نے قرآن کے سلسلے میں اپنی
فاصاب فقد اخطاء [۵۲]	رائے سے کوئی بات کہی اور اس کی
	بات صحیح بھی ہوئی تو اس نے غلطی کی

اصحاب حدیث و روایت کے نزدیک وہ شخص خاطی اور گمراہ ہے جو تفسیر رسولؐ سے
بے نیاز کر کے اپنے جی سے قرآن مجید کی کوئی تفسیر کرے، اس قسم کی تفسیر بالرائے سے گمراہیوں
کا دروازہ کھل گیا، اور باطنیہ، شیعہ، معتزلہ، خوارج، مرجئہ وغیرہ مختلف گمراہ فرقے پیدا
ہو گئے، جنھوں نے قرآن کے ظاہر و باطن کے معنی الگ الگ قرار دیئے، بعد میں بدعت اور غرض
پرستی بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئی، اس لئے بے شمار مفاسد پیدا ہو گئے،

لیکن بعد کے دور میں نئے نئے مسائل نے نئی نئی الجھنیں پیدا کر دیں جن کے ازالہ کے لئے
اصحاب روایت کے پاس کوئی حربہ نہ تھا، بالخصوص جب مسلمانوں میں یونانی علوم و فنون کا
رواج ہوا، اور اُن کے عقائد و افکار دوسری قوموں سے متاثر ہوئے، تو اس وقت اہل

---

۵ ترمذی۔ یہ حدیث امام ترمذی کے نزدیک غریب ہے، اس کے ایک راوی سہیل بن حزم
کے بارے میں کلام کیا گیا ہے،

۵ مشکوٰۃ و جامع ترمذی

مکاتب فکر کا ظہور ہوا، ان مکاتب فکر کا دامن اتنا بڑھا کہ جزئی اور فروعی مسائل کے علاوہ اصولی اور بنیادی عقائد مثلاً صفات باری، خلق قرآن، جبر و قدر، ایمان و عمل کا تعلق، خیر و شر کی حقیقت، مرتکب کبیرہ کا حکم وغیرہ بھی تفسیروں میں موضوع بحث بن گئے، اور اس بحث و جدال نے متعدد فرقوں کی صورت اختیار کر لی، نتیجہ یہ ہوا کہ قرآنی آیات کی تشریح و توضیح ہر فرقہ اپنے میلان و رجحان کے مطابق کرنے لگا،

چوتھی صدی ہجری کے بعد مسلمانوں میں مختلف علمی تحریکیں بھی پیدا ہوئیں، صرف و نحو، بلاغت و معانی، فقہ و اصول فقہ، منطق و فلسفہ، کلام اور تصوف کا رواج ہوا، ان علوم کے حاملین نے اپنے اپنے فنی زاویہ نظر سے الفاظ و آیات کی تشریح میں بحثیں شروع کیں، علم و ادراک کے گوشوں میں جلا آئی، اور ارتقاء و تغیر کے تقاضے بروے کار آئے، اور روایات کے ساتھ اجتہاد کا بھی دروازہ کھل گیا، تفسیروں میں جہاں تنوع، رنگارنگی آئی، وہاں قرآن مجید کی تفسیر میں تاویل و توجیہ کا ایک باب کھل گیا جس سے قرآن مجید فقہی، کلامی اور فلسفیانہ بحثوں کا میدان بن گیا۔ ہر مفسر کوشش کرنے لگا کہ وہ جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے اس کو قرآن کی آیت سے ثابت کرے، اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں ان سے استدلال کرے،

تفسیر بالرائے کی ممانعت، ارتقاء کے اس موڑ پر قدرۃً یہ سوال پیدا ہوا کہ تفسیر کے صحیح حدود کیا ہیں، اور قرآن میں غور و فکر اور استخراج معانی کا دائرہ کتنا وسیع ہے،؟ اس سلسلے میں دو گروہ ہوگئے، ایک فریق تو اس بات کا حامی تھا کہ تفسیر میں ماثور و منقول ہی پر اکتفا کیا جائے، اور اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہی جائے، کیونکہ اس سے غیر ضروری بحثوں کا دروازہ کھلتا ہے، اور ایمان کے داعیوں اور تقاضوں کو نقصان پہنچتا ہے، اس فریق کے نزدیک

سیر میں صرف ماثور کا اعتبار کیا جائے گا، اور مجرد رائے کو حرام سمجھا جائے گا، کیونکہ
سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِغَیْرِ عِلْمٍ	قرآن مجید کے بارے میں بغیر علم کے
فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ[51]	جس نے کچھ کہا اسے چاہیے کہ اپنی

ایک اور حدیث میں فرمایا کہ

من قال فی القرآن برائہ	جس نے قرآن کے سلسلے میں اپنی
فاصاب فقد اخطاء[52]	رائے سے کوئی بات کہی اور اس کی
	بات صحیح بھی ہوئی تو اس نے غلطی کی

اصحاب حدیث و روایت کے نزدیک وہ شخص خاطی اور گمراہ ہے جو تفسیر رسول سے
گریز کرکے اپنے جی سے قرآن مجید کی کوئی تفسیر کرے، اس قسم کی تفسیر بالرائے سے گمراہیوں
کا دروازہ کھل گیا، اور باطنیہ، شیعہ، معتزلہ، خوارج، مرجئہ وغیرہ مختلف گمراہ فرقے پیدا
ہوگئے جنہوں نے قرآن کے ظاہر و باطن کے معنی الگ الگ قرار دیئے، بعد میں بدعت اور غرض
پرستی بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئی، اس لئے بے شمار مفاسد پیدا ہوگئے،

لیکن بعد کے دور میں نئے نئے مسائل نے نئی نئی الجھنیں پیدا کردیں جن کے ازالہ کے لئے
اصحاب روایت کے پاس کوئی حربہ نہ تھا، بالخصوص جب مسلمانوں میں یونانی علوم و فنون کا
رواج ہوا، اور اُن کے عقائد و افکار دوسری قوموں سے متاثر ہوئے، تو اس وقت ان

---

[51] ترمذی۔ یہ حدیث امام ترمذی کے نزدیک غریب ہے، اس کے ایک راوی سہیل بن حزم
کے بارے میں کلام کیا گیا ہے،

[52] مشکوٰۃ و جامع ترمذی

مشکلات اور الجھنوں کا عقلی جواب دینے کی ضرورت پیش آئی جس کے لئے علمائے اسلام کا ایک گروہ آگے بڑھا، اس زمانہ میں عقلی تفسیروں کی افادیت محسوس کی گئی، اس کے نتیجہ میں امام رازی، بیضاوی، نسفی، خازن، ابوحیان، نیشاپوری، سیوطی، شربینی، ابوالسعود اور آلوسی نے گو عقلی تفسیریں لکھ کر تفسیر و تاویل کے دائروں کو کافی وسعت دی لیکن اثر و روایت کے جادۂ مستقیم سے انحراف نہیں کیا، ان کی کتابوں میں جو فرق و اختلاف پایا جاتا ہے، وہ ان کے اپنے اپنے ذوق اور طریقۂ تعبیر کی وجہ سے ہے،

حالات کی تبدیلی سے متکلمین اسلام کے گروہ نے یہ محسوس کیا کہ عقل و رائے کے بغیر کام نہیں چلے گا، قرآن تو ایک ابدی صحیفہ ہے جس کی تعبیر و تشریح ہر دور کے حالات اور جدید علوم و فنون کے اعتبار سے کی جائے گی، اس نے خود بار بار تدبر و تعقل کی دعوت دی ہے، اس لئے لامحالہ ہر دور کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر ہی اس کی تفسیر بھی کرنی چاہئے،

رائے کی قسمیں تفسیر بالرائے کی ممانعت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن کے مطالب و معانی کے سمجھنے میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے، اگر یہ مطلب ہوتا، تو پھر قرآن فہم و تدبر کی تلقین کیوں کرتا، اس طرح تو قرآن کا درس و مطالعہ بھی بے سود ہو جاتا، علامہ شاطبی نے موافقات میں تحریر فرمایا ہے کہ

"رائے کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ رائے جو کتاب و سنت کے مطابق اور عربی زبان کے قواعد کے موافق ہو اس رائے سے اعراض اور غفلت ممکن نہیں ہے، دوسری وہ رائے ہے جو نہ دلائل شرعیہ کے موافق ہو اور نہ کلام عرب کے قواعد کے مطابق ہو اس قسم کی رائے بلاشبہ قابل مذمت ہے[1]"

ابوبکر جصاص رازی نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ

---

[1] موافقات للشاطبی جلد ۳،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد من قال فی القرآن برائه فاصاب فقد اخطاء اس شخص کے متعلق ہے جو قرآن کی تفسیر میں اصول سے ہٹ کر وہ بات کہے جو اس کے خیال میں آجائے اور اگر کوئی شخص آیات قرآنیہ کا مطلب بیان کرے اور اس کو ایسے معانی پر محمول کرے جن پر سب کا اتفاق ہے، تو وہ شخص قابل تعریف اور اجر کا مستحق ہے، اور وہ ان لوگوں میں ہے، جن کے متعلق خدا نے ارشاد فرمایا ہے:۔
لعلمه الذین یستنبطونه منهم[۵]"

تفسیر بالرائے میں رائے لغوی معنی میں نہیں ہے، بلکہ ایک مخصوص اصطلاح ہے، اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اپنے ذہن میں ٹھہرالی جائے، اور کسی طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جائے،

تفسیر بالرائے کے متعلق علماء کی تصریحات

تفسیر بالرائے کا مطلب کیا ہے، اور شارع علیہ السلام کا اس سے مقصود کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے علمائے اسلام کی مندرجۂ ذیل تصریحات قابل غور ہیں، علامہ قرطبی اندلسی فرماتے ہیں:۔

"کسی معاملہ میں آدمی کی خود اپنی ایک رائے ہو، اور اس کی جانب خواہش نفس کی بنا پر اس کا طبعی میلان بھی ہو، اور وہ اپنی اسی رائے اور خواہش کے مطابق قرآن کی اس لئے تفسیر کرے، کہ اپنی غرض فاسد کی صحت پر استدلال کر سکے[۶]"

علامہ خازن لکھتے ہیں:۔

"تفسیر بالرائے کی ممانعت اس شخص کے بارے میں وارد ہوئی ہے جو اپنی خواہش نفس کے مطابق قرآن کی تفسیر کرے، جیسے کوئی شخص اپنی بدعت کا جواز ثابت کرنے

---

[۵] احکام القرآن جلد ۲ ص ۸۰ [۶] تفسیر قرطبی جلد ۱ ص ۳۳

کے لئے قرآن کی بعض آیتوں سے استدلال کرے، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ آیت کا مطلب کچھ اور ہی ہے لیکن اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ مقابل کو ایسی چیز سے دھوکا دے جو اس کی بدعات کے دلائل کو مضبوط کرے، جیسا کہ باطنیہ خوارج اور دوسرے گمراہ فرقے اپنی اغراض فاسدہ کے لئے کرتے ہیں؟[۱]

امام غزالی نے تفسیر بالرائے کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، فرماتے ہیں:-

یہ کہ زیر بحث آیت کے موضوع سے متعلق کسی شخص نے پہلے سے کوئی رائے قائم کرلی ہو، اور اس کی جانب اس کا میلان و رجحان ہو، پھر وہ آیت قرآنی کی تاویل میں اس طرح کھینچ تان کرے، کہ وہ اس کی رائے کے مطابق ہو جائے، اور اپنی تیجہ غرض کے لئے اس سے حجت اور دلیل قائم کرسکے، اور اگر اس کی مخصوص رائے اور رجحان کا سوال نہ ہوتا، تو پھر وہ آیت زیر بحث کی تفسیر و تاویل کی طرف توجہ بھی نہ کرتا، بالعموم یہ تفسیر بالرائے اس علم کے ساتھ ہوتی ہے، کہ آیت زیر بحث کی تفسیر مقصود نہیں ہوتی، بلکہ اپنی بدعت کو صحیح اور جائز ثابت کرنے کے لئے حریف کو التباس میں مبتلا کرکے وہ آیات قرآنی سے حجت لاتا ہے، اور کبھی یہ تفسیر بالرائے جہالت پر بھی مبنی ہوتی ہے، اور آیت زیر بحث، اگر محتمل ہوتی ہے یعنی اس سے دونوں پہلو ثابت ہوسکتے ہیں تو اس کی فہم اپنے اغراض کے توافق پر مائل ہوتی ہے، اور آیت کا مفہوم اپنی غرض اور خواہش کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی رائے کے جانبدارانہ پہلو کو ترجیح دیتا ہے، اور اس طرح وہ تفسیر بالرائے کا ارتکاب کرتا ہے، یہ وہ رائے ہے کہ اگر پہلے سے اس نے قائم نہ کرلی ہوتی، تو وہ تفسیر کا یہ پہلو اختیار نہ کرتا، لوگوں کو بہکانے اور اپنے

---

[۱] تفسیر خازن جلد ۱ صفحہ ۷

مذہب باطل کی ترویج کے سلسلے میں اس طرز عمل کو باطنیہ نے خوب استعمال کیا، انھوں
نے قرآن کو اپنی رائے اور مذہب کے موافق ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت
نہیں کیا، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آیات قرآنی کا جو مفہوم یہ لے رہے ہیں
وہ قطعاً مراد نہیں ہے، یہی وہ مواقع ہیں جہاں، تفسیر بالرائے ممنوع ہے، کیونکہ
ایسے مواقع پر "رائے" سے مراد رائے فاسد ہے، جو ہوا و ہوس سے تو مطابقت
رکھتی ہے لیکن اجتہاد صحیح سے جسے کوئی واسطہ نہیں ہوتا"[۱]

تفسیر بالرائے کے حدود

بہرحال تفسیر میں رائے بالکلیہ ممنوع نہیں ہے، بلکہ اگر رائے محمود ہو
تو اس سے قرآنی حقائق کے بہت سے مخفی پہلو روشن ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ تفسیر کرنے والا شخص
دینی علوم پر گہری نظر رکھتا ہو، عربی زبان کے قواعد اور اسالیب پر اسے عبور بھی ہو، بلاغت و
معانی کی باریکیوں کو بھی سمجھتا ہو، احادیث و آثار کے ذخیرہ سے بھی واقف ہو، اور سب سے بڑی
بات یہ ہے کہ اس کے دل میں نور ایمان ہو، تقویٰ و خلوص نیت سے بھی بہرہ یاب ہو تو ایسا شخص
کسی آیت کا مفہوم بیان کرے تو اس کی تفسیر، تفسیر بالرائے نہ ہوگی چنانچہ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

"جس نے قرآن کی تفسیر میں لغت اور شریعت کے اعتبار سے اپنے علم کے مطابق
گفتگو کی، اس پر کوئی حرج نہیں، اسی لئے ان سلف سے اور بعد کے علماء سے تفسیر
میں بہت سے اقوال منقول ہیں"[۲]

مشہور مفسر ابو حیان اندلسی فرماتے ہیں:-

"جس نے غور و فکر سے کام لیا، اور علم و نظر کے اصولوں کے مطابق قرآن کی
تفسیر کی، وہ اس حدیث میں داخل نہیں، اس کی تفسیر بالرائے نہیں ہوگی، اور

---

[۱] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۲۹۱ - [۲] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۶

نہ خطا کی طرف منسوب ہوگی۔[51]

اہلِ نظر کے نزدیک آیات کی تاویل بھی جائز ہے، اور تاویل کا تعلق زیادہ تر عقل و رائے ہی سے ہے۔ علامہ سیوطی امام بغوی اور کواشی سے نقل کرتے ہیں کہ

"تاویل یعنی آیت کو اجتہاد و استنباط کے طریق پر ایسے مفہوم پر محمول کرنا جو سیاق و سباق کے مطابق ہو اور آیت میں اس کی گنجائش ہو، اور وہ مفہوم کتاب و سنت کے خلاف بھی نہ ہو، علماء تفسیر کے لئے ناجائز اور ممنوع نہیں ہے"۔[52]

بہرحال رائے محمود بھی ہو سکتی ہے اور مذموم بھی، اگر اصول و ضوابط کے تحت ہو تو اس سے فہم قرآن کی راہیں کھلتی ہیں، اور اگر ان سے انحراف ہو تو بیجا تاویلات کا بھی دروازہ کھلتا ہے۔ مجاہد مفسرین نے تفسیر بالرائے کے حدود کا ہمیشہ لحاظ رکھا ہے، اور ان کی مساعی جمیلہ کی بدولت تفسیر کے ذخیرہ میں گرانمایہ اضافہ ہوا۔

تفسیر بالماثور کا کمزور پہلو اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ تفسیر بالماثور ہمارے لئے کافی ہے اور ہمیں عقل و فہم کو کام میں نہیں لانا چاہئے، تو یہ اس کی کوتاہ فہمی ہے، قرآن پر جب بھی غور و فکر کیا جائے گا، اور گہرائی سے مطالعہ کیا جائے گا تو تفسیر بالماثور زیادہ کارآمد نہیں ثابت ہوگی اور نہ ہر زمانہ اور ماحول میں سازگار ہوگی، کیونکہ حدیث کی صحیح ترین کتابوں میں تفسیر کے ابواب اس قدر مختصر ہیں کہ کسی سورہ کے ایک یا دو لفظوں اور کسی سورہ کی صرف ایک یا دو آیتوں کے متعلق روایات درج کی گئی ہیں، اگرچہ یہ روایات قرآن کی تفسیر کے لئے نہایت اہمیت رکھتی ہیں،

---

[51] البحر المحیط جلد ۱ ص ۱۳۔

[52] الاتقان جلد ۲ ص ۱۸۰۔

گمان سے خود ان کا کوئی گوشہ سیراب نہیں ہوتا، علامہ سیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن کی آخری فصل میں ان تفسیری روایتوں کو جمع کر دیا ہے، جو صحابہ کے توسط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، اور وہ کل ان کی کتاب کے بیس[۵۱] صفحوں سے بھی کم ہیں، پھر وہ بھی زیادہ تر الفاظ کے معانی کے متعلق ہیں۔

ان کے علاوہ تفاسیر کے وہ مجموعے جن میں آثار و اقوال کو جمع کیا گیا ہے، ان میں ہر قسم کی روایات درج ہو گئی ہیں، ائمہ جرح و تعدیل نے جب راویوں اور روایتوں کی جانچ کی، تو تفسیری روایات کا بڑا حصہ ان کے رواۃ کے ضعف کی بنا پر مشکوک ثابت ہوا کیونکہ ضحاک بن مزاحم، مقاتل بن سلیمان، ابو صالح مصری، محمد بن سائب کلبی، السدی، محمد بن مروان، بشر بن عمارہ، اور عوفی وغیرہ جن سے زیادہ تر یہ روایتیں آئی ہیں، جانچنے سے کمزور بلکہ ان میں سے بعض وضاع نکلے[۵۱]،

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نام سے تفسیر کی روایات زیادہ تر موضوع ثابت ہوئیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے قرآن کی ہر آیت اور ہر لفظ کی تفسیر میں ۱۲۶۰ روایتیں نقل کی گئی ہیں، جن میں سے امام شافعی کے قول کے مطابق زیادہ سے زیادہ سو ایسی ہیں، جو صحیح مانی گئی ہیں[۵۲]۔

پھر منقول تفسیروں میں اسرائیلیات کا بڑا حصہ بھی شامل ہو گیا، جن میں زیادہ تر حصہ موضوعات و خرافات سے تعلق رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکابر ائمہ نے ان پر سخت تنقیدیں کیں، امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے،

"تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں، مغازی، ملاحم، اور تفسیر[۵۳]"

---

[۵۱] مرآۃ التفسیر ص ۳۰ تا ۲۸۔ [۵۲] الاتقان جلد ۲ ص ۱۹۵۔ [۵۳] تذکرۃ الموضوعات شیخ محمد بن طاہر ص ۸۲،

تفسیر میں اجتہاد ورائے کی ضرورت جب یہ معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی تفسیر کا صرف کچھ ہی حصہ ہم تک پہنچا ہے، تو باقی حصے کے بارے میں نصوص صریحہ کی روشنی میں ہم قرآن سمجھنے کی کوشش کریں،

صحابہ کرام سے جو تفسیر مرفوعاً ثابت نہیں لا محالہ اسے اُن کی فہم ورائے ہی قرار دیا جائے گا اور جب انھوں نے ایک طرح ڈال دی ہو تو ہم بھی اُن کے راستہ پر چلیں جس طرح فقہی مسائل میں ہم ان سے استفادہ کرتے، اور عربیت میں ان کو حجت سمجھتے ہیں، اسی طرح قرآن کے سلسلے میں بھی ہم اپنی فہم ورائے سے کام لیں،

ان اقوال میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے نہیں ہیں، ظاہر ہے وہ صحابۂ کرام کا اپنا فہم سمجھے جائیں گے، جسے اللہ تعالیٰ نے فہم وخرد سے نوازا ہے، اور لغت وسنت کا وہ علم بھی رکھتا ہے، تو وہ بھی صحابۂ کرام کی تقلید کرتے ہوئے اپنی فہم سے کام لے سکتا ہے،

تفسیر بالماثور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ سختی کے ساتھ آثار سلف سے تجاوز نہیں کرتے، وہ بھی سلف کے مختلف اقوال کو سامنے رکھ کر استنباط و ترجیح سے کام لیتے ہیں اور یہ اختیار و تمیز فہم بالرائے کے سوا اور کیا ہے،

جب یہ ثابت ہے کہ تفسیر بالماثور کا بہت کم حصہ صحیح طریقہ پر پہنچا ہے، تو دوسرے حصوں کے لئے فہم ورائے کا دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا، اخبار و آثار سے بھی تائید ہوتی ہے کہ اصحاب فہم و تدبر کے لئے قرآن میں غور و فکر کی کافی گنجایش ہے، جیسا کہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو کوئی ایسی چیز نہیں عطا فرمائی جسے لوگوں سے چھپایا ہو، سوائے اس کے کہ اللہ عز وجل اپنے کسی بندے کو فہم قرآن

کی نعمت عطا فرمائے ؎

مقصد یہ ہے کہ کتاب اللہ کی فہم کا دروازہ وسیع ہے، خدا جسے چاہے عطا کرے، اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کو ہمیشہ یہ نعمت حاصل ہوتی ہے، اولوالالباب اپنی حکمت و بصیرت قرآن سے استنباط کرتے، اور اپنی عقل و فہم کو قرآن کے علم و معرفت میں استعمال کرتے ہیں،

فہم قرآن کے سلسلے میں اہل علم کا یہی طریقہ رہا ہے، کہ پہلے انھوں نے قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کی۔ کیونکہ قرآن ایسی کتاب ہے جس میں کہیں اجمال ہے، تو کہیں دوسری آیت میں اس کی تفصیل ہو جاتی ہے، اس کے بعد انھوں نے سنت کو ذریعۂ فہم بنایا، کیونکہ رسول شارحِ قرآن ہیں، پھر اقوال صحابہ کو پیش نظر رکھا، کیونکہ انھوں نے براہ راست صحابہ سے استنباط کیا، پھر تابعین کے اقوال کو بھی دیکھا، پھر جب اشکال رہ گیا تو انھوں نے فکر و رائے سے کام بھی لیا، یہی طریقہ زیادہ محتاط اور اولیٰ ہے، اور اس کی تائید حضرت معاذ بن جبلؓ کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے یمن بھیجتے ہوئے سوال کیا کس چیز سے فیصلہ کروگے، معاذؓ نے عرض کیا کہ اللہ کی کتاب سے، فرمایا اگر اس میں نہ مل سکے؟ عرض کیا تو سنت سے۔ فرمایا کہ اگر سنت میں بھی نہ پایا؟ عرض کیا تو پھر اجتہاد و رائے سے کام لوں گا، یہ سن کر آپ نے سینہ پر تھپکی دیتے ہوئے فرمایا، الحمد للہ جس نے رسول کے قاصد کو اس امر کی توفیق بخشی جو اللہ کے رسول کو پسند ہے ؎،

ارباب علم کے لئے زندگی کے ہر باب میں حضرت معاذؓ کا اسوۂ قابل حجت رہا۔ تو فہم قرآن کے سلسلے میں یہ دلیل راہ کیوں نہ بنے حقیقت یہ ہے کہ فہم قرآن کا دائرہ تنگ نہیں ہے، بلکہ قرآن کی حکیمانہ اور ابدی تعلیمات کا تقاضا ہے، کہ اس میں ہمیشہ تعقل و تفکر سے کام لیا جائے

ؔ مشکوٰۃ بحوالہ کتاب القصص ص ۳۰۰، بحوالہ بخاری ؔ جامع ترمذی کتاب القضا

جتنی زیادہ گہرائی سے اس کا مطالعہ کیا جائے گا، اسی قدر خدا کی حکمت و معرفت
آئے گی، اس سلسلے میں امام غزالی نے بڑی اچھی بحث کی ہے، فرماتے ہیں:

"قرآن کریم میں جملہ دینی علوم موجود ہیں، بعض صراحت کے ساتھ
طور پر بعض تفصیل سے، لیکن ان سے بہرہ ور ہونے کے لئے گہرے غور
ہے نیز حقائق کی بصیرت بھی لازمی ہے، اور یہ کام صرف اس طرح نہیں
زبان سلف پر جو ظواہر تفسیر چلے آرہے ہیں، اُن پر اکتفا کر لیا جائے، بلکہ
کہ تعمق سے کام لیا جائے، اور استخراج معانی کیا جائے، بشرطیکہ وہ
کے خلاف نہ ہو،"

لیکن بہت سے امور ہیں جو تفسیر ماثور سے ماوراء ہیں، جیسا کہ عبداللہ بن مسعود
من اراد علم الاولین والآخرین ؓ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اولین
فلیتدبر القرآن، کا علم حاصل کرے اسے چاہئے کہ
اور ظاہر ہے کہ تدبر فی القرآن کے لئے تعمق فی الفہم ضروری اور ناگزیر ہے، جو ظا
انحصار کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے لئے اشارات اور مقاصد کا سمجھ

۳۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفات و افعال کا بیان بھی ہے اور اس کی
اس کے اسمائے حسنیٰ بھی آئے ہیں، ان چیزوں کو سمجھنے کے لئے فانی چیزوں کی مثا
کے ساتھ صرف ظواہر پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا، بلکہ فہم و تدبر کی بھی ضرور
کو جمع کیا جا سکے اور قول مختلف کی نفی کی جا سکے،

۴۔ آثار سلف بھی اس مسلک کی تائید میں موجود ہیں کہ قرآن کے سمجھنے
کام لینا چاہئے، چنانچہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے،

"جس نے قرآن کو سمجھا اس کے ہاتھ میں سارے علوم کی کنجی آگئی"

ظاہر ہے یہ بات اُس وقت تک ممکن نہیں، جب تک فہم میں تعمق سے کام نہ لیا جائے،

۴۔ خود قرآن کی آیات تعمق فی الفہم کی دعوت دیتی ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۚ (البقرۃ۔ ۳۷) اور جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دیا گیا،

مفسرین سلف نے حکمت کی تفسیر کرتے ہوئے اس کے معنی فہم قرآن کے بیان کئے ہیں، تو جب اللہ تعالیٰ خود فہم قرآن کو خیر کثیر سے تعبیر فرماتا ہے، تو ظاہر ہے کہ کس طرح وہ ان لوگوں کو جو فہم و تعمق قادر ہیں، بحث و تامل اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے،

۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو دعا دی،

اللّٰھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل[۵۱] اے خدا ابن عباسؓ کو دین کی سمجھ اور تاویل کی فہم عطا کر۔

تاویل سے مراد قرآن کی تفسیر ہی ہے، اور اس کی عبارت اور غایت کے اشاروں کو سمجھنا، اور اگر تفسیر محدود ہوتی، صرف اقوال تک جو وارد ہوئے تو آپ ابن عباسؓ کے لئے علمہ (اسے سکھا دے) کے بجائے (احفظہ) (اسے یاد کرا دے) فرماتے،[۵۲]

تفسیر کا صحیح طریقہ | تفسیر قرآن میں نہ تو صرف نقل و روایت پر انحصار کرنا درست ہے نہ مجرد رائے اور عقل پر اعتماد کرنا مناسب ہے، بلکہ صحیح اعتدال کی راہ یہی ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ صحیح طریقہ سے مروی ہے اس پر اعتماد کیا جائے، اور اپنے نزدیک ورے بے جا تاویلات سے احتراز کیا جائے، علامہ راغب اصفہانی دونوں فریقوں کے دلائل لکھنے

۵۱ فتح الباری جلد ا ص ۸۰، ۵۲ احیاء العلوم ص ۲۶۰ تا ۲۶۲، جلد ا،

کے بعد اپنے مقدمۂ تفسیر میں فرماتے ہیں :

غلو اور کوتاہ فہمی دونوں فریقوں میں پائی جاتی ہے، کیونکہ جس نے صرف منقول پر انحصار کر لیا اس نے ان تمام پہلوؤں سے صرف نظر کر لیا جن کی آیت متقاضی ہوتی ہے، اور جس نے اجازت دی اس نے ہر اہل و نااہل کے لئے غور و خوض کی اجازت دیدی جس نے اپنی غرض کیلئے اس کی تفسیر بیان کرنی شروع کر دی اور اس نے آیت تدبر کا لحاظ نہیں کیا[1]

امام غزالی بھی فرماتے ہیں :-

"اس افراط و تفریط سے بچنے کے لئے صحیح اور درست طریقہ یہی ہے کہ فہم قرآن کے سلسلے میں جو کچھ مروی اور ماثور ہے اس پر اعتماد کیا جائے لیکن منقولات اور دلائل لغویہ کے پہلو بہ پہلو فہم و عقل کو کام میں لانا چاہئے تاکہ قرآن کریم کے دور رس، وسیع اور گہرے معانی کا استخراج کیا جا سکے، اور کوئی نفسی حقائق کی گہرائیوں میں ڈوب کر گوہر مقصود کو حاصل کیا جائے۔ ظواہر کونیہ کا ادراک عقل اگر صحیح طور پر کرے گی تو قرآن میں رہنما اشارے بھی ضرور ملیں گے شاید یہی حقیقت ہے جس کی طرف بعض صحابہ نے اشارہ فرمایا ہے۔

مثلاً حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں :

لا یفقہ الرجل کل الفقہ حتیٰ یجعل للقرآن وجوھاً[2]	کوئی شخص فقیہ نہیں ہو سکتا جب تک وہ قرآنی الفاظ کے مختلف احتمالات کا علم نہ حاصل کرے

حافظ ابن حبان ابن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ

ان للقرآن ظاھراً و باطناً	قرآن کے ظاہری معانی بھی ہیں اور علمی نکتے

---

[1] تفسیر راغب ص ۴۲۳ [2] الاتقان جلد ۱ ص ۱۴۱

وحلٰلا و مطلعاً ، یعنی حلال و حرام بھی اور وعدہ و وعید بھی

یہاں قرآن کے دوسرے پہلو یعنی باطن سے وہ باطن نہیں مراد ہے جو حضرات شیعہ کے نزدیک صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصیا کے ساتھ خاص ہے بلکہ اس سے قرآن کا وہ اشاریہ بیانیہ مراد ہے جو حقائقِ کونیہ تکوینیہ و تشریعیہ وغیرہ سے متعلق ہے یعنی وہ امور ہیں جنہیں کوئی دقیقہ رس عالم ہی اپنی بصیرت کی روشنی میں سمجھ سکتا ہے، وہ بصیرت جو نورِ الٰہی سے مستفیذ ہو، اور جو استقامت فکر اور عقل رسا کی حامل ہو۔

امام غزالیؒ نے اس سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ

"ظاہر تفسیر میں نقل و سماع لابدی اور لازمی ہیں تاکہ انسان غلطی اور کجی سے محفوظ رہے، اس کے بعد ہی انسان وسعت فہم و ادراک اور استنباط و استخراج سے آشنا ہو سکتا ہے، جو شخص اسرار قرآن کے فہم کا دعویٰ کرتا ہے اور تفسیر ظاہر سے ناآشنا ہو اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دروازے میں سے گزرے بغیر اندرون خانہ پہنچ جانے کا مدعی ہو یا جو کہتا ہو کہ میں ترکوں کا کلام سمجھ لیتا اور ان کے مقاصد پہچان لیتا ہوں حالانکہ وہ ترکی زبان سے ناآشنائے محض ہو۔"

اسرار قرآن اور اس کے باطنی پہلو کے فہم و ادراک کے بارے میں آگے چل کر امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

"یہ اسرار الٰہی علماء پر منکشف ہوتے ہیں جن کا علم راسخ ہے وہ بھی بقدر علم و صفائے قلب، اور علم و صفائے قلب کی ترقی کی بھی ایک حد ہے ورنہ تمام اسرار قرآنی کا سمجھ لینا ناممکن ہو، اگرچہ سمندر روشنائی اور اشجار قلم کیوں نہ بن جائیں کیونکہ اللہ عزوجل کے کلمات کے اسرار و حکم کی کوئی انتہا نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ظاہر تفسیر میں اشتراک معرفت کے باوجود فہم قرآن کے سلسلے میں لوگوں کے درمیان تفاوت پایا جاتا ہے کیونکہ تفسیر کا صرف ظاہری پہلو دوسرے پہلوؤں سے انسان کو بے نیاز نہیں کر سکتا۔" [۱۵]

---

[۱۵] احیاء العلوم جلد اص ۲۶۲ ، ۲۶۳ و ۲۶۴ ،

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی

میں

قرآن پاک کی دوسری بین الاقوامی کانگریس

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کا بہت بڑا زریں کارنامہ ہے، اس کے بانی اور روح رواں ہمدرد دواخانہ کے مالک جناب حکیم عبد الحمید صاحب ہیں، جنھوں نے تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی گئی گذری حالت میں ایسے نمایاں کام انجام دیے ہیں جن پر ہندوستانی مسلمان فخر کر سکتے ہیں، ۱۹۴۷ء سے پہلے یونانی طب کی حالت اچھی نہ تھی، لیکن جناب عبد الحمید نے اپنے والد بزرگوار کے ہمدرد دواخانہ کو اپنی نگرانی میں لے کر اس میں ایسے چار چاند لگائے کہ اب اس کی دوائیں اور دوسری تیار کردہ چیزیں ظاہری اور معنوی حیثیت سے یورپ کی دواؤں کے مقابلہ میں ہو گئی ہیں، انھوں نے ہمدرد دواخانہ کو جو ترقی دی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس میں اتنی برکت ہوئی کہ اس کی آمدنی سے تغلق آباد میں ایک بہت ہی وسیع اور عریض رقبہ خریدا، اور اس بنجر اور پتھریلی زمین میں وہی کارنامہ انجام دیا جو اکبر نے فتح پور سیکری آباد کر کے دکھایا تھا، اکبر کے پاس شاہی خزانہ تھا، لیکن جناب عبد الحمید صاحب کے پاس شاہانہ دل ہے، اب اس کے احاطہ میں ایک طبیہ کالج ہے، جس کا ایک ہسپتال اور دار العمل بھی ہے، مگر جو چیز سب سے نمایاں اس رقبہ میں ہے، وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا کتب خانہ ہے، جو فنِ تعمیر کی

ندرت اور اپنی آرائش و زینت کے لحاظ سے یورپ اور امریکہ کے بڑے سے بڑے کتب خانوں پر بھی اپنی انفرادیت کی وجہ سے فوقیت رکھتا ہے، اس احاطہ میں ایک خوبصورت مسجد کے علاوہ اور بہت سی عمارتیں ہیں جن کی قیمت اگر موجودہ دور میں لگائی جائے تو شاید کھربوں میں طے ہو۔

حکیم عبدالحمید صاحب کی کیا عمر ہے؟ وہی ہے جس میں عام طور سے لوگ بوڑھے پھوس کہلاتے ہیں مگر ان کو دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکلتا ہے ؎

جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگِ شباب

وہ زیادہ تر خاموش رہتے ہیں، مگر اپنی خاموشی میں معلوم نہیں کیا کیا سوچتے رہتے ہیں ؎

گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب

دوسری بین الاقوامی کانگریس کے خضر راہ وہی تھے، ان کی اعانت کے لیے ان کے چھوٹے بھائی حکیم محمد سعید صاحب کراچی سے آئے ہوئے تھے، جن کو ایسے علمی اجتماع کو انتہائی خوش سلیقگی سے انجام دینے میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے، وہ جہاں بھی ہوتے ہیں اور جو بھی موسم ہوتا ہے، چاندکی چاندنی سے زیادہ سفید اور سہانے رنگ کی شیروانی زیب تن کیے ہوئے اپنی ہنسی اور خوش خلقی کی افشاں پاشی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ان کے جلو میں پروفیسر ایس۔ ایم۔ ایچ جعفری تھے، جو اس وقت آسٹریلیا میں پروفیسر ہیں، لیکن حکیم سعید کے خلوت و جلوت میں ہمدم اور دمساز ہیں، وہ کانگریس کو ہرطرح کامیاب بنانے میں حکیم سعید صاحب کی ہرطرح کی مدد کر رہے تھے حکیم سعید صاحب میں بڑی مردم شناسی بھی ہے، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کس سے کیا کام کس وقت لیا جاسکتا ہے، جناب برکات احمد صاحب ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس بھی ان کے ساتھ ہرطرف دکھائی دیے، مگر کام کے بارے جو سب سے زیادہ دبے اور تھکے دکھائی دیے، وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر جناب سید اوصاف علی تھے، جو متحرک ہوکر تھکنا نہیں جانتے اور اگر تھک بھی جاتے ہیں تو اس کا اظہار نہیں کرتے، دنیا بھر کے

سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کرنے کی وجہ سے ان میں بڑی خوش مذاقی پیدا ہو گئی ہے، جس کا اظہار ان کی ہر گفتگو اور تقریر بلکہ نشست و برخاست، ملنے ملانے اور خاطر تواضع کرنے میں ہوتا ہے، لہٰذا کوئی کم سے کم ان کے ہر بن مو سے مشرق اور مغرب کی ہر نئی پرانی تصنیف کی آواز سنائی دے گی، کانگریس کے ہر گوشہ اور ہر کام میں وہ جھلاوہ کی طرح دکھائی دیے،

کانگریس کے انعقاد کے لیے کوئی خاص تزک و احتشام کی ضرورت نہ تھی، جو بھی کمی زینت و آرائش کی جاتی وہ اس احاطہ کی شاندار لائبریری کے سامنے ماند پڑ جاتی، البتہ لائبریری کی عمارت کی دیواروں اور چھتوں پر اسمائے حسنیٰ کی کتابت کا جو آرٹ پاکستان کے مشہور مصور جناب صادقین نے دکھایا تھا وہ اس موقع کی زیبائش کے لیے بہت ہی خوب، مناسب، موزوں اور دیدہ زیب تھا۔

اس کانگریس کا اجلاس ۲ / دسمبر سے ۷ / دسمبر ۱۹۸۲ء تک ہوتا رہا، اس کا پہلا اجلاس آسٹریلیا میں ہوا تھا، دو سال کے بعد جناب حکیم عبدالحمید نے اس کی میزبانی کی ساری ذمہ داری لے کر اس کا دوسرا اجلاس اپنے یہاں منعقد کیا، اس کی اہمیت کا اندازہ ان نمایندوں سے ہوگا جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں :

آسٹریلیا :۔ ڈاکٹر احمد شیبول، سڈنی یونیورسٹی، احمد یوسف، میلبورن، ڈاکٹر محمد واصل کوئنز لینڈ ۔

آسٹریا :۔ ڈاکٹر اسماعیل بالک ،

امریکہ :۔ پروفیسر فریڈرک ام ڈینی، ڈاکٹر عبدوا ے. ایل کھولی، ڈاکٹر ٹی. بی اروِنگ، پروفیسر ڈیوڈ اے کنگ، پروفیسر منظور احمد، پروفیسر اسماعیل کے پونا والا، پروفیسر الفورڈ ٹی ویلش ۔

انگلستان :۔ پروفیسر آر. بی سرجنٹ سابق پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی، ڈاکٹر کے. کریگ، پروفیسر منٹگمری واٹ، ڈاکٹر یعقوب زکی بنگلہ دیش، ڈاکٹر مستفیض الرحمٰن ڈھاکہ، ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن، راج شاہی پروفیسر امام الدین ڈھاکہ ۔

پاکستان :- اے۔ کے بروہی، وزیر حکومت پاکستان، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتا اسلام آباد، ڈاکٹر مجیب الرحمن پشاور، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، کوئٹہ۔

ترکی :- ڈاکٹر ایل السین، ڈاکٹر اکمال الدین احسان اوگلو۔

جاکرتا :- ڈاکٹر چوہان آفندی۔

جنوبی افریقہ :- ڈاکٹر جی۔ ایم کریم۔

حجاز :- ڈاکٹر حسن باجوہ

لیڈن :- پروفیسر بالی اون۔

کینیڈا :- پروفیسر خالد بن سعید، کنگسٹن۔

ہندوستان :- پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی جامعہ ملیہ، پروفیسر مشیر الحق جامعہ ملیہ، ڈاکٹر شہزاد فاروقی جامعہ ملیہ۔ پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی علی گڑھ، ڈاکٹر محمد اقبال انصاری، ڈاکٹر اے مجید علی ڈاکٹر اکمل ایوبی ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی، ڈاکٹر عبدالباری مسلم یونیورسٹی، سید صباح الدین عبدالرحمن، مولوی ضیاء الدین اصلاحی (دارالمصنفین اعظم گڈھ) پروفیسر سید وحید الدین، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، نئی دہلی۔ ڈاکٹر کرسچین ٹرول، نئی دہلی۔ مولانا شاہین جمالی دیوبند، ڈاکٹر ادریس حیدرآباد، ڈاکٹر عبدالعلی بھوپال، پروفیسر بدر الحسن عابدی، بنارس یونیورسٹی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، پال جیکسن پٹنہ۔ ڈاکٹر محمد صابر خان کلکتہ مولانا فضل الرحمن ہلال عثمانی، مالیر کوٹلہ۔ مولوی محمد اسلم اصلاحی، سری نگر، کشمیر۔

شروع میں یہ بات کھٹکی کہ جو قرآن پاک کو کلام الٰہی تسلیم نہیں کرتے ہیں، وہ اس اجتماع میں کیوں مدعو کیے گئے، مگر معلوم ہوا کہ اس کانگریس کی تاسیس آسٹریلیا کے ایک عیسائی مسٹر جون نے کی ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ اس میں ہر مذہب، ہر فرقہ اور ہر خیال کے اہل علم جمع ہو کر قرآن پاک کو اپنے اپنے زاویہ نظر سے سمجھیں اور سمجھائیں، اس لحاظ سے یہ مسلمان علماء اور فضلاء کی کانگریس نہ تھی بلکہ عام علمی اجتماعات کی طرح

[illegible] ایک اجتماع تھا، اس میں مسلمانوں میں ان کو بھی مدعو کیا گیا ہے جو بنیاد پرست، قدیم الخیال، اور جدید الفکر سمجھے جاتے ہیں، اس طرح یہ کانگریس ایسا محاذ ہے جہاں ہر قسم کی معرکہ آرائی ہوسکتی ہے ایسے محاذ پر صحیح العقیدہ علماء کا پہونچنا ضروری ہے، ان کے لیے اس کو نظر انداز کرنا کسی طرح مناسب نہیں، ایسے اجتماع میں نظر و فکر کی گہرائی سے زیادہ قوت گویائی زیادہ مفید ہوتی ہے، حاضرین و سامعین کی مزاجی اور نفسیاتی کیفیت کو سامنے رکھ کر جو بھی رطب اللسان ہو جائے، مجلس اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے، جو مسلمان اپنے کو موڈرنسٹ سمجھتے ہیں ان کی نجی گفتگو یہی تھی کہ اسلام میں پردہ، موجودہ بینک کے نظام اور موسیقی سے متعلق کیا قرآنی احکام ہیں؟ جاکرتا کے ایک مسلمان نمایندہ نے اپنے مقالہ میں یہ پڑھا کہ ہم جب پندرہویں صدی ہجری میں رہتے ہیں تو پہلی صدی ہجری میں رہنا پسند نہیں کریں گے، مسلمان دنیا کے ہر حصہ میں پھیلے ہوئے ہیں، جہاں وہ رہتے ہیں، وہاں ان کا تاریخی، معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور عمرانی پس منظر ہے، جس سے وہ علٰحدہ رہ کر زندگی بسر نہیں کرسکتے، ہر قسم کے علوم کی ترقی سے دنیا کی سرزمین سمٹ گئی ہے، اور اس میں جو ترقی ہو رہی ہے اس سے منہ موڑ کر مسلمان زندگی بسر کرنا پسند نہیں کرتے، اگر اسلام ہر زمانہ کے لیے ہے، آج کے لیے بھی ہے اور کل کیلئے بھی ہے تو بتایا جائے کہ ہمارا مذہب ہماری تغیر پذیر زندگی کا ساتھ کس طرح دے، جو موڈرنسٹ تھے انھوں نے اس مقالہ کی بڑی داد دی، حالانکہ کچھ مقالے ایسے بھی تھے جن میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ قرآن پاک میں بدلتے ہوئے حالات کے مطابق مسائل کو حل کرنے کے لیے ساری ہدایتیں ہیں، اس کانگریس کے افتتاحی اجلاس میں پاکستان کے اے۔ کے بروہی صاحب نے اپنے کلیدی خطبہ میں بہت ہی موثر انداز میں یہ بات پیش کی کہ اگر ہر کام اللہ تعالیٰ کو سامنے رکھ کر کیا جائے اور یہ ذہن نشین ہو جائے کہ یہ کائنات، یہ دنیا، یہ دن، یہ رات اللہ تعالیٰ کی ہے اور کلام اللہ میں ساری باتیں ہیں جن کی تلاش ہر زمانہ میں ہوتی ہے تو پھر آج یا کل کا دور ہو، اس میں ذہن بگڑنے نہیں پاتا، اگر اللہ پر ایمان ہو تو ہر غیر واضح چیز

واضح ہوکر نظر آتی ہے، جناب بروہی صاحب جب اپنے خطبہ میں اپنی خطابت اور ایمان پروری کی گل پاشی کرنے والے تھے تو مغرب کی نماز کے لیے یہ افتتاحی اجلاس ختم کر دیا گیا، جس سے سامعین کی پوری تشنگی بجھ نہ سکی، مگر ان کی ناتمام تقریر پورے کانگریس کی جان تھی، اور جنھوں نے اس کو سنا وہ اپنے فردوس گوش میں اب تک لطف و لذت کے ساتھ آباد ہوں گے۔

اس کانگریس میں عیسائی مندوبین کافی تعداد میں تھے، ان میں کچھ پادریوں کے فرزندانِ ارجمند بھی تھے، ایسے ملے جلے اجتماع میں یہ لوگ ذرا مصلحت کوش بن جاتے ہیں، اور ان کی زہرچکانی کھل کر سامنے نہیں آتی، ذرا دبے دبے رہتے ہیں، اسی اجتماع میں ایک صاحب نے بتایا کہ اب تو عیسائیوں کو ان کے پوپ کی طرف سے ہدایت ملی ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں اسلام پر جارحانہ حملہ نہ کیا کریں، ایک اور صاحب نے بتایا کہ سری لنکا میں مسلمانوں اور عیسائیوں میں جو ڈائیلاگ ہوا تو وہاں کے عیسائیوں نے کلام پاک کو ایک الہامی کتاب تسلیم کر لیا ہے، اس اجتماع میں ودیا جیوتی انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے فادر کرسچین ڈبلیو۔ ٹرول سے ملاقات ہوئی جو مسلمانوں کے علمی حلقوں میں اچھی طرح روشناس ہیں، بڑی میٹھی گفتگو کرتے ہیں، انھوں نے اپنی طرف سے کئی کتابیں نذر کیں، جن میں ایک گائڈ لائنز فور ڈائیلاگ بٹوین مسلم اینڈ کرسچینز بھی تھی، اس کو شوق سے پڑھا، اس کی تمہید کا خلاصہ یہ ہے:

"دنیا میں خیالات، کلچر اور مذاہب کے تنوعات ہیں، ان میں اضافہ ہوتا رہے گا، آیندہ ان کے ختم ہونے کی امید نہیں، یہ ممکن نہیں کہ ہم ان کے پیرووں اور مقلدوں کو قائل کر کے ان کو اپنا ہم خیال اور ہم مذہب بنائیں، لیکن ضرورت اب اس کی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھیں اور سمجھ کر جہاں تک ممکن ہو اتفاق کر کے ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں تاکہ دنیا رہنے کے لیے ایک بہتر جگہ بن جائے، اسی لیے اس کتاب میں اس کی تلقین ہے کہ عیسائی اسلام کو اپنے زاویۂ نگاہ سے مطالعہ نہ کریں، بلکہ مسلمان اسلام کو کیا سمجھتے ہیں اس کو سمجھنے کی کوشش کریں، پھر اس میں عیسائیوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ اسلام کو ایک مذہب

سمجھیں اور اسلام میں قرآن کی جو اہمیت ہے اس کو کسی لحاظ سے نظر انداز نہ کریں، کیونکہ فرانس کے موسیئون نے بھی کہا ہے کہ مسیح کی ذات عیسائیت کا مرکز ہے، لیکن اسلام کا مرکز ایک کتاب ہے جس کا نام قرآن ہے۔ مسلمان قرآن کو کلام الٰہی سمجھتے ہیں، ہر پرہیز گار مسلمان اس سے والہانہ عقیدت رکھتا ہے، جس مسلمان کے دل میں کچھ شکوک بھی ہوتے ہیں وہ بھی اس کا بڑا احترام کرتا ہے، مسلمان اس وقت مشتعل ہو جاتے ہیں جب مغرب کا کوئی دانشور یہ کہتا ہے کہ قرآن میں محمدؐ نے یہ کہا، مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے، محمدؐ اس کے مصنف نہیں ہیں، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن محمدؐ پر نازل ہوا، موسیئون نے بھی کہا ہے کہ یہ آسمان سے لکھوایا گیا، اسی لیے جب مسلمان کسی آیت کا حوالہ دیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا ہے، وہ اس کی امید تو نہیں کرتے کہ عیسائی بھی یہی کہہ کر آیت کا حوالہ دیں، مگر عیسائیوں کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ یہ کہیں کہ قرآن کہتا ہے۔"

اس کتاب میں اسی طرح کی اور ہدایتیں ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ عیسائیوں کا جارحانہ اور غیر روادارانہ رویہ بدل رہا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس بدلے ہوئے رویہ میں ان کا جو اصل مقصد ہے، وہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، وہ افہام و تفہیم کو بھی اپنی تبلیغ کا ذریعہ بنا سکتے ہیں، جس سے بہرحال چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

افہام و تفہیم کے ذریعہ سے اسلام کو سمجھنے والے ابھی عیسائی اسکالرز کم ہیں، ان میں ایسے اہل قلم اب بھی ہیں جو قرآن کانگریس کے جیسے ملے جلے مجمع کو اپنے خیالات کی ترویج کے لیے غنیمت سمجھتے ہیں، مثلاً اس اجتماع میں امریکہ کی مچیگن یونیورسٹی کے پروفیسر الفورڈ ویلش نے جو مقالہ پڑھا، اس میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی:

"قرآن مسلمانوں کے دل و دماغ پر ضرور چھایا ہوا ہے، لیکن مغرب میں دنیا کے اس عظیم علمی کام کو اب تک بہت ہی کم سمجھا گیا ہے، مغرب کے عام لوگ اس سے ناواقف ہیں، اس کے علاوہ اس کے ناقدانہ مطالعہ سے ابھی تک بعض بنیادی سوالات کے جوابات نہیں ملے ہیں کہ اس کی ابتدا کب ہوئی اور اس کی اصلی تاریخ

کیا ہے؟ آج سے پچیس سال پہلے پروفیسر ارتھر جیفری کا ایک اہم مضمون "قرآن کے مطالعہ کی موجودہ حیثیت" کے عنوان سے واشنگٹن کے ایک رسالہ رپورٹ اون دی کرنٹ ریسرچ ان دی مڈل ایسٹ میں شایع ہوا تھا، اس ربع صدی میں اس پر شک کیا جارہا ہے کہ کیا قرآن کا موجودہ نسخہ مستند ہے؟ اس کی تدوین کس طرح ہوئی؟ اس کے مختلف پارے کس طریقہ سے ترتیب دیے گئے، محمدؐ نے اور آپ کے بعد کس نے کس حد تک اس کو ایڈٹ کیا، اس کے اندر جو تضاد ہے اس کی کیا اہمیت ہے؟ جفری نے اس کا ایک ناقدانہ نسخہ اسی طرح مرتب کرنے کی کوشش کی جس طرح انجیل اور دوسری مقدس کتابوں کا ہوا، لیکن ان کی موت کے بعد یہ کام بالکل رک گیا، اور بہت سے دانشوروں کا خیال ہے کہ ایسا کام کرنا ناممکن ہے"

اسی کے ساتھ اس مقالہ میں یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ کچھ دانشور ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کی تدوین صدیوں ہوتی رہی اور یہ بات ابھی تک واضح نہیں ہوسکی ہے کہ محمدؐ ہی نے اس کی تاریخی ترتیب دی، ضرورت اس بات کی ہے کہ بین الاقوامی تعاون سے ان سوالات کے جوابات دیے جائیں، جواب تک نہیں دیے جاسکے ہیں۔

مقالہ نگار نے کوئی نئی بات نہیں کی، ایسا لٹریچر بھرا پڑا ہے جس میں قرآن کی صحت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کی ترتیب اور تدوین سے متعلق پوری وضاحت کر دی گئی ہے، بات یہ ہے کہ موجودہ انجیل کے مستند ہونے اور نہ ہونے پر برابر بحثیں جاری ہیں جس سے عیسائیوں کا عام ذہن کافی شکوک اور شبہ ہوچکا ہے، اب سے پہلے عیسائی مبلغوں نے انجیل کی مدافعت میں قرآن پاک کے متعلق اس قسم کی بحثیں اٹھائی تھیں، اب یہ بحث علمی اور تحقیقی محاذ پر قصداً منتقل کر دی گئی ہے، لیکن اسی مجمع میں اس کا جواب کیمبرج یونیورسٹی کے ایک سابق پروفیسر آر۔ بی۔ سرجنٹ کے مقالہ کے بعض جملوں سے مل جاتا ہے کہ

مغرب کے اسکالرز جو مسلمان نہیں ہیں، فطری طور پر ایک مختلف زاویے سے قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں، اب ان کے مطالعہ میں معروضیت آرہی ہے، اس لیے اسلام سے متعلق ان کا مطالعہ اکثر ہمدردانہ ہوتا جارہا ہے، لیکن استثنائی مثالیں ایسی بھی ہیں جو تعصب کی نظر سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں، لیکن ان میں غیر فاضلانہ رنگ ہوتا ہے۔"

اور یہی بات قرآن کے تمام معترضوں اور ناقدوں کے لیے کہی جاسکتی ہے۔ پروفیسر ویلش نے جب مقالہ ختم کیا تو اس خاکسار نے اٹھ کر سوال کیا کہ ان کو قرآن پاک کے ایک کریٹیکل ٹکسٹ کی تلاش کیوں ہے؟ کیا یہ تلاش اس کے کلام الٰہی ہونے کی وجہ سے ہے، یا وہ محض اس کو ایک علمی شاہکار سمجھتے ہیں؟ ان کا ماہرانہ جواب یہ تھا کہ قرآن پاک کلام الٰہی یا علمی شاہکار سمجھا جائے، دونوں میں کوئی تضاد نہیں، ایسے اجتماع میں ایسے ہی جوابات سے لوگوں کو مطمئن کرلیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کا یہ مذہبی عقیدہ ہے کہ قرآن مجید کا ایک جملہ بھی ایسا باقی نہیں رہا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قلمبند نہ کرلیا گیا ہو، حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کے اہتمام سے قرآن مجید کا جو نسخہ مرتب کیا وہ تحریری نوشتوں سے مرتب ہوا تھا، جس کی تصدیق ان لوگوں سے بھی کرائی گئی جو قرآن مجید کے کلاً یا جزءاً حافظ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تمام سورتیں مرتب ہو چکی تھیں، اور ان کے الگ الگ نام قائم ہو چکے تھے، جو نسخے ایسے تھے جن میں کاتبوں کی غلطی سے کچھ تغیر ہوگیا تھا، حضرت عثمانؓ نے ان سب کو جلوا دیا، اور جو قرآن مجید اس وقت مسلمان پڑھتے ہیں ان ہی پر ان کا ایمان کامل ہے، اگر ہمارے عیسائی فضلاء اس کو تسلیم نہیں کرتے ہیں تو پھر انھوں نے اگر بین الاقوامی تعاون سے اپنے نقد و نظر سے کوئی نسخہ مرتب کیا تو وہ مسلمانوں کے لیے ہرگز قابل قبول نہ ہوگا، عیسائی اپنے فکر اور تدبر سے انجیل کے چاہے جتنے بھی نئے نئے نسخے مرتب کرنا چاہیں کرتے رہیں، مگر انھوں نے کلام پاک کا کوئی نیا نسخہ مسلمانوں یا غیر مسلمانوں کے لیے تیار کیا تو یہ مسلمانوں کے جذبات کو صرف

مشتعل کرنا ہوگا۔

اسی اجتماع میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے پروفیسر بدر الحسن عابدی نے ایک مقالہ پڑھا جس میں یہ واضح کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں حضرت علیؓ کے ذریعہ سے پورا قرآن مرتب کرا دیا تھا، اور آج کل جو قرآن ہم پڑھتے ہیں وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مرتب ہوا تھا، اس میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی، حضرت عثمانؓ پر یہ الزام بے بنیاد ہے کہ انھوں نے اس میں تحریف کی، ان کے عہد میں ان پر بہت سے الزامات عائد کیے گئے، لیکن یہ الزام نہیں لگایا گیا کہ انھوں نے قرآن مجید میں تحریف کی، حضرت علیؓ کو بھی ان سے اختلاف رہا، لیکن اس اختلاف میں انھوں نے حضرت عثمانؓ پر قرآن مجید کی تحریف کا الزام نہیں رکھا، پروفیسر عابدی نے پر زور طریقہ پر ثابت کیا کہ قرآن میں نہ اب تک کوئی تحریف ہوئی ہے اور نہ آیندہ ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں"۔ (سورۃ الحجر، رکوع ۱) پروفیسر عابدی نے بڑی محنت سے یہ مقالہ لکھا تھا، خاکسار نے اس پر ان کو داد اور مبارکباد دی، انھوں نے تمام شیعوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر کے ان سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور کر دیں۔

اس اجتماع میں خاکسار کے مرکز توجہ منٹگمری واٹ تھے جو ایڈنبرا یونیورسٹی میں استاد ہیں، انھوں نے محمد ایٹ مکہ، محمد ایٹ مدینہ، محمد دی اسٹیٹسمین وغیرہ لکھ کر بڑی شہرت حاصل کر لی ہے، راقم آج کل ان ہی کی کتابوں پر ایک طویل تبصرہ لکھ رہا ہے جو ممکن ہے کہ ایک پوری جلد میں ختم ہو، ان کی کتابوں کا ہر عنوان کے پُر فریب استدلالات اور معلولات سے پُر ہے، انھوں نے اپنی ان کتابوں میں دعویٰ کیا ہے کہ محمدؐ کی سوانحِ عمری اب تک مورخانہ انداز میں نہیں لکھی گئی، اس لیے وہ آپؐ کے حالات کا تجزیہ مورخانہ انداز میں کریں گے، جب یہ خاکسار تغلق آباد پہونچا تو مہمان خانہ کے ایک کمرہ میں پاکستان کے لائق اور قابل وزیر جناب اے۔ کے بروہی صاحب کیمبرج یونیورسٹی کے سابق استاد مسٹر آرنلڈ سرجنٹ سے باتیں کر رہے تھے، جناب بروہی صاحب نے

میرا تعارف ان سے کرایا، اس کے بعد بڑی دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی، منٹگمری واٹ کا
ذکر آگیا، خاکسار نے عرض کیا کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ انھوں نے محمدؐ کی زندگی کا مطالعہ ایک
مورخ کی حیثیت سے کیا ہے، مسٹر سرجنٹ نے کہا کہ ہمارے حلقہ میں وہ مورخ کی حیثیت سے تسلیم نہیں
کیے جاتے، اسی لیے کیمبرج ہسٹری کی تدوین کے سلسلہ میں ان سے کوئی مضمون طلب نہیں کیا گیا، وہ مورخ
ہو بھی نہیں سکتے، اس لیے کہ ان کی کتابوں کے مطالعہ کے وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کے یہاں
یقینیات کے بجائے قیاسات، احتمالات، ظنیات، تاویلات اور بے جا معلولات کو زیادہ دخل ہے
ان کی تحریروں میں غالباً' 'اندازہ کیا جاسکتا ہے' 'رہا ہوگا'' ہوا ہوگا'' شاید' 'خیال ہے' 'احتمال ہے'
وغیرہ جیسے الفاظ اور فقروں کو جمع کر دیا جائے تو معلوم نہیں ان کے جمع کرنے میں کتنے اوراق کی ضرورت
ہو، وہ اپنی تحریروں میں ثانوی درجہ کے ماخذوں سے زیادہ مدد لیتے ہیں، اور ان ہی ماخذوں پر بھروسہ
کرتے ہیں جو ان کے مطلب کے ہوتے ہیں، قرآن کی آیتوں کے بھی حوالے دیتے ہیں، مگر انگریزی ترجمے
کا سہارا لیتے ہیں، اور ایسے ہی ترجمے نقل کرتے ہیں جو مسخ اور غلط ہونے کی وجہ سے ان کی خاص
مطلب برآری میں مفید ہوتے ہیں، پھر قرآن کو اپنا ماخذ بنانے میں یہ کہہ کر ہلکا کر دیتے ہیں کہ اس میں
تو عقائد وغیرہ کی تفصیل ہے، اس زمانہ کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالات نہیں ہیں، خوب!
اس کا مطالعہ گویا ڈاکٹریٹ کے ایک مقالہ کی حیثیت سے کرنے کی ضرورت تھی، انھوں نے اپنے
پُرفریب طریقہ سے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کلام پاک کلام الٰہی نہیں، نہ یہ الہامی ہے، نہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی رہی، کلام پاک کے ان انگریزی ترجموں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن میں
وحی کا ترجمہ Revelation کیا گیا ہے، اس لیے وحی کے سلسلہ میں، Dream

Divine eruption , True vision , Vision ,

Intellectual locution Exterior locution

Intuition of creative imagination اور
وغیرہ کی اصطلاحات کی گنجلک بحث کر کے اپنے ناظرین کے ذہن کو بھی گنجلک بنانے کی کوشش کی ہے،
مورخانہ اور دیانت دارانہ تجزیہ تو یہ تھا کہ وہ صاف صاف لکھتے کہ محمدؐ کے پیرووں کا خیال ہے کہ
قرآن مجید کلام الٰہی ہے، جو وحی کے ذریعہ سے محمدؐ پر نازل ہوا، مگر اس کو یہودی اور عیسائی تسلیم نہیں کرتے
بات یہاں پر ختم ہو جاتی، پھر ان کو اسلام کا مورخانہ، ناقدانہ اور دانشمندانہ مطالعہ کر کے اپنی تحریروں کا
پشتارہ لگانے کی ضرورت نہ ہوتی۔

میں ان سے تعارف ہوا تو عرض کیا کہ ان کی کتابیں میرے مطالعہ میں ہیں اور ان پر میں بہت ہی
مخالفانہ تنقیدیں لکھ رہا ہوں، ان کا بڑا ٹھنڈا جواب یہ تھا کہ وہ ان تنقیدوں کو پڑھ کر خوش ہوں گے،
اس اجتماع میں وہ زیادہ تر خاموش رہے، یہاں وہ اپنی تصانیف کو شاید پیچھے چھوڑ کر آئے تھے،
ان کے مقالہ کا عنوان "قرآن میں مسلم اور عیسائی کے تعلقات" تھا، اس میں انھوں نے یہ بتایا کہ قرآن
میں ان تعلقات کے پانچ پہلو ہیں: (۱) عیسائی مسلمانوں کے دوست سمجھے گئے، یہ زیادہ تر مکی اور
مدینہ کے ابتدائی دور کی سورتوں میں ہے، (۲) حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا ذکر ہے (۳) یہودیوں نے
حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کو جس طرح رد کیا ہے اس کا بیان ہے (۴) تثلیث پر تنقیدیں ہیں (۵) محمدؐ کی
آخری زندگی میں مسلمانوں کو یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ عیسائیوں کو اپنا دوست نہ بنائیں بلکہ ان سے
جنگ کریں، یہ ہدایت موتہ کی جنگ کے بعد ہوئی جس میں زید بن حارثہؓ شہید ہوئے۔

اس اجتماع میں امریکہ کے ٹی۔ بی ارونگ اپنی اہلیہ کے ساتھ نمایاں ہو کر ہر شخص سے بے تکلفی سے
ملتے رہے، انھوں نے اسلام قبول کر کے کلام پاک کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے، اپنے مقالہ میں اس پر
زور دیا کہ قرآن پاک کے جو ترجمے مسلمانوں نے انگریزی میں کیے ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک
پہونچایا جائے، تاکہ غیر مسلموں نے اپنے تعصب میں اس کے ترجمے میں جو زہر چکانی کی ہے اس کا اثر

دورہ ہو، خاکسار نے ان سے ایک ملاقات میں یہ عرض کیا کہ وہ ایسے اجتماع میں عیسائی مقالہ نگاروں کے ذہن کو اچھی طرح سمجھ کر ان ہی کے انداز میں ان سے بحث کر کے ان کو خاموش کرسکتے ہیں، انھوں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں، امریکہ میں عیسائیوں کا ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اسلام اب ختم ہو چکا ہے، مگر وہاں ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا ہے جس کا یہ خیال ہے کہ جو قرآن کو کلام الٰہی نہیں سمجھتا ہے، وہ کافر ہے، اب ان دونوں گروہوں میں جو اختلاف ہے، اس سے خود بخود ایک ایسی نئی صورت پیدا ہو گی جس سے اسلام کو فائدہ پہونچے گا۔

اس اجتماع میں کافی مقالات پڑھے گئے، ان کی تعداد غالباً ترسٹھ تھی، زیادہ تر اچھے مقالات تھے، کینیڈا کی کوئن یونیورسٹی کے پروفیسر خالد بن سعید نے بہت ہی اچھے انداز میں اپنا مقالہ "قرآن میں سماجی انصاف کے تخیل" کے عنوان سے پڑھا، اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ قرآن میں توحید کے بعد سماجی انصاف ہی کی اہمیت ہے، ایران اور سعودی عرب میں سماجی انصاف کے سلسلہ میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی بھی تفصیل بتائی، گجرات یونیورسٹی کے پروفیسر جے. آئی. لائی والا نے اپنا مقالہ پڑھنے کے بجائے خطیبانہ انداز میں یہ بتایا کہ شرکت اور مضاربت کے اصول پر سود سے پاک بینک کا نظام قائم کیا جا سکتا ہے، ان کی رائے تھی کہ بینک میں روپیہ جمع کرنے والا بینک کا پارٹنر ہو جاتا ہے اور بینک کے منافع میں اس کا حق ہوتا ہے، بینک اگر کسی کو قرض دیتا ہے تو قرض لینے والا بینک کا پارٹنر نہیں ہوتا ہے بلکہ بینک اس کا پارٹنر ہو جاتا ہے، لیکن اس کی تجارت کا پارٹنر نہیں ہوتا اس لیے بینک اس کی تجارت کے منافع میں تو شریک ہو سکتا ہے لیکن اس کے خسارہ میں شریک نہیں ہو سکتا، وقت کی کمی کی وجہ سے وہ اپنے خیالات کو زیادہ پھیلا کر نہیں پیش کر سکے، مگر ان سے بینک کے منافع، یوژیری، انٹرسٹ، اور سود سے متعلق قرآنی احکام کے متعلق کافی سوالات کیے گئے۔

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر سید وحید الدین نے اپنے پُر مغز مقالہ میں

فلسفیانہ انداز میں یہ پیش کیا کہ قرآن بدلتے ہوئے حالات اور بدلتی ہوئی دنیا میں پورا ساتھ دے سکتا ہے، بشرطیکہ انسان اس کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کرے، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا مقالہ "قرآن میں امن پسندی اور اس کے مسائل کا حل" کے عنوان سے تھا، وہ اردو میں اپنے خیالات کے موتی بکھیرتے رہتے ہیں، انگریزی میں بھی یہ مقالہ لکھ کر اس زبان پر اپنی مہارت کا ثبوت دیا، ودیا جیوتی انسٹیٹیوٹ کے ڈاکٹر کرسچین ٹرول نے اپنا مقالہ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری کی تفسیر ثنائی پر جب پڑھا تو سامعین کو حیرت تھی کہ یہ کوئی عیسائی یا کوئی مسلمان مقالہ نگار پڑھ رہا ہے، پٹنہ کے پول جیکسن نے اپنے مقالہ میں یہ ثابت کیا کہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کا تصوف خالص قرآنی تعلیمات پر مبنی تھا، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے اسلامی قوانین کے شعبہ کے صدر ڈاکٹر طاہر محمود نے مقالہ پڑھنے کے بجائے ایک دل نشین تقریر کی اور اپنی خطابت کی پوری شان دکھاتے ہوئے بتایا کہ کلام پاک کے بظاہر تضاد میں اخلاقی، معاشرتی اور فقہی قوانین کا ایک خزانہ پوشیدہ ہے، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے صدر، ڈاکٹر محمد اقبال انصاری نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے تفسیری رموز و نکات کی وضاحت کی، مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر امجد علی کے مقالہ کا عنوان "توحید کے اثرات مسلمانوں کی معاشرتی زندگی پر" تھا، کشمیر یونیورسٹی کے مولوی محمد اسلم اصلاحی نے مولانا حمید الدین فراہی کی تصانیف پر بڑا اچھا تبصرہ کیا، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے ڈاکٹر محمد اکمل ایوبی نے ترکی زبان میں جو تفسیریں لکھی گئی ہیں، ان پر روشنی ڈالی، اسی شعبہ کے ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی نے توحید اور معاد پر اپنا مقالہ پڑھا، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے ڈاکٹر عبدالباری کا مقالہ "بیسویں صدی میں قرآن کی اخلاقی تعلیمات کی اہمیت" کے عنوان سے تھا، دیوبند کے مولانا شاہین جمالی کا مقالہ بھی توحید پر تھا، جامعہ ملیہ کے شعبۂ اسلامیات کے صدر ڈاکٹر مشیر الحق اپنی مقالہ خوانی سے سامعین کو اپنی طرف پورے طور سے متوجہ کر لیتے ہیں، اس اجتماع میں ان کے مقالہ کا یہ موضوع تھا کہ الٰہیات کو کس طرح سمجھا جا سکتا ہے، قرآن پاک میں بعض الفاظ اور مطالب

ایسے ہیں جن کے ترجمے دوسری زبانوں میں صحیح طور پر نہیں ہو سکتے۔ اس لیے اس کے معانی اور مطالب بھی صحیح طور پر ادا نہیں ہوتے۔ جناب ضیاء الحسن فاروقی تو سیمینار کے مرد میدان ہیں ان کے مقالہ کا موضوع "اسمائے حسنیٰ" تھا، ان کے صاحبزادے ڈاکٹر آزاد فاروقی کا مقالہ "قرآن میں آفاقیت اور تخصیصیت ...." کے عنوان سے تھا، کلکتہ کے ڈاکٹر محمد رمضان ہر مقالہ نگار سے کچھ نہ کچھ سوالات کرنے میں پیش پیش رہے، ان کے مقالہ کا موضوع "معاشرت میں انسان کی حیثیت کا قرآنی تخیل تھا" بھوپال کے حمیدیہ کالج کے ڈاکٹر عبدالعلی کا مقالہ "پُرامن بقائے باہمی سے متعلق قرآنی احکام" کے عنوان سے تھا۔

ترکی سے دو نمایندے تھے، ایک تو بوڑھی خاتون ڈاکٹر ایل امین تھیں، جنھوں نے "قرآن اور اسلامک آرٹ" پر اپنا مقالہ پڑھا، دوسرے اکمال الدین احسان اوگلو تھے، جنھوں نے مختلف زبانوں میں قرآن کے ترجمے کی ابتدائی کوششوں پر اپنے مقالہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا، کچھ سامعین نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ ترکی کے ترجمہ میں عربی متن بھی ضرور دیا جائے۔

پاکستان کے نمایندوں میں ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ ڈائرکٹر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد اپنی باوقار سفید داڑھی اور جاذب نظر شخصیت کی وجہ سے نمایاں رہے، وہ شاہ ولی اللہؒ کے بڑے شیدائی اور فدائی ہیں، کسی مقالہ میں شاہ ولی اللہؒ کا ذرا بھی نام آیا ان کا ذہن بیدار ہوجاتا، ان کے مقالہ کا موضوع "موجودہ حالات کے مطابق سندھی علماء کی قرآنی تفسیریں" تھا، پشاور سے ڈاکٹر محبیب الرحمن آئے، جن کو دیکھ کر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم (سابق صدر جمہوریہ ہند) کی جوانی یاد آجاتی، یہ خاکسار جب ان سے ملتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ ذاکر صاحب مرحوم اپنی جوانی میں آپ ہی کے ہم شکل تھے، ان کے قد رعنا، گورے رنگ اور خوبصورت سیاہ داڑھی کی وجہ سے ہر شخص کی نظر ان کی طرف اٹھتی، ان کا مقالہ "قرآن میں توحید اور اخوت" پر تھا۔

کویت کے ڈاکٹر انعام الحق کوثر کے مقالہ کا عنوان تو قرآن اینڈ سسٹم آف ریلوز تھا، لیکن ان کے مقالہ کی یہ بات بڑی معنی خیز تھی کہ موجودہ دور میں ان لوگوں کے لیے جن کو موجودہ علوم پر پورا عبور حاصل ہے قرآن پاک میں وہ ساری باتیں مل جائیں گی جن کی تلاش آج کل ہے، اور ان مشکلات کا حل بھی مل جائے گا جن سے وہ موجودہ زمانہ میں دوچار ہیں، پروفیسر منظور احمد آج کل لیبیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، مگر پاکستانی ہیں، انگریزی بہت اچھی اور دل کش لہجے میں بولتے ہیں، اچھے مقرر بھی ہیں، جو بات کہتے ہیں اس کو اپنے خاص خطیبانہ انداز سے موثر بنا دیتے ہیں، ان کا مقالہ مذہبی زبان کی نوعیت پر تھا، جس کے تحت سرسید احمد خان کی تفسیر پر روشنی ڈالی۔

بنگلہ دیش سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر مستفیض الرحمن اور راج شاہی یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد مجیب الرحمن آئے تھے، اول الذکر کے مقالہ کا عنوان "قرآن اور پندرہویں صدی ہجری کا چیلنج" تھا، موخر الذکر نے قرآن کے بنگالی ترجمہ پر روشنی ڈالی، ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر امام الدین بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، بین الاقوامی سیناروں میں ضرور بلائے جاتے ہیں، انھوں نے اپنا مقالہ "قرآن میں ماضی اور حال کی جھلکیں" کے عنوان سے پڑھا۔

خاکسار نے اپنے مقالہ میں یہ پیش کیا تھا کہ علامہ محمد اقبالؒ نے قرآن پاک کو کس طرح سمجھا اور لوگوں کو کس طرح سمجھانے کی کوشش کی، خاکسار کو علامہ محمد اقبالؒ سے عشق ہے، اس لیے جب وہ ان کے کسی خیال کو پیش کرتا ہے تو جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے، اس مجمع میں جب اقبال کا یہ شعر پڑھا کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن   نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

تو مجھے خود ایسا محسوس ہوا کہ میں اس مجمع کے لیے ملہم غیب کی آواز دہرا رہا ہوں۔

اور جب یہ پڑھا کہ اقبال نے وارڈ، برگساں، میک ٹگارٹ، ولیم جیمس سب ہی کا مطالعہ کیا لیکن ان کو ان فلسفیوں کے یہاں کچھ بھی نہیں ملا، انھوں نے سورۂ اخلاص کا مطالعہ چشم بینا اور

قلبِ مصفا سے کیا تو اس میں ان کو زندگی کی ساری تابانی مل گئی، انھوں نے اس میں خودی کا بیش بہا خزانہ بھی پایا، جہاں سے خودی کی دولت انسانوں میں تقسیم کی گئی، اور جب اس مقالہ میں یہ دکھایا کہ اقبال نے قرآن پاک کی آیتوں سے یہ ثابت کیا ہے سینۂ کائنات میں انسان خود خدا کا ہمراز ہے، اور خود خدا نے کائنات کو برقرار رکھنے میں انسان کو اپنا شریک کار بنالیا ہے، تو ایسا معلوم ہوا کہ اس مقالہ میں کوئی نئی بات کہی جارہی ہے، سورۂ اخلاص میں جو توحید کا درس ہے اس میں اقبال کے خیال میں انسانیت کی یکجہتی کا بھی پیام ہے، جس کے ذریعہ سے ایک لازوال انسانی تمدن بروئے کار آسکتا ہے، اقبال کے خیال میں قرآن میں اطاعت خداوندی کی تعلیم اس لیے دی گئی کہ انسان خود اپنی فطرت کی اطاعت کرے، اقبال کو زمان و مکان کا نظریہ بھی قرآن پاک ہی میں ملا، اقبال نے یہ بھی بتایا کہ سائنس دانوں کو اپنے جن نظری اور فکری ارتقاء پہ ناز ہے، قرآن پاک میں بہت پہلے ان کے منہاج طے کر دیے گئے ہیں، اسی قسم کی اور باتیں تھیں، جب یہ مقالہ ختم ہوا تو جناب حکیم سعید نے فرمایا کہ اس کا ترجمہ کرکے میرے پاس جلد از جلد بھجوائیں، اس سے ایک خاص کام لوں گا، پاکستان کے نمایندوں نے کہا کہ اقبال کا جو پیام پاکستان کی طرف سے آنا چاہیے تھا، وہ ایک ہندوستانی نے اس مجمع کو پہونچا دیا، کینیڈا کے پروفیسر خالد بن سعید نے مل کر کہا، مقالہ بڑا زوردار تھا، خاکسار نے عرض کیا، مقالہ زوردار نہیں تھا، اقبال کے خیالات زوردار تھے، وہی داد کے مستحق ہیں، پشاور کے ڈاکٹر مجیب الرحمٰن نے کہا کہ جس جذبہ سے یہ مقالہ لکھا اور پڑھا گیا وہ بہرحال قابل داد ہے۔

میرے رفیق کار مولوی ضیاء الدین اصلاحی نے "قرآن میں توحید کی دلیلیں" پر اپنا مقالہ اچھے انداز میں پڑھا جو پسند کیا گیا، بیرونی مہمانوں کیلئے اس کا خلاصہ جناب طاہر حسین صاحب آئی۔اے۔ایس نے انگریزی میں سنایا جب انسٹی ٹیوٹ سے جناب ادھم علی کی گاڑی پر رخصت ہوا تو دل سے یہ دعا نکل رہی تھی کہ اللہ اس انسٹی ٹیوٹ کو صحیح معنوں میں بیت الحکمت بنادے۔

ادبیات

نعت شریف

از

جناب وارث ریاضی صاحب چمپارن

اے نوبہارِ گلشنِ یزداں تجھے سلام
اے روحِ عصر و ہادیِ دوراں تجھے سلام

اے فخرِ کائنات و شہنشاہِ انس و جاں
اے صدرِ بزمِ عالمِ امکاں تجھے سلام

اے رمز آشنائے ہدایت، امامِ کل
اے منبعِ تجلیٔ عرفاں تجھے سلام

اے کاشفِ رموزِ جہاں، نازشِ وجود
اے رازدارِ محفلِ یزداں تجھے سلام

تجھ سے گلوں کا رنگ، چمن کا ہے تجھ سے حسن
اے آبروئے جشنِ بہاراں تجھے سلام

تیرے کرم سے دولتِ ایماں ہمیں ملی
اے قاسمِ خزینۂ ایماں تجھے سلام

اے صادق و بشیر، رؤف و رحیم بھی
اے غمگسار و محسنِ انساں تجھے سلام

اے بانیٔ ایثار و وفا، مرجعِ خلوص
جود و سخا کے مہرِ درخشاں تجھے سلام

قدموں پہ تیرے کفر کا پرچم ہے سرنگوں
اے ماحیِ ضلالت و عصیاں تجھے سلام

تیرے ہی ذکرِ خیر سے دل کو ملا سکوں
رنج و غمِ حیات کے درماں تجھے سلام

وارث کو تیرے موجِ حوادث کی فکر کیا
اے ناخدائے کشتیِ انساں تجھے سلام۔

نعت شریف

از

جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

تمنا ہے کہ مل جائے سہارا مصطفائی کا
وسیلہ چاہتا ہوں باغ جنت تک رسائی کا

اسیر کوچۂ سرور اگر اک بار ہو جاؤں
نہ لوں پھر زندگی بھر نام طیبہ سے رہائی کا

خموش اے دل حریم قدس میں لغزش نہ ہو جائے
ادب کی جا ہے یہ موقع نہیں ہے لب کشائی کا

حیات اس کی مات اس کی یہ ساری کائنات اس کی
شرف ہو جائے حاصل جس کو طیبہ تک رسائی کا

میں ہندو ہوں مگر ایمان رکھتا ہوں محمدؐ پر
کوئی انداز تو دیکھے مری کافر ادائی کا

ڈبوئے گی بھلا کیا موج طوفاں اس سفینے کو
سہارا مل گیا جس کو نبیؐ کی ناخدائی کا

ادھر آئیں کہاں ہیں حسن طیبہ دیکھنے والے
مری آنکھوں سے دیکھیں جلوہ شان مصطفائی کا

شہنشاہان عالم سے ہے اس کا مرتبہ اونچا
شرف حاصل ہے جس کو آپ کے در کی گدائی کا

زہے قسمت ملی ہے خاک پائے مصطفیٰ مجھ کو
یہی حاصل ہے جوہر زندگی بھر کی کمائی کا

مطبوعات جدیدہ

حسنات الحرمین ۔ مرتبہ و مترجمہ، جناب محمد اقبال مجددی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۰ مجلد قیمت ۳۲ روپیے، پتہ (۱) راجہ برادرز بک سلر رحیم بازار، ڈیرہ اسماعیل خان پاکستان، (۲) میاں احمد، معرفت قاری شاہنواز، مسجد سیداں والی، پاکستانی چوک اچھرہ، لاہور،

حضرت خواجہ محمد معصومؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے فرزند و جانشین اور خود بھی جامع شریعت و طریقت بزرگ تھے، دعوت و ارشاد کی خدمت میں مشغول رہنے کی بنا پر انھیں تصنیف و تالیف کا موقع نہیں ملا تاہم ان کے مکتوبات کی تین جلدیں اور بعض رسائل طالبین سلوک کے لیے سرمۂ بصیرت ہیں، زیر نظر رسالہ حضرت خواجہ کے سفر حج کی یادگار اور ان مکاشفات اور احوال، فرمودات اور ملفوظات کا مجموعہ ہے، جو حضرت کے آغاز سفر، قیام حجاز اور ہندوستان کی واپسی کے دوران میں انھوں نے بیان کئے تھے، حضرت خواجہ کے ہمراہ اس مبارک سفر میں ان کے صاحبزادگان، اعزہ، متوسلین اور خلفاء و مریدین کی بڑی تعداد تھی، زیر نظر رسالہ کے جامع و مرتب آپ کے فرزند حضرت محمد عبید اللہؒ ہیں، انھوں نے سفر کے دوران میں حضرت خواجہ کے فرمودات و مکاشفات کو عربی میں قلمبند کیا اور وطن پہنچنے کے بعد ان کی خدمت میں پیش کیا، اور شیخ محمد شاکر بن ملا بدر الدین سرہندی سے اس کا فارسی ترجمہ بھی کرایا، مترجم نے رسالہ کے جامع و مرتب کے علاوہ دوسرے صاحبزادوں کے

بیان بھی کہیں کہیں نقل کیے ہیں، یہ رسالہ تین فصلوں پر مشتمل ہے پہلی فصل میں وہ مکاشفات والہامات درج ہیں جو حرمین شریفین سے متعلق ہیں، مگر حضرت خواجہ کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ظہور میں آئے، دوسری فصل میں حرم مکہ کے انوار وتجلیات کا ذکر ہے، اور تیسری میں وہ مشاہدات ومکاشفات تحریر کیے گئے ہیں جو مدینہ منورہ اور وہاں سے مکہ معظمہ کو واپسی کے درمیان میں پیش آئے، اس طرح یہ پورا مجموعہ سفر حج کے انوار وبرکات اور مکاشفات والہامات کا گنجینہ ہے، ہر فصل مختلف یواقیت پر مشتمل ہے، اس لیے اس کا نام یواقیت الحرمین بھی ہے، جو اسم بامسمیٰ ہے، اس کے مطالعہ میں اہل دل کو خاص طور پر لذت وحلاوت ملے گی، حضرت معصومؒ کے مکاشفات کے اس مجموعہ کے عربی متن کا کوئی نسخہ دریافت نہیں ہو سکا مگر اس کے فارسی کے چند نسخے مختلف کتبخانوں میں موجود ہیں، جناب محمد اقبال مجددی نے دو نسخوں کی مدد سے اب فارسی متن محواشی اور اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے شروع میں ان کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے، اس میں خواجہ کے حالات وکمالات کے علاوہ انکے بعض خلفاء اور رسالہ کے جامع ومرتب کے حالات بھی تحریر کیے ہیں، اور حسنات الحرمین کے قلمی نسخوں کا عکس بھی دیا ہے،

فارسی مترجم کے حالات معلوم نہ ہونے کی بنا پر نہیں دیے جا سکے تاہم ان کے خانوادہ کے بعض اہل کمال کا مختصر تذکرہ دیا ہے، مقدمہ میں دو چیزیں قابل ذکر ہیں، (۱) اس مشہور روایت کی تردید جس میں حضرت خواجہ محمد معصومؒ اور حضرت شیخ آدم بنوریؒ خلیفہ حضرت مجددؒ کے تعلقات کی کشیدگی کا ذکر ہے (۲) حضرت خواجہ محمد معصومؒ اور حضرت مجددؒ کے عہد کا مذہبی ماحول، اس سلسلہ میں پہلے وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر گفتگو کی ہے، اور دکھایا ہے کہ وحدت الوجود میں ہند وفلسفہ کی آمیزش سے صوفیہ خام کا طبقہ متاثر ہوا اور وحدت ادیان کی بنیاد پڑی ان حالات میں امام ربانیؒ نے اس نظریہ کو آمیزش سے پاک کرنے کی سعی بلیغ فرمائی اور وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا،

اس سلسلہ میں پہلے داراشکوہ اور اس کے ہمنوا صوفیہ کا ذکر کیا ہے، داراشکوہ کے عقائد و خیالات کی تفصیل اس لئے پیش کی گئی ہے کہ اس نے وحدت الوجود اور فلسفہ ویدانت کو ملانے کی کوشش کی تھی اس کے بعد اورنگ زیب کا بھی مفصل تذکرہ ہے جس میں علماء و مشائخ خصوصاً نقشبندی صوفیہ سے اس کے تعلقات، حضرت مجدد اور حضرت خواجہ محمد معصوم سے عقیدت مندی اور دونوں کی اولاد سے تعلقات کا ذکر ہے، مقدمہ نگار نے دکھایا ہے کہ داراشکوہ کو صوفیہ خام کی اور اورنگ زیب کو حضرت مجدد کی سرپرستی حاصل تھی، ان بحثوں کے بعض مندرجات سے ممکن ہے بعض لوگوں کو پورا اتفاق نہ ہو مگر یہ قابل غور اور لائق مطالعہ ہیں،

دین و ادب :۔ مرتبہ مولانا محمد رابع ندوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۴، قیمت چھ روپیہ، پتہ مجلس ادبیات اسلامی پوسٹ باکس نمبر ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی دعوت پر اپریل ۱۹۸۱ء میں ادبیات اسلامی کے موضوع پر ایک سہ روزہ بین الاقوامی سمینار ہوا تھا جو بہت کامیاب رہا، اس میں متعدد عرب ملکوں کے ممتاز فضلاء و علماء کے علاوہ ہندوستان کے مختلف اداروں، یونیورسٹیوں اور عربی درسگاہوں کے ارباب علم و کمال بھی بڑی تعداد میں شریک تھے، اور وقت کی تنگی کی وجہ سے بیک وقت اردو اور عربی کے جلسے علٰحدہ علٰحدہ ہوتے رہے، یہ کتاب اس مذاکرہ کی روداد ہے، اس میں پہلے اجلاس کا دعوت نامہ دیا گیا ہے جس میں سمینار کے انعقاد کی غرض، مقصد، ضرورت اور موضوع کا ذکر ہے، اور آخر میں اردو، فارسی، انگریزی اور عربی میں پڑھے جانے والے مضامین کی فہرست اور اجلاس کی تجویزیں درج ہیں، انکے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خطبہ صدارت اور اختتامی تقریر بھی دی گئی ہے، اول الذکر میں خاص طور پر عربی زبان و ادب میں ہندوستان کی خدمات اور اہم مصنفین کے کارناموں کا تذکرہ ہے، اور موخر الذکر میں ملک کی سیاسی بیداری اور آزادی کی تحریک میں علمی اور دینی طبقہ کے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے اور زبان و ادب کی خدمت و ترقی میں پیش پیش رہنے کا ذکر ہے، انھوں نے ادب پر کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری اور مذہبی ادب کو اسکی رعنائی و تازگی اور لطافت و حلاوت کے باوجود نظر انداز کرنے کے رجحان

کی پوری قوت سے مخالفت کی ہے ان کے نزدیک یہ نہ تو حسن مذاق تھا اور نہ حق پسندی کہ گلاب کا پھول کسی میخانہ کے صحن میں اس کے زیر سایہ کھلے تو وہ گلاب ہے، اور اس سے لطف اٹھایا جائے اور اگر کسی مسجد کے چمن میں کھل جائے تو پھر اس میں کوئی حسن نہیں، مولانا نے دونوں خطبوں میں ادب کی تعریف اور اس کا مقصد بھی بلند آہنگی اور جوش بیان کے ساتھ بتایا ہے، اس روداد میں دو عرب فضلا کے مضامین کا اردو ترجمہ بھی درج ہے، ان میں اسلام کے ادبی و تنقیدی نظریے، اسلامی ادب کی خصوصیات اور اس کے اہم اجزا و عناصر کا ذکر ہے، شروع میں لائق مرتب نے اجلاس کے سلسلہ کی ضروری اور قابل ذکر باتیں تحریر کی ہیں، اور اہم شرکاء کا ذکر بھی کیا ہے، اس روداد کی اشاعت اس حیثیت سے بھی مفید ہے کہ اس سے ادب کی اہمیت، اسلامی ادب کی قدر و قیمت اور اس کی خصوصیات وغیرہ معلوم ہوتی ہیں۔

اب جن کے دیکھنے کو . . . . . . از جناب انیس قدوائی صاحبہ، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰، مجلد قیمت بارہ روپیہ پچاس پیسے، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

اس کتاب میں مختلف طبقوں کے بعض نامور اشخاص کا قلمی خاکہ درج ہے، ارباب سیاست میں مولانا محمد علی، پنڈت جواہر لال نہرو، رفیع احمد قدوائی اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی سیرت و شخصیت کی مصوری کی ہے، سماجی و قومی سرگرمیوں میں حصہ لینے والی خواتین میں مردولا سارابھائی اور قدسیہ زیدی کی شرافت، رحمدلی اور خلوص و دلنوازی کا ذکر ہے، بلند علمی و ادبی ذوق رکھنے والے تعلقہ داروں میں اپنے والد محترم ولایت علی بمبوق اور چودھری محمد علی کی باغ و بہار شخصیت کے جلوے دکھائے ہیں، ماہرین تعلیم اور ارباب علم و قلم میں شفیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر سید عابد حسین کے متعلق تاثرات قلمبند کئے ہیں، اپنے ایک خاندانی ملازم حافظ جمن کا ذکر خیر بھی شوخی و ظرافت کے پیرایہ میں کیا ہے، تاثرات و مشاہدات پر مشتمل اس مجموعہ کے تیرہ ۱۳ مضامین میں جن اشخاص کا ذکر ہے، ان کی زندگی کے نمایاں خط و خال، اہم خصوصیات و عادات، دلچسپ حالات و واقعات اور عام سرگرمیوں اور دلچسپیوں کی تصویر سامنے آجاتی ہے، مصنفہ کو شوخی و ظرافت اور رعنائی تحریر اپنے والد بزرگوار سے وراثۃً ملی ہے، اسلئے اس کتاب کو پڑھ کر لوگ محظوظ بھی ہوں گے اور اس سے ان کی واقفیت میں اضافہ بھی ہوگا۔

"ض"

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی چند کتابوں کے جدید ایڈیشن

نقوشِ سلیمانی

سید صاحب کے ہندوستانی اور اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبۂ صدارت ان کی دوسری تقریریں، تحریریں، تبصرے اور مقدموں کا مجموعہ جن کا انتخاب خود فاضل مصنف نے اپنی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی کا نام دیکر ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پا گئی، طبع دوم عکسی،

قیمت:- ۲۵ روپیے،

خیام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رباعی گو شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہے، اور اس کی رباعیات کا یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ اور بھی بہت کچھ تھا، وہ فلسفی تھا، منجم تھا، ریاضی داں تھا، ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا، جس کی طرف شعر العجم میں خیام کے تذکرہ میں مولانا شبلیؒ نے بھی اشارہ کیا ہے، اس کتاب میں پہلی مرتبہ اس کے سوانح و حالات کے ساتھ اس کی ان ہی حیثیات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں اس کے چند نایاب فارسی و عربی کے فلسفیانہ رسائل اور اس کی مستند رباعیات بھی شامل کر دی گئی ہیں، طبع دوم عکسی، قیمت: ۲۵ روپیے،

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد میں چند خطبے دیے تھے، یہ انہی کا مجموعہ ہے، طبع دوم عکسی، قیمت ۳۰ روپیہ

"منیجر"

بزم تیموریہ

بزم تیموریہ پہلے ایک ضخیم جلد میں [illegible] تیموریہ
اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق، علم دوستی و علم پروری، اور ان سب کے عہدوں کے اہل ذوق امراء، علماء، فضلاء اور شعراء کے تذکرہ اور ان کے علمی ادبی و شعری کمالات اور ان کے نثر و نظم کے بہترین اقتباسات پر مشتمل تھا، اس کے دوسرے ایڈیشن میں اتنی اصلاح و ترمیم، تغیر و تبدل اور اس کثرت سے اضافے ہوئے، کہ اس کا حجم بہت بڑھ گیا، اس لئے قدردانوں اور مستفیدین کی سہولت کے لئے اس کو تین جلدوں میں کر دیا گیا، اس میں بعض نئے ماخذ کی مدد سے ان سلاطین، شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور علم پروری کی تفصیلات ایسے دلچسپ اور دلپذیر انداز میں درج کی گئی ہیں کہ بانی سلطنت تیموریہ شہنشاہ بابر سے لیکر آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تک کے عہد کے علم و ادب اور شعر و سخن کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، پہلی جلد میں پہلے تین مغل سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسری جلد جہانگیر و شاہجہاں اور ان کے دربار کے امراء کی علم دوستی اور ان کے دور کے شعراء، ادباء و فضلاء اور ارباب کمال کے تذکرہ اور ان کے علمی کمالات پر مشتمل ہے، تیسری جلد مابعد وفات اورنگ زیب عالمگیر آخری دور کے مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر وغیرہ اور تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں خصوصاً گلبدن بیگم، نور جہاں بیگم، جہاں آرا صاحبہ مونس الارواح، اور زیب النساء بیگم وغیرہ اور ان کے متوسلین ارباب کمال کے حالات اور کارناموں پر مشتمل ہے، جلد اول قیمت ۱۰ روپے، دوم ۱۲ روپے، سوم ۱۳ روپے

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن (ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ)

رجسٹرڈ نمبر ل ۵۲۰ فروری ۱۹۸۳ء

معارف

مجلسِ دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مُرتّبہ

سیّد صباح الدّین عبدالرّحمٰن

قیمت بیس روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنّفین اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

جلد ۱۳۱ ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۸۳ء عدد ۲

مضامین

مقالات

آثار علمیہ وادبیہ

شذرات

کچھ عرصہ سے اس برصغیر کی اردو شاعری کے آسمان پر سیاہ بادل ہاہم چھائے ہوئے ہیں، فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی کے بعد احسان دانش، حفیظ جالندھری اور اب نشور واحدی اللہ کو پیارے ہوئے۔

ان کی رحلت سے اردو شعر و ادب کے قصر کی رنگا رنگی میں بڑی کمی پیدا ہو گئی ہے، احسان دانش نے اپنی زندگی ایک پریشان حال مزدور کی حیثیت سے شروع کی لیکن اپنی وفات سے پہلے اردو شاعری کے ایک تاجدار تسلیم کر لیے گئے تھے، ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ اعظم گڈھ کے مشاعروں میں برابر آتے رہے، اس وقت تک ان کے کلام کے مجموعوں میں نغیرِ فطرت، جادۂ نو، چراغاں، دردِ زندگی، نوائے کارگر، آتشِ خاموش، حدیثِ ادب اور گورستان وغیرہ چھپ چکے تھے، مشاعرہ کے اسٹیج پر آتے تو ان کے چہرہ سے ان کی زندگی کی سادگی اور پریشانی ظاہر ہوتی، مگر کلام سناتے تو ان کے خیالات کی پُرکاری اور رعنائی سے سامعین متاثر ہو کر محسوس کرتے کہ وہ اپنی شاعری میں جادۂ نو پر چل رہے ہیں، غزلیں سناتے تو تغزل کا چراغاں کر کے دردِ زندگی کے رازِ پنہاں کو عیاں کرتے، ان کی زندگی زیادہ تر پریشانیوں میں گذری، مگر وہ آتشِ خاموش بن کر ایک شاعر کا حق ادا کرتے رہے، اسی لیے ان کی سخنوری نوائے کارگر اور حدیثِ ادب بنی رہی، ان کی مشقِ سخن کی کہانی ان ہی کی زبانی یہ ہے کہ جب ان پر جذبۂ شاعری طاری ہوتا تو وہ اپنی روح میں التہاب پاتے، اور جب شعر سپردِ قلم کر دیتے تو محسوس کرتے کہ الفاظ میں، کاغذ پر، دائروں، نقطوں، مرکزوں اور پیوندوں کے نیچے ان کی روح دبتی چلی جا رہی ہے، اور جب کوئی نظم پایۂ تکمیل کو پہونچ جاتی تو اپنی روح کو سبک اور آرام طلب پاتے، پھر وہ میٹھی نیند سو جاتے۔

وہ اردو کے نظم گویوں کی صفِ اول میں آ گئے تھے، تصویرِ خیالی ہو، نیرنگِ تصور ہو، حسنِ نظر ہو،

اثرات رباب ہو، متھرا کی چاندنی رات ہو، سب میں ان کی نظم گوئی کی جلوہ طرازیاں ہیں، وہ مزدوروں کے شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے، فاقہ کشی کے الم پرور مناظر، سرمایہ داری کے خونچکاں مرقعے اور پامال انسانیت کے دردانگیز خاکے بڑے موثر انداز میں پیش کرتے رہے، یہ محض جگ بیتی نہیں تھی بلکہ آپ بیتی بھی تھی مگر وہ کسی لمحہ بھی اشتراکی نہیں ہوئے، راسخ العقیدہ مسلمان رہ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے ان کی یہی راسخ العقیدگی آخرت میں زاد راہ ہوگی، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی فطرت سلیم کے بدلے ان کو کوثر و تسنیم سے سیراب کرے، آمین۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری اردو شاعری کے مرصع کار ستون بنے رہے، اپنے آغاز شباب میں مناجات بھی لکھی تو خواجہ حسن نظامی نے اس کو شایع کر کے لکھا کہ اگر میں دولت مند ہوتا تو اس مناجات کے ہر شعر کے معاوضہ میں ایک اشرفی نذر کرتا، کچھ دنوں وہ مزدوروں اور کسانوں کی دلسوزی کا بھی راگ الاپتے رہے، ہندو مسلمانوں کو پریت کا گیت بھی سنایا، "ہندوستان ہمارا" میں تاریخ ہند کو نظم کر کے بچوں کے دلوں میں مطالعہ تاریخ کا ذوق پیدا کرنے کی بھی کوشش کی، مناظر فطرت کی مصوری بھی کی، جوانی کے جذبات کی ہنگامہ آرائی میں وہ نظم لکھی جس کا عنوان ہے: "ابھی تو میں جوان ہوں" اور یہ اب بھی بہت مقبول ہے، رومانی گیت لکھنے میں بھی مہارت رکھتے تھے، یکایک ان کا ذوق بدلا تو اسلامی شاعری کی طرف چل پڑے جس کی جوت ظفر علی خان اور اقبال نے جگائی تھی۔

راقم کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۳۴ء میں ان کا کلام ان کی زبانی سننے کا اتفاق ہوا تھا، وہاں طلبہ کی یونین میں مدعو تھے، جو ان کی آمد پر اوپر سے نیچے تک بھر گیا تھا، وہ اس وقت تک شاہنامۂ اسلام کے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے، طلبہ ان سے اردو شاعری کے فردوسی کی حیثیت سے مل رہے تھے، انھوں نے شاہنامۂ اسلام ہی کا کچھ ٹکڑا اپنے خاص ترنم میں سنایا، تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ واقعی ابوالاثر ہیں، شاہنامہ کی پہلی جلد ہی شایع ہو سکی، جس میں جنگ بدر تک کے حالات ہیں، اس زمانہ میں اعلان ہوا تھا کہ اس کی دوسری جلد میں غزوات نبوی کی تفصیل ہوگی، پھر تیسری جلد میں خلفائے راشدینؓ اور اسلامی فتوحات کی باری آئے گی، اردو شاعری کے اس فردوسی کو ایک محمود کی سرپرستی حاصل نہ ہو سکی، اس لیے یہ ایمان پرور کام پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکا جو خود مسلمانوں کی حرمان نصیبی ہے۔

وہ اپنے پیچھے اپنے کلام کے مجموعوں میں نغمہ زار، سوز و ساز، تمنا، بہشیر، اور چراغِ سحر چھوڑ گئے ہیں بچوں کے لیے جو نظمیں لکھیں ان کے بھی کئی مجموعے ہیں، ان کی ایک پرکیف نظم سلام بھی ہے جس کو سن کر ایمانی حرارت پیدا ہوتی ہے، پاکستان کا قومی ترانہ بھی ان ہی سے لکھوایا گیا، مگر ان کی اصلی قدر و منزلت شاہنامۂ اسلام ہی کی وجہ سے رہی، اور رہیگی، اور عالم بقا میں وہ شاید اسی صف میں دکھائی دیں جہاں نبی آخر الزماںؐ کے فدائی اور شیدائی ہوں گے، آمین

ہندوستان میں فراق گورکھپوری کا ماتم ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ نشور واحدی بھی داغِ مفارقت دے گئے، ان کا کلام ان کی دلکش اور مترنم آواز میں اعظم گڈھ کے مشاعروں اور دار المصنفین کی نجی مجلسوں میں ان سے برابر سننے میں آیا، متین، سنجیدہ اور پرانی تہذیب کے حامل تھے، بلیا وطن تھا، مگر زندگی حلیم کالج کانپور میں ایک استاد کی حیثیت سے گذاری، شروع میں تعلیم دائرۂ رفیع الزمان الہ آباد کے بزرگ شاہ شفاء اللہ سے پائی، جن سے فلسفۂ اسلام، فلسفۂ خودی اور مولانا روم کے افکار کے بہت سے رموز و نکات کو اچھی طرح سمجھا، ان کا خوشگوار اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا، ان کے کلام کے کئی مجموعے آتش و نم، شورِ نشور، صہبائے ہند اور فروغِ جام کے نام سے شائع ہوئے، اصغر، حسرت، فانی، جگر اور فراق گورکھپوری کی صف کے بعد جو شعراء کھڑے نظر آئے ان میں نشور واحدی اپنے شاعرانہ کمال کی گل پیرہنی، شائستگی اور شیریں بیانی، پھر فکر و فن کے رنگ و آہنگ کی جلوہ گری میں کسی سے کم نہیں نظر آئے، بلکہ بعض حیثیتوں سے اپنے معاصروں میں قد آور دکھائی دیئے۔ ۱۹۴۹ء میں جناب شاہ معین الدین احمد ندوی (سابق ناظم دار المصنفین) نے ان کے مجموعۂ کلام صہبائے ہند کے شروع میں ایک مختصر تبصرہ میں لکھا تھا کہ ان کی شاعری میں تغزل کی رنگینیاں بھی ہیں، قوم و وطن کیلئے پیامِ زندگی بھی، مذہب و ملت کا درس بھی، الفاظ کی سلاست بھی، بیان کی لطافت بھی، معتدل شوخی بھی، اور جوش و سرمستی کے نمونے بھی ہیں، اپنی ان شاعرانہ خوبیوں کو انھوں نے آخر وقت تک قائم رکھا، نثر میں ان کی ایک کتاب اسلام میں فلسفۂ خودی پر بھی ہے، دعا ہے کہ ان کا اسلامی جذبہ بارگاہ ایزدی میں مقبول و مبرور ہو، آمین۔

مقالات

قرآن اور مستشرقین

از

جناب سید اطہر حسین ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس، لکھنؤ،

قرآن اپنے آپ کو الفرقان یعنی حق و باطل میں امتیاز کرنے والا کہتا ہے، اس کا پورا مضمون گویا ان الفاظ میں جمع ہو گیا ہے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ	حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا، تحقیق
اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا	کہ باطل اسی لیے تھا کہ نابود ہو کر رہے

(۸۱ - ۱۷)

قرآن کی غرض و غایت حقیقت الٰہیہ کو پیش کرنا ہے، قرآن دراصل مجسم سچائی اور قانون ہے، وہ تذبذب اور شک و شبہ یا بالفاظ دیگر باطل اور گناہ کو نیست و نابود کرتا ہے، باطل سے مراد یہ عقیدہ رکھنا کہ ذات مطلق کا وجود ہی نہیں ہے، یا یہ کہ اس کی ایک اضافی حیثیت ہے، یا یہ کہ ذات مطلق ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں، یا یہ کہ خود اضافی ہستی ہی ذات مطلق ہے،

اسلام کی بنیاد ذات مطلق سے تعلق رکھتی ہے، قرآن کی رو سے اس کی ذات کا یقین فطرت انسانی میں ودیعت کر دیا گیا ہے، انسان کی تخلیق پر اسے ذات مطلق کی جھلک ملی تھی اور اسے مقصد کائنات اور اشیاء کے اسماء و مفہوم سے واقفیت کرا دی گئی تھی، یہ امر

اس کی فطرت کے خلاف ہوگا کہ وہ کائنات کے قوانین اور اشیا پر غور کرے، اور خالقِ کائنات سے انکار کر دے، کائنات میں جو منصوبہ، توازن اور ہم آہنگی کی کارفرمائی ہے، وہ خود بزبان حال پکار پکار کر کہتی ہے کہ ان کا خالق عظیم ترین وجود ہے، جو کائنات کا مالک ہے' اور جسے اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔

دوسرے الہامی مذہب کے برخلاف اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی عقیدہ ہے، کہ کوئی الہویت یا حقیقت الٰہی یا ذات مطلق توحید باری تعالےٰ یعنی حقیقت الحقائق یا ذات مطلق کے سوا نہیں ہے، اور تمام انبیا علیہم السلام انسانیت کو یہی پیغام پہنچانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے، قرآن صرف توحید باری تعالیٰ پر زور دیتا ہے، بلکہ اس پر بھی یقین لازمی ہے، کہ اپنی اصلی شکل میں تمام انبیا علیہم السلام کا یہی عقیدہ اور پیغام تھا، قرآن کسی ایک فرقہ، یا قوم یا گروہ کے لیے نہیں ہے، بلکہ پوری انسانیت کے لیے پیغامِ خداوندی ہے، تمام الہامی مذاہب کی ایک ہی بنیاد تھی، اور صرف شریعت اور قوانین و دستور میں جزوی فرق اس وقت کے معاشرہ اور ذہن انسانی کے عروج کے اعتبار سے تھا، لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا، دوسرے مذاہب کے پیرووں نے تحریف و تخریب سے کام لیکر ان کی شکل بگاڑ دی، پیغامات کو اصلی رنگ و روپ میں پیش کرنے کے لیے اور لوگوں کو ان کے انحراف اور تخریب پر آگاہ کرنے کے لیے اور حقیقی اور ازلی صراط مستقیم پر لانے کے لیے یہ آخری پیغام خداوندی خاتم الانبیاء سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل ہوا، یہ وحی اُس وقت نازل ہوئی، جب عقل و دانش کے دور کا آغاز ہو چکا تھا، اور انسان غور و فکر اور تدبیر سے کام لینے لگا تھا، اور حقایق کی قدر و قیمت پہچان سکتا تھا، اور انسان کی مادی ترقیوں نے وہ ذرائع فراہم کر دئے کہ پیغام خداوندی عالم کے کونے کونے تک پہنچ سکتا تھا، قرآن کہتا ہے کہ اسلام انسان کا فطری مذہب ہے اور

اس فطرت کے مطابق ہے، جس پر انسان کی تخلیق ہوئی، اور خداوند کریم کے دستور اور طور و طریقہ میں کبھی کوئی فرق نہیں ہوتا ہے، اور اسلام ہی صحیح مذہب ہے،

صرف اس وجہ سے کہ اسلام عقیدۂ تثلیث کا حامی نہیں ہے عیسائی مشنری اور یہودی پیشواؤں نے اور ان کے زیر اثر مستشرقین نے اسلام پر بے بنیاد الزامات تراشے اور اس کی مذمت کی، اپنے عقیدوں اور اصولوں کی بقا اور برتری ثابت کرنے کے لیے ان مستشرقین نے اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا کہ قرآن کتاب الٰہی نہیں ہے، بلکہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق ہے، اور جو اس میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات و قصص ہیں، وہ عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابوں سے لیے گئے ہیں، اور یہ کہ قرآن کی آیتوں میں تکرار ہے، اور کہیں ناقابل فہم ہیں اور قرآن کی موجودہ سورتوں اور آیتوں کی ترتیب میں کوئی منطق نہیں ہے،

ان تمام اعتراضات اور مفروضات کا ماخذ عیسائیوں کی مشنری کاوش ہے، جس کا نصب العین اسلام کے چہرے کو داغدار دکھانا تھا، اس کی تبلیغ و اشاعت میں رکاوٹ پیدا کرنا تھا، اور اپنے مذہب کی فوقیت ظاہر کرنا تھا، یہ اعتراضات اور مفروضات قرآن کے بنیادی اصول اور عقائد سے لاعلمی پر یا قرآن کے طرز بیان سے ناواقفیت پر یا ان غلط تراجم پر مبنی ہیں، جو مستشرقین کے ہاتھوں انجام پائے تھے، جنھوں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر قرآن کی بہت سی آیتوں کے معنی و مفہوم کو بدل کر یا مسخ کرکے پیش کیے اور علمی تحقیق اور صحیح جائزے کے منافی ہیں، شروع میں یہ اعتراضات اور ریشہ دوانیاں بھونڈے طریقہ یا بدزبانی کے ساتھ اٹھائے گئے، لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا اور تحقیقی کاموں میں کچھ صداقت آنے لگی اور اسلام کے تہذیب و تمدن اور اس کے اثاثہ کی گہرائی وسعت اور حقیقت کا زیادہ انکشاف ہوتا گیا، تو انھوں نے تنقید کا طریقہ بدل دیا، اور

اپنی ستائش آمیز حکمت عملی کے ساتھ تیر و نشتر لگانے لگے،

جارج سیل نے جنھوں نے انگریزی زبان میں سب سے پہلی بار قرآن کا ترجمہ ۱۷۳۴ء میں کیا، اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ اس سے قبل جو لاطینی زبان میں ترجمے تھے، ان میں اصل سے انحراف تھا، ببلینڈر (Bibliander) نے جو ۱۵۴۳ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ کیا، اس کو ترجمہ ہی نہیں کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں اتنی کثیر غلطیاں ہیں، اور اتنی جسارت سے کام لیا گیا ہے، اور اتنی چیزوں کا اخفا کیا گیا ہے، یا تبدیلی کی گئی ہے کہ اس کی اصل سے کوئی مطابقت یا مماثلت نہیں ہے، ایک اور مستشرق کے لاطینی ترجمہ کے متعلق جارج سیل نے لکھا ہے کہ وہ اور بھی ناقص ہے، اور جو ترجمہ (Andrea Arrivadbere) نے فرانسیسی زبان میں کیا ہے، وہ کسی طرح ترجمہ کہلانے کے لائق نہیں ہے، کیونکہ اس کے ہر صفحہ پر بے شمار غلطیاں ہیں، جا بجا تحریف یا اضافے ہیں، اور آیتوں کو مسخ کیا گیا ہے، جو ناقابل معافی ہے، اسی فرانسیسی ترجمہ کو الکزنڈر روز (Alexander Ross) نے انگریزی زبان میں کیا، جس کے متعلق جارج سیل کی رائے ہے، کہ (Alexander Ross) عربی زبان متعلق نہیں جانتے تھے، اور نہ انھیں فرانسیسی زبان پر عبور تھا، اور انھوں نے (Du Ryan) کی غلطیوں میں اپنی طرف سے اضافہ کیا، اور انھوں نے بہت ہی مذموم زبان استعمال کر کے ترجمہ کو مضحکہ خیز کر دیا۔ Father Lewis Marracei نے ایک لاطینی زبان میں ۱۶۹۵ء میں ترجمہ کیا تھا، جس کے متعلق سیل نے یہ اظہار خیال کیا ہے، ان کی تفسیر اور ترجمہ میں تمام تر تکرار ہے، جس کی وجہ سے ضخامت تو بڑھ گئی مگر اتنا ہی غیر اطمینان بخش ہے، اور کہیں کہیں زبان میں جسارت اور گستاخی سے کام

یا گیا ہے،

خود اپنے ترجمہ کے متعلق سیل کا کہنا ہے کہ ان کا مقصد اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے، جو لوگوں میں بہتر ترجموں سے پیدا ہوگئی ہے، اور Protestants ہی کامیابی کے ساتھ قرآن پر حملہ کرسکتے ہیں اور بھروسہ ہے کہ قدرت نے Protestant کا ہی انتخاب کیا ہے کہ وہ قرآن کو شکست فاش دیں، انھوں نے اون کے پیش رو مترجمین اور مستشرقین کی مذمت کی، جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی یا قرآن عظیم پر بے بنیاد الزامات تراشے اور نہایت ہی قابل اعتراض زبان استعمال کی، مگر اپنی بے لوث کوشش اور فراخ دلی کے متعلق فرماتے ہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نعوذ باللہ کتنے ہی بڑے مجرم کیوں نہ رہے ہوں کہ انھوں نے انسانیت پر ایک غلط مذہب تھوپا، مگر ان کی ذاتی صفات سے انکار نہیں ہوسکتا ہے، اور میں لائق اور متقی Spanhemius کو داد و تحسین دیتا ہوں کہ ہر چند وہ سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) ایک جعل ساز تھے، مگر انھیں بھی تسلیم ہے کہ قدرت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام کمالات سے متصف کیا تھا، جس میں جسمانی خوبصورتی، لطیف زیرکی، اخلاق حمیدہ و غربا پروری، تواضع حریفوں اور غنیموں کے مقابلہ میں استقلال و ثابت قدمی، خدا کی حمد و ستائش کرنے والے مکاروں، زناکاروں، قاتلوں، حریصوں، افترا پردازوں کے خلاف سختی شامل تھی، اور ہمت و استقلال، سخاوت، ترحم، تشکر، والدین اور بزرگوں کی عزت کے بڑے داعی و مبلغ تھے، اور ہمہ وقت حمد باری تعالیٰ میں لگے رہتے تھے

جارج سیل نے خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے:
آپ کی ہوش مندی، عاقلانہ و کریمانہ برتاؤ اور رویہ جس کے تحت اپنے مشن میں

معروف رہے۔ اس جاہلانہ اعتراض کی تردید کرتے ہیں، کہ آپ ایک سخت خو مذہبی پیشوا تھے، سورۂ فاتحہ کے متعلق وہ کہتا ہے، کہ اگر یہ مان لیا جائے، کہ آپ کے جذبات وخیالات کی ترجمانی کرتی ہے، تو وہ دیدہ و دانستہ جعل سازی سے کام نہیں کرتے تھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، سورۂ فاتحہ نماز کی ہر رکعت میں بڑے خضوع وخشوع سے پڑھتے تھے لیکن جارج سیل نے اس میں شک ظاہر کرنے سے گریز نہیں کیا۔

Rd. E. M. Wherry نے سیل کے ترجمہ کو اپنی تفسیر کے ساتھ چار جلدوں میں شائع کرایا، اور خود دیباچہ میں انکشاف کرتے ہیں کہ یہ تفسیر اپنے جیسے لوگوں کے لیے ہے، جو مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ میں لگے ہوئے ہیں، انھوں نے اپنے فاسد خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ نعوذ باللہ قرآن خود ثبوت فراہم کرتا ہے، کہ وہ جعلسازی کی پیداوار ہے، اور پیغمبر اسلام کا یہ جھوٹا دعویٰ ہے کہ قرآن سابقہ کتب الٰہی کی تصدیق کرتا ہے، اس نے اپنا مقصد ان الفاظ میں واضح کیا کہ منازعہ اور نزاع کی تمام تفصیلات کو اس وجہ سے واضح کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کو اس عظیم ہستی حضرت عیسیٰ کا صحیح علم ہو جائے جن کے متعلق تمام انبیاء علیہم السلام نے پیشین گوئی کی کہ وہ خداوند قدوس کے فرزند تھے، اور گنہگاروں کے نجات دہندہ۔

ان تمام تراشیدہ الزامات اعتراضات، بہتان، اور مفروضات پر بحث کرنے اور ان کو تمام تر غلط ثابت کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ وہ تمام باتیں سامنے لائی جائیں جو بین اور ناقابل تردید ثبوت پیش کرتی ہیں کہ قرآن عظیم کسی انسان کی تخلیق ہو ہی نہیں سکتی اور خالق کائنات کے سوا اس کا کوئی خالق نہیں ہو سکتا ہے، اللہ تعالے قرآن میں خود فرماتا ہے۔

" اس کتاب کو ہم نے آپ (محمدؐ) پر اس لیے نازل کیا ہے، کہ آپ بنی نوع انسان کو

ان کے رب کے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر خدائے غالب وستودہ صفات کے نورانی راستے کی طرف لے جائیں۔" (ابراہیم)

"اور جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جو (قرآن) آپ پر نازل کیا گیا ہے، وہ حق ہے، اور اس خدا کا راستہ بتاتا ہے جو غالب اور محمود ہے۔" (سباء۔)

یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ہے، پرہیزگاروں کے لیے (سرچشمۂ) ہدایت ہے۔

قرآن خود اس بات کی شہادت دیتا ہے، کہ وہ اللہ کا کلام ہے، قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی تو بالراست مخاطب کرتا ہے، اور کبھی بصیغۂ غائب، اس کا انداز بیان حدیث سے مختلف ہے، اگر احیاناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی لغزش ہو جاتی، یا کسی معاملہ میں آپ کو پس وپیش ہو، تو وحی الٰہی سے آپ کی رہنمائی ہو جاتی تھی، اور کبھی کبھی آپ کو اس کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

جو لوگ قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شک وشبہ کرتے ہیں، انھیں قرآن پہلے تو یہ چیلنج دیتا ہے، کہ اس کے مماثل کوئی کتاب پیش کریں، اگر ایسا نہیں کر سکتے، تو یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس کے ان سورتوں کے مماثل سورتیں بنالائیں اس کے بعد چیلنج دیتا ہے، کہ کم از کم ایک سورہ کے مانند یا اس سے ملتی جلتی ہی کوئی سورہ بنا کر پیش کریں، واضح رہے کہ یہ چیلنج صرف زمانۂ نزولِ قرآن کی حد تک محدود نہیں تھا، بلکہ ہر زمانہ اور ہر وقت کے لیے کھلا ہے، قرآن نہ صرف اپنے مضامین کی بلند پائگی اور اپنے پیام کے اعتبار سے بے نظیر اور ناقابل نقل ہے، بلکہ اپنے باوقار اسلوب بیان، تشبیہ واستعارات کے تنوع اور الفاظ میں عکاسی کے لحاظ سے بھی بے مثل ہے، اس کی اہمیت اور اس کا طرز بیان انسانی طاقت سے باہر اور ناقابل تمثیل ہے، قرآن کی

ادبیت کا کچھ اندازہ جامع الازہر کی حسب ذیل تحریر سے ہوتا ہے،

(۱) قرآن کا انداز بیان نہ کسی مہذب شہری کی بزم نگاری و نزاکت کے مانند ہے اور نہ ایک خانہ بدوش بدوی کی درشت کلامی کے مماثل ہے، بلکہ وہ اول الذکر کی شیریں کلامی اور ثانی الذکر کے زور کلام کا حسین مجموعہ ہے،

(۲) نثر میں الفاظ کا وزن اور نغمہ اس طرح برقرار رکھا گیا ہے، جیسا کہ منظوم کلام میں ہوتا ہے، وقفے نہ بالکل نثر کی شکل میں آتے ہیں، نہ نظم کی صورت میں بلکہ عبارت میں موزونیت اور نغمہ کا ایک نرالا تناسب پایا جاتا ہے۔

(۳) الفاظ کا انتخاب ایسا ہے کہ نہ وہ ٹکسال باہر ہیں، اور نہ ایسے جن سے کان آشنا ہوں بالفاظ دیگر شوکت الفاظ کا وہ عالم ہے کہ کہیں بھی فصاحت سے تجاوز نہیں۔

(۴) جملوں کی ترکیب شاندار ہونے کے باوجود کم سے کم الفاظ میں بلند سے بلند خیالات کا اظہار ہوا ہے۔

(۵) اظہار خیال ایسے مختصر جامع مگر سلیس الفاظ مین کیا گیا ہے کہ معمولی سمجھ کا آدمی بغیر کسی دقت کے قرآن کا مفہوم سمجھ سکتا، ....

(۶) قرآن میں وہ باریک بینی، لچک اور تنوع ہے کہ وہ اسلامی علوم وفنون کے علاوہ شریعت وفقہ کی بنیاد کا کام بھی دیتا ہے۔

(۷) نفسیات کا یہ قانون ہے کہ عقل اور جذبات باہم متضاد ہوتے ہیں، مگر قرآن کی عبارت اس قانون سے بالا تر ہے، کیونکہ وہ مافوق البشر ہستی کی بنائی ہوئی ہے، قرآن میں عقل اور جذبات کی باہم متضاد قوتوں میں حیرت انگیز ارتباط پایا جاتا ہے، اور قرآن میں عبارت کی متانت اور عظمت حیرتناک طریقہ پر برقرار رکھی گئی ہے،

دریہ کہیں بھی ٹوٹنے نہیں پاتی ہے۔

(۸) جب ہم کسی ایسے جملہ یا چند جملوں کی ساخت سے گذر کر جو ایک ہی مضمون پر مشتمل ہوں غور کرتے ہیں، بلکہ بحیثیت مجموعی پورے قرآن کی ہیئت ترکیبی پر غور کرتے ہیں، تو ہم ایک ایسا ماہرانہ نقشہ یا منصوبہ پاتے ہیں، جو انسانی دماغ کی پیداوار نہیں ہو سکتا ہو

اسلام کی بے پناہ اشاعت بھی قرآن کے کتاب الہی ہونے کا ایک ثبوت ہے، جیسا کہ ایک مشہور مصنف اور فلسفی کہتا ہے، قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کا ثبوت نہ صرف اس کے پیش کردہ عقائد، اس کی نفسیاتی اور مابعد الطبیعیاتی صداقت اور جادو بیانی سے ہوتا ہے، بلکہ اس کے بیرونی اثرات اور اسلام کی معجزانہ اشاعت سے بھی یکساں طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

قرآن نے پہلے سے ہی پیشین گوئی کردی تھی، کہ اسلامی تحریک کن کن مراحل سے گزرے گی، (سورہ ۴۳۰) مخالفین کے ردعمل کی پیشین گوئی، ہو چکی تھی، کہ کس طرح وہ ابتداء میں بے فکر رہیں گے، پھر کچھ موافقت اور دلچسپی کا اظہار کریں گے، پھر مخالفت اور دشمنی پر اتر آئیں گے، پہلے اور سخت مقابلہ میں اہل مکہ کی مسلمانوں کے ہاتھ شکست ہوگی، قرآن نے اس کی بھی پیشین گوئی کردی تھی کہ اسلام کی فتح ہوگی، اس کے عقائد اٹل اور ابدی ہیں، اس کی نوزائیدہ حکومت ترقی پذیر رہے گی، اور دنیا کی کوئی طاقت اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹا نہیں سکتی ہے، (۱۳-۱۸، ۱۴، ۲۴۰ و ۵۵ و ۸-۳۶) اسلامی مشن کے انصرام حتیٰ کہ پیغمبر اسلام کی وفات کا پیشگی سے اعلان ہے، کوئی چیز گڑھی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ہر تفصیل ایک بے داغ منصوبہ کا جزو لاینفک کا کام دیتی ہے،

قرآن جستہ جستہ طور پر حسب ضرورت تیئس سال کی مدت میں نازل ہوا، قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ ہر سورہ یا آیت نہ صرف پیدا شدہ حالات کے متقاضی تھی، بلکہ قرآن کے پورے پلان کے مطابق بھی تھی، جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا گیا، آیتوں و سورتوں کو ترتیب دینے کا کام ہوتا گیا، اور آیتوں کی نمبر اندازی کر دی گئی، ہر آیت کے دو سلسلے ہیں، ایک بحسب تنزیل اور دوسرا بحسب ترتیب، سلسلۂ نزول کے اعتبار سے ہر آیت اسوقت کی ضروریات کے لائق تھی، اور پورے پلان کے لحاظ سے ہر آیت ماقبل آیت اور بعد کی آیتوں سے مربوط ہوتی گئی، سلسلۂ تنزیل کے اعتبار سے آیتوں میں رابطہ، تسلسل، ہم آہنگی، اور منطقی ارتقا تھا، اور جب اس ترتیب سے بالکل مختلف ترتیب میں آیتوں کو پرو دیا گیا، تب بھی اتنا ہی اعلیٰ رابطہ، تسلسل، ہم آہنگی، اور منطقی ارتقا پایا جاتا ہے، اگر یہ غور کیا جائے کہ قرآن میں ۱۱۴ سورتیں ہیں، اور ان میں سے زیادہ تر سورتیں ایسی ہیں، جو مختلف سنین میں جستہ جستہ اور کئی کئی سال کے وقفہ سے نازل ہوئیں، تو استعجاب حیرت میں بدل جاتا ہے، یہ انسانی کام نہیں بلکہ معجزہ ہے، یہ بالکل ظاہر ہے کہ اگر کوئی بھی مصنف پہلے سے ایسا کوئی خاکہ یا منصوبہ بنائے، تو اس کے لیے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ آیندہ ۲۳ سال میں کیا کیا واقعات رونما ہوں گے، کون کون سے مسائل درپیش ہوں گے، الفاظ کی کیسی موسیقیت ہوگی اور آنے والی آیتوں کا اس خاکہ میں کون کون سا مقام ہوگا، ظاہر ہے کہ قرآن کا مصنف خدائے عالم الغیب کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔

قرآن کوئی سائنس کی کتاب نہیں ہے، مگر وہ بہت سے مظاہر قدرت کی نسبت اشارے یا معلومات بہم پہنچاتا ہے، جن کے متعلق انسان کو صدیوں بعد تک مطلق کوئی علم نہیں تھا، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

زمین کی گولائی اور گردش (۳۹ - ۱۵۴)

مینہ کی تشکیل، (۴۰ - ۲۸)

ہوا کے ذریعہ نر و مادہ پھولوں کے تولیدی مادہ کا اتحاد، (۱۵ - ۲۲)

تمام اشیاء میں نر و مادہ کا وجود، (۳۲ - ۳۵)

چاند سورج اور سیاروں کا مقررہ برجوں میں گردش، (۳۶ - ۲۹ تا ۳۸)

سورج کی از خود روشنی اور چاند کا اس کی روشنی سے منور ہونا۔

تمام جانداروں کا آبی ماخذ، (۳۰ - ۲۱)

شہد کی مکھیوں کا طرز زندگی، (۱۶ - ۹۶)

بچہ کی رحم مادر میں تدریجی تشکیل اور اس کے تین پردوں میں رہنا، (۲۴-۲۳-۱۴)

اس کے علاوہ واقعہ یہ جیسے اور قرآن خود گواہی دیتا ہے، اور تمام مستشرقین کو تسلیم ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے، یعنی پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن اپنی ہٹ دھرمی اور قرآن کے آسمانی کتاب کے ہونے کے انکار میں مستشرقین پھر بھی کہتے ہیں، کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق ہے، قرآن نے کتنے متنوع مضامین، کتنی اعلیٰ اور بنیادی باتوں پر روشنی ڈالی ہے، اس نے پہلی بار اللہ تعالےٰ کی یکتائی اور اس کا ماورائی تصور اس طرح پیش کیا ہے، کہ دلوں میں خدا کے وجود کا متحرک احساس پیدا ہو جائے، اس کی حکومت اور اقتدار اعلیٰ پوری کائنات کا ایک مفصل اور مربوط منصوبہ جس میں تمام مظاہر فطرت کا خاص قوانین کے تحت کارفرمائی، انسان اس کے خالق کے درمیان ایک مابعد الطبیعیاتی رشتہ، انسان کے روحانی اور مادی پہلوؤں میں امتزاج، ایک مکمل دستور حیات کے تمام بنیادی اصول، روح انسانی کا تخلیق کے وقت سے یکجا بہ کمال

کی زندگی، اور اس کے مراحل، اس کا عقائد اور اعمال اور خیالات اور کردار میں صدق پر زور دینا، انسان کا بحیثیت اشرف المخلوقات درجہ و مرتبہ، عقل و فہم کے استعمال پر زور، انسان کے بنائے ہوئے امتیازات کی نفی جو فرقہ، نسل و رنگ وغیرہ پر مبنی ہوں پوری انسانیت کا ایک برادری ہونا، ایک نئی تہذیب اور تمدن کی داغ بیل ڈالنا، اس کے اصول اور ہدایت کی ابدیت اور حقوق اللہ اور حقوق الناس پر زور اور ان کی نسبت انسان کی ذمہ داریاں وغیرہ وغیرہ مضامین پر بحث کی گئی ہے، دنیا کا بڑے سے بڑا دانشور اور ادیب ایسی کتاب نہیں لاسکتا ہے، ایک ان پڑھ آدمی کا ذکر کیا، جارج سیل کو بھی تسلیم ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم یافتہ نہیں تھے، مگر وہ پھر بھی کہتا ہے، کہ قرآن کے مصنف وہی تھے، اور ہو سکتا ہے، کہ انھوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کی صحبت میں یہ تمام علم حاصل کر لیے ہوں، حالانکہ مکہ معظمہ میں اگر کچھ عیسائی یا یہودی تھے تو وہ معدودے چند رہے ہوں گے، انکی جو تعداد بتائی جاتی ہے وہ بالکل ناقابل اعتبار ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے، کہ قرآن میں جو رشد و ہدایت پر جا بجا زور ہے، وہ حضورؐ کی سیاحت اور سفر کا نتیجہ ہے مستشرقین نے قیاس آرائی کی ہے، کہ تمام الہامی باتیں حضورؐ نے ایک عیسائی پادری بحیرہ کی ایک روزہ ملاقات سے حاصل کیں، یا انجیل و تورات کے قصص سے حاصل کیں، حالانکہ اس کو تسلیم ہے، کہ یہ کتابیں حضورؐ کو دستیاب نہیں تھیں، اور نہ اس وقت تک ان کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تھا، ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے، کہ جو کچھ حضورؐ نے ان آسمانی کتابوں سے حاصل کیا اس کو ایک نئے انداز میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے طور پر پیش کر دیا، جو ایک بہت اعلیٰ مصنف اور ادیب کا ہی کام ہو سکتا ہے، اس نے

اپنے بغض میں یہاں تک کہہ دیا کہ اہل قریش کی مخالفت اس بات کی دلیل ہے، کہ حضورؐ نبی نہیں تھے، حالانکہ ایک قلیل مدت میں قریش کے بچہ بچہ نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

قرآن اور دوسری کتب الٰہی میں ابتدائے آفرینش، حضرت آدمؑ کی تخلیق، ان کا جنت سے نکالا جانا، انبیاء علیہم السلام کے قصص، جنت اور دوزخ، دنیوی اور ابدی زندگی کے تذکروں میں جو مماثلت ہے، اس سے مستشرقین نے یہ نتیجہ نکالا کہ حضورؐ نے تمام باتیں دوسرے مذاہب سے اخذ کیں، انھوں نے یہ بات بالکل نظرانداز کر دی ہے کہ خالق کائنات ایک ہے، انسانیت اور اس کی بنیادی ضرورتیں ایک ہیں، ابدی حقائق اور تمام انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ نازل پیغام خداوندی اپنی اصلی شکل میں ایک ہے، اور اگر ہر نبی کے زمانے میں ان کی تالیف ہو جاتی، اور دوسری کتابوں میں تحریف، اضافہ، تغیر و تبدل نہ کیا گیا ہوتا تو مماثلت ہی نہیں، ان سب کی شکل ایک ہی ہوتی، اور صرف شریعت میں معاشرہ میں تدریجی ارتقار کے اعتبار سے تھوڑا بہت فرق ہوتا۔

ان تمام باتوں اور دلائل کے پیش نظر کوئی معمولی سمجھ کا آدمی بھی قرآن عظیم کے کتاب الٰہی ہونے سے انکار نہیں کر سکتا ہے، ہٹ دھرمی بغض اور محرومی کی بات دوسری ہے۔

مستشرقین نے اسلام پر یہ بھی الزام لگایا، کہ وہ صرف قضاء و قدر پر زور دیتا ہے، اور انسان کی ذاتی فکر و کوشش کو سلب کر لیتا ہے، چنانچہ سر ولیم میور لکھتے ہیں اسلام میں اللہ کا رشتہ دنیا کے ساتھ اس طرح ہے، کہ انسان کا اختیار اور ارادہ ختم ہو جاتا ہے، اور امید اور توقع اللہ کے آہنی شکنجہ میں ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس طرح Clarke کہتا ہے کہ اسلام نے خدا کو دیکھا، انسان کو نہیں، اللہ کے حقوق جانے مگر

انسان کے حقوق کو نہ جانا، اس نے جبر اور اقتدار دیکھا آزادی نہیں، اور اس وجہ سے
ایک استبدادی ضابطہ بن گیا، جو سخت ہو کر آہنی ڈھانچہ رہ گیا، اور بالآخر ہلاک
یہ الزام سراسر بے بنیاد اور لغو ہے، اور صرف بغض اور عناد پر مبنی ہے، اسلام کے نظریا
اور تاریخ کے خلاف ہے، اور جناب کلارک کی بدخواہی کے باوجود اسلام حیرت انگیز
طریقہ سے پھیلتا گیا اور زمانہ اس کی طرف آرہا ہے، اللہ تعالیٰ قادر مطلق ضرور ہے، اور کائنات
کی ہر شے تابع تقدیر ہے، اسی نے ہر شے کو اس کی صفت دی، اور اسی قانون سے وابستہ
ہے، جو اس کے لیے اس نے مقرر کیا، انسان بہت حد تک تابع تقدیر ہے، مگر اس کو
بہت حد تک آزادی بھی ملی ہے، ہر شخص کے ضمیر اور فطرت میں یہ تمیز دی گئی ہے کہ
وہ اچھائی، اور برائی میں تمیز کر سکے، اور اس کو نیکی کے راستے پر چلنے کی ہدایت دی گئی
مگر یہ اس پر ہے کہ وہ کون سا طریقہ اختیار کرتا ہے، اچھا اور برا، اس کے اچھے
کی جزا اور برے کی سزا سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے، مگر اسے مجبور نہیں کیا گیا، کہ وہ کون
سا راستہ اختیار کرتا ہے، تقدیر الٰہی کہیں کہیں علم الٰہی سے متعلق ہے، جو ہر شے کے متعلق
اللہ تعالیٰ کو پہلے سے ہے، کہ وہ کیا کرے گا، اور کہیں کہیں اس قانون سے جس کے
تحت اس کی پیدائش، اس کی نمو، اس کی بقا اور اس کا وجود ہوا ہے،

قرآن عظیم میں بے شمار ایسی باتیں ہیں کہ انسان کو خود کوشش کرنی ہوگی اسے وہی ملے گا جو وہ کرے گا
اور انسان کو اپنی عقل و فہم سے کام لے کر اور مظاہر قدرت کا بغور مشاہدہ کر کے گذشتہ
قوموں کے واقعات اور حشر سے عبرت لے کر خدا کی قدرت کو سمجھنا ہے، اور اسکی تابعداری
اخلاص و انہماک سے کرنی ہے، اور اس سے اپنی امیدوں کو وابستہ کرنا ہے، جو اس کا سب سے
بڑا دوست، نگہبان، پرورش کرنے والا، ہدایت دینے والا اور مہربان ہے، بطور نمونہ کے

چند آیتیں لے لیجئے۔

سورہ ۵۳ کی ۳۹ آیت ہے کہ انسان کو وہی ملے گا، جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے یا سورہ ۱۳ کی گیارہویں آیت کہ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا ہے، جب تک وہ خود اپنی حالت کو بدلتی نہیں ہے۔ یا سورہ ۶۲ کی دسویں آیت کہ جب نماز ختم ہو جائے تو خدا کی نعمت حاصل کرنے کے لیے زمین میں منتشر ہو جاؤ اور خدا کا ہمہ وقت خیال رکھو، تاکہ فلاح پاؤ،

ان مستشرقین کا یہی حال ہے جس کے متعلق قرآن نے پیشگی اعلان کر دیا ہے ان کے دماغ ہے، مگر سوچتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں، مگر دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں مگر سنتے نہیں، (سورہ، آیت ۱۷۹) اور جن لوگوں نے دنیا میں حقیقت سے چشم پوشی کی وہ آخرت میں بھی اندھے اٹھیں گے، اور صحیح راستہ سے بہت دور ہوں گے (سورہ ۱۷-۷۲) قرآن انھی کو ہدایت دیتا ہے جو اس کے طلب گار ہیں،

جارج سیل Arberry Rodwell Richra Bell

نے قرآن کے ترجمہ میں جو غلطیاں کی ہیں، Dherry اور PickThall ان کے چند نمونے میں نے اپنے انگریزی کتابچہ میں پیش کیے ہیں، اس مختصر مقالہ میں انھیں دہرانا ممکن نہیں ہے انھوں نے جو غلطیاں کی ہیں، وہ عبارت کی ہیں، اور عربی زبان، قرآن کے اسلوب بیان اور عربی محاوروں سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کی ہیں PicKThall کی غلطیاں ترجمہ میں اصل کی طرح موسیقیت و نغمہ لانے کی کوشش کی وجہ سے ہوئیں، اور کچھ عربی محاوروں سے ناواقفیت کی بنا پر ہوئیں، اوروں نے دیدہ و دانستہ اور بدنیتی سے فاش غلطیاں کیں۔

براؤن اور اسلام

از

ڈاکٹر امیر حسن عابدی شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی

فارسی سے پہلے یورپ میں عربی کی ابتدا ہوئی، جس کے ذریعہ سے یونانی فلسفہ خاص کر ارسطو کے خیالات سب سے پہلے مغربی یورپ کو معلوم ہوئے، تیرہویں صدی عیسوی میں البرٹس میگنس نے فارابی اور ابن سینا کی کتابوں سے اخذ کر کے ارسطو کی تعلیمات کو پیرس میں پیش کیا، اسی صدی میں راجر بیکن اور ریمانڈ لل نے مشرقی زبانوں سے واقفیت حاصل کرنے پر زور دیا، تاکہ ان کے فلسفہ اور سائنس کا مطالعہ ہو سکے،

چودہویں صدی کے شروع میں پانچویں پوپ نے یورپ کے مختلف شہروں میں عربی وغیرہ کی پروفیسرشپ قائم کروائی، مگر اس کا خیال رکھا گیا کہ اس کے عیسائی مذہب کو کوئی نقصان نہ پہونچے، سولہویں صدی کے شروع میں باقاعدہ یورپ میں مشرقی علوم کا باقاعدہ چرچا اور رواج ہوا، آج دنیا پر مسلمانوں کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے یونانی علوم و فنون کو زندہ رکھا، اور آج یورپ والے ان ہی کے عربی ترجموں سے استفادہ کر کے آگے بڑھے ہیں،

یورپ میں عربی، فارسی، وغیرہ جیسے مشرقی علوم کی طرف توجہ کرنے کے دو اسباب تھے، ایک تو یہ کہ ان زبانوں، خاصکر عربی کے ذریعہ سے وہ یونان اور خاص کر سقراط افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے فلسفہ کو سمجھ سکیں۔ دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اسلام، قرآن اور مسلمانوں میں طرح طرح کی خامیاں اور کمزوریاں دکھا کر ان پر کیچڑ اچھالیں، پھر بھی بہت ایسے مستشرق ہیں جنھوں نے اسلام اور اسلامی علوم و فنون کا مطالعہ بڑی دیانتداری سے کرکے ان سے پورا پورا استفادہ کیا، اور مسلمانوں کی علمی دین کے معترف ہوئے، پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن کا شمار انھیں مستشرقین میں کیا جانا چاہئے، انھوں نے فارسی ادب کی تاریخ لکھنے میں مسلمانوں کی خدمات کا صحیح جائزہ لیا، اور اپنے کو ایک سچے ایماندار محقق کی حیثیت سے پیش کیا، انھوں نے ابن ہشام، الطبری، دینوری، بلاذری، مسعودی، یعقوبی وغیرہ کے حوالے سے اپنی تحقیقات کی تکمیل کی،

وہ لکھتے ہیں کہ نوشیرواں کی شاندار حکومت (۵۳۱ء-۵۷۹ء) کے زمانہ میں سب سے زیادہ اہم اس کا بیالیسواں سال (۵۷۲-۳ء) جسے عرب عام الفیل کہتے ہیں، اسی سال ایک طرف تو ایران نے یمن کی سلطنت پر فتح پائی، مگر دوسری طرف مکہ معظمہ میں محمد صَلَّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّم کی ولادت ہوئی، جن کی تعلیمات کے نتیجہ میں ساسانی سلطنت کا خاتمہ ہوا

یہاں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ خسرو انوشیرواں (۵۳۱ء-۵۷۹ء) سخت قسم کا جابر ظالم اور سفاک بادشاہ تھا، جس نے زرتشتی مذہب کے علاوہ کسی مذہب و ملت کو پنپنے نہیں دیا۔ بلکہ سب کا قلع قمع کر دیا، مزدک اپنے زمانہ کا کمیونسٹ تھا، ۵۲۸ء میں اس کا خاتمہ کرکے اس کی تحریک کو کچل کر رکھ دیا ۔ عیسائیوں کو وہ بڑی حقارت سے دیکھتا تھا، مانی

آخری اشکانی بادشاہ اردوان کے چوتھے سال (۲۱۵-۱۶ء) میں پیدا ہوا، اس کے دینی مذہب مانی کو زرتشتیوں نے کچلا، پھر بھی تیرہویں صدی تک اس کے ماننے والے موجود تھے، مگر زرتشتیوں کا اُس نے پورا احترام کیا، اور انھیں ہر طرح کی سہولتیں دیں، نیز اس کے ساتھ وہ بڑا مہربان اور عمدہ بادشاہ تھا، اسی لئے انھوں نے اسے نوشیروان عادل کا خطاب دیا، جو آج ہماری روایتوں کا جزو بن گیا ہے،

بہرحال ایک طرف تو براؤن نے نوشیرواں کو کٹر، متشدد اور متعصب بتلایا ہے مگر دوسری طرف اُسے مامون الرشید اور اکبر جیسے بادشاہوں کا ہم پلہ قرار دیا ہے، اس لئے کہ اس نے سات فلاطونی فلسفیوں کو، جنھیں شہنشاہ جسٹینین نے اپنے وطن سے نکال دیا تھا، پناہ دی،

بہرحال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے براؤن لکھتے ہیں کہ آپ کا کام بہت مشکل تھا، اس لئے کہ ریگستان عرب دل سے مادہ پرست اور متشکک تھے۔ انھیں ماوراء الطبیعیات اور الٰہیات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، نیز انھیں ایسے خدا کی ضرورت نہیں تھی، جو طاقتور تو ضرور ہو مگر اُن سے خدمت اور نفی ذات کا خواہاں ہو،

براؤن کے نزدیک ہجرت (۶۲۲ء) سے لے کر حضرت عمرؓ کی وفات (۶۴۴ء) تک کا زمانہ مقدس اسلام کا سنہرا عہد ہے، جو فلسفی اسلام سے جدا اور الگ ہے،

ایران پر عرب حملے کے باب میں براؤن نے ڈوزی کی کتاب کی بڑی تعریف کی ہے، اس سے ایک طویل عبارت نقل کی ہے، جس کے کچھ حصے یہاں دئے جا رہے ہیں وہ لکھتا ہے:-

"ساتویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں بزنطینی اور ایرانی۔۔۔ حکومتیں مغربی ایشیا پر قبضہ کرنا چاہتی تھیں، بظاہر دونوں سلطنتیں ٹیکسوں کی وجہ سے بیحد خوش نظر آ رہی تھیں، اور اُن کی شان و شوکت اور تعیش کی زندگی ایک

مثل بن گئی تھی، لیکن اندر سے ایک مرض نے دونوں میں گھن لگا دیا تھا، لوگ مطلق العنانیت کے بوجھ کے نیچے دبے جا رہے تھے، دونوں شاہی خاندانوں نے مسلسل دہشت پھیلا رکھی تھی، اور مذہبی تعصب کی وجہ سے لوگوں کو اذیتیں دی جا رہی تھیں، کہ اچانک عرب کے ریگستان سے کچھ نئے لوگ نمودار ہوئے، جو اس سے قبل بے شمار قبیلوں میں بٹے ہوئے اور باہمی جنگ و خونریزی میں مبتلا تھے، مگر اب سب ایک ہو گئے تھے، یہی لوگ تھے جو آزاد، لباس و غذا میں سادہ، شریف اور مہمان نواز اور سمجھدار تھے، لیکن اسی کے ساتھ وہ ایسے غیور اور خوددار، تند مزاج، انتقام جو، سخت دشمن سفاک اور ظالم بھی تھے، کہ دیکھتے دیکھتے قابلِ قدر، مگر سڑی گلی، ایرانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا، قسطنطنیہ کے جانشینوں سے ان کے اچھے صوبے چھین لئے، شیو ٹنی نسل کی حکومت کو اپنے قدموں سے کچل دیا، اور بقیہ یورپ میں ایک دہشت پھیلا دی، دوسری طرف اُن کی فاتح فوجیں ہمالیہ میں داخل ہو گئیں، پھر بھی یہ دوسرے فاتحوں کی طرح نہ تھے، اس لئے کہ یہ ایک نئے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے، ایرانیوں کی ثنویت اور بگڑی ہوئی عیسویت کے خلاف انھوں نے وحدت کا اعلان کیا، جسے لاکھوں آدمیوں نے قبول کیا، اور جو آج بھی انسانوں کے دسویں حصہ کا مذہب ہے۔"

براؤن نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، خلفائے راشدین کا عہد حضرت عثمانؓ کے قتل حضرت علیؓ کی خلافت اور معاویہ کا اس سے انکار، جنگ صفین و جمل و نہروان، خوارج، معاویہ کے ساتھ صلح اور امام حسنؓ کی خلافت سے دست برداری، یزید، معرکۂ کربلا، ابن زبیرؓ اور مختار کی بغاوتیں، عبدالملک کی حکومت، حجاج کے مظالم، لوگوں کے بنی امیہ کے خلاف ہونے، بنی امیہ کے زوال

کے دبنابا ب، عمر بن عبدالعزیز، بنی عباس کے پروپیگنڈے، ایرانیوں کا ان کے ساتھ ہونے، ابو مسلم خراسانی، انقلابیوں کی آنکھ کھلنے، عباسی حکومت، برمکیوں، فوروز کے تہوار کے احیا وغیرہ کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے،

معتزلہ کے ذکر میں براؤن نے دو مستشرق ڈوزی اور اسٹیز کا حوالہ دیا ہے جنھوں نے ان کے متعلق بحث اور تحقیق کی ہے، براؤن کے خیال میں شروع ہی سے معتزلہ یونانی فلسفے سے متاثر تھے، اُن کا خیال ہے کہ عباسی خلیفہ متوکل (؁۸۴۷ء تا ؁۸۶۱ء) کی تخت نشینی پر وہ سیاسی حیثیت سے ختم ہوگئے لیکن ان کے دبستان خیال کی تین سو سال بعد بھی زمخشری جیسے مفسر قرآن نے نمایندگی کی ہے، اس مستشرق نے متوکل کے عہد کو تقلید پسندی کا زمانہ کہا ہے، پھر بھی اشعریوں کے مقابلہ میں اس عہد کو ذہنی قابلیت کے لحاظ سے بلند قرار دیا ہے، اس مستشرق نے ابوالحسن اشعری کا ذکر کرکے ان کے بزرگ، ابوموسیٰ اشعری کو بے عقل کہکر یاد کیا ہے،

اخوان الصفاء کو براؤن نے غیر معمولی جماعت قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں فلوگل اور ڈیلیسی جیسے مستشرقوں کے حوالے دے کر ان کا اچھا تعارف کرایا ہے، ان کا خیال ہے کہ اخوان الصفا نے معتزلہ کے کاموں کو آگے بڑھایا، اور انھوں نے سائنس اور مذہب، اسلام اور یونانی فلسفہ میں تطبیق کی اور تمام علوم کو ملا جلا کر ایک انسائیکلوپیڈیا پیدا کر دیا،

براؤن نے زرتشتیوں کے صاحب کتاب ہونے کے مسئلہ کو بھی اٹھایا ہے، اور اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جمشید کو حضرت سلیمانؑ بتلایا گیا ہے، اسی طرح کوروش کی قبر کو مسجد مادر سلیمان اور مرغاب کی ایک تاریخی یادگار کو تخت سلیمان کہا گیا ہے اُن کے خیال میں یہ سب اس لئے کیا گیا تھا کہ ابتداے اسلام میں زرتشتی یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں سے اتنی

۔ردقیمت میں اضافہ کردائیں، اور اپنے کو اہلِ کتاب کہلوائیں، لیکن ابن مقفع جیسے دانشور نے
ۃ پہلے اس قسم کی باتوں سے انکار کیا ہے، حضرت عمرؓ کو مجوسیوں کے ساتھ اہلِ کتاب جیسا سلوک
رنے میں جھجک ہو رہی تھی لیکن عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اُن سے کہا کہ میں نے پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم
سے سنا ہے کہ ان کے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہئے جو اہلِ کتاب کے ساتھ ہوتا ہے،

ساسانی بادشاہ اپنے کو خدا کی طرف سے نامزد سمجھتے تھے، اور زرتشتیوں کے عقیدہ کے مطابق
ان کو خداداد حقوق حاصل تھے، یہی عقیدہ اور اس قسم کے دوسرے زرتشتی اور ایرانی عقیدے
مسلمانوں کے بعض فرقوں پر اثر انداز ہوئے ہیں، اس کے علاوہ چونکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں
ساسانی سلطنت کا خاتمہ ہوا، اس لئے اُن کے خلاف ایرانی جذبات کارفرما تھے، اس کے برخلاف
ایرانیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت امام حسینؑ کی شادی یزدگرد سوم کی صاحبزادی شہربانو
سے ہوئی جن سے نو امام عالمِ وجود میں آئے، اس طرح بقیہ امام حضرت پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم اور
ساسانی بادشاہوں کی اولاد سے ہوئے، اور وہ بھی خدا کی طرف سے امامت کے لئے نامزد ہوئے
تھے، ایران میں حضرت شہربانو بڑے احترام سے دیکھی جاتی ہیں، اُن کے نام سے ایک پہاڑ
بھی ہے جس کو کوہِ بی بی شہربانو کہا جاتا ہے، اور جو تہران سے ۳/۴ میل جنوب میں ہے،

آگے چل کر براؤن نے زندیق کی بحث اٹھائی ہے، جو دراصل مانی مذہب کے ماننے
والے تھے، آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں وہ اتنے فعال ہو گئے تھے کہ عباسی خلیفہ المہدی
(۷۷۵ء تا ۷۸۵ء) نے ایک مخصوص مفتش مقرر کیا جو زندیقوں کا پتہ لگائے جو بظاہر اسلام کے مبلغ ہونے کا دعویٰ کرتے
مگر درحقیقت مانی مذہب کا پروپیگنڈا کرتے تھے ان میں سے بعض کو امویوں اور عباسی خلفاء نے
قتل بھی کروا دیا تھا،

براؤن کے نزدیک ایران کی فتح کے بعد عربوں کے لئے زیادہ مشکل کام اسلام کے

زرتشتی مذہب پر تیغ کے ذریعہ فتح حاصل کرنا تھا، عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے، کہ اسلامی فاتحین نے
لوگوں کے لئے قرآن اور تلوار کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں چھوڑا تھا لیکن براؤن کے نزدیک
یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ مجوسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کو اجازت دی گئی تھی، کہ وہ اپنے
مذہب پر قائم رہ سکتے ہیں، البتہ انھیں جزیہ دینا ہوگا، اُن کے نزدیک یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ زرتشتیوں
پر کوئی خاص سختی کی گئی ہو یا ایران کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو بلکہ مذہب کی تبدیلی اختیاری تھی

عام طور سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلامی فتح کے بعد تین سو سال تک ایران ذہنی طور سے
کورا تھا لیکن براؤن کے خیال میں یہ زمانہ نئے اور پرانے امتزاج اور خیالات کے حلول اور
تناسخ کا زمانہ ہے، سیاسی اعتبار سے ایران مستقل اور آزاد نہ رہا ہو لیکن ذہنی اور عقلی پہلو
میں اس کی بلندی قائم رہی، اس لیے کہ علم کے ہر شعبہ میں ایرانیوں نے نمایاں حصہ لیا،

براؤن نے اپنی کتاب میں سر ولیم میور، ڈاکٹر گسٹو ویل، گولڈ زیہر، فان والٹن اور دوسرے بہت سے مستشرقوں
کا ذکر کیا ہے جن سے انھوں نے استفادہ کیا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ بہت سے اسلامی علماء کا بھی ذکر کیا ہے،
جن کے تبحر علمی اور دقت نظر کا انھوں نے اعتراف کیا ہے، ان میں سے ایک علامہ شبلی نعمانی بھی ہیں جن
کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "جہاں تک میں فیصلہ کرسکتا ہوں، شروع سے لے کر ستر ہویں صدی کے
آخر تک ممتاز فارسی شعراء کا سیر حاصل اور بہترین تبصرہ (انتہائی بدقسمتی سے) اردو یا ہندوستانی زبان
میں لکھی ہوئی علامہ شبلی نعمانی جیسے ممتاز عالم کی شعر العجم ہے"۔

براؤن کی اس سخت رائے سے ہم میں یہ احساس ہونا چاہیئے کہ ہمارے بزرگوں کے کارنامے
بہتر سے بہتر شکل میں دنیا کے مستشرقین کے سامنے پیش کئے جائیں،

ضرورت ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کی منتخب تصنیفات کو دنیا کی زبانوں خصوصاً انگریزی میں ترجمہ کیا جائے
تاکہ دوسری زبانوں کے لوگ بھی ان سے پورا پورا استفادہ کرسکیں،

کرّوبی اور کرّوبیان کے بارے میں تحقیق

از

ڈاکٹر محمد سلیم اختر دی آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی، کینبرا، آسٹریلیا۔

لفظ کرّوبی یا اس کے زیادہ معروف صیغۂ جمع کرّوبیاں کا قدیم ترین، متفق علیہ اور معلوم سرچشمہ عہد نامۂ عتیق بزبانِ عبرانی ہے، جہاں یہ لفظ بصورت کروب اور اس کی عبرانی قواعد کے رو سے جمع کروبیم دونوں ملتے ہیں[1]۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ لفظ پہلے پہل سرزمین آشور، میسوپوٹیمیا میں انسانی سر والے حیوانی دھڑ والے اُن پر دار مجسموں کے لیے استعمال ہوتا تھا جو عبادت گاہوں اور محلات کے دروازوں کے باہر محافظین کے طور پر نصب کیے جاتے تھے، وہاں سے یہ لفظ کنعانی ذرائع سے عبرانی زبان میں ماخوذ ہوا[2]، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بحث ابھی تک کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہیں پہونچ سکی[3]، بہرحال اتنا مسلّم ہے کہ عبرانی زبان

---

1. THE OXFORD ENGLISH DICTIONARY (A NEW ENGLISH DICTIONARY ON HISTORICAL PRINCIPLES), OXFORD, 1933 Vol VI, P. 325
2. THE ENCYCLOPEDIA AMERICANA, NEW YORK, 1960, Vol VI, P. 420
3. THE ENCYCLPEADIA OF RELIGION AND ETHICS, ed. James Hastings

میں بھی چونکہ اس لفظ کی صحیح وجہِ تسمیہ اور ریشہ پوری طرح روشن نہیں تھے، یہ لفظ یورپین زبانوں میں جوں کا
توں بلا ترجمہ منتقل ہونے لگا، نقل و انتقال کے اس عمل میں اتفاقاً جمع کا صیغہ زیادہ مورد التفات قرار پایا، چنانچہ
ان زبانوں نے اپنے متوازی الفاظ کی اساس اسی کو قرار دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لہجوں کے ادنیٰ اختلاف سے
ایطالیائی اور اسپانیائی زبانوں میں یہ لفظ بالترتیب CHERUBINO اور MERUBIN
بن گیا، جب کہ فرانسیسی، پرتگیزی اور لاطینی میں CHERUBIN کہلایا۔[1]

انگریزی میں یہ لفظ CHERUBIN لاطینی زبان کے راستے وارد ہوا، اور ایک عرصہ تک
اس کے ساتھ ایک اجنبی کا سا سلوک ہوتا رہا، کبھی اس سے مفرد کے معنیٰ مراد لیے گئے، کبھی اسے جمع کی جگہ کھڑا
کر دیا گیا، اور کبھی اس کے سر پر اسم معرفہ کا تاج رکھ دیا گیا، پھر انجیل مقدس کے تراجم کے دوران رفتہ رفتہ اس کی
جگہ CHERUB اور CHERUBINS کی بجائے پہلے CHERUBIMS
اور پھر CHERUBIM استعمال ہونے لگے، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے CHERUB کا
صیغۂ جمع CHERUBS بھی معرض وجود میں آ گیا۔[2]

مغربی زبانوں کے برعکس عبرانی کے عربی سے قریب ہونے کے باعث لفظ کروب من و عن موخر الذکر
زبان میں وارد ہوا، لیکن تداول کا شرف اس کے مترادف کروبی کو شاید زیادہ حاصل ہوا، عربی متون میں
اس لفظ کے استعمال کی قدیم ترین مثال جس کا سراغ ہم لگا سکے ہیں، امام عبداللہ بن عمر بیضاوی (متوفی ۱۹ء/۱۳۱۶ء/۷۱۶)
کے یہاں ملتی ہے، سورۂ مومن کی ساتویں آیت:

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ	جو لوگ عرش کو اٹھائے ہوئے اور جو اس کے گرد اگرد (حلقہ
يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ	باندھے ہوئے) ہیں (یعنی فرشتے) وہ اپنے پروردگار کی تعریف کے

---

[1] THE OXFORD ENGLISH DICTIONARY, op. cit., p. 325

[2] ایضاً، المنجد فی اللغۃ والعلوم، بیروت ۱۹۶۹، الطبعۃ العشرون، ص ۹۶۹۔

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا... ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور مومنوں کیلئے بخشش مانگتے رہتے ہیں کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں کہ کروبین سے مراد سب سے اعلیٰ درجہ پر فائز اور سب سے پہلے تخلیق ہونے والے فرشتے ہیں[۱]، جن کی تعداد عرش خداوندی کے گرد بعض تفاسیر کے مطابق ستر ہزار ہے[۲]۔

فارسی متون میں لفظ کروب بمعنی فرشتہ یا فرشتۂ مقرب کہیں دکھائی نہیں دیتا، اس کے برعکس کروبی اور اس کی فارسی جمع (کروبی با اضافۂ علامت جمع : ان) کروبیان کے موارد استعمال کی کمی نہیں، مثالیں ملاحظہ ہوں:

حکیم سنائی غزنوی | برنہ قدم اے شمع دین کز بہر روح الامین ؛ کروبیانت بر یمین، روحانیانت دست چپ[۳]

---

[۱] THOMAS PATRICK HUGHES, DICTIONARY OF ISLAM, NEW DELHI 1976 REPR., P. 50, II. CF. THE ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS, op. cit., P. 512. ('JEWISH TRADITIONAL EXEGESIS ADDS LITTLE CONCERNING WHICH THERE IS GENERAL AGREEMENT BUT PRESERVES THE OPINIONS OF SEVERAL EXEGETICAL AUTHORITIES OR GROUPS OF AUTHORITIES: THERE WAS A VIEW, BASED PROBABLY ON JOB 38 (7), THAT ANGELS, INCLUDING THE CHERUBIM WERE CREATED ON THE FIRST DAY, AND WERE INDEED THE FIRST THINGS CREATED; BUT THE VIEW NEVER BECAME GENERAL, THROUGH FEAR OF THE INFERENCE THAT CHERUBIM ASSISTED God AT THE WORK OF CREATION).

[۲] THOMAS PATRICK HUGHES, op. cit., P. 50, i.

[۳] دیوان حکیم سنائی، بکوشش دکتر مظاہر مصفا، تہران ۳۶ ہ۔ شمسی، ص ۴۰۔

ہمتِ گردبیاں شعبدۂ دستِ تست — سرمۂ روحانیاں، خاکِ کفِ پائے تست[1]

عطار نیشاپوری | ہمہ گردبیان پر برکشادہ — بپرِ خاکِ رہش بر سر نہادہ[2]

گفتی آں آب را کہ عرش بر دست — اشک گردبیاں ہمی پاید[3]

انوری ابیوردی | حق میکال، خواجۂ ملکوت — کہ ز گردبیاں مہینہ تر ست[4]

خاقانی شروانی | ... گر ناظر چراغی اگر منتظر آفتاب، نہ زہش نور گردبیان در زہِ گریبانِ تست، از چراغ مستعار چہ ہمی طلبی؟ ...[5]

سعدی شیرازی | کسی بدیدۂ انکار اگر نگاہ کند — نشانِ صورتِ یوسف دہد بناخوبی

اگر بچشمِ ارادت نگہ کنی در دیو — فرشتہ ایت نماید بچشم کروبی[6]

بتہدید اگر برکشد تیغِ حکم — بمانند کروبیان صمّ و بکم[7]

نظیری نیشاپوری | اے از صفائے دل ہمہ نور و صفا شدہ — برتر ز آفرینشِ ارض و سما شدہ

گلبانگِ حمد بردہ بکروبیانِ عرش — از کبریائے حق ہمہ تن کبریا شدہ[8]

میرزا مہدی خان استرآبادی | .... و زمانہ از روئے ترحیب و ترجیب، بر جیب و گریبان کروبیان، از ذکر دبیان و دعای دولتش زیحِ شمیم شمامۂ عنبر رضوع لبیحۂ مشک اذفر کرد ...[9]

---

۱ دیوان حکیم سنائی، بکوشش دکتر مظاہر مصفا، تہران ۱۳۳۶ شمسی ص ۹۷، ۲ اسرارنامہ باہتمام دکتر سید صادق گوہرین تہران ۱۳۳۸ شمسی ص ۲۳ ۳ دیوان غزلیات و قصائد عطار باہتمام و تصحیح دکتر تقی تفضلی تہران ۱۳۴۱ شمسی ص ۲۷۰۔ ۴ شرح لغات و مشکلات دیوان انوری ابیوردی تالیف دکتر سید جعفر شہیدی تہران ۱۳۵۷ شمسی ص ۱۰۰، ۵ منشآت خاقانی از افضل الدین بدیل بن علی خاقانی بہ تصحیح و تحشیۂ محمد روشن تہران ۱۳۴۹ شمسی ص ۱۷، ۶ متن دیوان کامل شیخ اجل سعدی شیرازی بکوشش مظاہر مصفا تہران ۱۳۴۰ شمسی ص ۸۰، ۷ ایضاً ص ۱۴۱، ۸ دیوان نظیری نیشاپوری باہتمام مظاہر مصفا تہران ۱۳۴۰ شمسی ص ۵۶۷، ۹ درۂ نادرہ تالیف میرزا مہدی خان استرآبادی باہتمام دکتر سید جعفر شہیدی تہران ۱۳۴۱ شمسی ص ۳۴۳۔

بسا اوقات لفظ کروبی اپنے اصل مفہوم یعنی مقرب کے معنوں میں ملائکہ کی صفت کے طور پر بھی مورد استفادہ قرار پاتا ہے، اس کی ہمیں صرف دو مثالیں دستیاب ہو سکی ہیں۔

نظامی عروضی سمرقندی | حمد و شکر و سپاس مرآں پادشاہی راکہ عالم عود و معاد را بتوسط ملائکہ کروبی در وجود آورد۔[2]

خاقانی شروانی | یہ ذات نامحسوس الٰہی و بہ ملائکہ کروبی ... کہ حضرت عظمی یگانگی را نصرہ اللہ تعالیٰ ... دولت خواہ تر از بندہ بر روئے زمین کس نیست۔[3]

اردو زبان میں بھی جو بقول مولانا شبلی فارسی کا دودھ پی کر پروان چڑھی ہے، بظاہر فارسی ہی کے زیر اثر یہ لفظ آیا ہے، اور اسے لاطینی الاصل[4] قرار دینا درست نہیں، اردو میں اس لفظ کے استعمال کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

---

۱ THOMAS PATRICK HUCHES, OP. cit. p. 50, 1.

۲ چہار مقالہ تالیف احمد بن عمر بن علی نظامی عروضی سمرقندی، بکوشش دکتر محمد معین، تہران ۱۳۳۳ شمسی، چاپ سوم، ص ۱ ۳ منشآت خاقانی ص ۳۳۱ ۴ ملاحظہ ہو، ڈاکٹر ریاض الحسن، اردو میں ایک لاطینی لفظ، ماہنامہ قومی زبان کراچی، جلد ۱۰، شمارہ ۱۲ (دسمبر ۱۹۵۸ء) ص ۴۱، موصوف کا خیال ہے کہ لفظ کروبی لاطینی لفظ CHERUB سے ماخوذ ہے، جس کا تلفظ "کیروب" ہے لیکن اکثر انگریزی داں لوگ اس کا تلفظ "چیرب" کرتے ہیں۔ اول یہ کہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اسلامی ادبیات میں یہ لفظ براہ راست عبرانی زبان سے وارد ہوا، اور دوسرے یہ کہ CHERUB کا زیادہ مستند و متداول تلفظ وہی ہے جو اکثر انگریزی داں لوگ کرتے ہیں، اور اس کی تائید انگریزی زبان کی درج ذیل دو عظیم فرہنگوں سے بھی ہوتی ہے:
i) THE OXFORD ENGLISH DICTIONARY, op. cit., 325;
ii) WEBSTER'S THIRD NEW INTERNATIONAL DICTIONARY SPRINGFIELD MASSACHUSETTS, 1961, 385
موخر الذکر نے "کیرب" تلفظ بھی ضبط کیا ہے، لیکن محض متبادل کے طور پر عام فرہنگوں میں یہ متبادل درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔

خواجہ میر درد | دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو — ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں[1]

میرزا محمد رفیع سودا | آہ و نالہ سے ساتوں فلک تا عرش — رہتے ہیں پنبہ بگوش اب روز و شب کرّوبیاں[2]

بدقسمتی سے فارسی کی طرح اردو امثلہ و نظائر سے بھی لفظ کرّوبیان کے مفہوم کا خاطر خواہ طریقے سے واضح نہیں ہوتے اور نہ ہی متداول فرہنگیں اس سلسلہ میں قاری کی پوری طرح پیاس بجھاتی ہیں۔ مثال کے طور پر برہانِ قاطع[3] میں کرّوبیان کی تشریح یوں کی گئی ہے:

"فرشتگانِ مقرب را گویند، وایشان را در عالمِ اجسام ہیچ تعلق و تدبیر و تصرفے نیست۔"

کم و بیش ایسی ہی توضیحات دوسری کتبِ لغت[4] میں ملتی ہیں۔ بعض مآخذ کی رو سے لفظ کرّوبیون (عربی جمع کرّوبی) کا اطلاق فرشتگانِ چہارگانہ جبرائیل و میکائیل و اسرافیل و عزرائیل پر ہوتا ہے[5]۔ بعض اسرائیلی روایات میں کرّوبیوں کو مختلف صفاتِ خداوندی کی مجسم صورت سے تعبیر کیا گیا ہے، اور علم کو اُن کی امتیازی خصوصیت گردانا گیا ہے[6]۔ زمانۂ ماقبل مسیحیت میں لفظ معانی و تعبیرات کے اعتبار سے جن مختلف مراحل سے گذرا، ان میں ایک بات بہرحال مشترک ہے، اور وہ یہ ہے کہ کرّوبیوں کا ذاتِ ایزد تعالیٰ سے نزدیکی اور تعا

---

1 بہ نقل از ڈاکٹر ریاض احسن، ص ۴۱   2 ایضاً کلیات سودا، الٰہ آباد ۱۹۶۱ء حصۂ دوم، ص ۲۱۔

3 تالیف محمد حسین بن خلف تبریزی متخلص بہ برہان، بہ اہتمام دکتر محمد معین، تہران ۱۳۴۲ شمسی چاپ دوم، جلد سوم ص ۱۶۲۹۔ 4 مثلاً ملاحظہ ہو: فرہنگ آنندراج، تالیف محمد پادشاہ متخلص بہ شاد، زیر نظر محمد دبیر سیاقی، تہران، جلد پنجم، ص ۳۳۹۹۔

5 THOMAS PATRICK HUGHES, op. cit. ff; CF. THE ENCYCLOPEDIA AMERCANA op. cit. P. 420

6 THE ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS, op. cit., p 510.

پہلے پہل ان کو ذاتِ باری تعالیٰ کے ایسے ممتاز پیشکار کا درجہ دیا گیا جن کی وساطت سے اللہ تعالیٰ انسانوں
سے رابطہ قائم کرنے اور کائنات میں مختلف امور کی انجام دہی کا کام لیتا تھا، لیکن بعد میں انہیں محض
مقربینِ ایزدی مانا جانے لگا، پھر ایک ایسا دور بھی آیا جب لوگوں نے عام فرشتوں اور کروبیوں میں امتیاز
کرنا ترک کر دیا، جب فکر، اندیشے، اور اعتقاد کی کیفیت بھی دوام نہ پیدا کر سکی تو کروبیوں کو بارگاہِ ربانی
میں حضورِ دوام کی خصوصیت سونپ دی گئی (جس کی صدائے بازگشت برہان قاطع کی مندرجہ بالا تعریف
میں سنائی دیتی ہے) اور فرشتوں سے مراد وہ مخلوق لی جانے لگی جس کے ذمہ اللہ تعالیٰ کے لیے پیغام رسانی
اور اس کے دیگر احکام کی بجا آوری تھا۔[1]

CHERUB اور CHRUBIM کے الفاظ انجیل مقدس میں بھی بکثرت استعمال
ہوئے ہیں، لیکن ان سے اس مخلوق کی کوئی مشخص اور دقیق تعریف یا تصویر قاری کے سامنے نہیں آتی،[2]
تاہم چوتھی صدی عیسوی کے راہب دیونیس[3] سے باشتباہ منسوب ایک ملکوتی نظامِ مراتب میں کروبیوں
کو جن کی نمایاں خصوصیت ان کی علمیت ہے، SERAPHIM کے بعد، جن کا طرۂ امتیاز عشقِ
خداوندی ہے، مقرب ترین ملائکہ قرار دیا ہے۔[4]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عربی، فارسی، اردو (اور غالباً دوسرے اسلامی ادب) پر اسرائیلیات کا اثر
مسیحی روایات سے زیادہ مستحکم ثابت ہوا، اور اس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلا کہ کروبیوں کو ذاتِ بحت کے مقرب ترین

۱۔ The Encyclopaedia of Religion and Ethics
Op. cit., P. 513

۲۔ ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA, LONDON, 1961, p. 419

۳۔ DIONYSIUS THE AREOPAGITE

۴۔ ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS op. cit., p. 513

ملائکہ ہی سے تعبیر کیا جاتا رہا۔

یہاں شاید اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ انگریزی ادب میں کیروبی یا کروبیوں کے الفاظ مجازی طور پر انتہائی معصوم بچوں، غیر معمولی طور پر خوبصورت خواتین، اور حد درجہ کی ذہین اور نابغہ شخصیات کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں[1]۔ اور شکسپیر نے تو ان کا اطلاق بعض اخلاقی اوصاف پر بھی کیا ہے[2]، ہمارے یہاں کم از کم فارسی اور اردو ادب میں ایسے موارد میں کروبی کے بجائے فرشتہ کا لفظ زیادہ مستعمل ہے، اور فرشتہ تن، فرشتہ خصال، فرشتہ خو، فرشتہ رخ، فرشتہ سرشت، فرشتہ سیرت، فرشتہ لقا، فرشتہ منش، فرشتہ نما، فرشتہ نہاد اور فرشتہ وش ایسی بے شمار تراکیب اس کا منھ بولتا ثبوت ہیں، کروبی کا اس طرح کا استعمال اول تو ہے نہیں، اگر کہیں نظر بھی آ جائے تو اس کی حیثیت اصول سے زیادہ استثنا کی ہوتی ہے۔

---

[1] THE OXFORD ENGLISH DICTIONARY, op. cit. p. 326

[2] PATIENCE, THOU YOUNG AND ROSE-LIPP'd CHERUBIN
OTHELLO, ACT iv, Sc. 2, 1. 63

از

جناب ڈاکٹر حامد افاق قریشی صاحب، مہانگر لکھنؤ

اودھ کے چوتھے نواب آصف الدولہ کی نوابی کے دور میں لکھنؤ میں مرزا فاخر تمکین اور مرزا رفیع سودا کی چشمک کا واقعہ کافی مشہور ہے لیکن افسوس ہر کسی نے بھی نہ تو اس واقعہ کی صحیح تفصیلات ہی لکھی ہیں اور نہ اس کی تاریخ متعین کرنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ اودھ کی تاریخ پر تحقیقی کام کرنے کے دوران مجھے ایسا مواد مل گیا ہے جس کی مدد سے اس چشمک کی تفصیلات بھی فراہم ہو گئی ہیں، اور اس کی تاریخ بھی متعین ہو گئی ہے،

اوس ذکر کو سن من وعن اب میری زباں سے
کھینچوں میں اس احوال کی تقریر میں تصویر

اودھ کے نوابی دور میں اشرف علی خاں فغاں نام کے ایک با اخلاق و مہذب بزرگ تھے، جن کا تعلق شرفا کے ایک عمدہ گھرانے سے تھا۔ ان کو نوجوانی سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا اور پیری تک رہا۔ انھوں نے پندرہ ۱۵ برس کی محنت شاقہ کے بعد مختلف تذکروں اور دواوین سے انتخاب کر کے تقریباً ایک لاکھ اشعار پر مشتمل ایک تذکرہ لکھا،

ان دنوں تمکین کی فارسی دانی کی شہرت تھی، اشرف علی کو اپنے انتخاب سے اطمینان نہ تھا، اس لئے وہ اپنے تذکرہ کو تمکین کے پاس اصلاح کے لئے لے گئے۔ الحاح و سماجت کے بعد تمکین اس شرط پر اس تذکرہ کی تصحیح کرنے کے لئے تیار ہوئے کہ تمام شعرائے ہند مثلاً فیضی، غنی، نسبتی،

ناصر علی، بیدل، سراج الدین علی خاں آرزو اور میر شمس الدین فقیر وغیرہم کے جو بھی اشعار اس تذکرہ میں ملیں گے انھیں وہ قلم زد کر دیں گے اور شعراے اہل ولایت کے انتخاب اشعار کی تصحیح بھی کرتے جائیں گے، یہ سن کر اشرف علی اس تذکرہ کو ان کے پاس سے لے آئے، اور اس کی تصحیح کرانے سے باز آگئے

چند سال کے بعد اشرف علی اس تذکرہ کے تین جز شیخ آیت اللہ ثنا کے پاس تصحیح کے لئے لے گئے، انھوں نے کچھ حصہ کو دیکھ کر اس کی تصحیح کر دی لیکن کچھ عرصہ کے بعد انھیں لکھنؤ سے فیض آباد جانا پڑا، اور اس کے بعد کچھ نامعلوم اسباب کی بنا پر وہ اس کام کو انجام نہ دے سکے،

اشرف علی ایک بار پھر اس تذکرہ کو لے کر مکین کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس کی تصحیح کرنے کے لئے گذارش کی،

اس تذکرہ کو لے گئے القصہ وہ اس پاس   تا دیکھے وہ اس تذکرہ کے شعر تباخیر

جو شعر ہو حیثیت اس میں کرے صاد وہ حق   اور حشمت کے احوال کو دیوے نہ وہ تغیر

مکین نے ان اجزا کو جن کو شیخ آیت اللہ نے تصحیح کیا تھا، دیکھنے کے بعد کہا کہ وہ اس تذکرہ کی تصحیح اس وقت کریں گے جب وہ اس کے لئے ایک تحریر لکھ کر دیں، اشرف علی نے ایک تحریر لکھکر ان کی خدمت میں پیش کی لیکن اس کو دیکھ کر انھوں نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے اسے پھینک دیا اور کہا کہ جس قسم کی تحریر وہ کہیں آپ اسی قسم کی دیں، اشرف علی خاں اس کے لئے بھی تیار ہو گئے،

اس کے بعد مکین نے اشرف علی سے کہا کہ اس نوشتہ میں یہ لکھو کہ میں اس تذکرہ کو پہلے مرزا فاخر سلمہ کی خدمت میں برائے تصحیح اشعار و عبارت لے گیا تھا لیکن موصوف بسبب کثرت اشغال اس کے لئے فرصت نہ نکال سکے، اس لئے اس کے تین جز کو شیخ آیت اللہ ثنا کے پاس جن پر مجھے اس فن کے استاد ہونے کا گمان تھا، لے گیا، انھوں نے کچھ مقامات کو جو کہ غلط تھے،

سمجھا گمان سے درگزر کیا۔ اور بعض مقامات کو غلط سمجھ کر ان کی تصحیح کر کے بالکل مسخ کر دیا، لہذا دوسری بار تمام آرزو کے ساتھ میں نے اس کو مرزا فاخر مکین صاحب کی خدمت میں تصحیح کے لئے پیش کیا، جو کہ اس فن کے استاد ہیں۔ بلکہ ان کی مثل اس خطہ، زمانہ یا اس شہر میں کوئی دوسرا صاحب کمال نہیں ہے،

استاد مکین کے اس مضمون کو سن کر اشرف علی نے دل میں تو بڑا پیچ و تاب کھایا لیکن مرتا کیا نہ کرتا، صرف اتنا کہا کہ اس تحریر میں شیخ آیت اللہ کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ وہ اس بندہ کے آشنا ہی نہیں بلکہ مسلم الثبوت استاد بھی ہیں، مکین پر ان کی اس بات کا کوئی اثر نہ ہوا، اور وہ اسی تحریر کے لکھنے پر مصر رہے، عاجز ہو کر اشرف علی کو مکین کے بتائے ہوئے مضمون پر ہی اپنی مہر ثبت کرنی پڑی،

تذکرہ مشاہیر کے حالات اور کارناموں سے مزین تھا لیکن پھر بھی اس کی تصحیح کرنے میں مکین نے جو جارحانہ انداز اپنایا، وہ ذیل کے اشعار سے عیاں ہے،

اصلاح کی لکھوا سند اشرف علی خاں سے
وہ تیلیے مسند تعلیم جہا ہیر

اس طرح ہوا تذکرہ او پر متوجہ
کرتی ہے زبان جس کے بیاں کرنے میں تاخیر

تن پر نہ رکھا ایک کے سر ان میں سے آخر
لی ہاتھ جو ظالم نے قلم اپنے کی شمشیر

آئے وہ سب اس طرح بزیر قلم اس کے
جوں فوج گنہگاروں کی آئے تہ شمشیر

اشرف علی کو اس کی خبر ہوئی تو ان کی حالت غیر ہو گئی، وہ اسی سراسیمگی کے عالم میں کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح مکین کے پاس پہونچے، اور کافی گرما گرمی کے بعد وہ اس تذکرہ کو اپنے گھر لے آئے،

گھر لا کر جب اشرف علی نے تصحیح شدہ تذکرہ دیکھا تو وہ اور زیادہ رنجیدہ ہوئے، انھوں نے

گوشہ نشینی اختیار کر لی، اور ان اشعار کو جن کو مکین نے قلم زد کر دیا تھا، صاف کرنے میں ما شغول رہنے لگے، کچھ دن اسی طرح بیت گئے، ایک دن وہ مکین کے اس تصحیح کردہ تذکرہ کو لیکر مرزا رفیع سودا کی خدمت میں حاضر ہوئے جن سے ان دیرینہ شناسائی تھی، اور انصاف کے طالب ہوئے،

اشرف علی کا مدعا سن کر سودا نے اُن سے کہا کہ انھیں فارسی زبان سے زیادہ ربط نہیں، وہ تو اردو میں قصیدہ اور غزل تھوڑا بہت کہہ لیتے ہیں جس کو لوگوں کی قدر دانی کے سبب سے قبولیت کا درجہ حاصل ہو گیا ہے، مرزا فاخر صاحب کے کمالات میں کوئی شک نہیں ہے، انھوں نے جو کچھ کہا ہے، سوچ سمجھ کر، اور سنجیدگی ہی سے کہا ہوگا، اگر آپ انصاف ہی طلب کرنا ہے تو فارسی کے سخنورانِ فن کے پاس جائیں، اس دور میں شیخ محمد علی حزیں کے شاگرد شیخ آیت اللہ ثنا اور میر شمس الدین فقیر کے شاگرد مرزا بھچو ذرہ موجود ہیں، اُن کے علاوہ مرزا بو علی ہاتف بنگال، نظام الدین بلگرامی صانع فرخ آباد، اور شاہ نور العین واقف شاہ جہان آباد میں موجود ہیں، آپ اُن لوگوں کے پاس جائیں، اور اس بندہ کو معاف کریں،

انصاف طلب ہو جسے اون اشخاص سے جاکر
جو فارسی گوئی میں ہیں بالفعل مشاہیر

میں ریختہ گو ہوں مجھے اب رکھئے معاف آپ
دکھلایئے اس کو نہیں اچھی یہ تدبیر

یہ جواب سُن کر اشرف علی نے سودا سے کہا کہ ان نامور فارسی دانوں کو تو مکین خاطر میں بھی نہیں لاتے، ان کا کہنا ہے کہ شمس الدین فقیر نے اپنے رسالہ عروض میں پانچ چھ جگہ فاش غلطیاں کی ہیں، انھیں شیخ آیت اللہ ثنا کے اشعار پر اعتراض ہے، اور نور العین واقف کے متعدد اشعار میں بھی انھوں نے تصحیح کی ہے،

اشرف علی کا جواب سن کر سودا نے بدرشتی کہا کہ صاحب جب مرزا مکین کو کسی کا اعتبار

ہی نہیں ہے تو آپ اس بندہ سے کیا انصاف طلب کر رہے ہیں، بندہ کو تو ان لوگوں کے مقابلہ میں دانائی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے،

سودا کا یہ جواب سن کر اشرف علی اور زیادہ رنجیدہ و آزردہ ہو گئے، اور جبراً و قہراً اس تذکرہ کو ان کے یہاں چھوڑ کر اپنے گھر چلے گئے،

اس کے بعد سودا نے اس تذکرہ کو وقتاً فوقتاً دیکھنا شروع کیا، اور جب وہ ان مقامات کی طرف متوجہ ہوئے جہاں مکین نے اپنی تیغ اصلاح چلائی تھی، تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی،

سودا ہوا اس دم گلِ تصویر سا حیراں   یوں دیکھی جب اکی وہ جنبندیِ تحریر

اصلاح کے نام پر مکین نے اس تذکرہ میں عجب ستم ظریفیاں کی تھیں، اور فصیح و بلیغ کلام میں قطع و برید کر کے طرح طرح کے گل کھلائے تھے، کسی مصرع کو کاٹ دیا تھا اور کسی میں اصلاح کر دی تھی، بہت سے اشعار اور الفاظ کو بے معنی کہہ کر تضحیک کی تھی، کہیں معنی سے گذر کر رعایتِ لفظی سے کام لیا تھا اور کہیں الفاظ و معانی کو تبدیل کر دیا تھا، کہیں بے معنی و ناموزوں کہہ کر صفحات کے صفحات اشعار کو قلم زد کر دیا تھا، ستم یہ کہ یہ سلوک کسی ایک واحد شاعر کے ساتھ نہ تھا، بلکہ متقدمین، متوسطین اور متاخرین ہر دور کے شعرائے کرام پر مکین نے اسی طرح کی گرفت کی تھی، اور حالت یہ تھی کہ

اس تذکرہ پر ہاتھ وہ اس طرح کیا صاف   جس طرح سے جو زنگ لگاتے ہیں بہ شمشیر

ان سب باتوں میں دو باتیں سودا کو سب سے زیادہ کھٹکیں، ایک تو یہ کہ مکین نے استادانِ مسلّم الثبوت کے کلام کو قلم زد کر دیا تھا، اور دوسرے یہ کہ انھوں نے ان لوگوں کو جو کہ اس دنیا میں کوچ کر گئے تھے، اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا تھا،

اس کے بعد سوداؔ نے مکین کے دیوان کو جو ان کے پاس ایک صاحب تو قیر لے گئے تھے بغور دیکھا، تو اس میں متعدد الفاظ و معانی گرہ گیر تھے،

سودا نے مکین کی بے جا خامہ فرسائی اور ان کے کلام کے سقم کو واضح کرنے کے لئے ایک علمی رسالہ لکھا جس کا نام انھوں نے "عبرۃ الغافلین" رکھا،

کی اس نے رسالہ کی غرض پانچ ہیں فصلیں — پہلے میں تو لکھنے کے رسالہ کی ہے تقریر
اور دوسری وہ فصل کہ جس میں ہیں وہ اشعار — جو اس کے قلم کے تھے ہوئے طعمۂ شمشیر
اور تیسری وہ فصل کہ اصلاح کر اس نے — استادوں کے اشعار کئے ہیں زبر و زیر
اور فصل چہارم میں وہ اشعار مکیںؔ کے — کس لطف سے تقریر کو لایا ہے بہ تحریر
پنجم میں وہ اشعار ہیں کہ کر اصلاح — سودا نے جن اشعار کے دی معنی کو توقیر

جب مندرجۂ بالا رسالہ تیار ہو گیا اور اس کی شہرت ہوئی، تو مکینؔ بہت گھبرائے، اور اپنے ان اشعار کی اسناد وسے کر جن پر سوداؔ نے گرفت کی تھی، اپنے شاگرد بقاؔ اللہ خاں بقاؔ کو سودا کے پاس مناظرہ کے لئے بھیجا، ان میں کئی دن تک باہم تکرار رہی، اور آخر کار تان یہاں آکر ٹوٹی،

مکین کا ایک شعر تھا،

گرفتہ بود درین بزم چون قدح دل من — شگفتہ روے صہبا شگفتہ کرد مرا

اس پر سوداؔ کا یہ اعتراض تھا،

سوداؔ کی یہ اس شعر پہ حجت تھی کہ تو نے — کس واسطے باندھا ہے قدح کے تئیں دلگیر
وے گئے ہیں قدح کو دو گل و لالہ سے تشبیہ — جو ڈال گئے شعر کی بنیاد کی تعمیر
ہے شکل گل و لالہ شگفتہ کی گرفتہ — بیہودہ واہی منکر اس رنگ سے تقریر
صورت گل و لالہ کی اگر ہوتی گرفتہ — کب کرتی پیالہ کے تشابہ سے وہ تدبیر

ں کے جواب میں مکین نے بقا کو باذل کا یہ شعر لکھ کر دیا،

چہ نشاط باده بخشد بمن خراب بے تو   بدل گرفتہ ماند قدح شراب بے تو

ور کہا کہ اس سند کو دکھا کر تم سودا کو زیر کرنا اور پھر یہ تقریر کرنا،

ہے ستم سبھی شعر میں اس طرح ہمارے   ہے ان کے سمجھنے میں ترے فہم کی تقصیر

یہ جواب سن کر سودا نے بقا سے کہا کہ اے فہم کے دشمن پہلے اس شعر کے معنی سمجھ اور پھر اس کو تذکیر میں لا کیونکہ یہ شعر تو میرے اعتراض کی تائید کرتا ہے نہ کہ رد،

جب یہ شعر بھی مکین کے شعر کی سند نہ ٹھہر سکا تو بقا دلگیر ہو کر وہاں سے اٹھے اور اپنی شکست کا حال جا کر مکین کو سنایا،

سخن کے میدان میں شکست خوردہ ہونے پر مکین نے اپنی خفت مٹانے کے لئے اپنے تمام شاگردوں کو جن میں شیخ زادگان لکھنؤ کی تعداد زیادہ تھی، جمع کیا، اور کہا کہ تم سودا کے گھر جاؤ، اس کی تذلیل کرو۔ اور اس کو مجھ سے بحث کرنے کے لئے یہاں پکڑ کر لاؤ،

مکین کا اشارہ پاتے ہی اس کے تمام شاگرد خنجروں اور شمشیروں سے لیس ہو کر سودا کے گھر جا دھمکے، سودا نے بتعظیم و اخلاق ان کا خیر مقدم کیا، ان لوگوں نے بیٹھتے ہی سودا سے کہا کہ آپ کو مکین نے بلایا ہے، اس لئے چلنے میں تاخیر نہ کریں، انھوں نے خفقان کا عذر کیا اور کہا کہ میں مکین کے یہاں کل حاضر ہو جاؤں گا،

سودا کا جواب سنتے ہی ایک شخص نے ان کی کوکھ پر چھری رکھ دی، اور دو برہنہ شمشیریں لے کر ان کے سر پر کھڑے ہو گئے، اور کہا کہ ہم لوگ آپ کو اسی وقت مکین کے پاس لے چلیں گے اس لیے دیر نہ کریں، اور اس رسالہ کو بھی ساتھ لے لیں، جو آپ نے لکھا ہے، ان کا یہ رنگ دیکھ کر سودا کو ان کے ساتھ جانے ہی میں اپنی عافیت نظر آئی اور وہ اپنے میانہ کو منگوا کر اس پر

سوار ہو گئے، اس حالت میں بھی ایک شخص چھری لے کر ان کے ساتھ میانہ میں سوار ہو گیا،

ابھی وہ لوگ سودا کے گھر سے دس قدم ہی چلے ہوں گے کہ آصف الدولہ کے چھوٹے بھائی سعادت علی خاں کی سواری فوج و حشم کے ساتھ ادھر سے گذری، انھوں نے سودا کو ایک میانہ میں سوار اور ان کے اردگرد ایک جم غفیر دیکھ کر ان سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ اس معاملہ کا حال سن کر انھوں نے سودا کو بہ تیز اپنی خواصی میں جگہ دی، اور ان شر پسند عناصر کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا لیکن وہ سب کے سب وہاں سے رفو چکر ہو گئے،

جس طرح کمان سخت میں سے جائے نکل تیر | یاروں سے خبردار ہوں جاتے رہے وہ یوں
یوں آگے کا احوال کیا خامہ نے تحریر | اس لشکر حقہ نے تو یہ دی اوران کو ہزیمت

اس کے بعد سعادت علی خاں سودا کو اپنے گھر لے گئے، اور فرمایا کہ میں اس عہد کا حاکم نہیں ہوں، اس لئے مجبور ہوں، ورنہ تم دیکھتے کہ میں ان کی کیسی تعزیر کرتا، ان شرارت پسندوں سے ان کو محفوظ رکھنے کے لئے سعادت علی خاں نے سودا کو کچھ دن اپنے مکان میں رہنے کی بھی پیش کش کی،

سودا نے سعادت علی خاں کی کرم فرمائی کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا، اور کہا کہ مجھے مکین سے کوئی عداوت نہیں، بلکہ محض سخن کی تکرار تھی، شاعروں کے لئے جنگ سخن کرنے کے لئے تیغ زبان سے بڑھ کر کوئی اور شمشیر نہیں ہوتی، مکین کی تیغ سخن اصالت نہیں رکھتی، اس لئے انھوں نے شمشیر سے لڑنے کی تدبیر کی لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب ان کے حق ہی کی تقصیر ہے میں مسلم الثبوت استادوں کی وہ تحقیر گوارا نہ کر سکا، جو مکین نے اشرف علی کے تذکرہ کی تصحیح کرنے میں کی تھی، اس لئے میں نے وہ رسالہ لکھا تھا، اور مکین کے اشعار پر بھی بجا گرفت کی تھی، یہ سب کچھ عرض کر کے سودا سعادت علی خاں سے رخصت ہو کر اسی شب اپنے گھر

واپس لوٹ آئے،

جب نواب آصف الدولہ کو اس کی خبر پہنچی تو وہ آگ بگولا ہو گئے،

یہ شعلہ در آتش خشم و قہر کے اس کے | اس سخط تھی ظاہر ہے بیاں جسکی ہیں تقریر
بجھتی نہ تھی آتش غضب و غصہ کے اس کے | ہر چند کہ ارکاں تھے بجھانے کی بتدبیر

اور اپنے نائب مختار الدولہ کو بلا کر حکم دیا کہ مکین کو فوراً جلا وطن کر دو، اور شیخ زادگان

لکھنو کے محلہ کو کھدوا کر پھنکوا دو، اور ان کے بچوں بوڑھوں کو گنگا پار بھجوا دو،

لاؤ میرے احکام کو تم جلد عمل میں | خاصہ میں نہ کھاؤں گا اگر اسمیں ہوئی دیر

نواب صاحب کے اس حکم کو سُن کر مختار الدولہ حیران و ششدر رہ گئے، ان دنوں وہ

شیخ زادگانِ لکھنؤ کی سرداری کر رہے تھے، اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہتے تھے،

اس لئے انھوں نے اپنے اہلکاروں کو طلب کر کے حکم دیا کہ شیخ زادگانِ لکھنو اور مکین کو فوراً

سودا کے پاس لیجاؤ اور یہ کہو

حاضر ہوئے ہیں آج گنہگار تمھارے | جس طرح انھیں چاہئے اب دیجئے تعزیر

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، اور وہ لوگ اس عالم میں سودا کے سامنے حاضر ہوئے کہ

سودا کنے جس وقت کہ ان کے تئیں لائے | خجلت سے ہر اک ان میں تھا غرقِ خوئ تشویر
خفت سے انھوں کے تھا جو کچھ چہروں کا عالم | احوال وہ زنہار نہیں قابلِ تحریر

ان کا یہ عالم دیکھ کر سودا نے ان کا قصور معاف کر دیا، اور عطر و پان دے کر رخصت

کیا، آصف الدولہ کے ہرکارے وہاں موجود تھے، انھوں نے تمام تفصیلات نواب صاحب

کے گوش گذار کر دیں، اور اس طرح یہ معرکہ بخیر و عافیت اختتام پذیر ہوا،

معرکۂ مکین و سودا کی مندرجۂ بالا تفصیلات معاصر ماخذوں "عبرت الناظرین" تصنیف کیے

تلامذۂ ارشد مرزا رفیع المتخلص بسودا مع قصیدہ ۱۹۰ صد و پنجاہ شعر ۱۰ سے اخذ کی گئی ہیں، مگر سیاسی حالات سے بھی ان تفصیلات کی مزید تائید ہوتی ہے۔

اودھ کے تیسرے نواب شجاع الدولہ نے ۱۷۷۴ء میں روہیلکھنڈ فتح کیا اور سعادت کو اس علاقہ کا برائے نام گورنر بنایا۔ بعض ماخذوں میں ہے کہ شجاع الدولہ نے سعادت علی خاں کو اس علاقہ کا گورنر اس لئے بنایا تھا کہ وہ اُن کے بعد اس علاقہ کے مطلق العنان حکمراں بنیں گے لیکن یہ بات پایۂ تحقیق کو نہیں پہونچتی، کیونکہ اپنی وفات سے قبل انھوں نے جو خط گورنر جنرل کو لکھا تھا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ آصف الدولہ کو اودھ کے تمام علاقوں کا واحد حکمراں بنانا چاہتے تھے۔

شجاع الدولہ کی وفات ۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء کو ہوئی، اور اُن کے بعد ان کے سب سے بڑے بیٹے آصف الدولہ اودھ کے چوتھے نواب بنے۔ انھوں نے نواب بنتے ہی سعادت علی خاں کو پاس بلانے کے لئے ایک شقہ روانہ کیا۔ سعادت علی خاں اس حکم کو بالائے طاق رکھ کر اس علاقہ میں اپنی خود مختار ریاست قائم کرنا چاہتے تھے، اور کچھ فوجی افسر پہلے اس کے لئے تیار بھی ہو گئے، لیکن جب آصف الدولہ کی ماں بہو بیگم نے جو ان دنوں اودھ کی حکومت میں کافی اثر رکھتی تھیں، فوجی افسروں کو یہ حکم روانہ کیا کہ وہ آصف الدولہ کے وفادار رہیں، تو انھوں نے سعادت علی خاں کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ سعادت علی خاں نے یہ بھی دیکھا کہ انگریز آصف الدولہ کی مسند نشینی کی حمایت کر رہے تھے، اس لئے مجبور ہو کر انھوں نے بریلی سے لکھنؤ کے لئے کوچ کیا۔ اس بیچ آصف الدولہ لکھنؤ کو اپنا دار الحکومت بنانے کے لئے فروری ۱۷۷۵ء میں فیض آباد سے روانہ ہو چکے تھے، اور راستہ میں سعادت علی خاں ان سے آکر مل گئے۔ آصف الدولہ نے ان کے اخراجات کے لئے ۲ لاکھ روپیہ سالانہ کی ایک جاگیر مقرر کر دی، لیکن سعادت علی

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی چند کتابوں کے جدید ایڈیشن

نقوشِ سلیمانی

سید صاحب کے ہندوستانی اور اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبۂ صدارت
ی دوسری تقریریں، تحریریں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ جن کا انتخاب خود فاضل مصنف نے
ں زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستان کی
بت سے ہندوستانی کا نام دیکر ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ ان کا یہ خواب
رمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پا گئی، طبع دوم عکسی،

قیمت:- ۲۵ روپیے،

خیام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رباعی گو شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہے، او
س کی رباعیات کا یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ
ر بھی بہت کچھ تھا، وہ فلسفی تھا، منجم تھا، ریاضی داں تھا، ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا،
س کی طرف شعر العجم میں خیام کے تذکرہ میں مولانا شبلیؒ نے بھی اشارہ کیا ہے، اس کتاب میں پہلی
رتبہ اس کے سوانح و حالات کے ساتھ اس کی ان ہی حیثیات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی
الی گئی ہے، آخر میں اس کے چند نایاب فارسی و عربی کے فلسفیانہ رسائل اور اس کی مستند رباعیات
ھی شامل کر دی گئی ہیں، طبع دوم عکسی، قیمت: ۲۵ روپیے۔

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد میں چند خطبے
یے تھے، یہ انہی کا مجموعہ ہے، طبع دوم عکسی، قیمت ۳۰ روپیہ "منیجر"

ذکر ہے، اس میں آپ سے قبل ہونے کے عام نظم و نسق، دفاع، مالیہ، عدلیہ اور تعلیم و تربیت وغیرہ مختلف شعبوں کا ذکر ہے،
اسکے بعد دفاع و غزوات پر ایک مستقل خطبہ ہے، نویں خطبہ میں دورِ نبوت کے نظامِ تعلیم اور آپکے علوم کی سرپرستی فرمانے کا تذکرہ ہے،
ایک خطبہ میں عہدِ نبوی کے تشریعی نظام اور عدلیہ پر مفید گفتگو کی ہے، ایک اور خطبہ میں مالی نظام اور تقویم پر بحث کی گئی
ہے آخری خطبے میں رسول اللہ صلعم کی تبلیغِ اسلام کے طریقے اور غیر مسلموں کے ساتھ آپ کی رواداری اور شریفانہ برتاؤ کی
تفصیل پیش کی ہے خطبوں کے بعد ڈاکٹر صاحب سے سوالات کئے جاتے تھے اور وہ انکے جواب دیتے تھے، ہر خطبہ کے آخر میں
یہ سوال و جواب بھی درج ہیں جو دلچسپ اور معلومات سے پُر ہیں اسلامی علوم کی تاریخ، قانون بین الممالک اور عہدِ نبوی
کا نظامِ دفاع و تعلیم وغیرہ پر ڈاکٹر صاحب کی مستقل کتابیں پہلے چھپ چکی ہیں اور وہ ان موضوعات پر برابر غور و فکر اور تحقیق
فرماتے رہے ہیں، اسلئے یہ خطبے انکے برسوں کے مطالعہ کا نچوڑ ہیں، ڈاکٹر صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے وسیع علم
و مطالعہ کی بنا پر مسلمانوں کے مختلف فقہی و اعتقادی گروہوں کے بارہ میں بڑے معتدل واقع ہوئے ہیں اور مختلف فیہ
مسائل میں اپنی رائے مسلط کرنے کے بجائے ہر شخص کو اسکے مسلک پر عمل کرنے کی تلقین فرماتے ہیں، بعض مسائل میں انکا
نقطۂ نظر دوسروں سے مختلف ہے، مثلاً موسیقی کا جواز، ٹیلیویژن دیکھنے کی حرمت، ناموس سے تورات مراد لینا، رجم کو قرآن
سے اسطرح ثابت کرنا کہ تورات میں زنا کی یہی سزا تھی جسکو رسول اللہ صلعم نے اسلئے برقرار رکھا کہ آپ کو قرآن نے یہ ہدایت
کی تھی کہ جن چیزوں کے بارہ میں آپ کو کوئی وحی نہیں کی گئی ہے ان میں اہل کتاب کے حکم پر عمل کریں وغیرہ، ڈاکٹر صاحب نے
قرآن کے بیان کردہ مصارفِ زکوٰۃ کی تفصیل و تعیین میں قدیم فقہاء کی رائے پر اکتفا نہ کر کے انکی بہت سی مزید صورتیں
بھی بتائی ہیں، اور غیر مسلموں اور مجبوری کی حالت میں سادات کو بھی زکوٰۃ دئے جانے کا جواز ثابت کیا ہے، انکے نزدیک
فی سبیل اللہ سے فوجی ضرورتوں کے علاوہ مسجدوں، سراؤں اور مدرسوں کی تعمیر اور مردوں کی تجہیز و تکفین بھی کی جاسکتی ہے
ابن السبیل میں مسلم و غیر مسلم، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر، سڑکوں کیلئے محافظ پولس کا انتظام وغیرہ بھی شامل ہے، وہ مردہ کی
آنکھ زندہ کو اور مریض کیلئے تندرست کے خون دینے کو جائز سمجھتے ہیں، بینک یا کسی اور سود کو اس صورت میں جائز
قرار دیتے ہیں جب قرض دینے اور لینے والے منفعت اور خسارے میں برابر کے تناسب سے شریک رہنے پر آمادہ ہوں، حکومتیں
اور مجبور اشخاص بوقتِ ضرورت سود پر قرض لے سکتے ہیں لیکن اس صورت میں بھی سود خوار کو اللہ معاف نہ کریگا وغیرہ، ان مسائل میں
اختلافِ رائے کی گنجائش ہو سکتی ہے مگر انکے حل اور غور و فکر کی راہ بھی ہموار ہوتی ہے، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور شعبۂ تحقیقات کی نے فی کس
ان خطبوں کو اہتمام سے شائع کیا ہے، تحسین کی مستحق ہے، طباعت کے اغلاط ڈاکٹر صاحب نے علحدہ کاغذ پر تحریر کر کے کتاب کے ساتھ منسلک

اس کے بعد عہد صدیقی و عہد عثمانی کی جمع و ترتیب کی صحیح نوعیت بتائی ہے، دوسرے خطبہ میں
حدیث کی دینی اہمیت واضح کرنے کے بعد عہد نبویؐ کے تحریری سرمایے کا مفصل جائزہ لیکر
دکھایا ہے کہ اس عہد میں تحریر و کتابت کا رواج بھی تھا، اور احادیث کے علاوہ آپؐ کے مراسلے
وغیرہ بھی قلمبند کئے گئے تھے، پھر صحابۂ کرام اور ان کے بعد کے زمانہ میں آپؐ کے اقوال و افعال
جس مستند طریقہ پر مرتب کئے گئے اس کے بارہ میں لکھا ہے کہ اسکی مثال دوسری قوموں کے
انبیاؑ کے حالات تو درکنار ان کی مذہبی و آسمانی کتابوں کی ترتیب میں بھی نہیں ملتی، تیسرے
خطبہ میں فقہ اسلامی کی تاریخ بیان ہوئی ہے، اس ضمن میں اس کی تشکیل، نشو و نما، امام
ابو حنیفہؒ کے زمانہ میں اس کی باقاعدہ تدوین اور اس کے اہم ماخذ و مصادر پر سیر حاصل گفتگو کی ہے،
اور اس زمانہ کے رائج رومن لا پر اس کی برتری بھی دکھائی ہے، چوتھا خطبہ اصول فقہ و اجتہاد کی
تاریخ پر مشتمل ہے، اس میں اس کی وضاحت کی ہے کہ اسلامی قانون کی تدوین کسطرح عمل
میں آئی اور نئے مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں کس طرح حل کیا جاتا تھا، نیز دور حاضر
کے اجتہادی مسائل میں اجماع کی صورت کیا ہے، پانچواں خطبہ بڑا اہم ہے یہ قانون بین الممالک پر ہے،
اس میں دو مملکتوں کے باہمی تعلقات کے اصول و قوانین پر روشنی ڈالی ہے، اور بتایا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں اسکا
آغاز کسطرح ہوا، وہ سیر کی اصطلاح اور اس موضوع پر مسلمان علماء و فقہا کی مختلف تصنیفات اور انکے مندرجات
پر بحث کر کے انٹرنیشنل لا کے سلسلہ میں انکی اہمیت واضح کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب پورے وثوق سے فرماتے ہیں کہ اس
علم کو وجود بخشنے والے مسلمان ہیں، وہ قدیم یونانی اور رومی اور موجودہ یورپی دور میں انٹرنیشنل لا کے رواج کی
پرزور تردید کرتے ہیں، چھٹا خطبہ دین پر ہے، اس میں حدیث جبرئیلؑ کی روشنی میں عقائد و ایمانیات، اسلامی
عبادات اور احسان و تصوف کی حقیقت و اہمیت بہت دلنشین انداز میں واضح کی ہے، آخری چھ خطبوں میں سیرت نبویؐ
کے مختلف پہلوؤں پر عالمانہ بحث و گفتگو کی ہے، اس سلسلہ کے پہلے خطبہ میں آنحضرت صلعم کی مملکت کے نظم و نسق کا

خطباتِ بھاولپور:۔ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کاغذ عمدہ طباعت ٹائپ، صفحات ۳۲۳ قیمت ۵۰ روپے، ناشر رجسٹرار اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور۔

اسلامی علوم کے ماہر اور نامور فاضل ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور کی دعوت پر بارہ خطبے دیے تھے، زیر نظر کتاب ان ہی کا مجموعہ اور یونیورسٹی کے مجلہ مفکر کا خاص نمبر ہے، شروع کے چار خطبوں میں اسلام کے بنیادی آخذ یعنی قرآن و حدیث اور فقہ و اجتہاد کی تاریخ بیان کی گئی ہے، پہلے خطبہ میں قرآن مجید کی جمع و تدوین کے سلسلہ میں گذشتہ آسمانی کتابوں کا ذکر بھی آگیا ہے، اس میں بتایا ہے کہ سابقہ صحف و کتب میں بعض تو سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، اور جدید تحقیقات سے جن کتابوں کے کچھ اوراق و مندرجات دریافت ہوئے ہیں ان کے صحیفۂ ربانی ہونے کا کوئی یقینی ثبوت نہیں، اس بحث کے آخر میں عہد نامۂ قدیم و جدید کا تذکرہ ہے، اس میں توریت کی متعدد بار گمشدگی کا ذکر کیا ہے، جو اس کا ثبوت ہے کہ وہ بعینہٖ کلام الٰہی نہیں ہے، اسی طرح مروجہ چاروں انجیلوں کے بارہ میں بتایا ہے کہ وہ دراصل حضرت عیسیٰؑ کی سوانح عمری ہیں، اس لئے استناد کے لحاظ سے یہ سب مسلمانوں کی کتب سیرت کے ہم پایہ ہیں، پھر قرآن مجید جس محفوظ صورت میں مسلمانوں تک پہنچا ہے اس کی تفصیل پیش کی ہے، ڈاکٹر صاحب نے آنحضرت ﷺ کی زندگی کے ایسے واقعات تحریر کیے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شروع ہی سے قرآن مجید کی نقل و کتابت اور جمع و تدوین کا کام انجام پاتا رہا ہے، نیز آپ نے اپنی وفات کے وقت اسے مرتب و مدون حالت میں چھوڑا تھا

بیرونِ ہند کے مسلم مفادات کو بے لوث ہو کر مسلم سیاست میں پیشِ نظر رکھا جائے تو عین سیاست ملی ہے، یہ اندازِ فکر ترکی خلافت کے سلسلہ میں ہندوستانی مسلمانوں نے ثابت کر دکھایا یا سوودی تحریک کے زمانہ میں شدید اختلاف کے باوجود دونوں متحارب گروہ امید دار صلہ و انعام نہیں تھے، میری اس ناقص رائے پر اگر اور لوگ تبصرہ فرمائیں تو بڑی خوشی ہوگی، چونکہ اس وقت آلودۂ سیاست نہیں، شاہدِ سیاست ہوں، اس لیے بہت کچھ نیا راستہ دکھائی پڑ رہا ہے۔

والسلام

محمد رضا انصاری

مرادآباد ۴ر فروری ۸۳ء

جناب سید صاحب!

السلام علیکم

جنوری کے معارف میں ملی قیادت کے سلسلہ میں آپ کے شذرات بہت ہی دردناک ہیں، مسلمانوں کے زوال کی جڑ یہی ہے، خلافتِ راشدہ کے بعد ہی سے قیادت کی راہیں بدل گئیں، پھر ملت کو یہ شرف نصیب نہیں ہو سکا، کاش اس پر ملت کے دردمند غم خوار توجہ فرمائیں، اس موضوع پر دوسروں کو بھی لکھنے کی دعوت دیجئے، دردِ فکر خدا نصیب فرمائے، یہ ضرورت نہ صرف عالمِ اسلام کے لیے بلکہ پورے عالم کے لیے ہے، اور یہ دنیا ایٹم سے قیامت کی طرف جا رہی ہے۔ والسلام

افتخار فریدی

بعض غور طلب مکتوبات

۹ فرنگی محل، لکھنؤ یکم فروری سنہ ۶۳ء

محترم سید صاحب!

السلام علیکم

جنوری کا معارف ملتے ہی آپ کے شذرات پڑھے، سوال جس کو آپ نے غور طلب پایا ہے، میری ناقص رائے میں وہ ایسا بدیہی ہے کہ اگر مسلمان اس پر غور نہیں کرتے تو وہ حق بجانب ہیں، میں مسلم سیاست سے کم و بیش پچاس برس سے قریب رہا ہوں، آزادی کے بعد مسلم سیاست کے بارے میں اب اس نتیجہ پر پہونچ گیا ہوں کہ اب اس میں پارٹی سیاست گھس گئی ہے، جو مدعی قیادت جس پارٹی سے وابستہ ہے، یا اس کا دست گرفتہ ہے، وہ مسلمانوں کو اس میں جھونک دینا فرض سمجھتا ہے، حالانکہ مسلم سیاست کے یہ معنیٰ نہیں ہیں، مولانا محمد علیؒ اور ان کے مرشد مولانا عبد الباریؒ کی کیسی صاف مثالیں موجود ہیں، کہ مسلم سیاست کے تقاضے سے ایک نیا عنصر بھی داخل ہوگیا، وہ ہے بیرون ہند کی مختلف لابیوں سے مدعیانہ قیادت کی وفاداریاں اور ان وفاداریوں نے سلسلہ کی شکل، اگر

ولیعہد بہادر کو لکھ بھی دی ہوگی، اور بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو بات معیار اور مقام کی ہے، فارسی زبان اور فارسی شعر و سخن میں میری نظر ایک نیم خواندہ بلکہ ناخواندہ کی نظر ہے، جس نے تحت الثریٰ میں بیٹھ کر گرد و پیش کا جائزہ لیا ہے، جب کہ مولانا کا مقام زباں دانی اور شاعری کی کائنات میں اوج ثریا نہیں بلکہ سدرۃ المنتہیٰ ہے، جو لوگ مولانا کے حالات سے باخبر نہیں ہیں وہ میری اس بات کو مبالغہ آرائی پر محمول کریں گے، لیکن میں علی علم و بصیرۃ اپنی بات پر اصرار کروں گا، یہاں اس کے اسباب کی بحث چھڑ گئی تو یہ مضمون اپنی حد سے بہت آگے نکل جائے گا، یہ بحث مولانا فراہیؒ پر میرے مقالے میں اپنے مقام پر آئے گی جہاں ان کی فارسی دانی اور فارسی شاعری سے بحث ہوگی،

اب تک میں نے تلامذۂ فراہی کے باب کے لیے جو مواد جمع کیا ہے وہ اچھا خاصا ہے، لیکن اس میں سب علما و فضلا ہی ہیں جنھوں نے عربی اور علوم دین میں ان سے فیض پایا، یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ شعر و شاعری میں بھی ان کا کوئی شاگرد ہوگا، شادی صاحب نے خود کو مولانا کا شاگرد لکھا ہے اور اصلاح کی درخواست کی ہے، اس انکشاف کے بعد کہ مولانا نے انہی شادی صاحب کی فرمائش پر غزل لکھی یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہیں معلوم ہوتا کہ مولانا نے انھیں اپنی شاگردی میں لے بھی لیا، عزت و احترام کے ساتھ، ایک شاگرد کے لئے یہ بڑا اعزاز ہے کہ استاد نے اس کی فرمائش پر غزل لکھ دی اور اس کا تخلص بھی نظم کر دیا۔

کلیات شبلی

مولانا شبلی کے فارسی کلام یعنی نعت، قصائد، مراثی اور غزلوں کا مکمل مجموعہ (زیر طبع)

جنت الماویٰ، سوے بیت اللہ، نوح کشتیاں، ساحل جودی، بجول تو تش اور یہ شعر بھی

لقب امی و از صدر العلا مختاری آئی	دو عالم طرفوا گوید کہ از سرکاری آئی
خطا پوشی کن و ملبوس نو ایثار عریاں کن	کہ بخشندیش از یں چوں بر در ستاری آئی

ذخیرۂ الفاظ کے علاوہ یہ خیالات بھی ولیعہد نے فارسی اردو کی ایسی کتابوں اور ایسے اہل علم سے سیکھے جو دین اسلام کے نقیب تھے۔

یہ تو معلوم نہیں کہ مولانا نے یوبراج جنگ بہادر کے خط کا واقعۃً جواب کیا دیا، ممکن ہے حوصلہ افزائی کے خیال سے انھوں نے کوئی ایسی بات نہ لکھی ہو اور غزلوں پر حتی الوسع اصلاح دینے کی بھی کوشش فرمائی ہو لیکن ہماری حیرت کے لیے انھوں نے ایک غزل کے نیچے جان محمد قدسی کی ایک رباعی لکھ کر یوبراج کی شاعری کے متعلق فی الجملہ اپنی رائے کا قلم برداشتہ اظہار کر دیا ہے، آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند	نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجا است	نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

یہ رباعی مولانا نے اس غزل کے نیچے لکھی ہے جس کی ردیف "می آئی" اور قافیہ سرشار، سرکار، غفار، وغیرہ ہے۔

شادی صاحب کی غزل اور مولانا کی ناقدانہ رائے پڑھ کر پہلا تاثر یہی پیدا ہوتا ہے کہ یہ تنقید سخت ہے، مولانا نے تو سرے سے اسے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا، لیکن غور و تامل کے بعد نظر آتا ہے کہ میری تعریف تحسین نا شناس کے زمرے میں آتی ہے، اور مولانا کا تبصرہ ایک سخن شناس استاد اور ماہر فن کا فی البدیہہ اظہار خیال ہے،

مولانا کے مزاج میں تکلف نہیں تھا، اس لئے غالباً انھوں نے اس قسم کی رائے

لیکن جب میں نے خط شکست میں گھسیٹی ہوئی ان غزلوں کو ٹھیک پڑھا تو مجھے یو براج کی نسبت اپنے اس سوءِ ظن پر یک گونہ پشیمانی ہوئی، یو براج کا کلام اتنا بلند نہیں تو اتنا پست بھی نہیں بلکہ اس کے بعض پہلوؤں نے تو مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، اور میں یہ بدگمانی کرنے لگا کہ خود کہنے کے بجائے کسی مسلمان شاعر سے کہلوایا نہ ہو، اشعار میں بعض معمولی قسم کی فنی خامیاں بھی ہیں، مگر بحیثیت مجموعی میری نظر میں حرف گیری کی گنجائش بہت کم ہے، ان غزلوں میں مسلم ثقافت کا جو رنگ جھلکتا ہے، افکار کے علاوہ پیرایۂ اظہار میں دینی الفاظ و محاورات، تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کا جو استعمال ہوا ہے وہ نتیجہ ہے کچھ تو فارسی زبان سے تعلق کا اور کچھ مسلمان اہل علم کی صحبت اور شاگردی کا جس میں ایک نمایاں نام خود مولانا فراہیؒ کا ہے، فارسی کا مقولہ ہے۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند — صحبت طالح ترا طالح کند

جس طرح انسان کی صحبت کا اثر ہوتا ہے، اسی طرح کتابوں میں لکھی ہوئی زبان بھی اپنا مخصوص اثر ڈالتی ہے، نیپال کے شاہی خاندان میں مذہباً ہندو ہونے کے باوجود فارسی سے یہ شغف کہ خود ولیعہد وقت تمام تر دشواریوں کے باوجود ذاتی صلاحیت بہم پہنچائے کہ شعر و شاعری کا شغل اختیار کرے لائق توجہ بھی ہے اور قابل قدر بھی۔ فارسی اور فارسی گویوں سے تعلق پیدا کرکے ہی وہ اس قسم کے اشعار کہہ سکتا تھا، جس کا نمونہ اس کی مذکورۃ الصدر دو غزلوں میں موجود ہے، ذرا ان الفاظ اور فقروں کا اشعار میں برتنا تصور میں لائیے،

شور آشوب قیامت، قم باذنی، ظلمات کفر، رخ کعبہ، حملۂ اصحابِ فیل، تائید ایمان، بسم اللہ مجریہا، نوح، ریاض، حق، حضور، حضرت جبار، تعلق، زدائی

خطا پوشی کن و ملبوسِ نو ایثار عریاں کن　　　　کہ بخشند بیش ازاں چوں بر درستاری آئی

بیا خوش آمدی شادی بگو از طرۂ گیسو
ختن را اسیر کردہ از رہِ تاتاری آئی

مولانا فراہی کے نام ولیعہد نیپال کا اردو خط اور اصلاح کے لیے بھیجی گئی دونوں فارسی غزلیں آپ نے ملاحظہ فرمائیں، میرے لئے اس خط اور متعلقات کی اہمیت اس لیے ہے کہ ان کو مولانا فراہی سے نسبت ہے اور مولانا فراہی میرے تحقیقی منصوبے کا موضوع ہیں، اس سے سوانحی خاکے میں رنگ بھرنے میں مدد ملے گی، اس خط کی دریافت خود میری تحقیق کا ایک حاصل ہے، لیکن اس کے مطالعے سے تحقیق کی جونئی راہیں سامنے آتی ہیں، وہ ذوقِ جستجو کو مہمیز کرتی ہیں، مولانا نے اس خط کا کیا جواب دیا، غزلوں میں کیا اصلاح دی، ولیعہد کا دیوان مرتب ہوا یا نہیں اس دیوان کی ترتیب و تہذیب میں مولانا نے کیا مدد کی، دیوان اگر چھپا اور یقیناً چھپا ہوگا تو اس میں مولانا کا ذکر ضرور ہوگا، اور اس ذکر میں ایسی باتیں بھی ہوسکتی ہیں جو مجھے ابھی تک کسی اور ذریعے سے نہیں معلوم ہوئیں، لیکن میں ابھی ہندوستان سے متعلق مطالبات تحقیق کو ہی پورا نہیں کرسکا، نیپال تو نسبتاً اور بھی دور اور دشوار گذار ہے، اس کے مراجع تک رسائی خیال است و محال است و جنون۔

خط میں یوبراج کی اس خواہش کو کہ مولانا اصلاح دیں ابتداءً میں نے جسارت پر محمول کیا اور ایاز قدرِ خود بشناس، اسے چھوٹا منہ بڑی بات سمجھا، اس کی وجہ میرا یہ یہ خیال تھا، کہ ایک ہندو راجکمار بھلا کیا شعر کہے گا، اور وہ بھی فارسی میں اور مولانا بھلا کہاں یہ گوارا کریں گے کہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس کی تک بندیوں کو اپنی اصلاح سے نوازیں، اس دردسری کے لیے ان کے پاس نہ وقت رہا ہوگا نہ دماغ،

(٨)

مجمع فضائل منبع فوضل ادام اللہ افضالکم

آداب و تسلیمات تلمیذانہ بجالا کر عرض پرداز ہوں کہ ایک غزل جو جناب والا نے بفرمایش میرے دوست محمد رضا صاحب ماسٹر کے ارسال فرمایا ہے، جس کو پڑھ کر آنکھوں سے لگایا اور مضامین نے حسب دلخواہ اس خاکسار کو ایک سبق سکھایا، جس کا کہ شکریہ میں تہ دل سے ادا کرتا ہوں، عرض یہ ہے جو خیالات میرے ہیں، وہ بہت تھوڑے ہیں، اور اس کو مختصر دیوان میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں، مگر افسوس فارسی کیا بلکہ زبان اردو بھی مادری نہیں ہے مگر خوش قسمتی و عنایت و بخشش بزرگوں سے اسقدر فارسی حاصل ہوئی ہے، کہ اپنے خیالات کو بخوبی ظاہر کر سکتا ہوں، مگر بجز رہبری و دستگیری آنجناب والا القاب کے اس صوبہ میں مجھے کوئی شخص نظر نہیں آتا اگر ہے بھی تو میری اُن تک رسائی محال ہے، مگر آنجناب سے بہت نزدیکی اس واسطے کہ میرے دوست قدیم محمد رضا صاحب آپکے بھائی مولوی محمد اسحٰق صاحب کے بہت قدیمی یار غار ہیں، اس واسطے وہی سلسلہ آپ کو میرے ساتھ رکھنا واجب معلوم ہوتا ہے، اور اب آپ کا چھٹنا مجھ سے امر محال ہے، میں خود خدمت میں حاضر ہو کر بوقت تیاری دیوان واسطے اصلاح کے پیش کرونگا، فی الحال دو غزلیں ارسال خدمت ہیں، امید کہ قبول ہو کر اصلاح فرمائی جائے، زیادہ حد ادب۔

تلمیذ

یوبراج جنگ بہادر رانا تخلص شادی

دستخط انگریزی

غزل

شور آشوب قیامت فتنہ ساماں یکطرف　　قمر یادنی گرگئی خلخالِ حسیناں یکطرف

ان کی عظیم الشان کوٹھی موجود ہے۔ ولیعہد نے مولانا کو لکھا کہ وہ خود خدمت میں حاضر ہو کر اپنا دیوان اصلاح کے لیے پیش کرے گا، خط کی تاریخ متعین کرنا ممکن نہیں لیکن اغلب ہے کہ یہ ۱۹۱۲ء سے پہلے کا ہے، خط لکھنے کی غرض وغایت خط کے مضمون سے واضح ہوتی ہے، ولیعہد نے مولانا کے لیے جو القاب وآداب استعمال کئے ہیں وہ نوٹ کرنے کے قابل ہیں، آخر میں ولیعہد خود کو مولانا کا تلمیذ لکھتا ہے، میرے لیے یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ میں ولیعہد کا ذکر مولانا فراہی کے تلامذہ میں کروں یا نہ کروں، میرے ریسرچ پروجیکٹ کا ایک باب تلامذۂ فراہی ہو، اگر میں نے وسعت روا رکھی تو یوں یہ باب بہت طویل ہو جائے گا، کیفیت یہ ہے کہ ؎

تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ باغ وچمن　　ہمہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند

اس کے لیے مجھے کوئی معیار متعین اور دائرہ محدود کرنا پڑے گا، یہ بات بطور جملہ معترضہ درمیان میں آگئی، خط کے آخر میں خط نویسندہ کا نام اردو ہی میں یوں لکھا ہے، "یوبراج جنگ بہادر رانا تخلص شادی" اس کے بعد انگریزی خط شکست میں دستخط ہے، جس سے مترشح ہوتا ہے کہ شاید ولیعہد نے خط املا کرا کے دستخط کیا ہے۔

میرا خیال تھا کہ اسلام آباد میں نیپالی سفارتخانے سے جنگ بہادر رانا کے مختصر حالات معلوم کر کے درج کروں لیکن اس کا موقع نہ ملا، نیپال کے ساتھ ہمارے دوستانہ تعلقات ہیں، نیپال کے موجودہ حکمراں کو اس بات سے یقیناً دلچسپی ہوگی کہ نیپال کے شاہی خاندان کا ایک پرانا خط اسلامیہ یونیورسٹی اسلام آباد کے ایک اسکالر کے پاس ہے، تمہید طویل ہوگئی، ان تعارفی کلمات کے بعد پہلے اصل خط بہ تمام وکمال ملاحظہ ہو، اس کے بعد مختصر جائزہ پیش کیا جائے گا۔

چہرہ ہے، جو ہو بہو خود ولیعہد کا ہو یا اس کے کسی بزرگ کا ہو۔ نیپالی حروف میں یوبراج اور لاطینی میں
Scientia es Tvis لکھا ہوا ہے، یوبراج نیپالی میں ولیعہد کو کہتے ہیں، یہی لفظ
سنسکرت میں "یوبراج" بمعنی ولیعہد ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیپال کے ولیعہد کی ذاتی
مونوگرام ہے، لاطینی تحریر کا مطلب ہے "علم طاقت ہے" نیپالی میں پروفیسر مولانا عبدالقدوس
ہاشمی اور لاطینی میں محمود احمد غازی سے مدد لی، اگر ان دو حضرات کی مدد حاصل نہ ہوتی تو یہ
عقدہ لاینحل رہتا، فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

یہ مونوگرام صفحہ کے بیچ میں ہے، صفحہ کے اوپر دائیں طرف غور سے دیکھیں تو ڈائی کی
داب سے ابھرے ہوئے انگریزی حروف میں یہ تحریر پڑھنے میں آتی ہے۔

Phapamow Castle Allahabad.

پھاپامو کیسل الہ آباد۔ یہ یقینی طور پر ولیعہد کا رہائشی پتہ ہے، یہ وہ دور ہے جب لکھنؤ کے بجائے
الہ آباد یوپی کا صوبائی دارالحکومت تھا، نیپال اور یوپی کی سرحد ملی ہوئی ہے، نیپال کے امرا
مسوری اور نینی تال میں کوٹھیاں بنا کر یوں بھی رہتے تھے، ولیعہد نے اپنی جلاوطنی کے دن
گذارنے کے لیے الہ آباد کو پسند کیا۔ مولانا فراہیؒ بھی ابتداءً بسلسلۂ تعلیم بعدہٗ بسلسلۂ ملازمت
الہ آباد میں رہے، ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۴ء تک سنٹرل میور کالج میں انھوں نے خدمت تدریس
انجام دی، اسی زمانے میں ولیعہد نے ان سے رسم و راہ پیدا کی ہوگی، خط میں کوئی تاریخ درج نہیں
لیکن قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط مولانا کے الہ آباد میں قیام کے زمانہ کا ہے، اس لئے کہ
خط بذریعہ ڈاک نہیں دستی بھیجا گیا اور لفافے پر صرف نام لکھنے کو کافی سمجھا گیا، جیسے یہ اس شہر
بلکہ اسی محلے کا معاملہ ہو، خط کے بعض مندرجات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، مولوی اسحٰق
صاحب خط میں جن کا حوالہ ہے خود الہ آباد میں مستقل آباد ہو گئے تھے، جارج ٹاؤن میں آج تک

مسودے میں خود بھی اپنے قلم سے لکھدی ہو، اس مجموعے کی اشاعت تک ولیعہد یقیناً راجہ ہوگیا ہوگا، اور اس کی جلاوطنی کے دن بھی ختم ہوگئے ہوں گے تو انے پہلوی میں بھی شعر کے اندر شادی کے لفظ کو جلی خط میں لکھ کر نمایاں کیا گیا ہے. جو اسم خاص کو ظاہر کرنے کا ایک طریقہ ہے، مولانا کے فارسی کلام کا جو مجموعہ سنہ ۱۹۰۳ء میں "دیوان حمید" کے عنوان سے مطبع شمس حیدرآباد دکن میں چھپوا کر مولانا کے چھوٹے بھائی حاجی رشید الدین مرحوم نے شائع کیا تھا اس میں یہ غزل نہیں ہے، یہ اس لیے کہ اس دیوان کی اشاعت کے بعد یہ غزل کہی گئی ہے یقیناً تشنگی محسوس کی جائے گی اگر اس غزل کا آخری شعر نقل نہ کیا گیا۔

زرنگ و بوے گلزار جہاں دل شاد کے گردد بے شادی رہے جز طاعت یزداں نمی بینم

اس خط کے اندر جو شہادتیں اس بات کے حق میں جاتی ہیں کہ مکتوب الیہ مولانا فراہیؒ ہیں ان میں سے ایک تو خط کے متن کا یہ جملہ ہے "محمد رضا صاحب آپ کے بھائی مولوی محمد اسحاق صاحب کے بہت قدیمی یار غار ہیں۔" مولوی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد علامہ شبلیؒ کے سگے بھائی اور مولانا فراہی کے پھوپھی زاد بھائی تھے، اس رشتے کے علاوہ دونوں میں دوستی بھی تھی، دوسرے جو لوگ مولانا فراہی کا خط پہچانتے ہیں ان کی شناخت کے لیے ایک غزل کے نیچے مولانا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی جان محمد قدسی کی ایک رباعی کافی ہے جو ولیعہد کی غزل پر مولانا کا بے لاگ تبصرہ ہے

خط کے کاتب کے متعلق جو شہادتیں ہیں ان میں سب سے اہم وہ شاہی مونوگرام ہے جو خط کے کاغذ کی پیشانی پر بھی ڈالی کا چھپا ہوا ہے اور لفافے کے زاویے پر بھی مونوگرام خود ایک دلچسپ داستان ہے، اس میں سرخ، سبز اور سہرا تین رنگ ہیں، اتنا وقت گذرنے کے بعد بھی کوئی رنگ مدھم نہیں ہوا، نیپال کے دو جھنڈے کراس کرکے ایک طرف سے ہاتھی اور دوسری طرف سے شیر انہیں تھامے ہوئے ہے، دونوں پھریروں کے بیچ ایک ستارہ ہے، ستارے کے اندر کسی آنکھ کا

چھوڑ کر عبدالحمید لکھا ہے، جو صرف ان کی تصانیف میں ملتا ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ ولیعہد مولانا کے اسی نام سے واقف تھا، مولانا نے اسے کبھی خط لکھا ہوگا یا کوئی غزل بھیجی ہوگی، اور اس میں عبدالحمید ہی لکھا ہوگا، اس لیے یہی نام اس نے لفافے پر تحریر کیا، مولانا کے خط لکھنے کی تو کوئی شہادت نہیں ملی، ولیعہد کی فرمایش پر غزل لکھنے کا ثبوت البتہ موجود ہے، ولیعہد کی فرمایش پر غزل لکھی تو اسے بھیجی بھی ضرور ہوگی اور خط بھی ضرور لکھا ہوگا، جس میں اپنے نام کا ذکر لازماً کیا ہوگا، ماہنامہ الاصلاح کے ستمبر ۱۹۳۶ء کے شمارہ میں مولانا امین احسن اصلاحی نے مولانا فراہی کے اشعار کی ایک فارسی غزل شائع کی، "نمی بینم" جس کی ردیف اور گیہاں، خزاں، ریحاں، مژگاں، درماں، پیماں، ساماں وغیرہ جس کے قافیے ہیں، اس غزل کے ساتھ کا ادارتی نوٹ اور خود غزل کا آخری شعر اس ضمن میں لائق توجہ ہے، پہلے نوٹ ملاحظہ ہو:

"نیپال کے شاہی خاندان کے کوئی رکن الہ آباد میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے، فارسی میں شعر و سخن کا مذاق رکھتے، اور شادی تخلص کرتے تھے، اس تقریب سے مولانا سے راہ و رسم ہوئی، مولانا نے یہ غزل ان کی فرمایش سے لکھی۔"

(الاصلاح ستمبر ۱۹۳۶ء ص ۵۵)

اس غزل کے آخری شعر میں مولانا نے لفظ "شادی" کو اس طرح نظم کر دیا ہے کہ اس سے خوشی کے معنی بھی نکلتے ہیں، اور فرمایش کرنے والے کا تخلص بھی مفہوم ہوتا ہے، لفظ شادی پر تخلص کی علامت (ــــ) لگا کر اس اشارے کو اور کھول دیا گیا ہے، یہ غزل مولانا کے فارسی مجموعہ کلام "نغمائے پہلوی" مرتبہ مولانا بدرالدین اصلاحی مطبوعہ ۱۹۶۷ء میں بھی شامل ہے، اور اس کے ساتھ مرتب کا یہ نوٹ ہے، "بفرمایش راجہ نیپال کہ شادی تخلص می کرد، گفتہ آمد۔" (نوائے پہلوی، حصہ سرود پارسی ص ص ۱۷ - ۱۸) غزل کی شان نزول بہت ممکن ہے مولانا نے اصل

ایک ورق خط کا ہے، ان چار متفرق چیزوں کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کے لیے بھی ہمیں خارجی شہادتوں سے زیادہ داخلی شہادتوں پر اعتماد کرنا ہوگا، بہت غور سے مطالعہ کرنے کے بعد میں پورے اطمینان سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ خط ولیعہد نیپال کا ہے جو اس نے مولانا فراہیؒ کو لکھا، خط سے ساتھ اس نے اپنی دو فارسی غزلیں بھی اصلاح کی غرض سے ارسال کیں،

غزلوں کے دو ورقوں کا کاغذ عام معمولی کاغذ ہے اس کے برعکس خط اور لفافے کا کاغذ نہ صرف خاص بلکہ بہت اعلیٰ درجے کا شاہی کاغذ ہے، جس پر وقت اور زمانے کا ابھی کوئی اثر نظر نہیں آتا، لفافے اور خط دونوں کا کاغذ ایک ہے، یہ دبیز بھی ہے اور رنگین بھی، ہلکا نیلگوں جس سے شاہانہ خوش ذوقی ظاہر ہوتی ہے، غزلوں کے کاغذ اور خط کے کاغذ میں اتنا تفاوت ہے کہ اگر بعض دوسری باتوں سے اس کی تائید نہ ہوتی تو بڑی آسانی سے کہا جا سکتا تھا کہ غزلیں کسی اور کی ہیں اور خط کسی اور کا ہے، تعجب ہوتا ہے کہ ولیعہد موصوف کے شاہی ذوق نے یہ کیسے گوارا کر لیا کہ اپنے ہی کلام کے لیے اتنا معمولی بلکہ گھٹیا کاغذ استعمال کیا جب کہ خط کے لئے اتنا غیر معمولی اور بڑھیا کاغذ کو کام میں لائے کہ اتنی مدت گذرنے کے بعد بھی اس کی آب و تاب میں کوئی خاص فرق نہیں آیا نہ کہیں سے مڑا نہ جھڑا نہ کٹا نہ پھٹا نہ کرم کتابی کی غذا بنا، خط کے اندر بغرض اصلاح دو غزلیں بھیجنے کا ذکر ہے، غزلوں کے مقطع میں جو تخلص نظم ہوا ہے وہی تخلص خط کے آخر میں نام کے ساتھ بھی درج ہے، اس لئے یہ قطعی طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ دونوں غزلیں وہی ہیں جن کا ذکر اس خط میں ہے، خط کا کاتب اور غزلوں کا شاعر ایک ہی شخص ہے، رہا اس بات کا ثبوت کہ یہ خط مولانا فراہیؒ کے نام ہے تو وہ ہمیں لفافے سے مل جاتا ہے، لفافے کا مضمون یوں ہے۔ "بخدمت فیضدرجت جناب مولانا مولوی عبدالحمید صاحب بی۔اے مشرف باد"۔ یہ بات البتہ غور طلب ہے کہ ولیعہد نے مولانا کا معروف نام حمیدالدین

دیکھنے کی مہلت نہ دی، مجھے افسوس ہے کہ میں پہلے اس کی طرف توجہ نہ دے سکا، اخویم ناصر اصلاحی نے مختصراً بتادیا تھا کہ یہ خط ولیعہد نیپال کا ہے لیکن روا روی میں اس وقت میرے لئے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا ممکن نہ تھا، میں نے اس خیال سے اسے اپنے کاغذات میں رکھ لیا کہ مولانا فراہیؒ کے نام ہے تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی بات میرے کام کی ہوگی۔

اس خط کی نسبت میرے ذہن میں ایک الجھن یہ تھی کہ کہاں نیپال اور کہاں پھریہا او ، سرائے میر، کہاں ایک شہزادہ اور ولیعہد اور کہاں ایک عالم دین، نیپال کے ولیعہد کو ایسی کیا ضرورت پیش آئی کہ اس نے مولانا فراہیؒ کو خط لکھا، لیکن یہ الجھن خط پڑھنے کے بعد خود بخود دور ہو گئی،

یہ خط اندازاً اب سے کوئی ستر سال پہلے لکھا گیا، اور یہ محض اتفاق ہے کہ وہ دست برد زمانہ سے بچ بچا کر مجھ تک پہنچ گیا، آج اس کے ما لہٗ وما علیہ کو جانچنے کیلئے کوئی چیز بآسانی مل سکتی ہے، تو وہ خود خط کی اپنی داخلی شہادتیں ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ اگر خود خط کے اندر ایسے ناقابل تردید شواہد موجود نہ ہوتے تو کاتب اور مکتوب الیہ دونوں ہی کی نسبت یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا، غنیمت ہے کہ خط کے ساتھ اس کا لفافہ بھی محفوظ رہا، ورنہ اس کی بعض گتھیاں کسی طور نہ سلجھ سکتی تھیں، اس لئے کہ مکتوب الیہ کا نام صرف لفافے پر درج ہے،
کسی زیرک شاعر نے کہا ہے،

ع　خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر

لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کے برعکس معاملہ بھی صحیح ہو، کم از کم اس خط میں یہ صورت ممکن نہیں تھی، خط کے مضمون سے لفافے کے اندراجات کا پتہ لگانا دشوار تھا،
لفافے کے علاوہ اس کا ملفوف تین الگ الگ اوراق پر مشتمل ہے، دو ورق دو غزلوں کے ہیں

آثار علمیہ وادبیہ

ولی عہد نیپال کا خط

مولانا عبدالحمید فراہیؒ کے نام

از

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ریڈر ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

مولانا فراہیؒ کے نام ولیعہد نیپال کا یہ خط جو اردو میں ہے مجھے دائرۂ حمیدیہ سرائیر اعظم گڑھ سے ۱۹۷۶ء میں ملا تھا، جب میں ہندوستان گیا تھا، یہ واقعہ ہے کہ دائرۂ حمیدیہ کے ناظم مولانا بدرالدین اصلاحی اور معتمد جناب عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی جامعی نے اسے میرے حوالہ کرکے ایثار و برادر نوازی کا جو ثبوت دیا اس کی مثال ملنی مشکل ہے، ستر سال کا پرانا یہ خط جو گذشتہ پچاس سال (مولانا فراہیؒ کی وفات ۱۹۳۰ء) سے دائرۂ حمیدیہ میں محفوظ تھا اسے یوں کسی کے حوالہ کر دینا کوئی معمولی بات نہیں، میں ایک برادر خورد کی حیثیت سے ان دونوں کا بزرگوں کا ممنون ہوں، مجھے خوشی ہے کہ میں یہ تاریخی دستاویز تاریخ کے اوراق میں محفوظ کرکے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاؤں گا، جو اس کو اپنی تحویل میں لے کر میں نے خود اپنے اوپر عائد کرلی تھی،

گذشتہ چار سال سے یہ علمی امانت میرے پاس طاق نسیاں کی زینت بنی پڑی رہی ہے، فکر معاش کی مصروفیات اور دنیوی مکروہات نے خود اپنے ہی قدموں کے نشان کو پلٹ کر

ثقات ابن شاہین اور تاریخ جرجان دونوں کے آخر میں اس کا جس قدر ناقص الآخر حصہ ہے، اس میں یہی طریقہ ہے کہ ابتداء میں ردی ابن شاہین کہہ کر ائمہ کے مختلف اقوال نقل کیے ہیں اور آخر میں قال ابوحفص کہہ کر اپنی رائے ظاہر کی ہے، افسوس کہ المختلف فیہم کا زیادہ حصہ غائب ہے، ابتداء کے صرف ۱۵ تراجم ہیں۔

میں نے ۱۳۹۸ھ میں محترم مولانا غلام محمد صاحب خطیب جامع مسجد بمبئی کی عنایت سے ابن شاہین کی کتاب الثقات کو نقل کیا تھا، اس کی خبر کسی طرح شکاگو امریکہ میں مقیم ایک ازہری فاضل شیخ احمد زکی حماد کو ملی اور موصوف نے شوال ۱۳۹۹ھ میں ایک مفصل مکتوب میرے پاس روانہ کیا، جس میں لکھا کہ میں "الحافظ ابن شاہین' حیاتہ ومؤلفاتہ" کے موضوع پر تحقیقی کام کر رہا ہوں، ان دنوں ان کی تصانیف کا باب در پیش ہے جن میں تاریخ اسماء الثقات ممن نقل عنہم العلم نہایت اہم کتاب ہے، اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ بمبئی میں آپ کے پاس اس کا ایک نادر قلمی نسخہ موجود ہے، مہربانی فرما کر اس کا عکسی فوٹو مجھے روانہ کر دیں، میں نے اس زمانہ میں اس کی فوٹو کاپی ان کو بھیجدی، خدا کرے یہ نادر اور اہم کتاب جلد چھپ کر اہل علم کی خدمت میں پہونچ سکے۔

تذکرۃ المحدثین

(حصۂ اول)

اس میں دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام یعنی ائمہ صحاح ستہ کے اور بہت سے ائمہ حدیث کے حالات و سوانح اور ان کی خدمات حدیث کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

مرتبہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی

قیمت ۱۹ روپیے

ان کا قول نقل کیا ہے، جب کہ صدہا مقامات پر کتاب الثقات سے ان کا قول نقل کرتے وقت قال ابن شاہین فی الثقات لکھا ہے، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مستقل کتاب ہے، پھر اس کا انداز کتاب الثقات سے بالکل جداگانہ ہے، اس میں ابن شاہین راوی کے بارے میں علمائے جرح وتعدیل کے متضاد اقوال بیان کر کے اپنی رائے فیصلہ کے طور پر ظاہر کرتے ہیں، صرف جامع اور ناقل نہیں ہیں، مثال ملاحظہ ہو:

جعفر الجعفی والخلاف فیہ

روی ابن شاہین، ان عبدالرحمٰن بن مہدی قال: سمعت سفیان الثوری یقول: ما رأیت احداً اورع فی الحدیث من جابر ولا منصور، وعن سلام ابن ابی مطیع انہ قال: قال لی جابر الجعفی: عندی خمسون الف باب من العلم ما حدثت بہ احداً، فذکرت ذٰلک لایوب، فقال: اما الآن فھو کاذب، وعن زائدۃ انہ قال: کان جابر الجعفی کذاباً، کان یؤمن بالرجعۃ، وعن ابی حنیفۃ انہ قال: ما رأیت احداً اکذب من جابر، ولا افضل من عطاء، وعن یحییٰ بن معین انہ قال: جابر الجعفی لا یکتب حدیثہ ولا کرامۃ، وقال یحییٰ مرۃً اخریٰ: جابر الجعفی لیس بشیٔ۔

قال ابو حفص: وھذہ الروایات فی جابر مختلفۃ جداً، یقول الثوری: لم ار اورع منہ فی الحدیث، ویقول ایوب السختیانی: ھو کذّاب، ویقول زائدۃ وابو حنیفۃ ھو کذّاب، ویقول یحییٰ بن معین کذالک، واقل ما فی ھذا الرجل ان یکون حدیثہ لا یحتج بہ الا ان یروی حدیثاً یشارکہ فیہ الثقات، فاذا انفرد ھو بحدیث لم یعمل علیہ لتفضیل سفیان لہ

ترتیب کا اہتمام بھی نہیں ہے، پوری کتاب میں ۱۴۸۰ سے زائد تراجم ہیں، جن میں بہت سے مکررات بھی شامل ہیں۔

تراجم کے خاتمہ پر ص ۱۲۱ تا ۱۲۵ امام ابن شاہین نے اپنی سند کے ساتھ ائمۂ جرح وتعدیل کے اقوال و احوال بیان کیے ہیں، اس کا کوئی عنوان نہیں ہے، بظاہر یہ حصہ کتاب کی ابتدا میں مقدمہ کے طور پر ہونا چاہیے تھا، اسی بیان پر کتاب ختم ہے اور کاتب نے لکھ دیا ہے: "آخر کتاب تاریخ اسماء الثقات ممن نقل منه العلم الخ. اس کے بعد ص ۱۲۶ تا ۱۲۸ المختلف فیہم کا کچھ درمیانی حصہ درج ہے، اس کا بھی کوئی عنوان نہیں ہے، حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں اس کو المختلف فیہم بتایا ہے، چنانچہ جعفر بن سلیمان ضبعی کے حال میں لکھا ہے قال ابن شاہین فی المختلف فیہم، اس کے بعد اس کی عبارت نقل کی ہے، اسی طرح بعض دوسرے تراجم میں اس کا تذکرہ اسی عنوان سے کیا ہے، ابو القاسم حمزۃ بن یوسف سہمی جرجانی متوفی ۴۲۷ھ امام دارقطنی کے شاگرد ہیں، امام ابن شاہین سے بھی روایت کی ہے، ان کی کتاب تاریخ جرجان ۱۳۶۹ھ میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد میں چھپی ہے، اس کے آخر میں ص ۵۰۵ تا ۵۱۵ اس کا ابتدائی حصہ چھپا ہے، اس میں شروع اس طرح ہے:

قال: وحدث القاضی الشریف ابو الحسن محمد بن علی بن محمد بن المہتدی باللہ اجازۃً عن ابی حفص عمر بن احمد بن عثمان بن شاہین الواعظ رحمہ اللہ قال: ذکر من اختلف العلماء ونقاد الحدیث فیه، فمنهم من وثقه ومنهم من ضعفه ومن قیل فیه قولان، بیّنت ذلک بالتراجم لیعرف ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی علیحدہ کتاب ہے جس کی روایت حمیدی نے ابن المہتدی سے اور انھوں نے ابن شاہین سے کی ہے، حافظ ابن حجرؒ نے چند مقامات پر قال ابن شاہین فی المختلف فیہم لکھ کر

یسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب پر نظرِ ثانی کی باری نہیں آسکی۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس کتاب سے ائمۂ جرح وتعدیل کے جو اقوال نقل کیے ہیں بعض مقامات پر ان میں اور کتاب میں فرق ہے، بعض اقوال کتاب میں نہیں ہیں، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں: کتاب میں اسمٰعیل بن ابی حکیم کے ذکر میں اسناد اهل المدینة ہے، اور تہذیب التہذیب میں اسی سے نقل میں اسانید[1] ہے۔ اسمٰعیل بن مجارہ کے ذکر میں ابن معین کا یہ قول درج ہے: وکان اعمیٰ، ولم یکن به بأس، مگر تہذیب التہذیب میں اسی سے یوں نقل ہے: وحکی ابن شاهین عن عثمان بن ابی شیبة انه لایسوی شیئاً[2]۔ حالانکہ یہ عبارت کتاب میں نہیں ہے[3]۔ ابو عون محمد بن عبید اللہ بن سعید ثقفی کوفی کے تذکرہ میں ابن حجرؒ نے لکھا ہے: وقال ابن شاهین[4] فی الثقات هو اوثق من عبد الملک بن عمیر[5]۔ یہ قول کتاب میں نہیں ہے۔ حفص بن سلیمان منقری کے بارے میں یحییٰ بن معین کا قول ثقہ درج ہے، اور ابن حجر نے ان کے حال میں لکھا ہے وقال ابن شاهین فی الثقات: قال احمد بن حنبل: هو صالح[6]۔ یہ قول کتاب میں نہیں ہے۔

پیش نظر نسخہ ناقص بھی ہے، درمیان سے متعدد تراجم غائب ہیں، مثلاً سفیان بن حبیب ابو محمد بزار بصری کے بارہ میں ابن حجرؒ نے لکھا ہے: وذکرہ ابن شاهین فی الثقات وقال: قال عثمان ابن ابی شیبة الخ[7] اور کتاب میں ان کا ذکر نہیں ہے، سالم بن نوح بن ابو عطا بصری کے حال میں ابن حجرؒ نے لکھا ہے: ذکرہ ابن شاهین فی الثقات وقال، قال ابن معین الخ[8] حالانکہ کتاب میں ان کا تذکرہ نہیں ہے، اسی طرح بعض اور تراجم اس نسخہ سے ساقط ہیں، ابتدا کے چند ابواب میں متفق الاسماء کے ذیلی عنوانات ہیں، بعد میں اس کا التزام نہیں ہے، اسماء کے ذکر میں

---

۱ تہذیب التہذیب ج ۱، ص ۲۸۹۔ ۲ التہذیب ج ۱، ص ۳۲۹ ۳ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۲۲ ۴ ایضاً ج ۴، ص ۴۰۲۔ ۵ ایضاً ج ۳، ص ۱۰۷ ۶ ایضاً ج ۳، ص ۴۴۳۔

اسمٰعیل بن سُمیع کوفی ثقۃ، وقال مرّۃً اخریٰ: ثقۃ مامون۔

نا محمد بن مخلد، نا صالح بن احمد بن حنبل، نا علی بن المدینی: قیل لیحییٰ ابن معین: نا السدّی، یعنی اسمٰعیل بن عبد الرحمٰن؟ قال: السدّی عندنا لاباس بہ۔

نا یحییٰ بن محمد بن صاعد و محمّد بن ھارون الحضرمی قالا: نا ابو ھشام الرفاعی، نا اسمٰعیل بن شعیب السمّان۔ وکان ثقۃ۔

وقال احمد بن صالح المصری: اسمٰعیل بن ابی حکیم، عن عبیدۃ بن سفیان ھٰذا من اثبت اسناد اھل المدینۃ، اسمٰعیل لہ شأن، وقال یحییٰ بن معین: اسمٰعیل ابن ابی حکیم صالح (ص۳)

حافظ ابن حجرؒ نے اسمٰعیل بن ابی حکیم کے ذکر میں ابن شاہین سے یوں نقل کیا ہے: قلت: ونقل ابن شاھین فی الثقات عن احمد بن صالح قال: اسمٰعیل بن ابی حکیم عن عبیدۃ بن سفیان، ھٰذا من اثبت اسانید اھل المدینۃ[1]

یہ کتاب امام ابن شاہین کے اس قول کی آئینہ دار ہے:

انا اکتب ولا اعارض (میں لکھتا ہوں اور اس کا اصل سے مقابلہ نہیں کرتا) اور جمیع ماخرجتُہ وصنفتُہ من حدیثی لم اعارضہ بالاصول (یعنی میں نے اپنی احادیث و مرویات کی تمام تخاریج و تصانیف کا اصول سے مقابلہ نہیں کیا ہے)[2] پوری کتاب میں مکررات بہت زیادہ ہیں، کہیں ایک ہی عبارت مکرر ہے، کہیں معمولی سا فرق ہے، کہیں کمی زیادتی ہے، کئی اسماء تین تین بلکہ چار چار بار آگئے ہیں، بعض ابواب میں دوسرے ابواب کے اسماء آگئے ہیں، ایک قسم کے اسماء میں دوسرے قسم کے اسماء درج ہیں، بعض مقامات میں عبارتیں بے محل ہیں،

---

[1] تہذیب التہذیب ج۱، ص ۲۸۹۔ [2] تاریخ بغداد ج ۱۱، ص ۲۶۸۔

عبادت میں اس قدر آگے تھے کہ ان کو زاہد بنی ہاشم کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا، وہ دنیا میں آخری عالم و محدث تھے جنھوں نے امام دارقطنی، امام ابن شاہین اور امام ابوبکر بن درست سے روایت کی تھی اور اہل علم نے ان کے ذریعہ ان تینوں ائمۂ حدیث کی مرویات کی روایت کی،[1] اور ابن المہتدی سے شیخ ابو عبداللہ محمد بن ابی نصر فتوح حمیدی متوفی ۴۸۸ھ نے اس کتاب کی روایت کی، مشہور ظاہری امام ابن حزم کے صحبت یافتہ اور خود ظاہری مسلک کے عالم تھے، ان کی کتاب الجمع بین الصحیحین بہت مشہور ہے۔[2]

ابن شاہین نے جیسا کہ مقدمۃ الکتاب میں بتایا ہے اس میں صرف ائمۂ جرح و تعدیل کے اقوال درج ہیں، وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ، کسی کسی راوی کے حال پر کچھ روشنی بھی ہے، ابن شاہین نے شاید ہی کہیں اپنی ذاتی رائے درج کی ہو، کہیں اپنی سند سے اور کہیں بے سند کے اقوال نقل کیے ہیں، ان کی حیثیت صرف ناقل اور جامع کی ہے، نمونہ ملاحظہ ہو:

من اسمہ اسمٰعیل

فا الحسین بن احمد بن صدقۃ، فا احمد بن ابی خیثمۃ، قال، سمعت بن معین یقول: من سئل ابن مہدی عن اسمٰعیل ـ یعنی ابن ابی خالد، فقال: ثقۃ، واثنی علیہ الشعبی۔

وقال یحیٰی بن معین: اسمٰعیل بن مسلم المخزومی مکی ثقۃ، یروی عنہ وکیع یحدث عن عبداللہ بن عبید ابن عمیر۔

وقال ابن معین اسمٰعیل بن مسلم العبدی ثقۃ، وھو بصری، روی عن ابن عیینۃ اسمٰعیل بن امیۃ اذا حدث عن الثقات فھو ثقۃ، قالہ ابن معین۔

---

[1] المنتظم ج ۹ ص ۲۰۳ [2] العبر ج ۳، ص ۳۳۳۔

تبع ہے، اس کے عقیدہ میں امامت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں دائر و سائر ہے، اور افضل کے ہوتے ہوئے مفضول کی امامت جائز ہے، تفصیل کے لیے الملل والنحل شہرستانی وغیرہ ملاحظہ ہو۔

دوسرے صفحہ سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے، ہم یہ پورا صفحہ نقل کرتے ہیں جس سے کتاب کے راوی، نام اور غرض و غایت اور اس کے مندرجات کا حال معلوم ہوتا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم (عونك اللّٰھم، اللّٰھم صل علی سیدنا محمد وآلہ) اخبرنا الشیخ ابو عبد اللہ محمد بن ابی نصر بن عبد اللہ الحمیدی رضی اللہ عنہ قراءۃً علیہ فی منزلہ ببغداد، قال: انا الشیخ الامام القاضی الشریف ابو الحسین محمد بن علی بن المھتدی باللہ فی الاجازۃ وغیرہ، عن ابی حفص عمر بن احمد بن شاھین الواعظ رحمہ اللہ تعالیٰ قال: کتاب اسماء الثقات ممن روی الحدیث ممن انتھیٰ الینا ذکرہ عن نقاد الحدیث ممن قبلت شھادتہ واشتھرت عدالتہ وعرف ونقل، مثل یحییٰ بن سعید القطان، وعبد الرحمٰن بن مھدی، و یحییٰ بن معین، واحمد بن محمد بن حنبل، وعلی بن المدینی، وعثمان ابن ابی شیبۃ، ومحمد بن عبد اللہ بن عباد[1] الموصلی، واحمد بن صالح، ومثل من تقدمھم ومثل من قاربھم، واخرجت اسماء الثقات علی حروف المعجم لیقرب للناظر فیہ اسم من قصدہ، وباللہ نستعین وعلیہ متوکل۔

اس مقدمہ کے بعد باب الالف سے من اسمہ اسمٰعیل کے عنوان سے اصل کتاب ہے، اس کتاب کے پہلے راوی امام ابن شاہین کے خاتمۃ الاصحاب اور تلمیذ رشید شیخ ابو الحسین محمد بن علی ابن محمد بن مہتدی باللہ متوفی ۴۶۵ھ ہیں جو ابن الغریق کی کنیت سے مشہور ہیں، زہد و تقویٰ اور

[1] عمار صحیح ہے، ابو جعفر محمد بن عبد اللہ بن عمار موصلی، صاحب التاریخ، متوفی ۲۴۲ھ۔

احمد بن یوسف بن حسین بن حسن بن المنصور باللہ القاسم بن محمد بن علی رضوان اللہ علیہ وسلامہ۔

کاتب اور مالک دونوں اہل علم کا نسبی تعلق شمالی یمن کے زیدی المذہب حکمران قاسمی خاندان سے ہے جس کا نسب حضرت حسن رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے، اس کے بانی و مورث قاسم بن محمد بن علی ۹۶۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۰۶ھ میں صنعاء کے حکمراں خاندان شرف الدین پر قبضہ کر کے الامام المنصور باللہ کا لقب اختیار کیا، اور امام یمن بن کر وفات ۱۰۲۹ھ تک حکومت کی، اسی زیدی امامت و سلطنت کا خاتمہ ۱۹۶۲ء میں شمالی یمن کے عوامی انقلاب پر ہوا۔

علامہ شوکانی نے البدر الطالع میں اس نسخہ کے کاتب کا حال لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سید احمد بن یوسف بن حسین بن حسن بن امام قاسم کی ولادت ۱۱۲۰ھ کے بعد ہوئی اور اواخر جمادی الآخرۃ ۱۱۹۱ھ میں فوت ہوئے، صنعاء میں نشو و نما ہوئی اور وہیں کے علماء سے تحصیل علم کی، محقق، علامہ، محدث، علم سنت کے ماہر اور رجال و حدیث کے حفظ میں مشہور تھے، علم حدیث میں رسوخ و تبحر کی وجہ سے ان کا لقب حدیث تھا، ساتھ ہی جملہ علوم آلیہ کے جامع اور شعر و ادب میں ید طولیٰ رکھتے تھے، مجموعۂ امام زید بن علی کی نہایت نفیس تخریج لکھی تھی جو علم الروایہ میں ان کی مہارت کی دلیل ہے، نہایت متواضع، خوش خلق، باوقار اور صابر و شاکر عالم تھے[1]۔

کاتب سید احمد بن یوسف بن حسین کے جمادی الآخرۃ ۱۱۹۱ھ میں انتقال کے چند ماہ بعد یہ نسخہ یوسف بن احمد بن حسین کی ملکیت میں آیا، یہ غالباً کاتب کے چچازاد بھائی ہیں، یمن کے بہت سے زیدی العقیدہ اہل علم فروعات اور فقہی مسائل میں شافعی، حنبلی وغیرہ تھے، یہ دونوں اہل علم غالباً فروعات میں فقہ اہل سنت پر عامل تھے، فرقۂ زیدیہ شیعوں میں زید بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

[1] البدر الطالع ج ۱ ص ۱۲۸ تا ص ۱۳۰۔

ہر صفحہ میں پندرہ[15] سطریں ہیں، کاتب صنعاء کے ایک زیدی المذہب عالم احمد بن یوسف بن حسین ہیں جن کا نسبی تعلق یمن کے حکمراں اسرۂ قاسمیہ سے ہے، کاتب نے منقول عنہ نسخہ کے بارے میں کوئی تصریح نہیں کی ہے کہ یہ نسخہ کس نے، کب اور کہاں لکھا ہے، البتہ حاشیہ میں بعض جگہ اس کو "الام" لکھا ہے، نیز تقریب التہذیب سے حاشیہ میں متعدد رواۃ کے بارے میں مزید معلومات درج کی ہیں، اسی سلسلہ میں ایک جگہ حضرت سمرہ ابن جندب رضی اللہ عنہ کے متعلق بغض و عداوت کا سخت لہجہ میں مظاہرہ کیا ہے، جس سے کاتب کا رفض و تشیع نمایاں ہوگیا ہے، اسی سے نقل کردہ نسخہ کا عکسی نسخہ جامعۂ اسلامیہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں آیا ہے جیسا کہ اس کے ترقیمہ سے معلوم ہوتا ہے، میں نے ۸ ذوقعدہ ۱۴۰۲ھ میں اس کو دیکھا ہے۔

کتاب کا نام پہلے صفحہ پر یوں لکھا ہے:

کتاب تاریخ اسماء الثقات ممن نقل عنهم العلم

علی حروف المعجم، عن ابی حفص عمر بن احمد

ابن شاهین رضی الله تعالیٰ عنه

آمین

نیچے بائیں طرف فارسی رسم الخط میں ایک تملیک یوں ہے: "من فضل الله سبحانه وتعالیٰ علی الفقیر الحقیر المعترف بالعجز والتقصیر المذنب الجانی یوسف بن احمد بن الحسین بن الحسن بن امیر المومنین المنصور بالله رب العالمین القاسم بن محمد ابن علی رضوان الله تعالیٰ علی الجمیع، بتاریخ؛ شہر ذی قعدہ ۱۱۹۱ھ"

اور آخر میں ترقیمہ یوں ہے: آخر کتاب اسماء الثقات ممن نقل منه العلم علی حروف المعجم، الحمد لله وحده وصلی الله علی سیدنا محمد وآله وصحبه وسلم، کان الفراغ من رقمه لیلة الاحد ثالث عشر من شهر رجب احد شهور سنة ثلاثة وسبعین ومأیة والف من هجرته صلی الله علیه وآله وسلم، بخط اسیر ذنبه ورهین کسبه الفقیر الی رحمة الله [نفعنی]

تاج الدین سبکی متوفی ۷۷۱ھ اور امام نور الدین ہیثمی متوفی ۸۰۷ھ نے حروف تہجی پر مرتب کیا اور وہ ترتیب الثقات للعجلی کے نام سے مشہور ہے۔

(۲) امام ابو حاتم محمد بن حیان بن احمد بستی متوفی ۳۵۴ھ کی کتاب الثقات، یہ اپنے موضوع پر بہت مشہور کتاب ہے، اور چند سال ہوئے دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد میں چھپ گئی ہے۔

(۳) امام ابو حفص عمر بن احمد بن عثمان الواعظ المعروف بابن شاہین بغدادی متوفی ۳۸۵ھ کی کتاب الثقات۔

یہ عجیب بات ہے کہ امام ابن شاہین کی تین سو ساٹھ [۳۶۰] سے زائد تصانیف ہیں، ان کے کسی تذکرہ نگار نے اس کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے، ہماری محدود معلومات میں صرف حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ نے تہذیب التہذیب میں جا بجا رُواۃ و رجال کے ذکر میں عجلی اور ابن حبان کے ساتھ ابن شاہین کا قول ان کی کتاب الثقات سے نقل کیا ہے اور قال ابن شاہین فی الثقات کی تصریح کی ہے، نیز حافظ ابن حجر نے بعض مقامات پر اس کتاب کے آخری حصہ المختلف فیہم سے قال ابن شاہین فی المختلف فیہم لکھ کر ان کا قول درج کیا ہے، چلپی نے کشف الظنون میں اس کی نسبت خلیل ابن شاہین کی طرف کی ہے[۱]، اور شیخ عبدالعزیز خولی مصری نے بھی مفتاح السنہ میں اسی کو نقل کیا ہے[۲]، خلیل ابن شاہین نویں صدی کے ظاہری عالم ہیں، اس موضوع پر ان کی کتاب نہیں ہے، صحیح یہ ہے کہ یہ ابو حفص ابن شاہین کی کتاب ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن شاہین کی کتاب الثقات ہمیشہ سے نادر الوجود رہی ہے، اس لیے محدثین کے یہاں اس کا تذکرہ نہیں ملتا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۳ رجب ۱۱۳۲ھ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانہ میں موجود ہے، کاغذ دبیز سفید، کتابت عربی رسم الخط میں جلی، سائز متوسط، کل صفحات لکھے ہوئے

---

[۱] کشف الظنون ج ۱، ص ۳۵۵، طبع ترکی۔ [۲] مفتاح السنہ ص ۱۵۲۔

تاریخ اسماء الثقات لابن شاہین

از

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، ایڈیٹر البلاغ، بمبئی

اصول حدیث میں جرح و تعدیل کا علم بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس میں حدیث کے رُواۃ و رجال کی جرح و تعدیل یعنی تضعیف و توثیق سے بحث کی جاتی ہے، اس کے لیے مخصوص الفاظ اور ان کے درجات ہوتے ہیں، اس کا مقصد احادیث رسولؐ اور شریعت کی حفاظت و صیانت ہے، جرح و تعدیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور عہد بہ عہد ایمۂ حدیث سے منقول ہے، اس فن کے ایمہ و جہابذہ کے طبقات و اسماء کے لیے ابن ابی حاتم رازی کی کتاب تقدمۃ الجرح والتعدیل اور ابن حبان بُستی کی کتاب المجروحون من المحدثین کا مطالعہ کرنا چاہیے،

اس فن میں متقدمین و متاخرین نے مختلف انداز میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں، بعض میں صرف ثقات، بعض میں صرف ضعفاء اور بعض میں دونوں طبقوں کا تذکرہ ہے، ثقات اور ضعفاء کی جامع کتابوں میں طبقات ابن سعد، طبقات خلیفہ بن خیاط، التاریخ الکبیر بخاری اور الجرح والتعدیل ابن ابی حاتم رازی مشہور و متداول ہیں، ثقات پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں بعض حیثیات سے یہ تین کتابیں زیادہ مشہور ہیں اور محدثین نے ان کے ساتھ خصوصی اعتناء کیا ہے؛

(۱) امام ابوالحسن احمد بن عبداللہ ابن صالح عجلی، متوفی ۲۶۱ھ کی کتاب الثقات جس کو امام

۱۸ سودا (لکھنؤ ۱۹۷۲ء) ۷۵،

۱۹ آب حیات ۱۶۷

۲۰ ایضاً ۱۶۷-۱۶۸-

۲۱ تاریخ ادب اردو (لکھنؤ ۱۹۶۹ء) ۱۱۱

۲۲ سوانحات ۹۵

۲۳ تاریخ ادب اردو ۱۱۱

۲۴ لکھنؤ کا دبستان شاعری (دہلی طبع اول ۱۰۲-۱۰۳،

۲۵ بی ایس سی ۲۹ راپریل ۱۷۷۶ء نمبر ۳

۲۶ وقائع آصف ۱۴؛ مرآۃ السلاطین (نولکشور پریس) ۹۹/۳

۲۷ آب حیات ۱۵۱-۱۶۰،

۲۸ ایبسٹریکٹ ریوے نیو اکاونٹ ۱۸۰۰ء (مخطوطہ نیشنل آرکائوز دہلی)

آف پرشین کرس پونڈینس) ۴/۸ ، ۱۰۷ ؛ طلایۃ المقدور من مطالع الدھور (دہلی ۱۹۱۱ء) ۱۳۸

۵۶ عماد السعادت (بدایوں کے ایک مخطوطہ کی ذاتی کاپی) ۲۰۴ ؛ تاریخ فرخ آباد (مخطوطہ رضا لائبریری) ۲۰۱ ؛ منتخب تنقیح الاخبار (سلطان المطابع) ۵۴ ،

۵۷ بی ایس سی (نیشنل آرکاوز میں محفوظ سیکریٹ کنسلٹیشن) ۶ ، فروری ۱۷۶۶ء ، شجاع الدولہ کا خط وارین ہیسٹنگز کو ۲ ، فروری ۔

۵۸ اے ایل سری واستو ، شجاع الدولہ آف اودھ (۲ جلد آگرہ ۱۹۶۱-۱۹۷۴) ۲/۱ ، ۹-۲۵۸

۵۹ سی پی سی ۵/۲۴۰ ؛ عماد السعادت ۷-۸۰ ؛ وقائع آصف ۱۰-۱۱ ؛ مرقع خسروی مخطوطہ ٹیگور لائبریری لکھنؤ) ۵۳-۵۴ ؛ سلطان التواریخ (مخطوطہ ٹیگور) ۲۴۳ ؛ تاریخ فرخ آباد ۱۷۰ ، ۱۹۷ ، ۲۰۱ ،

۶۰ حامد آفاق قریشی ، سعادت علی آف اودھ (لکھنؤ ۱۹۵۱ء) ۱۳

۶۱ سی پی سی ۵/۲۸۳ ؛ سوانحات ، سوانحات سلاطین اودھ (لکھنؤ ۱۸۶۹ء) ۹۴ ؛

۶۲ سی پی سی ۵/۲۸۳

۶۳ عماد السعادت ۹۳-۹۴ ؛ سلطان التواریخ ۴۴ ؛ مرقع خسروی ۶۱

۶۴ تاریخ فرح بخش (مخطوطہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) ۲۳۱ ب ۲۳۲ ب ؛ بی ایس سی ، ۲۶ فروری ۱۷۶۶ء ؛ برسٹو کا خط بورڈ کو ۱۲ ، فروری ؛ سوانحات ۹۵ ۔

۶۵ سی پی سی ۴/۱۶۸۳ ، ۹/۱۱۰۰ ؛ عماد السعادت ۱۱۴-۱۲۴ ؛ وقائع آصف ۱۱ ؛ عقد ثریا (دہلی ۱۹۳۹) ۹ ۔

۶۶ ہینسوے ، ہسٹری آف آصف الدولہ (لکھنؤ ۱۹۷۰) ۱۵ ؛ مرقع خسروی ۶۱ ۔

۶۷ سری واستو : فرسٹ ٹو نوابس آف اودھ (آگرہ ۱۹۵۴ء) ۳۲-۳۴ ، ۱۰۰-۱۰۱

طرف سے بہت نازیبا حرکت ہوئی، اگر شعر کے مرد میدان ہو تو اب روبرو سودا کی ہجو کہو، مرزا فاخر نے کہا این از ما نمی آید، آصف الدولہ نے بگڑ کر کہا، در دست این از شما نمی آید این می آید کہ شیاطین خود را بر سر مرزائے بیچارہ فرستادید انہا بیادارش کشیدند۔ می خواستند آبروئش بخاک ریزند، پھر سودا کی طرف اشارہ کیا، یہاں کیا دیر تھی، فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی،

توفخر خراسانی وفا ساقط ازو — گوہر بہ ہاں داری ودا ساقط ازو
روزان وشبان زحق تعالیٰ خواہم — مرکب و بدت خدا وبا ساقط ازو

انجام یہ ہوا کہ علاوہ انعام واکرام کے چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ہو گیا[۲۴]"

لیکن یہ بھی آزاد کا محض ایک شاخسانہ ہے، کیونکہ ایک معاصر کاغذ سے یہ امر ثابت ہے کہ سنہ ۱۱۹۷ھ تک سودا کا وظیفہ مبلغ ۲۳۷۰ (دو ہزار تین سو ستر) روپیہ سالانہ تھا[۲۵]

حواشی

۱ کلیات سودا (کانپور ۱۳۲۳ھ) ص ۲۱،

۲ آب حیات (الہ آباد ۱۹۶۷ء) صفحات ۱۶۶-۷

۳ عبرت الغافلین (کلیات سودا) صفحات ۳۳-۷۱

۴ کلیات سودا صفحات ۵-۲۱-۲۷،

۵ وقائع زمان نواب آصف الدولہ (مخطوطہ رضا لائبریری رامپور) ۳؛ گیان پرکاش (مخطوطہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) ۴ ب، ۵ الف؛ تاریخ فیض بخش (مخطوطہ سر سالار جنگ میوزیم) ۱۹۲ ب؛ ایس پی ڈی سلکشنز فرام پیشوا دفتر ۳۱ صفحات ۲۷-۲۸؛ سی۔ پی۔ سی [illegible]

گمان کو تو خیال دور دراز اپنا تھا۔ قبول نہ کیا۔ اسکیسنہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ معرکۂ مکین وسودا کا تصفیہ نواب سعادت علی خاں نے .... نواب کے روبرو مرزا کی موافقت میں کرا دیا، لیکن ظاہر ہے کہ ان کا یہ بیان صحیح نہیں،

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اس معرکہ کے واقعات کو جہاں تک عبرت الغافلین سے لکھا ہے وہاں تک تو صحیح لکھا ہے لیکن اس کے بعد انھوں نے اس واقعہ سے متعلق آزاد کے اس حصہ کو نقل کر دیا ہے، جو اوپر درج کیا گیا ہے، البتہ انھیں آزاد کے ان بیانات کو صحیح ماننے میں تردد ہے، کہ مکین کے شاگردوں نے سودا کے پیٹ پر چھری رکھ دی تھی، اور آصف الدولہ نے شیخ زادگان کے محلّہ کو کھدوا کر پھنکوا دینے کا حکم دیا تھا، اس سے صاف صاف ظاہر ہے کہ اصلح الدین کا قصیدہ ان کی نظر سے نہیں گزرا ہے،

اب سوال یہ ہے کہ معرکۂ مکین وسودا کب ہوا؟ اس معرکہ کی معاصر تفصیلات سے یہ واضح ہے کہ سعادت علی خاں اور مختار الدولہ دونوں اس واقعہ سے وابستہ تھے، اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے کہ سعادت علی خاں بریلی سے روانہ ہو کر آصف الدولہ سے فروری ۱۷۷۵ء میں آ کر مل گئے تھے، مختار الدولہ کو ایک سازش کے تحت اثناء میں، اپریل ۱۷۷۶ء کو قتل کر دیا گیا تھا، اس سے پہلے وہ اور سعادت علی خاں دونوں شوال ۱۱۸۹ھ (نومبر، دسمبر ۱۷۷۵ء) تک لکھنؤ میں تھے، پھر ظاہر ہے کہ یہ واقعہ لکھنؤ میں فروری، دسمبر ۱۷۷۵ء کے بیچ کسی وقت ہوا ہوگا،

اس معرکہ پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ:-

"جھگڑے نے ایسا طول کھینچا کہ نواب آصف الدولہ کے دربار تک نوبت پہنچی، دوسرے دن آصف الدولہ نے سر دربار مرزا فاخر کو بھی بلایا، اور کہا کہ تمھارا

اور شہر میں یہ قیامت! آصف الدولہ نے کہا کیوں بھئی خیر باشد، انھوں نے کہا کہ مرزا رفیع
جس کو بابا جان نے برادرمن اور مشفق مہربان کہہ کر خط لکھا، آرزوئیں کر کے بلایا، اور
وہ نہ آیا، آج وہ یہاں موجود ہے، اور اس حال میں ہے کہ اگر اس وقت میں نہ
نہ پہنچتا تو شہر کے بدمعاشوں نے اس بیچارے کو بے حرمت کر ڈالا تھا، پھر سارا ماجرا
بیان کیا، آصف الدولہ فرشتہ خصال گھبرا کر بولے کہ بھئی مرزا فاخر نے ایسا کیا تو
مرزا کو کیا گویا ہم کو بے عزت کیا، بابا جان نے ان کو بھائی لکھا تو وہ ہمارے چچا
ہوئے، سعادت علی خاں نے کہا کہ اس میں کیا شبہ ہے، اسی وقت باہر نکل آئے،
سارا حال سنا، بہت غصہ ہوئے، اور حکم دیا کہ (شیخ زادگان کا محلہ کا محلہ اکھڑوا کر
پھینک دو، اور شہر سے نکلوا دو) مرزا فاخر کو جس حال میں ہو اسی حال سے حاضر
کرو، سودا کی نیک نیتی دیکھنی چاہئے، ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جناب عالی ہم لوگوں
کی لڑائی کاغذ قلم کے میدان میں آپ ہی فیصل ہو جاتی ہے، حضور اس میں مداخلت
نہ فرمائیں، خادم کی بدنامی ہے، جتنی مدد حضور کے اقبال سے پہنچی وہی کافی ہے!
غرض مرزا رفیع سودا باعزاز و اکرام وہاں سے رخصت ہوئے، نواب نے
احتیاطاً سپاہی ساتھ کر دیے، حریفوں پر جب یہ راز کھلا تو امراے دربار کے پاس
دوڑے، صلاح ٹھہری کہ معاملہ روپیہ یا جاگیر کا نہیں، تم سب مرزا فاخر کو ساتھ
لے کر مرزا رفیع کے پاس چلے جاؤ، اور خطا معاف کرا لو۔"

رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے کہ سعادت علی، ان دنوں ولی عہد سلطنت تھے،
جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سعادت علی کے لکھنؤ آنے کے بعد آصف الدولہ نے اپنے بھائی سے
کہا تھا کہ اپنے بیٹے غازی الدین حیدر کو میری فرزندی میں دیں [illegible] میں اپنا جانشین کر دوں گا

سوداکو خوشگوار طریقہ سے ختم کرانے میں اتنی دلچسپی کا اظہار کیا،

شیخ چاند نے لکھا ہے کہ "اس معرکہ کا حال سودا کے رسالہ عبرت الغافلین"، اور ان کے شاگرد صلح الدین کے اس قصیدے میں معلوم ہوگا، جو مصحفی کی ہجو میں تحریر ہوا ہے، آزاد دہلوی نے رسالۂ مذکورہ اور اس قصیدے کا خلاصہ آب حیات میں درج کیا ہے، جو یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے"۔ شاید شیخ چاند نے نہ تو عبرت الغافلین بغور پڑھی تھی، نہ صلح الدین ہی کے قصیدہ کو، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس واقعہ کو آب حیات سے بجنسہٖ نقل کرنے کے بجائے اس کا متن و کچھ اس طرح سے پیش کرتے، جیسا کہ اس مضمون میں کیا گیا ہے، مکین نے اشرف علی کے تذکرہ کی تصحیح کرنے میں قطع برید کے جو گل کھلائے تھے، ان کا حال تو آپ پڑھ چکے لیکن محمد حسین آزاد نے اس واقعہ کو عبرت الغافلین اور صلح الدین کے قصیدے سے اپنے لفظوں میں منتقل کرنے میں ان سے بھی بازی لے گئے ہیں، اور ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا ہے، کہ انھیں مضامین کے گل پھول اور باتوں کے طوطا مینا بنانے بہت آتے تھے، اس معرکہ کی اصل تفصیلات مدنظر رکھتے ہوئے اب آزاد کا یہ بیان پڑھئے، اور اس بیان میں جو باتیں صحیح ہیں ان کو ( ) میں بند کر دیا گیا ہے،

"بچارے نے جز دان غلام کو دیا، (خود میانے میں بیٹھے، اور ان کے ساتھ ہوئے، گروہ لشکر شیطان تھا، بیچ میں تھے،) چوک میں پہنچے تو انھوں نے چاہا کہ یہاں انھیں بے عزت کیجئے، کچھ تکرار کرکے پھر جھگڑنے لگے (مگر جسے خدا عزت دے، اسے کون بے عزت کر سکتا ہے؟ اتفاقاً سعادت علی خاں کی سواری آنکلی، مجمع دیکھ کر ٹھہر گئے، اور حال دریافت کرکے سودا کو اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھا کر لے گئے،) آصف الدولہ حرم سرا میں دسترخوان پر تھے، سعادت علی خاں اندر گئے، اور کہا کہ بھائی صاحب بڑا غضب ہے، آپ کی

خاں اس سے خوش نہ تھے کیونکہ یہ جاگیر ان کے اخراجات کے لئے ناکافی تھی، اور اُن کی
مرضی کے خلاف زبردستی اُن پر تھوپ دی گئی تھی۔ سعادت علی خاں آصف الدولہ کے
بعد شجاع الدولہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے، اس لئے ان کا خیال تھا کہ اُن کو دوسرے
بھائیوں کے مقابلہ میں اودھ کے دربار میں زیادہ عزت اور وقار ملنا چاہئے لیکن آصف الدولہ
اُن سب کے ساتھ مساوی برتاؤ کرتے تھے، اور اپنے دیگر بھائیوں کی طرح ان کو بھی سواری
کے لئے محض دو ہاتھی ہی دیئے تھے۔ آصف الدولہ کے نائب مختار الدولہ کا رویہ بھی ان
کے ساتھ اچھا نہ تھا، اور وہ اُن کو ان کے مرتبہ کے مطابق خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان سب
باتوں سے ظاہر ہے کہ آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے تعلقات ان دنوں اچھے
نہ تھے، اور یہی وجہ ہے کہ سودا کو ان موذیوں سے چھڑانے کے بعد سعادت علی خاں محض اُن
کو اپنے گھر لے جانے اور ان کی تسلی و تشفی کرنے کے علاوہ کچھ اور نہ کر سکے۔

مسند نشینی کے بعد آصف الدولہ اپنا تمام تر وقت لہو و لعب میں گزارتے تھے اور
حکومت کے معاملات سے اُن کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اگر کوئی آدمی اُن کے پاس فریاد لیجاتا
تھا تو کہتے کہ مختار الدولہ کے پاس جاؤ، مجھے ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مختار الدولہ
نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا، انھوں نے حکومت کے تمام محکموں میں اپنے دوستوں، بھائیوں،
رشتہ داروں اور اپنی پسند کے امیروں کو لا بٹھایا، شجاع الدولہ کے دور کے بہت سے امیروں
کو برطرف کر دیا، اور جو باقی رہے ان کو ستانے لگے۔ ان حالات میں اودھ کے یہ امراء ان کے
جانی دشمن بن گئے، اور ان کے زوال کی فکر میں لگ گئے، ان امیروں کے خلاف ایک گروہ
کھڑا کرنے کے لئے مختار الدولہ ان دنوں شیخ زادگانِ لکھنؤ کی سرداری کر رہے تھے جو [illegible]
کے جنگجو تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے ان وفادار حامیوں کو بچانے کے لئے معرکہ

مجلسِ دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مُرتّبہ

سیّد صباح الدّین عبد الرّحمٰن

قیمت بیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنّفین اعظم گڈھ

جلد ۱۳۱ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۸۳ء عدد ۳

مضامین

مقالات

وفیات

شذرات

اس برصغیر کے نامور، علم دوست اور علم نواز جناب حکیم محمد سعید دہلوی نے کراچی سے جناب سید امیر علی کی انگریزی میں کلام پاک کی تفسیر کی پہلی جلد Quran: The Fundamental Law of Human Life بھیج کر ایک بہت ہی قیمتی تحفہ سے نوازا،

جناب سید امیر علی صاحب پاکستان کے سپریم کورٹ کے ایڈوکیٹ ہیں، اب تک وہ حسب ذیل کتابیں لکھ چکے ہیں (۱) Life-the Essential of Ultimate Reality (۲) Religion -the Science of Life (۳) Islam-the Religion (۴) Real Tragedy of the Human Life (۵) Real Achievement of the Human Life (۶) Seal of Prophethood -

یہ وہ کتابیں ہیں جن سے اسلام کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی، اب جناب سید امیر علی انگریزی میں دس جلدوں میں قرآن پاک کی تفسیر لکھنے کے علمی جہاد میں مشغول ہو گئے ہیں جس کی پہلی جلد سید پبلیکیشنز، ۲۰۶، لائرز چیمبر، محمد علی جناح روڈ کراچی نمبر ۱ سے شائع ہوئی ہے،

اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوگا کہ اس کے شروع میں پاکستان کے دیدہ ور صاحب دل توحید اور رسالت کے راز نہاں کے واقف کار، مصنف، خطیب، قانون داں اور مدیر جناب اے کے بروہی صاحب کا ایک مقدمہ ہے، جو ایک سو چھبیس صفحے پر مشتمل ہے، یہ پُرمغز مقدمہ خود ایک مستقل تصنیف ہے، جس میں کلام اللہ کے مطالعہ سے متعلق ہر قسم کی موشگافیاں کر کے عہد حاضر کے ذہنی، نفسیاتی، تمدنی، معاشی، سیاسی، مادی اور مذہبی امراض کا مداوا پیش کیا گیا ہے، اس کو پڑھ کر بے اختیار دل کہہ اٹھتا ہے ع ابھی محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی وہ مشکک ذہن جو انداز فرنگ کی بجلی کے چراغوں کے جوہر کی براقی سے چکا چوند ہو گیا ہے، اس مقد

کو پڑھے گا تو وہ محسوس کریگا کہ جس سے دنیا کی تدبیریں الٹ جاتی ہیں اور تقدیریں بدل جاتی ہیں، وہ اس میں موجود ہیں، یہ تحریر قرون اولیٰ کی بیدہ دری اور رمز شناسی کی یاد تازہ کرتی ہے،

اس تفسیر کی خوبی یہ ہو کہ چھوٹے چھوٹے ابواب میں وہ تمام باتیں بہت ہی صاف اور دلنشیں انداز میں قرآن پاک کے ذریعہ سے سمجھا دی گئی ہیں جو انسانی ذہن میں اس مقدس کتاب سے متعلق آتی رہتی ہیں، پہلے باب میں توریت انجیل، وید، اوستا اور بودھ مذہب کے لٹریچر میں کیا کیا چیزیں ہیں، ان کو سمجھانے کے بعد قرآن پاک کی اہمیت دکھائی گئی ہو، دوسرے باب میں وحی، وحی کے اقسام، نزول قرآن، تحفظ قرآن، کتابت قرآن، تدوین قرآن، ترتیب قرآن اور لغات و اعراب قرآن کی تفصیل ہو، تیسرا باب آیات، سورتیں، منازل، رکوع، حروف مقطعات، محکمات اور متشابہات اور ناسخ و منسوخ پر ہے، چوتھا باب تلاوت، آداب تلاوت، آیات سجدہ، رموز الاوقاف اور قراٰت سبعہ پر ہو، پانچواں باب تفسیر، تاویل، تفسیر کی قسمیں، علم الاصول، قرآن پاک کے الفاظ کی قسمیں مثلاً خاص، عام، مشترک، مؤول، پھر آیات کے اقسام مثلاً ظاہر، نص، مفسر، محکم، خفی، مشکل، مجمل، اور متشابہ پھر حروف کے استعمال مثلاً حقیقت، مجاز، صریح اور کنایہ پر ہے، اسی میں صحابۂ کرام، تابعین، اور تبع تابعین نے کلام پاک کی جو تفسیریں کیں، عربی، اردو، انگریزی میں اور شیعوں کے یہاں جو تفسیریں لکھی گئی ہیں، اور قرآن پاک کے جو مختلف ترجمے ہیں، اُن کا بھی ذکر ہے،

چھٹے باب میں قرآن پاک سے جو اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہو، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق جو کچھ فرمایا ہو، یا انجیل میں اس کا ذکر جس طرح آیا ہو، یا غیر مسلموں نے اس کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہو، یا اس پر جو اعتراضات ہوتے رہتے ہیں، اُن کی تفصیل ہو، ساتویں باب میں قرآن اور دیگر علوم، قرآن اور فلسفہ، قرآن اور سائنس، قرآن اور تصوف، قرآن اور فقہ کے عنوانات سے علٰحدہ علٰحدہ مباحث ہیں، اجتہاد، اجماع، قیاس، استحسان، استصلاح، مصالح مرسلہ، استدلال، علت، عرف، تقلید، اصول، اجتہاد کے قیود اور مجتہدین کے اوصاف پر پورے معلومات جمع کر دیئے گئے ہیں، آٹھویں باب میں قرآن میں عاد، ثمود، قوم لوط، اصحاب مدین، قوم سبا، بنی اسرائیل، نصاریٰ، اصحاب الایکہ،

اصحاب الرس، قوم تبع، صابئین اور مجوسیوں اور ان کے ساتھ پیغمبروں کے جتنے نام آئے ہیں مثلاً آدمؑ، ادریسؑ، نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، ابراہیمؑ، لوطؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، شعیبؑ، موسیٰؑ، سموئیلؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یونسؑ، الیاسؑ، یوشعؑ، ذوالکفلؑ، عزیرؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ، مریمؑ سے متعلق مستند واقعات فراہم کئے گئے ہیں،

نویں باب میں قرآن میں عقائد، عبادات، ذکر، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، اخلاق، مالیات، اور سیاسیات کی جو تعلیمات دی گئی ہیں، ان کی تفصیل ہے، دسویں باب میں انسان اور اللہ کے تعلقات، انسان اور خود اس کی ذات، انسان اور معاشرہ کے باہمی روابط پر بحث ہے، انسان کو دولت کا مصرف کس طرح لینا چاہئے، وہ مزدوروں کے مسائل کو کس طرح حل کرے، بین الاقوامی معاملات میں اس کا کیا رتبہ ہو، ان تمام مسائل کی وضاحت اچھی طرح کی گئی ہے، گیارہویں باب میں قرآن کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات بیان کئے گئے ہیں،

یہ زیر نظر جلد مصنف کی آیندہ نو جلدوں کا دیباچہ ہے جو تحقیق و مشقت کے ساتھ خاص انداز میں قلمبند ہوا ہے، اس میں دورِ حاضر کے جدید بے چین ذہن کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، بہت ممکن ہے کہ اس ضخیم جلد میں لائق مصنف کی کچھ فروگذاشتوں اور غیر صحیح تعبیروں کی نشاندہی کی جائے، مگر انھوں نے اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ اپنے تمام مباحث کے سلسلہ میں انگریزی میں مارماڈیوک پکتھال، علامہ عبد اللہ یوسف علی، مولانا عبد الماجد دریابادی، اور اردو میں مولانا فتح محمد خاں جالندھری، مولانا احمد رضا خاں، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا نعیم الدین مرادآبادی، پیر محمد کرم شاہ، مفتی محمد شفیع اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیروں کا سہارا لیا، لائق مصنف نے جس محنت و ریاضت سے زیر نظر جلد لکھی ہے امید کہ ان کی آیندہ جلدوں میں ان کا جوہر اور بھی زیادہ چمکے گا، جس کے بعد وہ اپنے ناظرین کو کہہ سکیں گے،

وہ آتش آج بھی تیرا نشیمن پھونک سکتی ہے ۔۔۔۔ طلب صادق نہ ہو تیری تو پھر کیا شکوہ ساقی

امید کہ یہ کتاب یورپ اور امریکہ کے مستشرقین کے محاذ کے خلاف ایک طاقتور کمک کا بھی کام دے گی،

مقالات

قرآن مجید میں قصۂ ابراہیمؑ اور مستشرقین کے اعتراضات

از

ضیاء الدین اصلاحی

حضرت ابراہیم علیہ السلام بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دونوں کے مورث اعلیٰ اور روحانی پیشوا تھے، اس لیے یہود، نصاریٰ اور مسلمان سب ہی انھیں اپنا ہادی، رہنما اور امام تسلیم کرتے ہیں، تورات میں ان کی عظمت و تقدس اور ان کی نسل کی کثرت و برکت کی داستان کئی جگہ دہرائی گئی ہے، ذیل میں کتاب تکوین سے اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

"خداوند نے ابرام کو کہا تھا کہ تو اپنے ملک اور قرابتوں کے درمیان سے اور اپنے باپ کے گھر سے اس ملک میں جو میں تجھے دکھاؤں گا نکل چل، اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور تو ایک برکت ہوگا اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دوں گا، اور اس کو جو تجھ پہ لعنت کرتا ہے لعنتی کروں گا، اور دنیا کے سارے گھرانے تجھ سے برکت پاویں گے"

(پیدائش ۱۲: ۲ و ۳)

دوسری جگہ ہے:

"خداوند نے ابرام سے کہا کہ اپنی آنکھ اٹھا اور اس جگہ سے جہاں تو ہے' اتر اور دکھن اور پورب اور پچھم دیکھ کہ یہ تمام ملک جو تو اب دیکھتا ہے تجھ کو اور تیری نسل کو ہمیشہ کے لیے دوں گا، اور تیری نسل کو میں زمین کی خاک کے مانند بناؤں گا کہ اگر کوئی آدمی زمین کی خاک کو گن سکے تو تیری نسل بھی گنی جائے گی۔" (پیدائش ۱۳: ۱۴-۱۶)

اسی کتاب میں آگے ایک اور باب میں ہے:

"اور خداوند کے فرشتہ نے آسمان سے دوبارہ ابراہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا، اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا، اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کی ریت کے مانند کر دوں گا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی، کیونکہ تو نے میری بات مانی۔" (پیدائش ۲۲: ۱۵-۱۸)

ایک اور جگہ ہے:

"ابراہام تو یقیناً ایک بڑی اور زبردست قوم ہوگا، اور زمین کی سب قومیں اس سے برکت پائیں گی، کیونکہ میں اس کو جانتا ہوں' وہ اپنے بیٹوں اور اپنے بعد اپنے گھرانے کو حکم کرے گا اور وہ خداوند کی راہ کی نگہبانی کر کے عدل و انصاف کریں گے' تاکہ خداوند ابراہام کے واسطے سے جو کچھ اس نے اس کے حق میں کہا ہے' پورا کرے۔" (تکوین باب ۱۸)

قرآن مجید میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مسلمہ امامت و پیشوائی کا ذکر ان بلیغ لفظوں میں ہوا ہے' فرمایا:

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (بقرہ: ۱۲۴)

خدا نے کہا بیشک میں تمھیں (ابراہیمؑ کو) لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔

نیز فرمایا:

وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا۔ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (بقرہ: ۱۳۰)

اور ہم نے اس (ابراہیمؑ) کو برگزیدہ ٹھہرایا دنیا میں، اور وہ آخرت میں نیکوکاروں میں ہوگا۔

ابراہیم کے لفظی معنی قوموں کے باپ کے ہیں، توراۃ میں ان کو ابوالانبیاء (پیغمبروں کے باپ) کہا گیا ہے، اور قرآن مجید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ خدا نے ان کے خاندان کو بڑی برکت دوست عطا کی اور نسل ابراہیمی کی ساری شاخیں خوب پھلی پھولیں۔

قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اسی عظمت و فضیلت کی بنا پر ملت ابراہیمی کے اتباع و اقتدا کی پر زور تاکید اور اس سے سرمو انحراف و تجاوز کی سخت مذمت کی ہے، چنانچہ اسی حیثیت سے اس نے کفار قریش، یہود اور نصاریٰ سب کو دعوت دی کہ تم جن غلط راہوں پر پڑ گئے ہو ان کو چھوڑ کر حضرت ابراہیمؑ کی بتائی ہوئی شاہراہ پر گامزن ہو جاؤ، ارشاد ربانی ہے:

وَقَالُوْا کُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا۔ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَّمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (بقرہ: ۱۳۵)

اور انھوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت پاؤ گے کہدو (نہیں!) بلکہ ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو اللہ کی طرف یکسو تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔

قرآن مجید صراحت کے ساتھ بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ دونوں نے اپنے آخری وقت میں اپنی اولاد کو اسی ملت ابراہیمی کو اختیار کرنے کی وصیت و تلقین کی تھی:

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَ
يَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى
لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ
حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ
لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ
قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ
اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ
اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

(بقرہ : ۱۳۲ و ۱۳۳)

اور ابراہیمؑ نے اسی ملت ابراہیمی (اسلام)
کی وصیت اپنے بیٹوں کو کی اور اسی کی وصیت
یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو کی کہ اے میرے
بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے دین اسلام کو
منتخب فرمایا، تو تم نہ مرنا مگر اسلام کی حالت
پر، کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ
کی موت کا وقت آیا؟ جبکہ اس نے اپنے
بیٹوں سے پوچھا تم میرے بعد کس کی پرستش
کروگے؟ وہ بولے کہ ہم تیرے معبود اور تیرے
آباء و اجداد ابراہیم و اسماعیل و اسحاق کے
معبود کی پرستش کریں گے جو ایک ہی معبود ہے
اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا ذکر خصوصیت سے اسی بنا پر کیا ہے کہ بنی اسرائیل براہ راست ان ہی کی اولاد تھے، اور جب انہوں نے اپنی اولاد کو یہودیت و نصرانیت کے بجائے ملت ابراہیمی اور توحید و اسلام کی تلقین و وصیت اپنی زندگی کے بالکل آخری لمحہ میں کی تھی تو سمجھ لو کہ تم لوگوں کا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسرائیلؑ (یعقوبؑ) کو یہودی و نصرانی کہنا صریح زیادتی اور اللہ تعالیٰ پر کھلا ہوا بہتان ہے:

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ
اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق،
یعقوب اور ان کی ذریت کے لوگ یہودی

وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى — یا نصرانی تھے، پوچھو! تم زیادہ جانتے ہو
قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ، وَمَنْ — یا اللہ؟ ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے
اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ — جو اللہ کی کسی شہادت کو جو ان کے پاس ہے
مِنَ اللّٰهِ. (بقرہ: ۱۴۰) — چھپا ئیں۔

قرآن مجید ملت ابراہیمی سے بیزاری اور برگشتگی کو سفاہت اور بے وقوفی قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ — اور بھلا کون ملت ابراہیمی سے بے رغبتی
اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ. — اختیار کرے گا، مگر وہی جو اپنے کو حماقت
(بقرہ: ۱۳۰) — میں مبتلا کرے۔

اس نے مشرکینِ عرب، یہود و نصاریٰ سب کو ملامت و تنبیہ کی کہ آخر تم اپنے غلط آرا و اقوال کی سند کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کیوں حوالہ دیتے ہو، وہ یہودی و نصرانی اور مشرک نہ تھے، بلکہ مسلم حنیف تھے، یہودیت و نصرانیت کے شاخسانے تو ان کے بعد کھڑے کیے گئے ہیں، پھر ان کی تائید و حمایت کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام کیوں لیتے ہو؟ ان کے ساتھ نسبت و قربت کے حقدار تو وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو ان کی ملت کی پیروی کرتے ہیں، توراۃ و انجیل تو حضرت ابراہیمؑ کے صدیوں بعد نازل ہوئی ہیں، پھر انھیں یہودیت یا نصرانیت کا کس طرح علمبردار قرار دیتے ہو؟

حضرت اسماعیل علیہ السلام ان ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند اکبر اور حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے تولد ہوئے تھے، جنھیں اور ان کی والدہ ماجدہ کو انھوں نے مکہ کی وادیٔ غیر ذی زرع میں لاکر بسایا، اور ان کی نسل کے لیے برکت کی دعا کی، حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی

قبولیت کا یہ اثر ہوا کہ حضرت اسماعیلؑ کی نسل کو خوب فروغ ہوا، مگر بنی اسرائیل کو اپنے عم زاد بھائیوں سے ہمیشہ رشک وحسد رہا، اس لیے ان کی عزت، عظمت، فضیلت، برتری، سیادت اور وسعت وکثرت برابر ان کی نگاہ میں کھٹکتی رہی، پیغمبر آخرالزماں کی بعثت گو صحف یہود کی عین پیشین گوئیوں کے مطابق ہوئی تھی اور یہود کو آپؐ کی بعثت کا انتظار بھی تھا، مگر جب آپؐ تشریف لائے تو انھوں نے آپؐ کی تکذیب کردی۔

دراصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ بنی اسرائیل کی دینی ودنیاوی سیادت ووجاہت اور سیاسی قوت واقتدار کے خاتمہ کی تمہید واعلان تھی، چنانچہ آپؐ کے بعد ان سے ہر قسم کا اعزاز چھین لیا گیا اور بنی اسماعیل کو امامت کا منصب جلیل سپرد کردیا گیا، اسی لیے بنی اسرائیل کو ان سے اور مسلمانوں سے شدید نفرت وبیزاری ہوگئی اور انھوں نے ان کی عزت وعظمت کو خاک میں ملانے کا منصوبہ بنایا، حضرت اسماعیلؑ کے حسب ونسب پر رکیک اعتراضات، ان کے بجائے حضرت اسحاقؑ کو ذبیح ثابت کرنے کی کوشش، خانۂ کعبہ کے بجائے بیت المقدس کو ملت ابراہیمی کا قبلہ قرار دینا، حج وقربانی کی مختلف یادگاروں کو مٹانا، یہاں تک کہ خود حضرت ابراہیمؑ کو یہودیت ونصرانیت کا علمبردار سمجھنا اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، قرآن مجید میں ان کی اس طرح کی تحریف وتلبیس کا متعدد جگہ ذکر ہوا ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

اس تمہید سے یہ بتانا مقصود تھا کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اسماعیلی نسل، عربوں اور مسلمانوں کے معاملہ میں اہل کتاب کا رویہ شروع ہی سے معاندانہ رہا ہے، اب بعض مستشرقین بھی ان ہی کے نقش قدم پر گامزن ہو کر حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اسماعیلی نسل اور مسلمانوں کے معاملہ میں اسی طرح کی بے سروپا باتیں کر رہے ہیں جو ان کے پیش روؤں نے کی تھیں، ان کی اس کاوش کا مقصد حضرت اسماعیلؑ، ان کی نسل، عربوں اور مسلمانوں نیز خانۂ کعبہ کا حضرت ابراہیمؑ سے

رشتہ و تعلق منقطع کر دیا ہے، چنانچہ اسپرنگر لکھتے ہیں :

"حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا تذکرہ قرآن مجید میں جس طور پر کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف مراحل سے گذرتی ہوئی آخر میں اس نے مؤسسِ کعبہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے"[1]

سنوک نے اسپرنگر کے اس دعویٰ کو مزید شرح و بسط کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے :

"قدیم اور ابتدائی وحی یعنی کی سورتوں مثلاً ذاریات، حجر، صافات، انعام، ہود، مریم، انبیاء اور عنکبوت وغیرہ میں حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عام پیغمبروں کی طرح ایک رسول تھے، جو اپنی قوم کو ڈرانے کے لیے بھیجے گئے تھے، ان سورتوں میں حضرت اسمٰعیلؑ و حضرت ابراہیمؑ کے درمیان کسی رشتہ کی کوئی صراحت نہیں کی گئی ہے بلکہ ان سے تو پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اللہ نے کسی پیغمبر کو عربوں کے اندر مبعوث ہی نہیں کیا تھا، چنانچہ ایک جگہ فرمایا :

وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا	اور ہم نے نہیں دیں ان کو کچھ کتابیں
وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ	جن کو وہ پڑھتے ہوں، اور نہیں بھیجا
نَّذِيْرٍ (سبا : ۴۴)	ان کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا

دوسری جگہ ارشاد ہے :

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ	تاکہ تو ڈرائے ایک ایسی قوم کو جن کے
فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (یٰس : ۶)	آباء کو نہیں ڈرایا گیا تھا، سو وہ غافل ہیں۔

---

[1] حیات محمد ج ۲ ص ۲۷۹ بحوالہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱ ص ۲۸، ترجمہ عربی انسائیکلوپیڈیا مطبوعہ مصر ۱۹۳۳ء۔

یہی وجہ ہے کہ ان سورتوں کے اندر اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خانۂ کعبہ کے بانی اور اول المسلمین تھے، لیکن مدنی سورتوں میں معاملہ اس کے برعکس ہوگیا ہے، چنانچہ ان میں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کے بعض ایسے گوشے اور پہلو نظر آتے ہیں جن کا کی سورتوں میں کوئی وجود نہ تھا، مثلاً ان میں ان کو مسلم حنیف کہا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ملت ابراہیمی کے داعی و بانی تھے، اور انھوں نے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر خانۂ کعبہ کی تعمیر کی تھی، اس مفہوم کی آیتیں مدنی سورتوں میں بکثرت ہیں، مثلاً سورۂ بقرہ میں فرمایا:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ (بقرہ: ۱۲۷)

اور جب ابراہیم و اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے۔

اس اختلاف و تضاد کا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کی دور میں یہودیوں پر مکمل اعتماد تھا، لیکن جب آپؐ نے مدینہ منورہ میں انھیں اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے ضد و عناد کی راہ اختیار کی اور وہ آپؐ کی عداوت و مخالفت پر کمر بستہ ہوگئے، اس صورت حال کے نتیجہ میں رسول اللہؐ کو اب ان کی جگہ دوسرے مددگاروں کی تلاش ہوئی، اس موقع پر آپؐ نے اپنی ذہانت اور اصابت فکر و رائے سے کام لے کر عربوں کے سامنے ان کے ابو الآباء حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا ایک نیا رخ پیش کیا، تاکہ اس طرح آپؐ اپنے زمانہ کی یہودیت سے دامن کش ہو کر ایک ایسے دین کو پیش کر سکیں جس کا تعلق یہودیت ابراہیمؑ سے جوڑ دینا ممکن ہو، چنانچہ جب تمام مکہ نبیؐ کی دعوت کے سامنے سرنگوں ہوگیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کے معمار کی حیثیت اختیار کر لی۔[1]

اس اعتراض میں قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہدف طعن بنایا گیا ہے،

---

[1] دیکھو دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱، ص ۲۸ مطبوعہ مصر سنہ ۱۹۳۳ء۔

اور اس کے اندر متعدد بے سروپا باتیں بھی آگئی ہیں، لیکن ہماری گفتگو ان ہی امور تک محدود رہے گی جن کا تعلق حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ اور بنی اسمٰعیلؑ سے ہے، ہم نے دوسری کتابوں کے علاوہ عبدالوہاب نجار کی قصص الانبیاء سے زیادہ مدد لی ہے،

اس اعتراض کا خاص منشا یہ ثابت کرنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے نہ عربوں اور مسلمانوں کا کوئی نسلی و نسبی تعلق تھا اور نہ ان سے ان کا کوئی دینی و مذہبی رشتہ تھا، اس لیے مسلمانوں کا انھیں اپنا روحانی و مذہبی پیشوا ماننا اور عربوں کا انھیں اپنا خاندانی مورث اعلیٰ تسلیم کرنا غلط ہے، کیونکہ آنحضرتؐ کی مکی زندگی میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ملت سے آپؐ اور آپؐ کے دین کے تعلق کی کوئی صراحت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے، اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے خانۂ کعبہ کے بانی اور معمار ہونے اور خود کعبہ کی مرکزیت و اہمیت کا بھی مکی آیتوں میں کوئی ثبوت موجود نہیں ہے، البتہ رسول اکرمؐ صلعم کو حضرت ابراہیمؑ سے نسبی و مذہبی تعلق قائم کرنے کا خیال مدنی زندگی میں اس لیے ہوا کہ یہود نے آپ کی شدید مخالفت شروع کردی تھی۔

دونوں فاضل مستشرقین نے اصل اور بنیادی غلط فہمی یہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکی دور میں یہود پر کلی اعتماد کرتے تھے، حالانکہ یہ سرے سے غلط ہے، اگر اس میں کچھ حقیقت ہے تو وہ صرف اس قدر ہے کہ آپؐ مکی اور مدنی دور میں بھی ان امور کے بارہ میں جن کے متعلق آپؐ کو کوئی وحی نہیں کی گئی تھی، یہود کی شریعت کے مطابق اس بنا پر عمل کرتے تھے کہ وہ اہل کتاب تھے اور اللہ تعالیٰ نے ایسے امور کے بارہ میں ان ہی کی شریعت پر عمل کرنے کی آپ کو ہدایت کی تھی، چنانچہ جب تک آپؐ کو خانۂ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، اس وقت تک آپ بیت المقدس کی جانب ہی رخ کرکے نماز پڑھتے تھے، کیونکہ اولاً تو یہی یہود کا قبلہ تھا، ثانیاً خود مسلمانوں کے نزدیک بھی اس کی اہمیت اور تقدس پوری طرح مسلم تھا، لیکن

اس قسم کی چند مثالوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دور میں یہود پر مکمل اعتماد کرتے تھے، مسلمانوں کے بدترین مخالف بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت و تبلیغ میں یہود کا سہارا لیا ہو، یا ان پر کسی قسم کا اعتماد کیا ہو، بلکہ واقعات تو اس کے برعکس یہ ثابت کرتے ہیں کہ مکی دور میں مسلمانوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہود سے کوئی خاص واسطہ ہی نہ تھا، ان سے جو کچھ سابقہ پیش آیا وہ مدنی دور میں آیا، اسی زمانہ میں آپ نے ان سے اخوت اور دوستی کا معاہدہ بھی کیا، تاکہ ان کی جانب سے مطمئن ہوکر مشرکین مکہ کے حملے کا مقابلہ کرسکیں لیکن جب یہود نے معاہدہ کا پاس و لحاظ نہیں رکھا اور در پردہ اور کھلم کھلا آپ کی مخالفت کرنے لگے بلکہ مشرکین سے سازباز کرکے ان کی مدد بھی کرنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی جانب سے چوکنا ہو گئے،

رہی مکی زندگی تو اس میں یہود سے موالات اور ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی طرح کے اعتماد کرنے کی کوئی مثال نہیں ملتی، اور مدنی دور کے موالات کا جو انجام ہوا وہ ظاہر ہے، اور اسی کے نتیجہ میں قرآن نے یہود کی اس مستقل جبلی صفت اور طبعی خصوصیت کی اس طرح نشاندہی کی ہے:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۔ (مائدہ : ۸۲)	تم اہل ایمان کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔

یہی نہیں بلکہ عربوں کو بھی یہود پر کبھی کوئی اعتماد و اعتبار نہیں رہا، بلکہ ان کی تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آپ کی بعثت سے قبل بھی یہود کی قربت، تعلق، ہم نشینی، مجالست اور مجاورت کو ناپسند کرتے تھے اور انھیں عرب کی سرزمین سے نکالنے اور جلاوطن کرنے کے لیے

ان سے برابر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے، قرآن مجید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان معرکۂ جنگ وجدال برپا رہتا تھا، اس کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل یہود آپ کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، تاکہ آپ کے ذریعہ مشرکین پر فتح وغلبہ حاصل کر سکیں:

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا، فَلَمَّا جَآءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِينَ۔ (بقرہ: ۸۹)

اور جب آئی ان کے پاس ایک کتاب اللہ کے یہاں سے ٹھیک ان پیشین گوئیوں کے مطابق جو ان کے یہاں موجود ہیں اور وہ پہلے سے کافروں کے مقابلہ میں فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے تو جب آئی ان کے پاس وہ چیز جس کو وہ جانے پہچانے ہوئے تھے تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا، پس ان منکروں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن جریر نے ابو العالیہ سے یہ روایت کی ہے:

كانت اليهود تستفتح بمحمد صلى الله عليه وسلم على كفار العرب من قبل وقالوا اللّٰهم ابعث هذا النبي الذي نجده في التوراة يعذبهم ويقتلهم فلما بعث الله محمدًا صلى الله عليه وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہود آپ کے ذریعہ کفار عرب پر فتح پانے کے آرزومند تھے، اور کہتے تھے اے اللہ اس نبی کو مبعوث کر جس کا ذکر ہم کو توراۃ میں ملتا ہے، تاکہ وہ انھیں عذاب دے اور قتل کرے، مگر جب اللہ نے

فرأوا انه يبعث من غيرهم كفروا به حسداً للعرب وهم يعلمون انه رسول الله صلى الله عليه وسلم يجدونه مكتوباً عندهم في التوراة فلما جاءهم ما عرفوا كفروا به.

(تفسیر ابن جریر طبری ج ۱، ص ۳۱۰)

محمدؐ کو مبعوث کیا تو انھوں نے یہ سمجھ کر کہ اس نبی کی بعثت ان کے اندر سے نہیں ہوئی، نیز عربوں پر رشک و حسد کی وجہ سے اس کا انکار کر دیا، حالانکہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ خدا کے رسول ہیں اور توراۃ میں ان کا ذکر بھی موجود ہے، چنانچہ جب آپؐ تشریف لائے تو انھوں نے آپؐ کا انکار کر دیا۔

مصر کے مشہور عالم محمد فرید وجدی لکھتے ہیں:

"حضرت ابراہیمؑ سے تعلق قائم کرنے کا خیال تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے بجائے مکہ معظمہ ہی میں ہونا چاہیے تھا، کیونکہ وہاں کا ہر ہر قبیلہ حضرت ابراہیمؑ سے اپنا انتساب کرتا تھا، اس کے برخلاف مدینہ کے اکثر قبائل یمنی تھے، جو حضرت ابراہیمؑ سے اپنا رشتہ ناطہ نہیں جوڑتے تھے"

(حاشیہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ص ۲۹)

سنوک نے اسی ضمن میں ایک نہایت لغو اور بے بنیاد بات یہ بھی کہی ہے کہ آپؐ نے اپنے زمانہ کی یہودیت کو رد کر کے ایک نئی یہودیت کی داغ بیل ڈالی اور اسے حضرت ابراہیمؑ کی جانب منسوب کر دیا، حالانکہ جب یہودیت کا تمامتر تعلق حضرت یعقوبؑ سے ہے اور یہود اپنے دین کو حضرت ابراہیمؑ کے بجائے ان ہی کی جانب منسوب کرتے تھے، اسی لیے وہ اپنے کو بنی اسرائیل کہلانا پسند کرتے تھے تو تاریخ یہودیت کا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے کس طرح ہو سکتا ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کو یہودی کہنا کس قدر مضحکہ خیز بات ہے، حضرت یعقوبؑ تو ان کے پوتے تھے، ایسی صورت میں

حضرت ابراہیمؑ کا دین اپنے پوتے کے دین کے تابع کس طرح ہو سکتا ہے، اسی لیے قرآن مجید نے نہایت صراحت کے ساتھ کہا ہے:

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (آل عمران: ۶۷)

ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے، نہ نصرانی، بلکہ حنیف مسلم تھے، اور وہ مشرکین میں سے بھی نہ تھے۔

یہودیت و نصرانیت دونوں حضرت ابراہیمؑ کے بعد کی پیداوار ہیں:

لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنجِيلُ إِلَّا مِن بَعْدِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ. (آل عمران: ۶۵)

(اے اہل کتاب!) تم ابراہیمؑ کے بارہ میں کیوں حجت کرتے ہو، دراں حالیکہ توراۃ اور انجیل اس کے بعد نازل کی گئی ہیں کیا تم لوگ (اس بات کو) نہیں سمجھتے۔

درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اور کسی دور میں بھی یہودیت سے تعلق قائم کرنے کا خیال سرے سے نہیں ہوا، کیونکہ قرآن مجید کا نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ اسلام قدیم دین ہے، اس کی دعوت حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ وغیرہ تمام نبیوں نے دی تھی، اور اسی کی دعوت دینے کے لیے آنحضورؐ بھی تشریف لائے تھے، فرمایا:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (الشوریٰ: ۱۳)

(اللہ نے) تمہارے لیے اسی دین (اسلام) کو مقرر کیا جس کی وصیت نوحؑ کو کی تھی اور جس کی ہم نے تیری طرف وحی کی ہے، اور جس کی ہم نے ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو وصیت کی تھی، یعنی دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا

بھلا ایسی صورت میں آپ اسلام کو چھوڑ کر یہودیت سے کیوں وابستہ ہوتے۔

حضرت ابراہیمؑ چونکہ بنی اسرائیل و بنی اسماعیل کے مسلمہ خاندانی و روحانی پیشوا تھے، اس لیے یہود، نصاریٰ اور مشرکین تینوں ہی اپنی اپنی تائید کے لیے ان کے نام کو استعمال کرتے تھے، اور ان میں سے ہر ایک ان کو اپنے طریقہ پر بتاتا تھا، اور کہتا تھا کہ اصل دین ابراہیمی کا حامل وہی ہے، اور محمدؐ اسے اس کے اصلی دین سے ہٹا کر گمراہ کرنا چاہتے ہیں، قرآن مجید کا مقصد ان کے اسی غلط اور گمراہ پروپیگنڈے کی تردید ہے کہ توراۃ وانجیل تو حضرت ابراہیمؑ کے صدیوں بعد نازل ہوئی ہیں پھر وہ یہودی یا نصرانی کس طرح ہوئے، یہ تو سراسر حماقت اور بے وقوفی کی بات ہے کہ یہودیت و نصرانیت کو ان کی جانب منسوب کیا جائے، حالانکہ وہ ان کے بہت بعد کی وضع وایجاد ہیں، درا صل ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی و نصرانی تھے اور نہ مشرک تھے، بلکہ مسلم حنیف تھے،

رہا یہ اعتراض کہ قرآن مجید کی مکی و مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت اور تصویر یکساں نہیں ہے، کیونکہ مکی دور میں ان کی حیثیت عام رسولوں جیسی بیان کی گئی ہے اور مدنی دور میں ان کو دین حنیفی کا داعی اور خانہ کعبہ کا بانی و مؤسس بتایا گیا ہے، تو مندرجۂ ذیل تجزیہ کے بعد اس کا لغو و بے بنیاد ہونا اچھی طرح ظاہر ہو جائے گا۔

قرآن مجید کی مکی و مدنی سورتوں کے اسلوب و طرز بیان میں اس اعتبار سے ضرور فرق ہے کہ مکی سورتوں میں عموماً اجمال و اختصار ہوتا ہے اور مدنی سورتوں میں بسط و تفصیل سے کام لیا گیا ہے مکی سورتوں میں بنیادی عقائد اور مسلمات بیان کیے گئے ہیں اور اسی حیثیت سے استدلال کا پیرایہ بھی اختیار کیا گیا ہے، اس کے برعکس مدنی سورتوں میں احکام، فروع اور جزئیات کا بھی ذکر ہے، جن کے دلائل کا طریقہ و انداز بھی جداگانہ ہے، مکی دور میں اصل مخاطب کفار قریش تھے،

اور مدنی دور میں یہود و نصاریٰ سے بھی خطاب ہے، قرآن مجید کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت موقع و محل، اقتضائے حال اور مخاطب کے ذوق و مزاج کی رعایت بھی ہے، اس لیے اس کی ہر سورہ میں اس کے موضوع اور موقع کے لحاظ سے بھی فرق ہوتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگذشت کے مختلف حصے مختلف سورتوں میں بیان کیے گئے ہیں اور ہر جگہ موقع و محل، اقتضائے حال اور موضوع سورہ کے لحاظ سے اس میں کچھ حذف و اضافہ اور فرق ہے، یہ قرآن کا عام اور معروف اسلوب ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ کو مختلف جگہ بیان کرتا ہے مگر ہر جگہ اس کی نوعیت بدلی ہوئی ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے جس جگہ اس کا جس قدر حصہ بیان کرنا ضروری اور موزوں ہوتا ہے اسی کو وہاں بیان کرتا ہے اور باقی اجزاء کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے، تاکہ خواہ مخواہ کا اطناب و طول بیان نہ ہو اور مخاطب فضول اور بے موقع باتوں میں الجھ جانے کی وجہ سے اصل مقصد ہی سے غافل ہو جائے، حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاءؑ کے واقعات و قصص میں اسی اصول کو مدنظر رکھا گیا ہے، جس کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ظاہر بین لوگوں کو ان میں فرق و اختلاف دکھائی دیتا ہے۔

قرآن مجید کے اس اسلوب کو مدنظر نہ رکھنے کی وجہ سے ان مستشرقین کو یہ خیال ہو گیا، یا انھوں نے خواہ مخواہ کے لیے یہ غلط فہمی پیدا کی کہ مدنی سورتوں میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کے جو جلوے نظر آتے ہیں ان کا مکی سورتوں میں وجود نہیں۔

یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ مکی سورتوں میں نہ حضرت ابراہیمؑ کے خانہ کعبہ اور حضرت اسمٰعیلؑ سے تعلق کی کوئی صراحت کی گئی ہے اور نہ انھیں ملت ابراہیمی کا داعی اور مسلم حنیف وغیرہ کہا گیا ہے، قرآن مجید کی ایک سورہ تو خاص ان ہی کے نام سے موسوم ہے اور یہ مکی ہے، مگر ان فاضل مستشرقین نے سورۂ ابراہیم کا نام ہی اپنی فہرست میں درج نہیں کیا ہے، اس میں حضرت ابراہیمؑ کی ایک دعا کا

ذکر ہے، اس سے ان کی شخصیت کے مندرجہ ذیل پہلو سامنے آتے ہیں:

(۱) حضرت ابراہیمؑ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مکہ کی سرزمین کو گہوارۂ امن بنا:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا۔ — خداوندا تو اس شہر کو پر امن بنا۔

(ابراہیم : ۳۵)

(۲) وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی درخواست کرتے ہیں کہ انھیں اور ان کی اولاد کو شرک و بت پرستی سے محفوظ رکھے:

وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (ابراہیم : ۳۵) — (خداوندا!) تو مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا۔

(۳) حضرت ابراہیم خدا کے مقدس گھر کے پاس بے آب و گیاہ سرزمین میں اللہ واحد کی عبادت، نماز، نذر و قربانی اور طواف و حج کی ادائیگی کے لیے اپنی اولاد حضرت اسماعیلؑ کو بسانے کا اعتراف کرتے ہیں، اور ان کی رزق رسانی کے لیے اللہ سے دعا و التجا کرتے ہیں:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ۔

ابراهیم (۳۷)

خداوندا! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض (اسماعیلؑ اور ان کی ذریت) کو اس بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے خداوند اس لیے کہ یہ نماز قائم کریں، پس تو لوگوں کے دل ان کی جانب مائل کر دے (یعنی لوگ ان کے پاس تیرے گھر کی زیارت کے لیے آئیں) اور انھیں پھلوں میں سے رزق دے، تاکہ

(ابراہیم : ۳۷) وہ شکر گذار ہوں۔

(۴) حضرت ابراہیمؑ اس امر پر خداوند قدوس کی شکر گذاری کرتے ہیں کہ اس نے ان کے دینی مشن اور ملت ابراہیمی کی تکمیل کے لیے ان کو بڑھاپے میں دو بیٹے اسماعیل و اسحاق عطا کیے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ	سارا شکر اس اللہ کے لیے ہے جس نے
اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ	مجھے بڑھاپے میں اسماعیل و اسحاق کو بخشا
الدُّعَاءِ۔ (ابراہیم : ۳۹)	بے شک میرا خداوند پکار سننے والا ہے۔

(۵) وہ خدا سے اپنے اور اپنی اولاد کے لیے ملت حنیفی کے خاص شعار نماز کو قائم کرنے کی توفیق طلب کرتے ہیں جس کو یہود نے سرے سے ضایع کر دیا تھا، اور نصاریٰ نے اس کی حقیقت درروح مسخ کر ڈالی تھی:

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ	خداوندا! مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم
ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ۔	کرنے والا بنا! خداوندا! اور تو میری دعا
(ابراہیم : ۴۰)	قبول کر لے۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مکی سورتوں میں بھی حضرت ابراہیمؑ کے خانہ کعبہ اور حضرت اسماعیلؑ سے تعلق کی صراحت موجود ہے اور مکی سورتوں کے ضمن میں سورۂ ابراہیم کا ذکر نہ کرنا ایک بڑی اور بدترین علمی خیانت ہے۔

اسی طرح یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے حنیف ہونے کا ذکر صرف مدنی سورتوں میں ہے، کیونکہ سورۂ نحل مکی ہے، اس میں ان کے متعلق فرمایا:

اِنَّ اِبْرَاهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ	بے شک ابراہیم پیشوا، خدا کا فرمان بردار
حَنِیْفًا وَّلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔	اور موحد تھا، اور وہ مشرکوں میں سے

(نحل : ۱۲۱)　　نہ تھا۔

اسی مکی سورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حضرت ابراہیمؑ کی ملت کے اتباع کی اس طرح تلقین کی گئی ہے:

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ (نحل : ۱۲۳)	پھر ہم نے تمہاری طرف وحی کی کہ ابراہیمؑ کی ملت پر چلو، جو یک طرف کا تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔

ان مستشرقین کی فہرست میں سورۂ انعام کا ذکر بھی ہے جو مکی ہے، حالانکہ اس میں بھی ان کے حنیف اور شرک سے بیزار ہونے کی تصریح موجود ہے، فرمایا:

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ (انعام : ۷۹)	بے شک میں نے اپنا رخ بالکل یکسو ہوکر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

اسی سورہ کی ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۔ (انعام : ۱۶۱)	کہدو! میرے رب نے میری رہنمائی کی ایک سیدھے رستہ کی طرف، دین قیم، ابراہیمؑ کی ملت کی طرف جو یکسو تھے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگیا کہ قرآن مجید کی مکی و مدنی سورتوں کے اسلوب اور انداز بیان کا فرق اقتضائے حال اور مخاطب کی رعایت کا نتیجہ ہے، اور مکی سورتوں میں بھی حضرت ابراہیمؑ کی زندگی اور شخصیت کے ایسے گوشے نظر آتے ہیں جن کو مستشرقین نے مدنی سورتوں کا خاصہ بتایا ہے۔

ان مستشرقین نے مسلمانوں اور عربوں، نیز حضرت اسمٰعیلؑ کے حضرت ابراہیمؑ سے رشتہ

دتعلق کی نفی بھی کی ہے، حالانکہ یہ مسئلہ اس قدر واضح ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اور اس کا ثبوت خالی قرآن مجید اور عربوں کے بیان ہی سے نہیں ملتا، بلکہ تورات میں بھی اس کی صراحت موجود ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ جو عربوں کے باپ ہیں حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے ہیں، انھوں نے اپنے لخت جگر حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ماں حضرت ہاجرہؑ کو بکہ (مکہ) میں آباد کیا، اس طرح اسمٰعیلی عربوں کی نشو ونما ہوئی اور وہ حجاز کی سرزمین میں آباد ہوئے، تورات کے باب پیدایش میں جابجا اس سلسلہ کی تفصیلات موجود ہیں مثلاً اٹھارہویں باب میں ہے کہ حضرت ہاجرہ کو جب حمل ہوا تو حضرت سارہؑ کو جو اس وقت تک بے اولاد تھیں رشک و حسد ہوا اور وہ ہاجرہؑ کو ستانے لگیں، ہاجرہؑ نے آزردہ ہوکر گھر چھوڑ دینے کا ارادہ کیا، اور ایک چشمہ پر جو شور کی راہ میں واقع ہے آکر ٹھہر گئیں، اس وقت خدا کے فرشتہ نے ان سے کہا:

"ہاجرہ اپنی بی بی[1] کے گھر واپس جا، میں تیری نسل کو اتنا بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی"

(تکوین، باب ۱۸)

حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسمٰعیلؑ سے جو تعلق اور غیر معمولی محبت تھی اس کا بھی تورات سے پتہ چلتاہے، اس کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کی بشارت دی گئی تو اس سے ان کو کوئی خاص مسرت نہیں ہوئی، بلکہ انھوں نے یہ فرمایا کہ:

"اے کاش اسمٰعیل تیرے حضور زندہ رہے۔" (تکوین ۱۸ - ۱۸)

اس پر خداوند نے فرمایا:

---

[1] یہ ترجمہ تورات کے مترجمین کا ہے، کیونکہ بنی اسرائیل حضرت ہاجرہؑ کو حضرت سارہؑ کی لونڈی کہتے ہیں اسی لیے وہ اپنے کو بنی اسمٰعیل سے افضل سمجھتے ہیں، یہاں اس کی تردید کا موقع نہیں، مولانا عنایت رسول چریا کوٹی نے اس موضوع پر ایک رسالہ النصوص الباھرۃ فی حریۃ ھاجرۃ لکھا تھا۔

"اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ[۱۲] سردار پیدا ہوں گے، اور میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔"

آگے اس کا ذکر ہے کہ حضرت سارہؑ نے اس ڈر سے کہ حضرت اسمٰعیلؑ باپ کی وراثت میں شریک ہو جائیں گے حضرت ابراہیمؑ کو انھیں اور ان کی ماں حضرت ہاجرہؑ کو علٰحدہ کر دینے کے لیے مجبور کیا، اس پر حضرت ابراہیمؑ رنجیدہ ہوئے تو خداوند نے کہا:

"ابراہیم غم نہ کر، سارہ کی بات مان لے، تیری نسل اسحاقؑ سے کہی جائے گی، تیرے بیٹے (خادمہ زاد) حضرت اسمٰعیلؑ کو بھی میں ایک قوم بناؤں گا، کہ یہ بھی تیری ہی نسل ہے۔"

(تکوین: ۲۱ - ۱۳)

اس کے بعد ان کی روانگی اور ماں بیٹے کو عرب میں بسانے کا ذکر اس طرح ہے:

"ابراہیم صبح کو اٹھا اور روٹی لی اور پانی کا مشکیزہ ہاجرہ کو دیا..... وہ روانہ ہوئی، اور بئر سبع کے میدان میں بھٹکتی رہی، مشکیزہ کا پانی چک گیا، بچہ کو ایک جھاڑی میں ڈال دیا اور بچہ سے تھوڑی دور ایک شبر کے برابر ہٹ کر غمزدہ بیٹھ گئی اور اس نے کہا کہ بچے کو اپنی آنکھ سے مرتے نہیں دیکھوں گی اور الگ ہٹ کر گریہ وزاری کرنے لگی، خدا نے بچہ کی آواز سنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکار کر کہا: ہاجرہ! ڈر نہیں، خدا نے بچہ کی آواز جہاں وہ پڑا ہے سن لی، اٹھ اور بچے کو اٹھا، اور اپنے ہاتھ سے اس کو سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا، خدا نے ہاجرہ کی آنکھ کھول دی، اس کو پانی کا ایک کنواں نظر آیا، وہ گئی اور مشکیزہ کو پانی سے بھر لیا اور بچہ کو پانی پلایا، خدا اس بچہ کے ساتھ تھا، وہ بڑا ہوا، بیابان میں رہا اور ایک تیرانداز ہوا، وہ فاران کے بیابان میں رہا، اس کی ماں نے ملک مصر کی ایک بیوی

اس کے لیے لی۔" (تکوین : ۲۱)

توراۃ کی ان واضح تصریحات کے بعد کون حضرت اسماعیلؑ کے حضرت ابراہیمؑ سے نسبی تعلق اور نسلی رشتہ کی نفی کی جرأت کرسکتا ہے، البتہ قرآن اور توراۃ کے مندرجہ بالا آخری بیان میں ایک نمایاں تضاد یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ سے حضرت ابراہیمؑ کی غیر معمولی شفقت و محبت کا ثبوت خود توراۃ ہی کے حوالہ سے اوپر نقل کیا گیا ہے، مگر اس بیان میں وہ ایک ایسے قسی القلب باپ نظر آتے ہیں جو شفقتِ پدری سے بالکل ہی خالی ہے، چنانچہ وہ اپنے بیٹے اور بیوی کو چند روٹیاں اور مشکیزہ دے کر گھر سے باہر نکال دیتے ہیں، اور فاران کے بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑ دیتے ہیں اور پھر کبھی خود اس کا خیال ہی دل میں نہیں لاتے اور نہ اس کے پاس جاتے ہیں، جبکہ قرآن کی یہ واضح تصریح ہے کہ وہ خود بھی مکہ تشریف لے گئے تھے اور انھوں نے ہی وہاں ماں اور بیٹے کو خانہ کعبہ کی خدمت کے لیے بسایا تھا، لیکن یہاں اس اختلاف پر بحث و گفتگو کی گنجایش نہیں ہے' ہمارا مقصد تو صرف یہ دکھانا تھا کہ قرآن اور توراۃ دونوں سے قطعی طور پر حضرت اسماعیلؑ کا حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونا اور مکہ کی وادیٔ غیر ذی زرع میں سکونت پذیر ہونا اور حضرت اسماعیلؑ کا خانہ کعبہ کی خدمت کے لیے وقف ہوجانا ثابت ہے۔

شروع ہی میں یہ تحریر کیا جاچکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل کی کثرت و برکت کا ثبوت قرآن مجید اور توراۃ دونوں ہی سے پوری طرح عیاں ہے، یہاں یہ واضح کردینا بھی مناسب ہوگا کہ اس کثرت و برکت کا ظہور بنی اسحٰق کے مقابلہ میں بنی اسماعیل میں زیادہ ہوا، اس کی تفصیل یہ ہے:

"خدا نے حضرت ابراہیمؑ کی ذات کو خیر و برکت کا سرچشمہ بنایا تھا، وہ حضرت نوحؑ کے بعد تمام آسمانی برکتوں کے وارث ہوئے، ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۔ (آل عمران : ۳۳)

بے شک اللہ نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو اہلِ عالم کی رہنمائی کے لیے منتخب فرمایا۔

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ لکھتے ہیں :

"آلِ عمران بھی ذریت ابراہیمؑ میں شامل ہے، اس لیے خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے لیے گویا تمام عالم میں صرف آلِ ابراہیمؑ کا انتخاب ہوا، پھر حضرت ابراہیمؑ کے واسطہ سے تمام اہلِ زمین کو برکت دینے کا وعدہ کیا گیا" (تفسیر سورۂ کوثر)

توراۃ کی کتاب تکوین کے جو حوالے نقل کیے گئے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے برکت کا جو وعدہ کیا تھا، وہ ان کی ذریت کے واسطہ سے پورا ہوگا، گو یہ برکت حضرت اسحاقؑ کی ذریت سے بھی پھیلی لیکن اس کا اصلی سبب حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ذریت ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور اسی کا نتیجہ ہے، کیونکہ آپؐ اس سرزمین میں مبعوث کیے گئے تھے جو تمام برکتوں کا سرچشمہ تھی اور اللہ نے آپؐ کو اس سرزمین اور دینِ ابراہیمی کا وارث بنایا تھا، آپؐ کی بعثت سے تمام روئے زمین کے لیے عام برکت کا وعدہ پورا ہوا کیونکہ آپؐ کی رسالت تمام عالم کے لیے ہے :

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۔ (سبا : ۲۸)

ہم نے تم کو نہیں بھیجا، مگر تمام لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بناکر۔

نیز آپؐ ساری دنیا کے لیے رحمت تھے :

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ (انبیاء : ۱۰۷)

اور ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر تمام عالم کے لیے رحمت بناکر۔

اوپر اسفار یہود کے حوالے سے یہ بھی گذر چکا ہے کہ بنی اسماعیلؑ و بنی اسحاقؑ کی علیحدگی اس وجہ سے ہوئی تھی کہ جب اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت ہاجرہؑ کے بطن سے اولاد بخشی تو حضرت سارہؑ کو رشک ہوا، اور انھوں نے حضرت ہاجرہؑ کے ساتھ بدسلوکی کی، جسے حضرت ہاجرہؑ نے نہایت صبر کے ساتھ انگیز کیا، اس کے صلہ میں اللہ نے ان کو بڑی برکت دی، حضرت سارہؑ تحقیر کی وجہ سے انھیں لونڈی کہتی تھیں اور بنی اسحاق بنی اسماعیل کو کنیز زادے کہتے تھے، حالانکہ یہ بالکل خلاف حقیقت ہے، اور عملاً یہ ہوا کہ حضرت سارہؑ کی اولاد اسماعیلیوں کے ہاتھ مصر میں فروخت ہوئی، پھر ایرانیوں، مصریوں اور رومیوں نے ان کو گرفتار کیا اور غلام بنایا، اس کے برخلاف حضرت ہاجرہؑ کی اولاد اپنی پوری تاریخ میں کبھی غلامی کی ذلت سے آشنا نہیں ہوئی۔

بنی اسماعیل کی ان خصوصیات و امتیازات سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں بنی اسحاق پر ہر حیثیت سے فوقیت و برتری حاصل ہے، اور قرآن مجید اور توراۃ دونوں سے حضرت ابراہیمؑ سے ان کا رشتہ و تعلق نہایت قطعیت کے ساتھ ثابت ہے، اگر بفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس کی مکی سورتوں کے اندر نہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کے رشتہ کی صراحت کی گئی ہے اور نہ ان کے خانۂ کعبہ کے معمار ہونے کا ذکر ہے تو توراۃ کی ان صراحتوں اور شہادتوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔

فاضل مستشرقین کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ عرب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نبی نہیں گذرا، اس سلسلہ میں انھوں نے جو آیتیں نقل کی ہیں، ان کے مفہوم اور اسلوب کو سمجھنے میں یا تو انھیں دھوکہ ہوا ہے، یا انھوں نے دیدہ و دانستہ یہ شوشہ چھوڑا ہے، ورنہ حضرت اسماعیلؑ و حضرت محمدؐ کے علاوہ حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ کا تعلق بھی تو اسی سرزمین سے تھا جن کا خود قرآن نے بھی مفصل تذکرہ کیا ہے،

بنگال کی ایک قدیم فارسی فرہنگ

از۔ ڈاکٹر کلیم سہسرامی، پروفیسر شعبہ السنہ، راج شاہی یونیورسٹی راج شاہی بنگلہ دیش

لغت نگاری کا فن جتنا مشکل ہے اتنا ہی صبر آزما بھی ہے۔ لغت کی تدوین کے لیے زبان و بیان پر مکمل گرفت کے ساتھ وسیع علم اور زبان دانی سے پوری واقفیت ضروری ہے ورنہ لغت نگار علمی اور تحقیقی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ برصغیر میں فارسی کی جو فرہنگیں لکھی گئی ہیں ان میں فخر الدین مبارک غزنوی قواس کے "فرہنگ نامہ" کو اولیت حاصل ہے جو علاء الدین خلجی کے عہد (۶۹۵ - ۷۱۵ھ/۱۲۹۶ - ۱۳۱۶) میں ترتیب دیا گیا اور عام طور پر "فرہنگ قواس" کے نام سے مشہور رہے، دوسری قدیم فرہنگ "دستور الافاضل" ہے جسے مولانا رفیع نے جو حاجب خیرات کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں ۷۴۳ھ میں مرتب کیا اسی طرح قاضی بدر الدین محمد کی "ادات الفضلا" مرتبہ (۸۲۲ھ) اور رشید کی "زفان گویا" مرتبہ (۸۳۷ھ) اور مولانا فضل الدین محمد کی "بحر الافاضل" مرتبہ (۸۳۷ھ) ایسی فرہنگیں ہیں جو "شرفنامہ" سے پہلے لکھی گئیں،

دلی یا بحیثیت مجموعی شمالی ہند کی مرکزیت سے اردو اور فارسی زبان و ادب کو جو ترقی ہوئی اس کی مثالیں تاریخ کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ لغت کی تدوین و تالیف شمالی ہند کے مرکز سے دور بنگال اور دکن میں بھی "شرفنامہ" اور "برہان قاطع" کی صورت میں ہوئی، چنانچہ "شرفنامہ" یا "فرہنگ ابراہیمی" کا شمار ایک

اہم فرہنگ میں ہوتا ہے، جو بنگال میں نویں صدی ہجری میں لکھی گئی، یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ فارسی لغت کی جو کتابیں ساتویں صدی سے نویں صدی ہجری تک مرتب کی گئیں اور جن کی بدولت برصغیر میں فارسی زبان و ادب اور فارسی لغت نویسی کی ترویج و ترقی ہوئی، ان میں "شرفنامہ" کی اہمیت نظرانداز نہیں کی جا سکتی، یہ فرہنگ ہنوز غیر مطبوعہ ہے، اور اس کے قلمی نسخے مدرسہ عالیہ ڈھاکا (بنگلادیش) کے علاوہ بیرون ملک "مدرسہ سپہ سالار عالی" (تہران)، "برٹش میوزیم" "انڈیا آفس" اور "بوڈلین" (لندن) کے کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے ہیں، پچھلے سال (۱۹۸۲ء) حیدرآباد دکن سے جناب علی یاور جنگ کی قلمی کتابوں کے ذخیرے میں "شرفنامہ" کا بھی ایک نسخہ منتقل ہو کر پٹنہ کی "خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری" میں آگیا ہے۔

بنگال جب سلطنت دہلی سے آزاد ہو گیا تو یہاں حاجی شمس الدین الیاس نے ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی جسے تاریخ میں "خاندان الیاس شاہی" (۱۳۴۲-۱۴۹۴ء) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسی خاندان کے بادشاہ ابو المظفر رکن الدین باربک شاہ (۸۶۴-۸۷۹/۱۴۵۹-۱۴۷۴) کے زمانے میں "شرفنامہ" کی تدوین ہوئی، یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی لیکن اس کا امکان ہے کہ اس کتاب کا مصنف سلطان مذکور کے دربار سے وابستہ رہا ہو، ثبوت کے طور پر اس قصیدے کے حسب ذیل اشعار درج کئے جاتے ہیں، جو سلطان باربک شاہ کی مدح سے متعلق اس کتاب میں شامل ہیں۔

بو المظفر باربک شہ، شاہ عالم باد دست	در نگین او ہمیشہ مملکت جم باد دست
دانشاور دز باں رہم، فتح ہست وہم ظفر	بو المظفر باربک شہ، شاہ عالم باد دست
ایا براده بر سائلی فراوان اسپ	پیادگان را بخشیدہ صد ہزاران اسپ

ابو المظفر ملا جہان لطف کہ ہست — گنج بخشش عامت بگاہ احسان اسب

کتاب کی تدوین کے متعلق محققین میں اختلاف ہے، پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کے خیال میں "شرفنامہ" (۸۶۴ھ - ۹۰۷ھ) کے درمیان، انڈیا آفس کے فہرست نگار کے مطابق (۸۲۲ھ - ۹۰۹ھ) کے درمیان اور برٹش میوزیم کے فہرست نگار چارلس ریو کی تحقیق کے مطابق (۸۷۸ھ) میں مرتب ہوا۔ لیکن شیخ محمد اکرام نے "ثقافت پاکستان" میں اس کی ترتیب و تدوین کا سال ۱۴۵۹ء یعنی (۸۶۳ھ) بتایا ہے، ڈاکٹر شہریار نقوی کی رائے میں "شرفنامہ" (۸۰۰ھ) میں لکھا گیا، لیکن عصر حاضر کے مستند و معتبر محقق پروفیسر نذیر احمد کے قول کے مطابق شرفنامہ ۸۶۲ھ کی تالیف ہے۔

اسی طرح اس کتاب کے مصنف کے وطن کے بارے میں بھی مختلف رائیں ہیں، پروفیسر محمود شیرانی اور شیخ محمد اکرام اس کا وطن "بنگال" بتاتے ہیں اور ڈاکٹر شہریار نقوی اسے "ساکن شہر منیر" (بہار) کہتے ہیں، برٹش میوزیم کے فہرست نگار کے خیال میں مصنف "شہر بہار" کا باشندہ تھا، اور کوئی اس کا وطن جونپور کو بتاتا ہے، کتاب کا انتساب چونکہ بہار کے ایک خدا رسیدہ بزرگ کے نام کیا گیا ہے، اس لئے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مصنف کا وطن بہار ہے، البتہ اس کا امکان ہے کہ صوفی مذکور سے عقیدت کی بنا پر مصنف کا قیام کچھ دنوں بہار میں رہا ہو کیوں کہ "شرفنامہ" کے آخر میں جو مناجات شامل ہے، اس میں مصنف نے اپنی اس تمنا کا اظہار کیا ہے کہ وفات کے بعد اس کی آرام گاہ، اس کے مرشد روحانی کے مزار کے پہلو میں ہو، چوں کہ مصنف ایک طویل مدت تک بنگال میں رہا اس لئے بعضوں کے خیال میں یہ بنگالی ہے۔

مصنف کا نام ابراہیم اور اس کے والد کا نام "قوام" تھا، اور وہ نسباً فاروقی تھا، اس لیے اپنے آپ کو ابراہیم قوام فاروقی لکھتا ہے، مصنف کے دادا کے بھائی ملا رشید "زفان گویا" کے مصنف نہ صرف ایک عالم متبحر تھے، بلکہ فن لغت نویسی کے بھی ماہر تھے،

اس طرح یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مصنف کا خاندان علم و فن کا گہوارہ تھا، اور لغت نویسی کا فن اسے ورثے میں ملا تھا،

"شرفنامہ" کے مختلف نام ہیں، کسی نے اسے "شرفنامہ منیری" لکھا ہے اور کوئی اسے "شرفنامۂ ابراہیمی" کے نام سے یاد کرتا ہے، اور کوئی "فرہنگ ابراہیمی" یا "فرہنگ نامہ شیخ ابراہیم" کہتا ہے، یعنی ایک ہی کتاب کے پانچ نام ہیں، پہلے دو ناموں کا تعلق مصنف کے مرشد روحانی اور انکے وطن سے ہے، تیسرے نام کی مناسبت مصنف اور اس کے مرشد روحانی دونوں سے ہے، اور چوتھے اور پانچویں نام کی نسبت صرف مصنف سے ہے، مصنف کے مرشد روحانی کا نام حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد ابن شیخ یحییٰ منیری ہے، سنہ۵۷۶ھ میں حضرت مخدوم الملک کے پردادا حضرت امام محمد تاج فقیہہ تبلیغ اسلام کے خیال سے بیت المقدس سے صوبۂ بہار کے قصبہ منیر شریف تشریف لائے اور وہاں کے راجہ کو شکست دے کر منیر فتح کر لیا، اور اپنے دو بڑے لڑکوں کو وہاں اپنا قائم مقام بنایا اور چھوٹے لڑکے کو اپنے ساتھ لے کر بیت المقدس واپس تشریف لے گئے، اسی قصبہ منیر میں حضرت مخدوم الملک کی پیدائش (سنہ۶۶۱ھ) میں ہوئی اور وفات (سنہ۷۸۲ھ) میں بہار شریف (موجودہ ضلع نالندہ) میں ہوئی، ایک زمانہ میں قصبہ منیر صوفیائے کرام کا مرکز تھا، اور آج بھی وہاں حضرت مخدوم الملک کے بزرگوں اور معتقدوں کے مزار شریف اور خانقاہ کے آثار باقی ہیں، "تذکرہ شعرائے منیر" مرتبہ شاہ مراد اللہ منیری کی اشاعت سے اس امر کی بھی نشان دہی ہوتی ہے کہ یہ قصبہ نہ صرف عرفان و تصوف بلکہ شعر و ادب کا گہوارہ بھی رہ چکا ہے، منیر کا محل وقوع پٹنہ اور آرہ کے درمیان ہے، جو عام شاہراہ سے متصل ہے،

کتاب کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

بنام خداوند ہستی بہ است سر آغاز ہر نامۂ راکہ ہست

آگے چل کر مصنف کتاب کے نام اور اپنے مرشد روحانی کی تعریف و توصیف یوں بیان کرتا ہے۔

سراپا کہ مملو ز دُرِّ دری است شرفنامۂ احمد منیری است

مغیثِ جہاں، سرورِ مُنیَراست کہ خاکِ درِ روضہ اش عنبر است

کسی کو شجادر، در آن روضہ است بعین الیقین، عرش را دیدہ است

کنوں روضہ اش کعبۂ ثانی است کہ باران برو فیضِ رحمانی است

کفیلِ نجات است خاکِ درش خوشا آن کسی کش بُوَد بر سرش

مکاتیبِ او، کانِ ایمان شمر بود منکر او ز کافر بتر

تصانیف او را ہمہ عرشیاں بگیرند از بر پئی حرزِ جان

ہر آن کس کہ دارد تولّا بود زنجیرگی حق تعالیٰ ازد

خدایا بحقِ جمالِ بشر

براہیم راز سگانش شمر

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ بہار کے خواص و عوام کی زبان پر اس قصبے کا نام مُنیر (Maner) کی حیثیت سے چلا آرہا ہے، معلوم نہیں مصنف نے شعری ضرورت یا قافیے کی مجبوری کی بنا پر اسے بطور مُنیَر (Manyar) نظم کیا ہے، یا ممکن ہے کثرتِ استعمال اور تلفظ کی آسانی کی وجہ سے مُنیَر اپنی اصلی حالت بدل کر مُنیر ہو گیا ہے، لیکن منیر شریف کے مخدوم زادوں کے سفینوں میں قصبۂ منیر کی فتح کا جو قطعۂ تاریخ درج ہے اس میں بھی اس لفظ کا تلفظ مُنیَر ہی نظم ہوا ہے، مثلاً

یافت چوں برراجۂ مُنیرُ ظفر داد امام از دیں جہانے رانوی
ہست منقول از بزرگانِ سلف سال آن دینِ محمد شد قوی

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، شرفنامہ فارسی لغت کی ایک کتاب ہے جس کے آغاز میں منظوم مقدمہ، لغت اور مدح بھی شامل ہے، الفاظ کی شرح سے پہلے حرف مفرد اور فارسی حروف تہجی سے بحث کی گئی ہے، اور ہر باب کی ابتدا میں اس باب سے متعلق ایک قصیدہ ہے، الفاظ کے معنی بیان کرنے کے سلسلے میں حافظ شیرازی سے فردوسی طوسی تک اور بعض جگہ خود مصنف نے اپنے اشعار سے استدلال کیا ہے، ہر فصل کے آخر میں بعض ترکی الفاظ بھی پائے جاتے ہیں اور بعض جگہ فارسی الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے مصنف نے ان کے مترادف ہندی (اردو) الفاظ بھی دئے ہیں، لیکن اردو الفاظ کے استعمال کی یہ کوئی پہلی مثال نہیں بلکہ ہندوستان کی اولین فارسی لغت یعنی "فرہنگ قواس" اور ادات الفضلاء میں بھی ہندی (اردو) الفاظ استعمال کئے گئے ہیں بلکہ "بحر الفضائل" کے آخر میں جو فارسی کی لغت ہے اردو زبان کے مسائل زیر بحث آئے ہیں، گویا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو زبان کا وجود تیرہویں صدی عیسوی یعنی مغلوں سے پہلے علاؤ الدین خلجی کے زمانے سے پایا جاتا ہے، اردو زبان کے آغاز کی تاریخ میں یہ ایک اہم انکشاف ہے جسے تاریخی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اردو کا ابتدائی نام ہندی یا ہندوی ہی تھا جو متذکرہ لغات میں استعمال ہوئے ہیں، بہرکیف، "فرہنگ نظام" مرتبہ آقای محمد علی شیرازی کی پانچویں جلد میں ہندوستان میں مرتب ہونے والی تین فارسی لغت کی کتابوں پر عالمانہ اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے، ان میں "شرفنامہ" کو ایک خاص اہمیت دی گئی ہے، یہی نہیں بلکہ "شرفنامہ" کے مصنف کو بھی اپنے اس ادبی کارنامے پر فخر ہے، چنانچہ خود کہتا ہے

جز امعنیٔ دارد مراد ابراہیم　　　　کسی کہ نیست محقق در فصیح لغات

"تفسر فنامہ" میں جو اشعار درج ہیں، ان کی نوعیت اور تفصیل یوں بیان کی جاسکتی ہے مثلاً (الف) نو طویل قصیدے (ب) دو قصیدوں کے بعض حصے (ج) آٹھ غزلیں یا ان کے حصے (د) دو قطعے (ہ) ایک رباعی (و) تقریباً چار سو چالیس مطلعے یا ابیات۔ ان اشعار میں علم نجوم کی اصطلاحات، تشبیہات و استعارات، محاورات و امثال رعایتِ لفظی اور صنایع، بدایع پائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ شاذ و نادر قافیوں اور کم استعمال لفظوں کی وجہ سے اشعار پُر تکلف اور آمد کی جگہ آورد معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ کتاب شاعری کے نقطۂ نظر سے اہم نہیں بلکہ اس کی نوعیت ایک لغت کی حیثیت سے مسلّم ہے، جس میں عام لفظوں کے علاوہ نادر و نایاب لفظوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے، البتہ مصنف کے اشعار کا اور کوئی مجموعہ نہیں ملتا، اسی لئے ایک شاعر کی حیثیت سے مصنف کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکتی، مثال کے طور پر ایک قصیدہ اور ایک غزل کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

آفتاب خاوری سر نارد از روزن برون　　　　تا جو از امر تو بود (؟) در ابرِ صبحدم (کذا)

تا زند سکہ بنامت بر درست قرص چرخ　　　　کورہ می سازد، ز نار خاوری واز صبحدم

گرنہ دست قہر تو نای گلوشان بفشرد　　　　قے کند در ہر دمے بر چہ شام و صبحدم

گہ مقابل می شوی، پیش رخت ہر آفتاب　　　　گر ندادی آفتاب سادہ دل را صبحدم

از خجالت دم فرو بستیش در نای گلو　　　　گر زدی از مہر تابان پیشِ رویت صبحدم

آسمان را مہر گوید باشدش رویت مراد　　　　گرای لبوبیش آن یکاد آن مہر ہمچو صبحدم

عنبریں سازد، بذکر خامۂ تو شام کام　　　　مشک بو دارد، بنام سدرہ تو صبحدم

اشعار غزلیات

(ذیل یار ۱)

اگر مطالعۂ حسن خود کنی یارا ۔۔۔ وگرنہ فرق کنی از جہان الف دیا را (کذا)

کجا روم، چہ کنم؟ ہیچ رہ نمی دانم ۔۔۔ مرا کہ نیست بجز تو چارۂ دیا را

چہ اکباب نہ سازی از بہر نقل دلم ۔۔۔ چو با شراب تراہست رغبتی یارا

یہاں یہ بات بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ڈاکٹر شہریار نقوی مرحوم نے جو پہلے تہران اور بعد میں اصفہان یونیورسٹی میں اردو کے استاد تھے، اپنی کتاب "فرہنگ نویسی فارسی در ہندوپاکستان" میں شرفنامہ کی تدوین، اس کے مصنف اور مرشد روحانی کے متعلق بعض ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو محض غلط فہمی پر مبنی ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ یہ تسامح ڈاکٹر صاحب سے کیسے ہوا؟ بہرکیف ان کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) مصنف کے مرشد روحانی حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد کو کہیں "شیخ"[۲۱] اور کہیں "سید"[۲۲] لکھا ہے۔

(۲) (الف) شیخ شرف الدین احمد ابن یحییٰ منیری کا سفر قصبہ منیر سے دہلی تک (ب) حضرت شیخ نجیب الدین فردوسی کے دست مبارک پر دہلی میں حضرت شیخ شرف الدین احمد کا بیعت ہونا (ج) حضرت شیخ شرف الدین احمد کا وصال بہار شریف میں (۷۸۲ھ ق) یہ تینوں باتیں ابراہیم قوام فاروقی سے منسوب کر دی ہیں،

(۳) حضرت شیخ شرف الدینؒ کے مجموعۂ ملفوظات "معدن المعانی" کا نام "معدن المعنیٰ" لکھا ہے،

نمبر (۲) اور (۳) کے متعلق ڈاکٹر صاحب موصوف نے برٹش میوزیم کے فہرست نگار

چارلس ریو کی فہرست مخطوطات فارسی جلد دوم صفحہ ۴۹۳ شمارہ (۷۰۰۰) کا حوالہ دیا ہے، لیکن جب میں نے اس فہرست کا جائزہ لیا تو یہ انکشاف ہوا کہ جہاں جہاں حضرت مخدوم الملک کا تذکرہ آیا ہے وہاں وہاں ڈاکٹر نقوی نے ابراہیم قوام فاروقی کا نام لکھ دیا ہے، اس طرح دو تمام باتیں جو شیخ مذکور سے منسوب تھیں، فاروقی سے منسوب کر دیں دونوں کی عبارتیں نیچے درج کی جاتی ہیں، نقوی صاحب فرماتے ہیں :۔

"ریو در فہرست کتاب خانۂ موزۂ بریطانیا جلد دوم ضمن کتاب شمارہ (۷۰۰۰) در صفحہ ۴۹۳ مینویسد کہ ابراہیم قوام فاروقی از قریۂ منیر بہ دہلی مسافرت کرد اما نظام الدین اولیا، (متوفی ۷۲۵ ہجری قمری) را آنجا نیافت و مرید شیخ نجیب الدین فردوسی شد، او اواخر عمرش را در بہار گذرانیدہ و در ہمان جا بسال ۷۸۲ ہجری فوت کردہ است، ریو اضافہ می نماید کہ نامہ ہای ابراہیم قوام فاروقی و سخنرانیہای وی کہ بنام "معدن المعنی" تدوین گردیدہ است دارای ارزش ادبی و اخلاقی می باشد۔" [۲۳]

چارلس ریو لکھتا ہے۔ [۲۴]

Sharaf uddin Ahmad B.Yahya Munyari, so called from his native place, Munyar, a village in Bihar, went to Delhi in quest of Nizam Uddin Auliya but finding him dead (Nizam died A.H.725) became a Murid of Shaikh Najib Uddin Firdausi who gave him investiture of the Chishti order. He spent the later part of his

life in the city of Bihar(Thornton's Bihar),where he died A.H.782,and where his tomb became the resort of the devout.His letters (Stewart's Catalogue P.42) are much admired,as well as his discourses collected under the title of Maden ul Ma'ani.

اگر ڈاکٹر نقوی کے قول کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ابراہیم قوام فاروقی کی وفات ۷۸۲ھ میں ہوتی ہے، اور ۸۰۰ھ میں وہ شرفنامہ مرتب کرتے ہیں،

اسی طرح انڈیا آفس کے فہرست نگار کو "فرہنگ ابراہیمی" کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ محمود ابن شیخ ضیا تھانیسری کی کتاب "تحفۃ السعادت" کے مقدمے کا کچھ حصہ "فرہنگ ابراہیمی" کے ساتھ مل گیا ہے، جس کی بنا پر اس نے ابراہیم قوام فاروقی اور محمود بن شیخ ضیا تھانیسری یعنی دونوں کو "فرہنگ ابراہیمی" کا مشترک مصنف قرار دیا ہے، حالانکہ "شرفنامہ" یا "فرہنگ ابراہیمی" کا سال تالیف خود اسی کے قول کے مطابق (۸۶۲ - ۸۶۹ھ / ۱۴۵۸ - ۱۴۶۵ع) کے درمیان ہے اور "تحفۃ السعادت" کا سنہ تالیف (۹۱۶ھ / ۱۵۱۰ع) ہے، اگر فہرست نگار مذکور نے ذرا سی توجہ کی ہوتی تو ایسی فاحش غلطی نہ ہوتی، وہ کتاب کے خاتمے پر اس طرح لکھتا ہے۔

"فرہنگ نامہ شیخ ابراہیم رحمۃ (؟ رحمہ) اللہ تعالیٰ و قاضی محمود تھانیسری سلمہ اللہ تعالیٰ..."

"شرفنامہ" کا ایک افادی پہلو یہ ہے کہ اس نے اپنے معاصر شاہان سلاطین بنگال کی

مشہور اور قابل ذکر شخصیتوں کا تذکرہ کیا ہے، جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نویں صدی ہجری قمری یعنی پندرہویں صدی عیسوی میں آزاد سلاطینِ بنگال کے عہد میں فارسی نہ صرف سرکاری زبان تھی بلکہ اس زبان کے شاعر و ادیب ایک مستقل اور مسلمہ حیثیت کے مالک تھے، اور انھوں نے اس زبان میں تصنیف بھی کی ہے، یہ الگ بات ہے کہ ان کے شعری و ادبی کارنامے ہم تک نہ پہنچ سکے اور جن کے نام معلوم ہو سکے اب وہ کتابیں ناپید ہیں، اسی لئے صحیح طور پر ان کی ادبی حیثیت کا تعین ممکن نہیں، ان میں افتخار الحکما، امیر شہاب الدین حکیم کرمانی کی "فرہنگ امیر شہاب الدین کرمانی" کا اس طرح پتہ چلتا ہے کہ "شرفنامہ" میں ابراہیم قوام فاروقی نے اس سے بعض الفاظ کے سلسلے میں سند پیش کی ہے، دوسرے شخص جن کا تذکرہ "شرفنامہ" میں آیا ہے وہ شیخ واحدی ہیں جن کی "حبل المتین" سے کئی جگہ اشعار کے حوالے پیش کئے گئے ہیں، شیخ واحدی کا نام ابراہیم قوام فاروقی نے بڑے احترام سے لیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "شرفنامہ" کی تالیف کے وقت شیخ وفات پا چکے تھے، تیسرے شخص امیر زین الدین ہروی ہیں جو اس زمانے میں بنگال کے ملک الشعراء تھے، ابراہیم قوام فاروقی سے ان کے بڑے گہرے تعلقات تھے، چناں چہ امیر زین الدین کی ادبی مجلسوں کا اس نے تذکرہ کیا ہے، چوتھے شخص منصور شیرازی ہیں جن کا خاندان بنگال میں آباد ہو گیا تھا، منصور ایک بلند پایہ شاعر تھے، جن کے اشعار "شرفنامہ" میں نقل کئے گئے ہیں اور "شرفنامے" کے مولف نے خود بھی اس کے جواب میں چار قصیدے لکھے ہیں، پانچویں شخص ملک یوسف ابن حمید ہیں جن کا شمار یہاں کے مقامی شعراء میں ہوتا ہے، ان کے اشعار بھی "شرفنامہ" میں پائے جاتے ہیں، ممکن ہے ملک یوسف ابن حمید ایک مقامی رئیس ملک محمد کے والد ہوں کیوں کہ وہ اپنے آپ کو ملک محمد ابن یوسف لکھتے ہیں، ان پانچ کے علاوہ

اور تین شاعروں کا تذکرہ شرفنامہ میں پایا جاتا ہے، جن کے نام سید جلال، سید محمد رکن، اور سید حسن ہیں،

متذکرۂ بالا اشخاص میں سے جن کا کلام "شرفنامہ" میں ملتا ہے، اسے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

(۱) شیخ واحدی۔

پسر مرد تہی کیسہ مباد از بیا ... گرچہ از دولت او کیسہ کند پُر بابا
این زنک زشت را ترک کن ای واحدی ... لیکن زنک بیوفا گشتہ بسی شوہرک
عقد دو خواہر چنان، عقل تصور کند ... طالب آن خواہری، بگذر از ین خواہرک
مالک ذالک مبین، مارکِ او بین کراست ... مالکِ عفریت را، مارکِ او بہ مرک
شنگلک دشوخک بود، شاہر گرد لربا ... تجبلک عشوہ پہ، خوبک سیمین برک

(۲) منصور شیرازی

چو دست یاسمن صبح، از ین زمرد شاخ ... بخورد سنبل شب را غزال زرین شاخ
در آمد از درِ من، دلربای سنبل مو ... شگفتہ بر سمن عارضش چو گل بر شاخ
فتاد در نظرش، از بادۂ شبینہ خمار ... بعزم عیش، صبوحی نہادہ بر کفِ شاخ
زدہ بہ سنبل پرتاب شانہ، وز غم را ... چو شانہ سینۂ صاحبدلاں شدہ صد شاخ
چو چشم ابر شد آبی در روی گلناری ... در آبگون قدح افگن شراب گلناری
بدور گل، مئی گلگوں، بیاور ای ساقی ... کہ حیف باشد گرمی بدور گلناری
بسوخت لالہ صفت صد ہزار دل، آن دم ... کہ کرد ساقی ما، چہرہ را چو گلناری

(۳) ملک یوسف بن حمید

نیر شدہ دیدہ کہ از خاک در تو دوری است ... دوری از خاک درت، باعثِ رنجوری است

بار عیسیٰ نفس و رنج تنم را لازم چارم می برکف و مار الم مخموری است

"شرفنامہ" پر کئی سال قبل ایران کی فارسی اکاڈمی میں مینا حکیمہ نامی ایک خاتون سے ڈاکٹریٹ کے لیے لسانیات کے مشہور ایرانی پروفیسر ڈاکٹر صادق کیا کی رہنمائی میں تحقیق شروع کی تھی لیکن وہاں اسلامی انقلاب کے بعد یہ کام اب کس منزل میں ہے اس کا علم نہیں کیونکہ ڈاکٹر صادق کیا اب اس اکاڈمی کے ڈائریکٹر نہیں رہے، البتہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ڈاکٹر سید طارق حسن (لیکچرار شعبۂ فارسی) نے برصغیر کے مشہور محقق پروفیسر نذیر احمد صاحب کی رہنمائی میں "شرفنامہ" کا انتقادی متن تیار کر لیا ہے جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی ہے، اس کتاب کی اشاعت سے فارسی فرہنگ نویسی میں ایک خوشگوار اور قابل قدر اضافہ ہوگا۔

حواشی

۱۔ "فرہنگ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" مطبوعہ چاپخانہ دانشگاہ تہران ۱۳۴۱ھ (ص ۴۵) ڈاکٹر شہریار نقوی نے اسے "فرہنگ قواسی" لکھا ہے، جو درست نہیں، برصغیر کے مشہور محقق پروفیسر نذیر احمد صاحب نے مرتب کر کے ۱۹۶۲ء میں اسے بنگاہ ترجمہ ونشر کتاب (تہران) سے شائع کر دیا ہے،

۲۔ پنجاب میں اردو "ذخیرہ اڈیشن ۱۹۶۳ء) ص ۲۸۵ ، پروفیسر محمود شیرانی نے اس کا سنہ تالیف ۶۰۰ھ لکھا جو غالباً کتابت کی غلطی ہے، پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اسے مرتب کر کے ۱۹۷۰ء میں "بنیاد فرہنگ" (تہران) سے شائع کر دیا ہے،

۳۔ "زفان گویا" کا ناقص الاول نسخہ اور بانکی پور نسخے کا خلاصہ س۔ الف۔ بائیفسکی نے ۱۹۷۴ء میں ماسکو سے شائع کر دیا ہے۔

۴۔ آقا احمد علی اصفہانی نے "مؤید برہان" بنگال ہی میں مرتب کی۔

۵۔ "پنجاب میں اردو" تیسرا اڈیشن ۱۹۶۳ء ص ۲۹۳

۶۔ " فہرست مخطوطات فارسی شمارہ (۳۰۵۲)

۷۔ " فہرست مخطوطات فارسی جلد دوم شمارہ (۸۶۶) ص ۴۹۲

۸۔ " ثقافت پاکستان" مطبوعہ ادارہ مطبوعات پاکستان، کراچی ص ۲۰۲

۹۔ " فرہنگ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" مطبوعہ چاپخانہ دانشگاہ تہران ۱۳۴۱ ص ۶۲

۱۰۔ مجلہ "غالب نامہ" جولائی ۱۹۸۱ء "نقد برہان قاطع" ص ۷

۱۱۔ " پنجاب میں اردو" محولہ بالا ص ۲۹۳

۱۲۔ "ثقافت پاکستان" محولہ بالا ص ۲۰۲

۱۳۔ " فرہنگ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" محولہ بالا ص ۶۲

۱۴۔ "فہرست مخطوطات فارسی" محولہ بالا ص ۴۹۲ شمارہ (۸۶۶)

۱۵۔ "پنجاب میں اردو" محولہ بالا ص ۲۸۵

۱۶۔ تاریخ سلسلۂ فردوسیہ مرتبہ معین الدین دردائی، مطبوعہ تاج پریس گیا ۱۹۶۲ء (ص ۱۳۹)
دردائی صاحب نے حضرت تاج فقیہہ کا وطن بیت المقدس کا محلہ قدس خلیل بتایا ہے، موصوف کو مغالطہ ہوا ہے، بیت المقدس میں قدس خلیل نام کا کوئی محلہ نہیں البتہ ہبرون کو "خلیل الرحمٰن یا مختصر طور پر "الخلیل" بھی کہتے ہیں۔ جو بیت المقدس سے تقریباً تیرہ کیلومیٹر دور ایک مستقل شہر ہے، (ملاحظہ ہو۔ Al-Haram Al-Ibrahimi
Al-Khalil (Afrtef guide)

۱۔ "بہار میں اردو نثر کا ارتقا" از ڈاکٹر مظفر اقبال، بکتا بخانہ تریولیا، پٹنہ (۱۹۸۰ء) ص

اس مصرعے میں "محمد" کی جگہ "محمدی" لکھا ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

۱۸۔ "پنجاب میں اردو" محولہ بالا ص۲۹۳

۱۹۔ ماسبق ص۲۹۲۔

۲۰۔ مجلہ "غالب نامہ" جولائی ۱۹۸۰ء "نقد برہان قاطع" ص۵

۲۱۔ "فرہنگ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" محولہ بالا ص۶۲ سطر ۳۔

۲۲۔ ماسبق ص۶۲ سطر ۱۰۔

۲۳۔ ماسبق ص۶۳

۲۴۔ "فہرست مخطوطات فارسی" محولہ بالا شمارہ (۸،۶۰، ص۲۹۲)

۲۵۔ "اخبار الاخیار" از عبد الحق محدث دہلوی مطبوعہ ۱۹۱۳ء ص۱۲۴ میں بھی یہی لکھا ہے لیکن "لطائف اشرفی" مطبوعہ نصرت المطابع، دہلی ص۳۰۰ (بحوالہ "تاریخ سلسلۂ فردوسیہ" محولہ بالا ص۱۴۴)، میں لکھا ہے کہ حضرت مخدوم بہاریؒ کی ملاقات حضرت نظام الدین اولیاء سے دہلی میں ہوئی تھی،

۲۶۔ فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس، شمارہ (۳۰۵۲)

۲۷۔ "پنجاب میں اردو" محولہ بالا ص۲۹۳ پروفیسر شیرانی نے "محمد شیرازی" لکھا ہے، جو غالباً کتابت کی غلطی ہے،

۲۸۔ مجلہ "غالب نامہ" محولہ بالا ص۶ "نقد برہان قاطع" مقالہ پروفیسر نذیر احمد صاحب۔

ایک خاندانی بیاض

از جناب آصف احمد صاحب علی گڑھ،

میرا تعلق بریلی کے ایک معزز علمی گھرانے سے ہے، میرے پردادا سید ولایت علی گورنمنٹ اسکول بریلی میں (جو بعد میں بریلی کالج ہوا) ہیڈ مولوی تھے، وہ سر محمد یعقوب کے ہم جماعت اور دوست تھے، سید ولایت علی کے بیٹے یعنی میرے دادا کا نام سید ارادت علی تھا، وہ عربی و فارسی میں کافی دستگاہ اور شعر و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے، ان کا ذاتی کتب خانہ تھا، جو اردو، فارسی اور عربی کی منتخب کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا، ان کو کتابت کا بھی شوق تھا، قرآن مجید کا ایک نسخہ خود ان کا لکھا ہوا ان کے ذخیرے میں تھا، کتب بینی کے شوق کا یہ عالم تھا کہ باہر جاتے تو کتابوں کا صندوق ساتھ لے جاتے تھے، ان کی وفات ۱۹۲۳ء کے بعد یہ کتبخانہ برباد ہوگیا، سیکڑوں کتابیں کیڑوں کی نذر ہوگئیں، ایک صندوق کتابیں جو کیڑوں نے بالکل برباد کردی تھیں، میں نے اپنے ہاتھ سے نذر آتش کیں، ان کے بڑے صاحبزادے سید شوکت علی ریاست رامپور میں دار الانشا کے سکریٹری تھے، اور اب رامپور میں مقیم ہیں، ان کے پاس بھی کوئی کتاب نہیں رہی، البتہ میرے پاس خود میرے دادا کی مرتب کی ہوئی ایک بیاض ہے، یہ بیاض کئی سال کے وقفے سے تیار ہوئی، وہ اس میں برابر اضافہ کرتے رہتے تھے، ایک دو اضافے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۲ء کے بھی ہیں، کچھ اضافے دوسرے قلم کے ہیں، درمیان میں بعض جگہ کافی اوراق سادے چھوٹے ہوئے ہیں، ان کے پُر کرنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔

اس بیاض میں کل ۲۰۰ سے زائد اوراق ہیں، آخر میں پچاس ورق سادے چھوٹے ہیں، بیاض کا سائز ۳½ × ۳½ ہے، اس کے تین جز ہیں، پہلا جز فارسی اشعار پر مشتمل ہے، یہ ۱۸ اوراق کو حاوی ہے، دوسرا جز اردو اشعار کا ہے، اس میں ۳۵ ورق ہیں، ورق ۸۲ تا ۱۳۶، تیسرا نسخہ اوراد و وظائف اور کچھ طبی نسخوں پر مشتمل ہے،

اب میں بیاض کے بعض مندرجات کی تشریح کرنا چاہتی ہوں۔

حصۂ فارسی | اس کی ابتدا فیضی کی حمد سے ہوتی ہے۔

یا ازلی الظہور یا ابدی الخفا الخ

اس کے بعد دو مختصر منظومے ہیں، پہلی نظم میں کسی شخص نے ابو علی سینا کو اپنی علالت لکھ بھیجی تھی، دوسری نظم میں اس شخص کی بیماری کے لیے ایک نسخہ تجویز ہوا ہے دوسری نظم ابو علی سینا کی ہے لیکن اس کی نسبت ابو علی سینا کی طرف غلط معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ اول یہ کہ بہت ہی پھسپھسی نظم ہے، دوسرے یہ کہ زبان بھی اتنی قدیم نہیں معلوم ہوتی ہے، ابن سینا کی کتاب دانش نامۂ علائی فارسی میں موجود ہے، اس کی زبان سے اس نظم کی زبان کافی مؤخر ہے نظم کی ابتدا اس طرح ہے۔

زہے ستودہ خصائل کہ گاہ نظم سخن زبہر لطف طبیعت گہر ہمی ریزد

اس کے بعد نثر کا صفحہ ہے جو ایک چھکڑ ہے، دونوں نظم اور نثر کا یہ ٹکڑا ایک ورق پر ہے، اس کی سیاہی دوسری ہے، گو خط ایک ہی ہے، اس کے بعد خیام کی ۴۲ رباعیاں درج ہیں، ایک ورق میں غنی، ظہوری، نظیری، جامی اور سلیمان کے مختلف اشعار درج ہیں، اسکے بعد خیام کی پھر ۱۱ رباعیاں ہیں، اس کے بعد مولانا شبلی کا مشہور ترکیب بند ہے، جو امرتسر کے ایک جلسے منعقدہ ۱۰ اکتوبر میں پڑھا گیا تھا، اس کی ابتدا یوں ہے، (ورق ۱۸)

اے کہ پرسی کہ چہ کسانیم و چہ سامان داریم الخ

اس کے بعد پھر خیام کی ۸ رباعیاں ہیں، اس کے بعد ابن یمین، بیدلؔ، صائبؔ، سعدی، نظامی، خاقانی وغیرہ فارسی شعرا کی چند ابیات کے بعد ملکہ نورجہاں کے حسب ذیل ابیات درج ہیں،

هلال عید[1] به اوجِ فلک هویدا شد — کلیدِ میکده گم گشته بود پیدا شد

هنوز آن نُقلِ خندیدن نداند — نگه دزدیدن و دیدن نداند

کشادِ غنچه اگر از نسیم گلزار است — کلیدِ قفلِ دلِ ما تبسّمِ یار است

سیه زلف و خالش بلای نهان است — مترس از بلائے که شب درمیان است

دقیقه‌های معانیش در سوادِ حروف — چو در سیاهیِ شب روشنی پردین است

سلک مروارید بر فرق سرش دانی که چیست — تشنگان شوق را جوئی است از آب حیات

(ورق ۱۲)

نورجہاں کے حسب ذیل اشعار ورق ۲۰ ب پر پھر درج ہوئے ہیں،

تاب زن مثل گہر بر خویشتن پیچیده به — چشمِ زار زندگانی از نظر پوشیده به

زندگی بحرِ پرآشوب است وزن پایاب او — موج گرداندش نگر پایاب او نادیده به

اشکارائی زنست آفرینش دوری است — زانکه حفظ جوهرِ هر خلق از مستوری است

ان اشعار کے درمیان قواعد کی رعایت کرتے ہوئے "ز" کے بجائے "ذ" لکھا ہے، نورجہاں کے اشعار (جزو اول) کے بعد چند شعرائے متقدم و متاخر کا کلام ہے، ان ہی میں شادؔ عظیم آبادی کے دو فارسی شعر ہیں۔

بداں عیارای دل چند روزی ساختی رفتی — متاعِ دین و دنیا در محبت باختی رفتی

دفہمیدی که این شاد است و ناشاد است در هجران — شکاری بود از فتراک خود انداختی رفتی (ورق ۲۰ ب)

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ایک مناجات ہے، جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔ (ورق ۱۴)

---

[1] تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا مصرعہ جہانگیر کا ہے، جو عید کے چاند کی رویت کے موقع پر کہا گیا اور دوسرا مصرعہ نورجہاں نے فی البدیہہ کہا۔

خذ بلطفک یا الٰہی من لہ زاد قلیل مفلساً بالصدق یاتی عند بابک یا جلیل

پھر قدسی کی مشہور نعت ہے۔ (ورق ۱۴ ب)

اس کے بعد چند شعرا کے کلام کے بعد منشی امیر احمد امیر کی ایک ۱۲ اشعار پر مشتمل غزل ہو جسکا مطلع یہ ہے۔ (ورق ۱۹ ب)

شاہد حسن نیازم چو شود جلوہ فروش سجدہ رقصد بدر یار و سر من بر دوش

ورق ۲۲ ب پر اکبر بادشاہ کے نام حسب ذیل اشعار درج ہیں۔

گریہ کردم ز غمت موجب خوشحالی شد ریختم خون دل از دیدہ دلم خالی شد

رباعی

می نازکہ دل خون شدہ از دوری او من بار غم ز دست ہجوری او (کذا)

در آئینۂ چرخ نہ قوس قزح است عکس است نمایان شدہ از چوری او

من بنگ نمی خورم مے آرید من چنگ نمی زنم نیارید

قطعہ

دو شنبہ بکوے می فروشان پیمانۂ مے بزر خریدم

اکنون ز خمار سر گرانم زر دادم و درد سر خریدم

ورق ۲۳ ب پر اوحد الدین کرمانی کا نعتیہ قصیدہ درج ہے۔ قصیدہ کی اہمیت کے پیش نظر اس کے چند منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

خوش آنکہ بندم در رہت بر ناقہ محمل از وطن خیزم چو گرد افتم چو اشک آیم بسر غلطم بتن

چون پانہم در راہ تو باشد پی قطع رہم یا راحلہ کف ابلہ چشم ندم غم زاد من

آیم برین دار الشفا گویم بیزاری و بیدم ای شمع دین ختم رسل مطلوب حق فخر زمن

لہ شیخ سعدی کے (وفات ۶۹۲) کے معاصر اور تصوف و عرفان میں سعدی کی طرح ابوحفص عمر سہروردی کے شاگرد تھے۔

شاہ سریر سلطنت سلطانِ اوادنی لقب — مکی نسب امی حسب بطحی مکان یثرب وطن

از گفتن نعتت بود ساعت بساعت تازہ تر — باغ امل شاخ طرب گل زار جان نخل بدن

از شوق باغ عارضت از دست حسرت چاک زد — لالہ گریبان غنچہ دل نسرین قبا گل پیرہن

از شرم خاک درگہت برخاک خواری ریختہ — رنگ گل و آب مل و تاب چمن بوی سمن

سحر آفرین عقل را در وقت وصفت او فتد — کلک از بنان لفظ از بیان نطق از زبان حرف از دہن

کمتر گدای درگہت بر مسند شاہی بود — خسرو صفت دارا محل خاقاں مکاں جمشید فن

ای رحمۃ للعالمین برخیز تا خیزد دگر — شور از فلک جور از فلک رنگ از زحل بمراد لمن (کذا)

از سطوت حکمت سزد گر روی تا بد تا ابد — آب از زمین تاب از شرر بلبل ز گل باد از چمن

بر گردن اعدای تو دستِ سپہر انداختہ — زنجیر غم بند الم غل ستم طوق محن

عقل و دل و دین و خرد گر دند گرد روضہ ات — این شادماں آن جاں فشان این طوف کن آن چرخ زن

شمشیر شرع انورت از بہر دفع کفر شد — گیتی ستان آتش فشان کشور کشا اعدا فگن

از ہیبت شرعت عجب نبود اگر دوری کند — چشم از غضب ابرو ز چین جان از فسون لف از شکن

کلک بدائع سنج من از صفحۂ نعتت شود — دستان سرا نغمی نوا عیسیٰ نفس عنبر فگن

بے نافہ ات ہر جا نہد از دولت گامش بود — باغ ارم ملک بقا صحرای چین دستِ ختن

وقت چیدن از دہن خاری کہ افتد بر زمین — سوسن شود نسرین دمد خیزد گل آرد نسترن

در پیش خدام درت بستہ میانِ بندگی — علم و ادب عقل و ہنر ذہن و ذکا جود و محن

تا بر زمین افتد ز شرم بنمای روی نازنین — زہرہ ز بام مہ ز افق نیر ز نتق شمع از لگن

از حجرہ بیرون نہ قدم برکن درخت ظلم را — بر باد دہ آتش فگن درہم شکن از پا فگن

در زیر فرمان آمدہ فرمان حکم ترا — چین و خطا مصر و حلب روم و ری شام و یمن

گر حفظ تو مانع شود گردد گریزان تا ابد   مرگ از مرض رنگ از عرض گرگ از غنم زاغ از دغن

از دولت نعت بود لحظہ بہ لحظہ تازہ تر   فیضِ ازل عمرِ ابد نوروز نو عیشِ کہن

ای آفتاب شرع و دین چون خاک پامال توام   در من نگر بر من گذر سایہ فگن بر فرقِ من

نوبت شفاعت کردن است ہستی شفیع المذنبین   بیچارہ من نامہ سیہ حالم تبہ دل پُر حزن

اس کے بعد جامی، سعدی، خسرو، ظہیر اور شمس تبریزی کی نعتیہ نظمیں ہیں، جامی کی پہلی نعتیہ غزل کا مطلع یہ ہے،

کی بود یارب کہ رو در یثرب و بطحا کنم   گہ بہ مکہ منزل وگہ در مدینہ جا کنم

پھر ظہیر فاریابی کی نعت ہے، جس کا مطلع اس طرح ہے۔

ای از ہلال ناخنت بدر بیک اشارہ شق   چرخ نثار مقدمت کردہ ستارہ پر طبق

نعتیہ منظومات کے بعد فردوسی کا ایک قطعہ ہے۔

درختی کہ تلخ است وے را سرشت   گرش در نشانی بہ باغِ بہشت

ور از جوی خلدش بہ ہنگام آب   بہ بیخ انگبین ریزی و شہد ناب

سرانجام گوہر بکار آورد   ہمان میوۂ تلخ بار آورد (۲۸ ب)

اس کے جواب میں ہاتفی کے حسب ذیل دو قطعے ہیں۔ (۲۸ ب)

اگر بیضۂ زاغ ظلمت سرشت   نہی زیر طاؤس باغِ بہشت (۲۲۸)

اگر وقت آن بیضۂ پروردیش   ز انجیر جنت دہی روزیش

دہی آبش از چشمۂ سلسبیل   دران بیضہ دم در دمد جبرئیل

شود عاقبت بیضۂ زاغ زاغ   برد رنج بیہودہ طاؤس باغ

اگر سالہا مردمِ بد سرشت   شود ہمدمِ حوریان در بہشت

دران محفل پُر صفا روز و شب زجبرئیل خواند فنون ادب
بران اعتقادم کہ ہنگام کار نگردد آزو جز بدی آشکار

اس کے بعد چند شاعروں کے اشعار درج ہیں، پھر غالبؔ کی ایک فارسی غزل ہے، جس کا مطلع یہ ہے۔

تابم ز دل برد کافرادائی بالابلندی کوتہ قبائی (۳۰ ب)

بعد از آن گرامیؔ جالندھری شاعر خاص حضور نظام دکن کی غزل "خفت است" زمین میں ہے، جو اس طرح شروع ہوتی ہے،

بگوشۂ آن چشم سرمہ ساخفت است نگہ کنید کہ برق بلا کجا خفت است (۳۰ ب)

اس کے فوراً بعد حکیم ابوالصواب قریشی انصاری کی ایک نظم نو روز کے خیر مقدم کے عنوان سے درج ہے جو ۲۳ر مارچ ۱۹۱۸ء کے اخبار ہمدم سے نقل ہوئی ہے، (۳۲ الف)

مولانا رومؔ کی ایک غزل کے بعد غالبؔ کی ایک اردو غزل دوسری سیاہی میں درج ہے،

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں الخ

اس کے بعد فارسی کے متعدد شعرا کا کلام نقل ہے جس میں کسی قدر حروف تہجی کا لحاظ رکھا گیا ہے، (ورق ۳۳ ب ببعد) شعرا یہ ہیں،

انوریؔ، آصفیؔ، اہلیؔ، انیسیؔ، اسیرؔ، امانیؔ، انصابؔ، ایجادؔ، اوجیؔ، آذریؔ، اہدیؔ، ابوالحسنؔ، اسدیؔ طوسی، ابن یمینؔ، ابویزیدؔ، افضلؔ کاشی، اوحدیؔ، انسیؔ، آزردہؔ، (مفتی صدر الدین) احمدیؔ، ایماؔ، آگاہؔ، الفتیؔ، آقائیؔ، اعجازؔ، ابراہیمؔ، اشرف خانؔ، افتخارؔ، امدادؔ، الہیؔ، اثیرؔ، آرزوؔ، آزادؔ بلگرامی، آفرینؔ، آصفؔ، امیدؔ، فضلیؔ، اہلیؔ،

اقدس ایجاد، اذل، بیدل، بیخبر، پرول، پیامی، پیام، ترانی، تجلی، تشبیہی، تائب، ترکمان، جامی، جہانگیر، جمالی، جرأت، جدائی، چاکری، حسن غزنوی، حسن دہلوی، حافظ، حیاتی، حزین، خاقانی، خسرو، خوشدل گوپاموی دانش، درد دہلوی، ذوقی، ذہنی، ذرہ، رودکی، رفیعی، رازی ہندی، رحیم، زائر الہ آبادی، زیب النساء، سعدی، سلمان، سرمد، شانی، شیدا، شوکت، شرف قزوینی، شوقی، شکوہی، شعیب، شہرت، شاہ شرف بوعلی قلندر، شاہین، شہید مولوی غلام احمد، نواب صدیق حسن خان، صائب، صبوری، صادق، اس کے بعد کے انتخاب میں حروف تہجی کی ترتیب باقی نہیں ہے، (تا ورق ۹۴ ا)

حافظ شیرازی کے ممدوح شاہ شجاع کے اشعار دو جگہ درج ہیں، ورق ۳۳ اپر دو شعر

جان در طلب وصل تو شیدائی شد دل در خم گیسوی تو سودائی شد
اندر طلب وصال تو گرد جہان بیچارہ دلم گشت و ہرجائی شد

ورق ۷۰ اپر یہ مخمس شاہ شجاع کے نام سے درج ہے۔

چہ باز فکرت من برکشود بال نظر بیام شدرہ شدم زیں رواق نہ منظر
درین سراچہ خاکی بجوئیم آبشخور فراز قاف قناعت بگستر انم پر
کہ جز نشیمن سیمرغ نیستم درخور

عراقی کی مشہور غزل عام روایت سے مختلف ہے، مثلاً

صنا رو قلندر سزد ار بمن نمائی کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

عام روایت[1] ہے، پسر ارہ قلندر بزن از حریف مائی الخ ورق ۱۲۹ امفتی صدرالدین آزردہ کے کچھ اشعار درج ہیں، چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں،

---

[1] "شعری" میں بشرارہ قلندر درج ہے،

تو خود انصاف کن ای آشنا دشمن روا باشد | مرا از دست تو در پہلو ترا بیگانہ در پہلو

بایں تقوی درون میکدہ آزردہ زاہدیم | صراحی در بغل ساغر بکف پیمانہ در پہلو

زاہد بیا و موت شہیدان عشق بیں | کین موت را نہ زندگی جاودان رسد

طوبی لک از ملائک رحمت خورد بگوش | ہر دم ندای ارجعی از آسمان رسد

آتش عشق فلک در دل و در جانم سوخت | زانکہ از داغ دگر دید کہ نتوانم سوخت

روز ہجران تو می سوخت مرا حسرت وصل | در شب وصل تو اندیشۂ ہجرانم سوخت

ہیچگہ چرخ جفا پیشہ نمی ساخت بمن | شکر ایزد کہ ز آہ شرر آنسانم سوخت

رحمت از بہر عذابم مکش ای نار جحیم | کہ سراپای مرا خجلت عصیانم سوخت

باز آن بستر خار است ہمان بالش سنگ | سر شوریدہ من زانوی جانانم سوخت...

جہانگیر بادشاہ کے حسب ذیل اشعار درج ہیں۔ (ورق ۳۷)

ای آنکہ غم زمانہ پاکت خوردہ | اندوہ دل وسوسہ ناکت خوردہ

مانندۂ قطرہ ہای شبنم بزمین | جا گرم نکردہ کہ خاکت خوردہ

ہر کس بضمیر خود صفا خواہد داد | آئینۂ خویش را جلا خواہد داد

ہر جا کہ شکستہ بود دستش گیر | بشنو کہ ہمیں کاسہ صدا خواہد داد

دل بد مکن کہ عمر نماند بہ ہیچکس | این یک نفس کہ خوش گذرد بس غنیمت است

ما نامہ ببرگ گل نوشتیم | شاید کہ صبا بدو رساند (ورق ۴۴ أ)

ہمایوں بادشاہ کے یہ تین شعر درج ہیں۔

گرچہ اندیشۂ من رشتۂ نظام است ولے | مثل زنار بہ اندام دو عالم بستند

ہر زمان تازہ برے خوبترے می جویند | نقش خوبی کہ شکستند دگر کم بستند

عشق از لذت نظارہ بدیدار جہاں		ریختہ کردند وز آب و گل آدم بستند

نواب صدیق حسن خاں شوہر شاہجہاں بیگم والیۂ ریاست بھوپال کی ایک دلچسپ غزل نقل ہے۔ (۶۰ ب)

دل بردز من تاجورے شاہ شہانے		لشکر شکنے تیغ کشے آفت جانے
خورشید وشے سیمبرے ماہ لقائے		جادو نگہے کج کلہے جور نشانے
کے مرتبہ نازد زنے فتنہ پرستے		پیمان شکنے جور گرے شور جہانے
در مملکت حسن شہ صدر نشینے		در زمرۂ خوبانِ جہاں باج ستانے
ہاروت فنے ماہ رخے یوسف عہدے		عیسیٰ نفسے خضر رہے سحر بیانے
غلماں روشے خلد وشے مست حیائے		کوثر منشے آب بقا رطل گرانے
بیداد گرے عربدہ جو جور پسندے		خاطر شکنے تیر قدے سخت کمانے
از حالت دل با تو چہ افسانہ سرایم		شوریدہ سرے جور کشے خوار جہانے
مجنوں صفتے کوہ کنے خانہ بدوشے		بے تاب دلے ریش تنے سوختہ جانے
نواب نخواہد کہ بہجر تو بمیرد		اے جان جہاں وعدۂ وصلے و امانے

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین کی یہ رباعی امیر خسرو کے لیے ہے (۶۰ ب)

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست		ملک است ملک سخن آن خسرو راست
این خسرو ماست ناصر خسرو نیست		زیرا کہ خدائے ناصر خسرو ماست

ورق ۶۵ الف پر حافظ کے یہ تین اشعار ہیں، جو دیوان ورق ۶۰ ب میں شامل نہیں،

مرغ دلم طائریست قدسی عرش آشیان		از قفس تن ملول سیر شدہ از جہان
از در این خاکداں چوں بپرد مرغ ما		باز نشیمن کند بر سر آن آشیان

چون نیم پرونیں جہاں سدرہ بود جای او — تکیہ گہ باز ما کنگرۂ عرش دان

ایک غیر معروف شاعرہ عصمت الدین شاہ عالم بنت قطب الدین محمد سلطان کرمانی

کے چند شعر درج ہیں، قطب الدین محمد سلطان[1] قراختائیان خانوادے کا تیسرا بادشاہ تھا، جو اپنے چچازاد بھائی رکن الدین مبارک کے بعد کرمان کا فرمانروا ہوا، اس نے اپنی چچی قتلغ ترکان سے نکاح کر لیا، اس سے ایک دانشمند لڑکی بادشاہ خاتون پیدا ہوئی، قتلغ ترکان خود بڑی مدبر تھی، بادشاہ خاتون اپنے بھائی جلال الدین سیورغتمش کو مقید کرکے خود ۶۹۱ھ میں کرمان کے تخت پر بیٹھی، ۶۹۴ھ میں بایدو کے حکم سے قتل ہو گئی، علم و ادب کی بڑی شوقین اور خود شاعرہ تھی، اس کے اشعار تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں، عصمت الدین شاہ عالم بادشاہ خاتون کی بہن تھی، اس سے زیادہ عصمت الدین کے متعلق معلوم نہیں بہرحال اس بیاض میں حسب ذیل اشعار اس کی طرف منسوب ہیں، (ورق ۵، ب)

آن روز کہ در ازل نشانش کردند — آسایش جان بیدلانش کردند

دعوی لب نگار می کرد نبات — زان روی سہ چوب در دہانش کردند

بر لعل کہ دید ہرگز از مشک رقم — یا غالیہ بر نوش کجا کرد ستم

جانا اثر خال سیہ بر لب تو — تاریکی و آب زندگانی ست بہم

درون پردۂ عصمت کہ تکیہ گاہ منست — مسافران ہوا گذر بہ دشواری است

نسیم باد مزن سر بزیر مقنعۂ او — کہ تار و پود وی از عصمت و نکوکاری است

این وصل دوستان کہ می بینی — مگسانند گرد شیرینی

تا طعامی ہست می نوشند — ہمچو زنبور بر تو می جوشند

باز وقتی کہ دہ خراب شود — کیسہ چون کاسۂ رباب شود

[1] دیکھئے تاریخ ادبیات در ایران از صفا جلد ۳ بخش ۱، ص ۸۵۹

ترکِ صحبت کنند دو دلداری دوستی خود نبود پنداری

حصہ اردو اردو حصہ ورق ۲۰ا سے شروع ہو کر ۴۰۹ پر ختم ہو جاتا ہے، اس کی ترتیب میں کوئی خاص اصول مدنظر نہیں رکھا گیا ہے، اس میں حسب ذیل شعرا کا کلام انتخاب ہوا ہے،

اکبر، اقبال، مولانا محمود الحسن، اسماعیل، درد، امیر مینائی، میر، رند، سحر، جلیل میر مہدی مجروح، شیفتہ، زکی مرادآبادی، آتش، بقا، رند، شاد عظیم آبادی، وفا رامپوری (حکیم عبد الہادی) حاتم، کمن لال فارغ بریلوی، محمد امان نثار، مصحفی، سودا، آشفتہ سعادت علی خان رنگین، شہیدی، ناسخ، داغ، منشی منیر جلال، بیدار، قلم لکھنوی، منتظر گرد مصحفی، درویش، شمس الضحیٰ اخگر، قائم، میر حسن، فغان، وفا، شہرت، عزیز لکھنوی، مجنوں، احسن اللہ خان ثاقب، محسن کاکوروی، میر تقی ہوس، غالب، جرأت، ذوق، مومن، انیس، امجد علی اشہری، سیماب اکبرآبادی، عبد العلی آسی مدراسی، فیروز الدین لاہوری، شبلی، کیفی، صفی، مولانا آزاد سبحانی، ذیل میں بعض اشعار کی نشاندہی کی جاتی ہے، جو کسی نہ کسی اعتبار سے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں،

مولانا محمود الحسن دیوبندی عظیم القدر شخصیت کے مالک ہیں، ان کی شاعری کے یہ نمونے اس بیاض میں درج ہیں،

قربِ جسمانی یہ ہے انکے تعلق کا مدار قربِ روحانی سے ہیں یکدل و یکجاں دونوں
ایک صورت ہے نظر آتے ہیں جسکے دو عکس اک حقیقت ہے کہ ہیں جسکے یہ عنواں دونوں

ہشیار رہو عشق کی مستی سے بچو عفریتِ ہوس کی چیرہ دستی سے بچو
غارت گرایماں ہیں بتانِ طناز مومن ہے اگر تو بت پرستی سے بچو

اکبر الہ آبادی کی حسب ذیل نظم نواب محسن الملک کی فرمائش پر کلکتہ کانفرنس کے لئے

لکھی گئی تھی،

مسلمانوں بتاؤ تو تھیں اپنی خبر کچھ ہے
تھارے کیا مراحل رہ گئے اسکی خبر کچھ ہو

اگر کچھ ہو تو سوچو دل میں بھی اسکا اثر کچھ ہو
حریفوں کی تعلی باعث سوز جگر کچھ ہو

تھیں معلوم ہے کچھ رہ گئی ہے کیا سے کیا ہو کر
کدھر آ نکلے ہو راہِ ترقی سے جدا ہو کر (دس بند)، ۹ ب۔ ۸۰ آ

شادؔ عظیم آبادی کی یہ مترنم نظم ورق ۱۰۰ پر نقل ہوئی ہے۔

ترے جور کا نہ کروں گلہ کٹے تیغ سے بھی اگر گلا
کروں وجد میں بھی میں صدا کہ انا الشہید بکربلا

ہوا نور بار جو رخ ترا او لموع وجھک اعتلا
چمک اٹھے دشت و جبل و در متشعشا متنزلا

مرا سر رہے جو سر نہاں مری نعش خاک میں ہو نہاں
لب زخم سے یہ کروں نہاں کہ انا لقتیل مرسلا

مجھے ذوق ہے مئی وصل کا یہ نہیں عجول ہیں ساقیا
کہ یہ جام آئے گا مجھ تلک تری بزم میں متدادلا

ترے دم سے اسکا رواج ہے ترا ناز منفرد آج ہے
ترے سر پہ حسن کا تاج ہے متر صعا متکللا

نہ کروں جو عجز و فروتنی تو خود اپنے ساتھ سے دشمنی
فلذا وجدت من العدم وکذا سحقت من العلا

ہے نگاہ شوق میں منحصر ترا کوچہ ہے کہ قتل گہ (احد)
تری جلوہ گاہ . . . . جو منی ہے یہ وہ کربلا

ہمیں شادؔ حسن کا بت تھا ڈر دہی پیش آگیا الحذر
تمہیں کہتے تھے کہ امید سے نہ زیادہ رکھو خلا ملا

حکیم عبد الہادی وفا رامپوری کی یہ غزل انتخاب ہوئی ہے۔ (۱۰۰ ب)

اثر اس تلخکامی کا رگ ذوقِ بیاں تک ہے
جسے دل میں چھپایا تھا وہی کانٹا زباں تک ہے

ذرا بیٹھے رہو دشمن کی باتوں میں نہ آجانا
ہماری سخت جانی بھی قریبِ امتحاں تک ہے

کہاں یہ حسن سادہ اور کہاں دستِ حنا گیں
تکلف برطرف ہاں یہ مری چشم خوں فشاں تک ہے

چھری چلتی ہے دشنہ تیز ہے آزاد بیٹھے ہو
یہ شانِ بے نیازی غمزہ ہائے جانستاں تک ہے

ترکِ صحبت کنند دو لداری   دوستی خود نمود پنداری

حصّہ اردو| اردو حصہ ورق ۲۰۸ سے شروع ہوکر ۳۰۹ پہ ختم ہوجاتا ہے، اس کی ترتیب میں کوئی خاص اصول مدنظر نہیں رکھا گیا ہے، اس میں حسب ذیل شعرا کا کلام انتخاب ہوا ہے،

اکبر، اقبال، مولانا محمود الحسن، اسماعیل، درد، امیر مینائی، میر، رند، سحر، جلیل میر مہدی مجروح، شیفتہ، زکی مرادآبادی، آتش، بقا، رند، شاد عظیم آبادی، وفا رامپوری (حکیم عبد الہادی) حاتم، کمندلال فارغ بریلوی، محمد امان نثار، مصحفی، سودا، آشفتہ سعادت علی خان رنگین، شہیدی، ناسخ، داغ، منشی منیر جلال، بیدار، قلم لکھنوی، منتظر گرد مصحفی، درویش، شمس الضحیٰ اخگر، قائم، میر حسن، فغان، وفا، شہرت، عزیز لکھنوی، مجنوں، احسن اللہ خان ثاقب، محسن کاکوروی، میر تقی ہوس، غالب، جرأت، ذوق، مومن، انیس، امجد علی اشہری، سیماب اکبرآبادی، عبد العلی آسی مدراسی، فیروزالدین لاہوری، شبلی، کیفی، صفی، مولانا آزاد سبحانی، ذیل میں بعض اشعار کی نشاندہی کی جاتی ہے، جو کسی نہ کسی اعتبار سے زیادہ توجہ کے مستحق ہیں،

مولانا محمود الحسن دیوبندی عظیم القدر شخصیت کے مالک ہیں، ان کی شاعری کے یہ نمونے اس بیاض میں درج ہیں،

قربِ جسمانی پہ ہے انکے تعلق کا مدار   قربِ روحانی سے ہیں یکدل و یکجاں دونوں
ایک صورت ہی نظر آتے ہیں جیسکے دو عکس   اک حقیقت ہو کہ ہیں جنکے یہ عنواں دونوں

ہشیار رہو عشق کی مستی سے بچو   عزت ہو تو ہوس کی چیرہ دستی سے بچو
غارت گر ایماں ہیں بتانِ طناز   مومن ہے اگر تو بت پرستی سے بچو

اکبرالٰہ آبادی کی حسب ذیل نظم نواب محسن الملک کی فرمائش پہ کلکتہ کانفرنس کے لیے

لکھی گئی تھی،

مسلمانوں بتاؤ تو تمھیں اپنی خبر کچھ ہے تمھارے کیا مراحج رہ گئے اسکی خبر کچھ ہو

اگر کچھ ہو تو سوچو دل میں بھی اسکا اثر کچھ ہو حریفوں کی تعلّی باعث سوز جگر کچھ ہو

تمھیں معلوم ہے کچھ رہ گئی ہے کیا سے کیا ہو کر

کدھر آ نکلے ہو راہ ترقی سے جدا ہو کر (دس بند)، ۹۹ ب - ۱۰۰ آ)

شاد عظیم آبادی کی یہ مترنم نظم ورق ۱۰۰ پر نقل ہوئی ہے۔

ترے جور کا نہ کروں گلہ کٹے تیغ سے بھی اگر گلا کروں وجد میں یہی میں صدا کہ انا الشہید کم بلا

ہوا نور بار جو رخ ترا دل موج وجھک اعتلا چمک اٹھے دشت دجبل و در متشعشا متنزلا

مرا سر رہے جو سر نہاں مری نعش خاک میں ہو نہاں لب زخم سے یہ کروں نہاں کہ انا القتیل مرسلا

مجھے ذوق ہو جو وصل کا یہ نہیں عجول ہیں ساقیا کہ یہ جام آئے گا مجھ تلک تری بزم میں متداولا

ترے دم سے اسکا رواج ہے ترا ناز منفرد آج ہے ترے سر پہ حسن کا تاج ہے مترصعا متکللا

نہ کروں جو عجز و فروتنی تو خود اپنے ساتھ سے دشمنی فلذا وجدت من العدم وکذا سحقت من العلا

ہے نگاہ شوق میں متحد ترا کوچہ ہو کہ قتل گہ (احد) تری جلوہ گاہ . . . . جو منی ہے یہ وہ کربلا

ہمیں شاد حسن کا بست تھا ذرہی بیش آگیا الحذر تمہیں کہتے تھے کہ امید سے نہ زیادہ رکھو خلا ملا

حکیم عبدالہادی وفا رامپوری کی یہ غزل انتخاب ہوئی ہے۔ (۱۰۰ ب)

اثر اس تلخکامی کا رگ ذوق بیاں تک ہے جسے دل میں چھپایا تھا وہی کانٹا زباں تک ہے

ذرا بیٹھے رہو دشمن کی باتوں میں نہ آجانا ہماری سخت جانی بھی قریب امتحاں تک ہے

کہاں یہ حسن سادہ اور کہاں دست حنا گیں تکلف برطرف ہاں یہ مری چشم خوں فشاں تک ہے

چھری چلتی ہے دشنہ تیز ہے آزاد بیٹھے ہو یہ شغل بے نیازی غمزہ ہائے جانستاں تک ہے

انھیں ذروں کو چھانے جاؤ آخر برق نکلے گی | اسی بے پردگی سے سلسلۂ راز نہاں تک ہو
ابھی اک ذرۂ فیض ہوائے شوق ہے باقی | وہ شمع کشتہ ہوں جس کا دھواں بھی آسماں تک ہے
کوئی اپنی زباں میں بلبل ہندوستاں ہوگا | مرے مضمون کا چرچا دفا اقلیم جاں تک ہے

بقا کی یہ غزل اس بیاض میں شامل ہے۔

عارض یار نہیں زلف پریشاں کے تلے | ہے نہاں صبح وطن شام غریباں کے تلے
کیا کروں سینہ جو ناصح سے چھپائے نہ پھروں | داغ سو داغ ہیں کچھ میرے گریباں کے تلے
آہ کی برق جو سینے میں چمکتی دیکھی | طفل اشک آہی چھپے دامن مژگاں کے تلے
یوں نہاں داغ جگر اس سے میں رکھتا ہوں کہ جوں | باد سے شمع چھپا دے کوئی داماں کے تلے
نہیں ملنے کی بقا ہم کو بجز کنج مزار | جائے آسودگی اس گنبد گرداں کے تلے (۱۰۱ ب)

بیدار کی یہ غزل قابل توجہ ہے۔

جانیں مشتاقوں کی لب پر آئیاں | ہے ظالم تیری بے پروائیاں
صبح ہونے آئی رات آخر ہوئی | بس کہاں تک شوخیاں مچلائیاں
اس سمن اندام گل رخسار کی | جانفزا نکہت چرا کر لائیاں
سن کے یہ باد صبا نے باغ میں | گٹھڑیاں غنچوں کی سب کھلوائیاں
دیکھتے ہی اس کے شیدا ہو گیا | کیا ہوئیں بیدار وہ دانائیاں (ورق ۱۰۴ ا)

بیدار نے قائم کی غزل پر یہ مخمس لکھا تھا۔

میخانۂ عشق میں گزر کر | پی بادۂ شوق جام بھر کر
کتنا ہی ہوں چشم تر کر | بے شغل نہ زندگی بسر کر
گر اشک نہیں تو آہ بھر کر

ہان چھوڑکے شاہی و وزیری　　کرتے ہیں جو مرد ہیں، فقیری
بیکار ہے خواہشِ امیری　　دے طول امل نہ وقت پیری
شب تھوڑی ہے قصہ مختصر کر

صہبائے فنا جنھوں نے پی تھی　　تحقیق یہ بات انھوں نے کی تھی
آخر دیکھی جو کچھ سنی تھی　　کچھ طرفہ مرض یہ زندگی تھی
اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

غافل ہے تو حال سے ہمارے　　لوگ آئے ہیں دیکھنے کو سارے
آرایشِ حسن رکھ کنارے　　کیا دیکھے ہے آئینے کو پیارے
ایدھر بھی تو ایکدم نظر کر

اگلے گئے چھوڑ کر نہ اے دل　　کام آئے یہ بام و در نہ لے دل
بیدار کی ریس کر نہ اے دل　　تعمیر یہ گھر کی مر نہ اے دل
قائم کی طرح دلوں میں گھر کر　　ورق ۱۰۵ (ب)

سودا نے حزیں کے دو[۲] اشعار کا ترجمہ کیا ہے،　　(ق ۱۰۵ ب)

تیرے چو توزہ کرد کمانے بہ کمینے　　صیدے کہ نہ آسود زمانے بہ زمینے　　حزیں
ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں　　تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں　　سودا

سودا نے حزیں کے شعر پر بیت اضافہ کرکے مطلب کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا ہے۔

ظالم بیا ببیں کہ درین انتظار ما　　نرگس شگفتہ است بلوح مزار ما　　حزیں
ظالم تو آکے دیکھ مرے انتظار کو　　نرگس نے چھا لیا ہے ہمارے مزار کو　　سودا

سودا نے محض لفظی ترجمہ کر دیا ہے۔ اس ترجمے میں کوئی خاص بات نہیں، البتہ غالب دہلوی نے یہی مضمون اس بیت میں نہایت خوبصورتی سے باندھا ہے۔

دمید دانہ و بالید و آشیانگہ شد　　در انتظار ہما دانہ چید نمی ہنگر

عزیز لکھنوی کی منتخبہ اور غزلوں کے یہ غزل منتخب ہوئی ہے۔

یہ طاق ابرو یہ روئے انور — اللہ اکبر اللہ اکبر
یہ کبریائی یہ خود نمائی — یہ دلربائی ہے ختم تجھ پر
صد سینہ خوں شد از گریۂ ما — تاکہ تغافل اے ترک دلبر
ضبط شکایت آخر کہاں تک — اے بت خدا را اب آشتی کر
دارد خرابم ہر دم عزیزا — شوخے چینے ترک ستمگر (۱۰۰ب)

شمس الضحیٰ اخگر کی حسب ذیل غزل قابلِ ذکر ہے۔ (۱۰۰ا)

راحت کی ہیں تدبیریں کیا عقل ہے دیوانی — زندانیِ دنیا کو امید تن آسانی
دل ہے نہ جگر باقی حسرت ہو نہ ہو ارماں — کیا قہر کیا تو نے اے سوزشِ پنہانی
بدنام عبث کر دوں ایام عبث رسوا — ہر ظلم کے تم موجد ہر جور کے تم بانی
ہم داور محشر سے گر کہتے تو کیا کہتے — تھا وقت بہت تھوڑا اور قصہ تھا طولانی
کچھ سوچ سمجھ کر ہم صحرا سے پلٹ آئے — تنہائی میں گھبراتی گھر میں مری ویرانی
اپنا جسے ہم سمجھے تھا غیر سے وہ بد تر — اور دوست جسے جانا دشمن تھا وہ جانی
گر مر گیا اخگر بھی کیا رنج نہیں اس کا — اس عشق نے کر ڈالا کس کس کا لہو پانی (ذق ۱۰۸)

غالب کی حسب ذیل غزل غیر مطبوعہ قرار دی گئی ہے۔

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں — میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں
ہوں دردمند جبر ہو یا اختیار ہو — گہ نالۂ کشیدہ گہ اشک چکیدہ ہوں
نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ — میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں
ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھکو لاگ — نے دانۂ فتادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں
ہر گز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہہ — ہوں میں کلامِ نغز ولے ناشنیدہ ہوں

اہل ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل　　　　پر عاصیوں کے زمرے میں میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ　　　　ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

مولانا کرامت علی شہیدی لکھنوی کا پورا نعتیہ قصیدہ درج ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے۔ (ورق ۱۱)

رقم پیدا کیا کیا طرفہ بسم اللہ کی مد کا　　　　سر دیوان لکھا ہے میں نے مطلع نعت احمد کا (۱۱۱)

انیسؔ کا حسب ذیل منظومہ، غزل کے عنوان سے درج ہے،

وہ ہنستے آئے یہاں سو ہمیں رلا کے چلے　　　　نہ بیٹھے آپ مگر درد دل اٹھا کے چلے (۱۱۲ ب)

نواب محسن الملک کی وفات (۱۶ ستمبر ۱۹۰۷ء) پر مولانا امجد علی اشہری نے ایک مرثیہ لکھا تھا اس کو اختصاراً یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مدی کا شجر باغ سے سید کے قلم ہے　　　　جو ہاتھ ہے شجرف ہے یاقوت رقم ہے

جاں لب پہ ہے لب ہلتے ہیں مشتاق ارم ہے　　　　دنیائے دنی سے سفر ملک عدم ہے

بی بی ہے نہ بھائی نہ عزیز و رفقا ہیں

اس وقت کے جو حرف ہیں ڈھو نثر پا ہیں

رخ سرخ ہوا بادۂ احمر کے سبب سو　　　　ہے بے کسی و یاس گھڑی پاس ادب سے

اب قطع تعلق ہے دل جاہ طلب سے　　　　نزدیک قضا اسکے ہے، ڈور ہی سب سے

شملہ پہ ہے سر، سر پہ قضا طول مرض ہے

کالج سے تعلق نہ علی گڑھ سے غرض ہے

معلوم ہوا جب اسے اب پاس ہے رحلت　　　　اور پاس نہیں کوئی یہاں جز غم و حسرت

نب باغم و اندوہ بہ انداز محرمت　　　　سردار علی خاں سے کیا راز وصیت

فرمایا اٹھا دو کو مری نعش رواں ہو

واں دفن قریب پدر خلد مکاں ہو

---

۵ عبد العلی آسی کے قطعے میں ۱۲ - اکتوبر درج ہے [illegible]

لہراتا ہے تابوت پہ دامانِ شفاعت
پہلے سے ہو مہدی کے لیے داورِ جنت

خدام ہیں صف بستہ کھڑے باغم و حسرت
شملہ کے مسلماں ہیں کمربستۂ خدمت

اب ڈاک پہ تابوت رواں ہوتا ہے دم میں
ہستی کو لیے آتی ہے آغوشِ عدم میں

شملہ پہ گری برقِ مصیبت ہو ستم کی
بجلی نے خبر تار پہ بھیجی ہے عدم کی

امڈے ہوئے بادل ہیں گھٹا چھائی ہے غم کی
احباب میں کچھ حد نہیں اس رنج و الم کی

اردو کی صدا خاطرِ مغموم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

القصہ اٹاوہ کو ہوئی نعش روانہ
ہر ایک کا دل تیرِ الم کا تھا نشانہ

آئی تھی اجل ان کی مرض کا تھا بہانہ
تاریخ میں مذکور رہے گا یہ فسانہ

پہنچی جو علی گڈھ میں تو ایک جوش تھا سب کو
بھولے ہوئے اس جوش میں تھے رنج و تعب کو

مشتاق نے ظاہر کیا اشفاق کو اپنے
اشفاق نے بھی پایا مشتاق کو اپنے

ظاہر کیا احباب نے اخلاق کو اپنے
آراستہ حجرہ نے کیا طاق کو اپنے

سید کے برابر ہی بہم مدفن ہوا اس کا
گلزار علی گڈھ میں نشیمن ہوا اس کا...

لیکن نہ ہوا حسبِ وصیت یہ سرانجام
افسوس اٹاوہ نے نہ پایا شرف نا[م]

جو خاص محل تھا وہ ہوا وقفِ رہِ عام
خالی رہے مہدی کی ہر دھیرے کے در و بام

مہدی نے نہ جا روضۂ عباس میں پائی
بھائی کے قریب دفن ہوا آہ نہ بھائی

پہنچی وا ندور میں دو بھائی ہیں ان کے ہیں ایک امیر ایک علی وجیہ حسن کے
وہ دفن ہوئے پس از دفن تھے پہنچے دل تھام کے تا دیر رہے فاتحہ پڑھتے

اب فاتحہ پڑھنے کے سوا کچھ نہ رہا تھا
موقع بھی نہ اسکا تھا جو محسن نے کہا تھا

شمس العلما شبلی نعمانی و حالی پھر ہوں سخن آرائے مضامین خیالی
طوبیٰ میں لگا آئیں نئے رنگ کی ڈالی ہوں دنگ جسے دیکھ کے فردوس کے مالی

فردوس میں غل ہو نہیں دیکھی قلم ایسی
طوبیٰ کے ملتی نہیں شاخیں بہم ایسی

اے خلد علی گڑھ ترا آدم ہوا رخصت پنجاب ترا قبلۂ عالم ہوا رخصت
بنگال ترا مونس و ہمدم ہوا رخصت مدراس ترا مصلح اعظم ہوا رخصت

اے دہلی و لاہور عزادار بہم ہو
اے لکھنو و آگرہ مصروف الم ہو

جو سرو تھا اس باغ کا وہ آج رواں ہے گلزار علی باغ حسن وقف خزاں ہے
رنگینی رخ سرخی عارض سے عیاں ہے خوں قوم کے بچوں کے لیے جوش زناں ہے

گلگونہ ملا چہرے پہ ہے رنگ شفق کا
ہوتا ہے گماں چہرے پہ سونے کے طبق کا

پیدا ہوئی تہذیب کی جب روشنی نو اس کے رخ روشن سے ملی قوم کو ضو
پھیلا وہ در و دیوار پہ اس ماہ کا پرتو اک شمع فسردہ نے نئی طرح سے دی لو

سید کا معاون رہا وہ شادی و غم میں

وہ آپ نظیر اپنا تھا احسان و کرم میں

ای اشہری سوختہ جاں ضبط فغاں کر   جو ہونا تھا وہ ہو گیا، اب ختم بیاں کر
مرحوم کے حق میں طلب قصر جناں کر   خاموشی تقریر کو اب قفل دہاں کر

جو روز گیا پھر کے وہ اب دن نہیں آتا
پھر لوٹ کے اب قوم کا محسن نہیں آتا (۱۱۴ - ۱۱۵ ا)

نواب محسن الملک کی وفات پر مولانا عبدالعلی آسی مدراسی نے ایک طویل تاریخی مرثیہ ۴۴ بند پر مشتمل رامپور میں لکھا تھا۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر چند بند ناظرین کی خدمت میں پیش ہیں۔ (ورق ۱۱۵ ب - ۱۱۹ ب)

ہائے دنیا نہیں ہے جائے ثبات   وائے اس کی حیات میں ہے ممات
عیش دنیائے دوں ہے دو دن کا   وہ بھی یا صبح شام یا دن رات

ایُّ عیشٍ ہنا و عیشٌ ألیش
انّما العیشُ عیشۃ الجنّات

نفس کی شہوتوں سے باز آؤ   حرص و آز و ہوا ہیں سب شہوات
جو ہیں دنیا کی سرزمیں پر شہر   ہیں وہ چرخ کہن کے نیرجات

فَا ترکوا کُلّ ما بہ شرٌّ
بل خُذوا اجلّ ما بہ خیرات

جو ہیں دنیا میں جی وہ میت ہیں   ہیں سب احیا حقیقتاً اموات
مگر اللہ حیّ اور قیوم   ہے اسی کی ہمیشہ باقی ذات

أیُّ حیٍّ حیاتہ تخلدُ
أیُّ نفسٍ مماتہا لم یات

ایک دن جائے گی بدن سے روح — ایک دن آئے گی اسے سکرات
ایسے جینے پر مرتے ہیں افسوس — ایسے مرنے پہ جیتے ہیں ہیہات

نَهُوَّ النفس اَیُّہَا الخُلّان
بحفاتِ النفوس والنسمات

جو ہیں انجام بین و دور اندیش — موت کو یاد کرتے ہیں دن رات
بس انھیں کے لیے نبی نے کہا — ان پہ نازل ہو افضل الصلوات

وھو ہذا الحدیث موزوناً
اکثروا ذکر ہادم اللذّاتِ

کیا ہی بہتر ہے پند میں یہ حدیث — بہترین مواعظ و خطبات
غافلو اب تو چونک جاؤ ذرا — رکھو ہر دم زبان پہ ذکر ممات

وَاعْلَمُوا اَنَّکُمْ من الموتیٰ
مَا لِکُلٍّ وممکن بالذات

موت جانو قبا مت صغرا — قبر کو سمجھو عرصہ عرصات
دم میں جو دم ہے وہ غنیمت ہے — دم کو اک دم کا بھی نہیں ہے ثبات

اِنَّ اَنْفَاسَکُمْ مصیرتی رُ
اِنَّہَا بالعداد معدودات

فانی ہوتے ہیں دم بدم یہ دم — دھوپ سے جیسے شبنمی قطرات
ساری دنیا کی زندگی کا شمار — دو ہے یا پانچ دن ہے یا ہے رات

کُلَّ یوم تَمُرُّ اَعْمَارُنَا
من مرورِ الشہور والسنوات

غفلت اک روز کی نہیں اچھی — موت ہر دم لگا رہی ہے گھات
اس سے بازی نہ پا سکو گے تم — بلکہ دے گی یہ موت اک دن مات

ایّها الغافلون قد غمتم
انقذوا انفسکم من الغفلات

سمجھو ہر دم کو دا پسیں ہر دم — کیا بھروسا ہو دم کا اے حضرات
دیکھو دم بھر میں سرخ بادہ سے — محسن الملک چل بسے ہیہات

وابتوراہُ ثُمَّ واسفاہ
ارہ قال الاناس والجماعات

چار شنبہ کو دن کے پانچ بجے — ہوا لبریز ان کا جام حیات
قبل مغرب ہوا غروب وہ شمس — مغرب کوہ شملہ میں ہیہات

لم یوخرہ موتہ اجلاً
لم یزد ساعۃً من الساعات

آہ افسوس صد ہزار افسوس — نہیں ممکن اعادۂ مافات
غم کی ظلمت سے رات تھا وہ دن — اور قیامت کے دن کی تھی وہ رات

یومہٗ کان لیلۃً لیلاً
لیلہٗ کان ظلمۃ الحسرات

انگریزی تھی سولھویں تاریخ — ماہ اکتوبر اور سن تھا سات
ماہ رمضان کی ساتویں تاریخ — بست و پنجم سنین ہجریات

ہو خیر الشہور فی الاشہر
ہی خیر السنین فی السنوات

طاق تاریخ اور سن بھی طاق اور بھی طاق ..... طاعات
ہفتہ بھی طاق اور دن بھی طاق اور بہی طاق جملہ معدودات

اِنَّ سَابَ الورای یحب الوتر
اَنَّہٗ حسنٌ محسن الحسنات

جب علی گڑھ میں نعش لائی گئی ہوئے حاضر وہاں کے سب حضرات
بعد جمعہ قریب سرسید دفن ان کو کیا بصد حسرات

فہما سید ان قد جمعا
بعد موت کما ہما بحیات

دس برس، بعد سید احمد کے چھلکا مہدی علی کا جام حیات
غفر کہ ہے ان کا سال وصال یغفر لہ ہے ان کا سال وفات
۱۳۱۵ھ ۱۳۲۵ھ

فہما فی الحیات قد غفرا
وہما یغفران فی العرصات

ایک جا متحد حیات میں تھے اسے کہتے ہیں اتحاد حیات
اب ہوئے متفق ممات میں بھی اسے کہتے ہیں اتفاق ممات

دُفنا فی احاطۃ الکالج
من محاط المحیط للتبرکات

آہ کرتے تھے سب بڑے چھوٹے روتے تھے سب ذکور و مستورات
کوئی کہتا تھا ہائے صد افسوس کوئی کہتا تھا وائی صد ہیہات

لہف الناس کلہم اسفاً
وجرت من عیونہم عبرات

ان کے مرنے سے مرگئے طلبات کیا کہوں ان کے دلوں پہ ہیں صدمات
کون اب ان کا محسن و مشفق کون اب انکا مرجع حاجات

ایُّ من مثلہ قد اعطا ہم
کُلّ وقتٍ من الضروریات

اک غریب الوطن تھا طالب علم تھے انھیں پہ سب اس کے اخراجات
مگر اخفا سے اس کو دیتے تھے اس کو کہتے ہیں بے ریا خدمات...

کُلّ شہر بغیر اظہار
کان یُعطیہ عشر رُبیاتٌ

ہیں کمالات بیشمار ان کے حد سے زاید ہیں ان کی تعریفات
ان کے اوصاف سے ہے ناطقہ لال بہتر اس جا ہے نطق سے اسکات

خرستُ عن بیانہ لُسنٌ
عجزت عن مدیحہ اثبات

الغرض جب زبان و دل نے کہا ذکر تاریخ و فکر راہ نجات
پوچھا رضوان سے حسن کو آسی نے کہا رو کے جس سے سال وفات

رضی اللہ عنہ احسانًا
۱۳۲۵
جاء ہذا الدعاء من اُرخات

روز رحلت تھا ہفتیں رمضان رحلت ان کی ہوئی سوئے جنات
کیونکہ ماہ صیام میں ہر روز وا تھے در ہای روضۂ نعمات

خلد اقال ارخہ رضوان
سابقا کان داخل الجنات
۱۳۲۵

محسن الملک کا تھا محسن وصف — محسن الملک کی تھی محسن ذات
سال محسن بھی ایسا محسن ہو — جس سے محسن کے ہوں عیاں حسنات

قلتُ من وجہ حق ارخا

محسن الملک مات بالحسنات

پھر ہوئی دل میں فکر اس سن کی — جس سے ظاہر ہوں عیسوی سنوات
صوری و معنوی بھی ہوتا ریخ — کہ یہ صنعت ہے احسن الصنعات

محسن الملک مات فی الرمضان

آہ ارخت ارخ من ہومات

چونکہ ہیں چار حرف محسن میں — اس لیے بھی آئے چار سال وفات
ان پہ نازل ہو رحمت یزداں — ابر غفران سے اُن پہ ہو برسات

رب ادخلہٗ جنتہ الماوی

خالصا فی القصور والغرفات

یا رب آسی کی یہ دعا ہو قبول — بطفیل شفیع جملہ عصات
تو ہی سب کی دعائیں سنتا ہے — تو ہی سب کا ہے مرجع دعوات

رب احسن الیہ احسانا

انت یا لحسن محسن الحسنات (۱۱۹ ب)

اکبر الہ آبادی کی وہ مشہور غزل جو اکثر گائی جاتی ہے، اس بیاض میں پوری نقل ہے، اس کا مطلع یہ ہے۔

ہنگامہ کیوں ہے برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے — ڈاکا تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے

علامہ شبلی نعمانی کی متعدد تاریخی نظمیں درج ہیں منجملہ ان کے یہ نظم بھی ہے۔

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر ۔۔۔ مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا

قرابت راجگان ہند سے اکبر نے جب چاہی ۔۔۔ کہ یہ رشتہ عروس کشور آرائی کا زیور تھا الخ

(ورق ۱۲۶ الف)

شہدائے دہلی کی یاد میں بہ سلسلہ واقعات ماہ اپریل ۱۹ء

بہت سے ہم نے دیکھے انقلاب آسماں برسوں ۔۔۔ رہی صرف سموم جاں ستاں یہ شمع جاں برسوں

قیامت خیز ہنگاموں کی کتنی بزم دنیا میں ۔۔۔ سنی ہے گوش عبرت آشنا نے داستاں برسوں

ہزاروں عیش گاہیں ہم نے دیکھیں صرف تاراجی ۔۔۔ کہ جن کی یاد میں رویا کئے اہل جہاں برسوں

مگر اس عہد نو میں آج وہ انصاف دیکھا ہے ۔۔۔ کہ پچھتائے گی خود اس پر بلائے ناگہاں برسوں

عجب کیا ہے جو کانپی ہیبت ہنگامہ سن کر ۔۔۔ وہ روح نادر و تیمور زیر خاکداں برسوں

شہیدان وطن کا جان دے دینا صداقت پر ۔۔۔ رہے گی یاد اے دہلی تجھے یہ داستاں برسوں

(ورق ۱۲۷)

کیفی کی یہ نظم ۱۹۲۰ء کی ہے (ملحضہ)

جب تک کہ یہ تار تھا نفس کا ۔۔۔ کھٹکا رہا دام اور قفس کا

جب آگیا وقت سر فروشی ۔۔۔ پردہ ہوا فاش بوالہوس کا

جب دار پہ آگیا تو حق کہ ۔۔۔ اب وقت نہیں ہے پیش و پس کا

آنا ہو تو راہ دیکھ لینا ۔۔۔ رہرو سے یہ شور ہے جرس کا

ہر سانس پہ ہے نگاہ ان کی ۔۔۔ مرنا بھی نہیں ہے اپنے بس کا

گاندھی کا پیام سننے والو ۔۔۔ اب توڑ دو طلسم پیش و پس کا

کیسے مسلم کہاں کے ہندو ۔۔۔ ہے ایک ہی تار ہر نفس کا

گھٹتا رہے جوش فرقہ بندی ۔۔۔ بڑھتا رہے زور کانگرس کا

کچھ پوچھ نہ حال زار کیفی ... مہمان ہے چند ہی نفس کا (ورق ۱۲۸-۲)

اقبال کے ترانے پر کسی شاعر تیغ تخلص نے تضمین کی ہے، پہلا بند یہ ہے۔

سرشار حریت ہے ہر نوجواں ہمارا ... یاد خیر اب آیا اگلا بیاں ہمارا

اسلام نے کیا ہے پر گراں ہمارا ... دعوائی ہے اس زمیں پہ آسماں ہمارا

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا (ورق ۱۲۹)

فریاد امت عاصی کے نام سے ۱۹۲۰ء میں سیماب اکبر آبادی نے جو طویل مسدس لکھا تھا وہ یہاں درج ہے، اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

باش اے کشمکش غم میں مٹا جاتا ہوں ... میں ترے کاہش بیہم سے گھلا جاتا ہوں

تا در سید لولاک لما جاتا ہوں ... لے کے دربار رسالت میں گلا جاتا ہوں

شنوا بھی نہ سنے نا شنوا بھی نہ سنے

میری فریاد کے لفظوں کو خدا بھی نہ سنے (ورق ۱۳۰-۱)

اس کے فوراً بعد صفی لکھنوی کی مشہور نظم ہے، سنہ ۱۹۲۰ء ہی میں نظم ہوئی تھی

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے ... مشرق کا سرا اٹھکر مغرب سے ملا دینگے
(ورق ۱۳۲)

مولانا آزاد سبحانی بڑے مجاہد و سرفروش تھے، ان کی شاعری کا نمونہ اس بیاض میں درج ہے، قارئین کرام کی خدمت میں اس کو پیش کیا جاتا ہے۔

زلف سیہ کھلی ہوئی اس پہ یہ مسکراہٹیں ... برق جہندہ ہے تپاں پہلوے کوہسار میں

چاندنی رات باغ گل مے اور کنار آب جو ... دیدہ انتظار ہیں آپ کے انتظار میں

چاند تھا آسمان پر وہ تھے زمیں پہ بے نقاب ... نور نے لے لئے تھے رات دونوں جہاں کنار میں

حاجت چنگ و نے نہیں خودی تو یاں ساز جو　　سیکڑوں نغمے ہیں ہر بن مو کے تار میں
بزم سرود و رقص میں ساز کچھ اس طرح بجا　　روح ازل کو وجد تھا محفل ساز گار میں
پھونک دیا زمانے کو اک مرے سوز قلب نے　　آگ جہاں بھڑک گئی چھوٹنے سے اس شرار میں
لاکھ گلہ سہی مگر توڑ سکو رف غلط　　زور اس غضب کا ہے جس جفا شعار میں
روئے نگار چھپ گیا کاکل مشکبار میں

اس کے فوراً بعد اقبال کے ترانے پر تضمین ہے بجز بی ممکن ہے کہ یہ بھی مولانا ہی کی ہو چند بیت ہدیۂ ناظرین ہیں۔

مومن ہیں اس لئے ہے باغ جناں ہمارا　　دنیا ہے ساتھ ہر دم دور زماں ہمارا
یعنی زمیں ہماری اور آسماں ہمارا　　چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اسلام کی صداقت سینوں میں ہے ہمارے　　ایمان کی محبت سینوں میں ہے ہمارے
حب النبی ودیعت سینوں میں ہے ہمارے　　توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

سوزِ اذانِ مغرب رجزِ وغا ہے گویا　　صف بندیٔ جماعت طرزِ غزا ہے گویا
آئینِ شرع ساقی اک رہنما ہے گویا　　اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

آخری نظم ناتمام کا تعلق دیوبند کے کسی حادثے سے ہے، اس میں صرف پانچ شعر ہیں جو اخبار اجتماع سہارنپور ۱۷ نومبر ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئے تھے، پھر مدینہ بجنور میں اور وہیں سے اس بیاض میں نقل ہوئے، وہ شعر یہ ہیں:

آج احساس تاثر سے جگر زخمی ہے　　چاک ہے دامنِ دل تارِ نظر زخمی ہے

جو کس شان سے اٹھتا تھا وہ سرزخمی ہے　　آج اسلام کا ہر فرد و بشر زخمی ہے
اہانت و بہی و ندامت کا نشانہ ہوں میں　　آج نیرنگ زمانہ سے تماشا ہوں میں
آج افسردہ نظر آتے ہیں حفظ الرحمان　　ہاں وہی شیر نہ چھوڑا کبھی جس نے میدان
آج حسین احمد و آزاد کا آنسو ہوں میں　　کسی ناکام و فنا کا ہی پہلو ہوں میں

آخر میں املا کی چند خصوصیات کے ذکر پر یہ گفتگو ختم کی جاتی ہے،

اس بیاض میں دو تین طرح کے قلم و سیاہی کا استعمال ہوا ہے، اکثر خط ریزہ ہے، یاے مجہول کے استعمال کا مکمل اہتمام نہیں ہوا، لفظوں کو ملا کر رکھنے کا عمومی میلان ہے، (ی) جو لفظ کے شروع میں آتی ہے، اس میں نقطوں کے نہ لانے سے لفظ کی قرأت دشوار ہو گئی ہے، بھ۔ پھ۔ تھ۔ کھ وغیرہ کے بجاے بہ، پہ، تہ، کہ وغیرہ آئے ہیں، تماشا کا املا تماشہ بھی ملتا ہے، "یا اللہ" کی طرح کے الفاظ میں ایک "الف" زائد ہے یہاں تک کہ عربی عبارت میں ایسی ہی صورت نظر آتی ہے، اگر رنا میں "ز" کا استعمال ہوا ہے،

خلاصۂ کلام یہ کہ اگرچہ یہ بیاض بہت حال کی ہے، اور اس لحاظ سے بہت اہم نہیں سمجھی جا سکتی، لیکن اس کی اہمیت اس میں ہے کہ اس کے ذریعے بعض نیا کلام دستیاب ہو جاتا ہے، اور اسی اعتبار سے بیاضیں اہم ماخذ کا کام دیتی ہیں، بیاض کے مرتب خود صاحبِ علم و فضل تھے، چنانچہ یہ بیاض ان کی شخصیت کے اس پہلو پر پوری طرح روشنی ڈالتی ہے،

وفیات

آہ! جناب نیاز احمد صدیقی

اسی مہینہ یعنی مارچ ۱۹۸۳ء میں جناب نیاز احمد صدیقی تقریباً ۸۴ سال کی عمر میں اﷲ
پیارے ہوئے، وہ کوئی ادیب، شاعر، نقاد اور مصنف نہ تھے، شروع سے آخر تک انگریزی ز
کے قابل قدر استاد رہے، وطن مریاہو ضلع جونپور تھا، اردو زبان کے مایۂ ناز ادیب اور نقا
جناب رشید احمد صدیقی کے چھوٹے بھائی تھے، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے ایم اے ایل ایل
اور بی ٹی کی ڈگریاں حاصل کرکے شبلی اسکول اعظم گڈھ میں انگریزی کے استاد ہوئے، پھر جب
اسکول انٹر اور ڈگری کالج بنا، تو اس کے انگریزی کے لکچرر مقرر کئے گئے، آخر میں محمد حسن انٹر کالج
کے پرنسپل بنے، وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں کچھ دنوں انگریزی پڑھا
رہے، یہی ان کی زندگی کی مختصر روداد ہے، مگر وہ ان چند شریف انسانوں میں تھے، جو حدیث
سوز و ساز زندگی کے حامل، اخوت کے بیان اور محبت کی زبان بن کر اپنے گھر والوں، دوستوں
اور معاصروں کے ساتھ رہے، اپنی اس طویل زندگی کے ۱۹ برس دار المصنفین کے احاطہ میں
گذارے، اور اس کے شب و روز کو پرکیف بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، کوئی مسئلہ
ہوتا، کوئی نازک وقت آتا، یا کوئی تقریب ہوتی، تو ہر موقع پر اپنے مخلصانہ، مشفقانہ اور ناصحانہ
مشوروں سے سب کی دلداری، دلنوازی اور رہنمائی کرتے، وہ یہاں کی زندگی کے جزو لاینفک
ہو گئے تھے، اپنے شریفانہ برتاؤ، اخلاقی بلندی اور روزمرہ کی زندگی کے لین دین کی طہارت
صاف باطنی میں قرون اولیٰ کی روایت کو تازہ کرتے، ان کی پاک اور طاہر زندگی پر اس وقت
رشک آتا جب دار المصنفین کے احاطہ کے اندر بعض لوگوں کی زبان سے یہ سننے میں آتا کہ ایک صحا

کی زندگی ایسی ہی رہی ہوگی،

اس احاطہ میں کوئی بھی بیمار پڑ جاتا تو اس کی تیمارداری کرنے میں مریض پر احسان کیا کرتے بلکہ مریض کے احسان کے بار سے دبے جاتے، کہ اس نے ان کو خدمت کرنے کا موقع دیا، اس کیلئے رات کو چپکے چپکے جاگتے رہتے، اگر انہیں اس کی آنکھ کھل جانے کا ذرا بھی اندیشہ ہوتا تو آنکھ موند کر ایسا سو جاتے کہ کہیں اس کو اس خیال سے تکلیف نہ ہو کہ وہ اس کے لئے جاگ رہے ہیں، وہ دوستوں کے لئے تحفے لاتے اور ان کے بستر کے سرہانے میں اس طرح رکھ دیتے کہ پتہ چلانا مشکل ہو جاتا کہ یہ کس نے لاکر رکھا ہے، تہجد کی نمازیں برابر پڑھتے رہے، اگر گھر کے لوگ یا ان کا کوئی ہمراز یا ہمدم ان کو رات کے آخری پہر میں تہجد پڑھتے کبھی دیکھ لیتا تو وہ سوگوار ہو جاتے کہ ان کی عفت مآبی عصمت دری اور دل کی پاکی پر حرف آ گیا، باتیں کرتے تو نرم دم گفتگو کی اعلیٰ مثال پیش کرتے، دوستوں کی صحبت میں بیٹھتے تو ان کی ہر ادا دلنواز دلفریب نظر آتی، رشتہ داروں کے ساتھ ہوتے تو ان کی ہر نگاہ معلوم ہوتی، مشورے دیتے تو ان کا ہر مشورہ کارآفریں، کارکشا، اور کارساز ہوتا، وہ اپنے بڑے بھائی رشید احمد صدیقی کے پاس مودب بیٹھتے تو جناب رشید احمد صدیقی محسوس کرتے کہ ان کے سامنے محبت واخلاص کی ایک جوئے شیر بہہ رہی ہے،

شبلی اسکول کو انٹر کالج اور ڈگری کالج بنانے میں اس کے پرنسپل جناب بشیر احمد صدیقی مرحوم کی ہم نفسی، دمسازی اور غمخواری کا جو حق ادا کیا، وہ اس زمانہ کی ایک اعلیٰ مثال تھی، پھر جونپور کے محمد حسن انٹر کالج کو حسن ظاہری اور معنوی خوبیوں سے اپنے رفقائے کار سے مل کر آراستہ کیا، وہ اس کی تاریخ کا زریں باب رہے گا، کوئی طالب علم بھی ان کی خشمگیں آنکھوں اور قہرناک باتوں کا شاکی نہیں ہوا، طلبہ اپنی ناروا اور نازیبا حرکتوں کے بعد ان سے ملتے تو ان کو اپنے سامنے جلیل اور ذلیل پاتے، وہ جھک کر سربلند ہوتا اور مفتوح ہو کر فاتح بنا جاتے تھے،

وہ جا چکے، مگر ایک شفیق شوہر، ایک دلنواز باپ، ایک جان نثار بھائی، ایک چہیتے بزرگ، ایک بے مثال استاد اور ایک انتہائی شریف النفس دوست کا اعلیٰ نمونہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے، خدا جانے اپنی کن کن باتوں کے عطر مجموعہ سے اپنی یادوں کی شامہ نوازی کرتے رہیں گے۔ اللہ تبارک تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کریں (آمین) "ص ۔ ع"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ،

نام مقام اشاعت	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	سید اقبال احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ :	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	" " "
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دارالمصنفین اعظم گڈھ
اڈیٹر	سید صباح الدین عبدالرحمٰن
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دارالمصنفین اعظم گڈھ
نام وپتہ مالک رسالہ	" " " "

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح و سچ ہیں

سید اقبال احمد

مطبوعات جدیدہ

شیعہ اور قرآن معروف بہ تنبیہ الحائرین | مرتبہ مولانا عبدالشکور فاروقیؒ، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات ۱۵۵، مجلد مع گردپوش قیمت بارہ روپے،

پتہ (۱) مکتبہ فاروقیہ ۲۲۰/۵۰ دریائی ٹولہ لکھنؤ (۲) مکتبہ البدر دارالعلوم فاروقیہ کاکوری لکھنؤ

مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنویؒ ممتاز علما میں تھے، ردشیعیت ان کا خاص مشن تھا، یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی ہے، جو پنجاب کے ایک شیعی عالم مولانا سید علی حائری کے جواب میں لکھی گئی تھی، اور پہلے قسط وار رسالہ النجم میں شائع ہوئی تھی پھر اس کے کتابی صورت میں متعدد اڈیشن چھپے، یہ نیا اڈیشن ہے، اس میں شیعوں کے متعدد اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے لیکن اس کی زیادہ اہم بحثیں دو ہیں، ایک تو یہ کہ شیعوں کے نزدیک قرآن مجید میں ہر نوعیت کی تحریف ہوئی ہے اسلئے اس پر نہ ان کا ایمان ہے اور نہ ہو سکتا ہے، دوسری بحث میں ان کے اس الزام کی تردید ہے، کہ اہل سنت کے یہاں بھی تحریف قرآن کا عقیدہ موجود ہے، مگر شیعہ محققین اپنی جانب تحریف قرآن کی نسبت تسلیم نہیں کرتے، یہ ان کے بعض غالی فرقوں کا ضرور عقیدہ تھا، مگر اس زمانہ کے اکثر شیعوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسی بنا پر عام اہل سنت ان کی تکفیر نہیں کرتے بلکہ انھیں بھی امت کا ایک فرقہ سمجھتے ہیں اور فرق ومذاہب کی کتابوں میں بھی ان کا اسلامی فرقہ ہی کی حیثیت سے تذکرہ کیا گیا ہے، سنیوں اور شیعوں کا بڑا اور بنیادی اختلاف مسئلہ امامت وخلافت میں بتایا جاتا ہو نہ کہ تحریف قرآن کے عقیدہ میں، اس سلسلہ میں مولانا نے

جو روایتیں نقل کی ہیں، وہ وضعی معلوم ہوتی ہیں ثانیاً جمہور اور محققین علمائے شیعہ ان سے برأت ظاہر کرتے ہیں اب اس قسم کی مناظرانہ بحث کا زمانہ نہیں رہا کیونکہ اس سے خواہ مخواہ تلخی پیدا ہوتی ہے، اس لئے دونوں فرقوں کو موجودہ حالات کے پیش نظر امت میں افتراق و انتشار پیدا کرنے والی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

سلطان شیر شاہ سوری مرتبہ جناب حسن آرزو صاحب تقطیع متوسط کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۳۲۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت پندرہ روپے۔ پتے (۱) مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ (۲) دانش کدہ، دریاپور، پٹنہ ۴۔

شیر شاہ سوری ایک معمولی جاگیر دار کا بیٹا اور ادنیٰ سپاہی تھا لیکن اپنی ذہانت و قابلیت کی بدولت ہندوستان کے تخت و تاج کا مالک بن گیا اس کی زندگی بڑی ہنگامہ خیز اور کارنامے عظیم الشان تھے، مگر ابھی تک اردو میں اس کی زندگی اور کارناموں کے متعلق کوئی مستند کتاب نہیں لکھی گئی تھی انگریزی میں کالکارنجن قانون گو کی کتاب ضرور اہم خیال کی جاتی ہے، مگر زیر نظر کتاب میں اسکے بعض کمی کسر کو بھی دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں سوری خاندان کی ہندوستان میں آمد، شیر شاہ کے آباؤ اجداد کا تذکرہ اور اس کی پیدائش اور دوسرے مشاغل کا ذکر ہے، دوسرے اور تیسرے باب میں شیر شاہ کی مختلف سرگرمیوں ہمایوں سے آویزش، اس کے سلطان دہلی ہونے اور بعض فتوحات وغیرہ کا تذکرہ ہے، چوتھے باب میں اس کی وفات و تدفین کا ذکر ہے، پانچواں باب اس کے تعمیراتی کارناموں کے لیے خاص ہے، اس میں اس کے اور اس کے دور کے دوسرے مقابر اور کتبوں کے متعلق معلومات کے علاوہ شیر شاہی سڑکوں، سکوں اور نظم مملکت پر بھی بحث کی گئی ہے، آخر میں شیر شاہ کے فرزند سلیم شاہ سوری کے ہشت سالہ دور حکومت کا تذکرہ اور شیر شاہ

کے شجرے اور دو اہم کتبوں کا عکس دیا گیا ہے، لائق مصنف نے یہ کتاب محنت و جستجو اور خوش سلیقگی سے مرتب کی ہے، ان کا ادبی ذوق بھی اچھا ہے، اس لئے اس قدر خشک موضوع کے باوجود تحریر کی رعنائی و شگفتگی میں فرق نہیں آیا ہے، اس کا اندازہ ابواب کے عنوانات سے بھی ہوتا ہے، مگر صے پر کتابت کی غلطی سے مآخذ کو مواخذ لکھا گیا ہے، صلا۱۱ پر ایک جگہ سلیم شاہ المعروف بہ اسلام شاہ اور دوسری جگہ اسلام شاہ المعروف بہ سلیم شاہ لکھا ہے۔ صلا۹ پر شیر شاہ کے روضہ کے کتبہ کی مندرجہ ذیل عبارت بنی فی سنۃ خمسین و السبع و تسعمائۃ میں عربیت کے قاعدوں کی دو غلطیاں ہیں، اول یہ کہ السبع کے بجائے صرف سبع (بغیر الف لام) ہونا چاہئے تھا، دوسرے یہ کہ سبع کو خمسین کے بعد نہیں اس سے پہلے آنا چاہئے تھا، اسی طرح صلا۱۲۶ کے کتبہ میں بنی کردہ پیارہ اسماعیلؒ میں پیارہ غلط ہے، صحیح بندہ ہوگا، آگے سہور کے بجائے شہور ہونا چاہئے، اور سنہ ہیں بھی غلط ہے۔ کیونکہ عربی میں ۷۶ کے لیے ست و اربعین آتا ہے،

منشی دیانرائن نگم :- مرتبہ جناب سری نرائن نگم صاحب تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۰۴ قیمت ۵۰ روپیہ پتہ سری نرائن نگم ۱۰۱ چلکبست روڈ لکھنؤ

منشی دیانرائن نگم کو اردو سے والہانہ عشق تھا، ان کے رسالہ زمانہ نے اردو صحافت کا معیار بلند کرنے کے علاوہ ملک و قوم کی اخلاقی، ذہنی اور دماغی تربیت بھی کی، وہ ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار بھی تھا، اور اس کے صفحات بلا امتیاز مذہب و ملت ہندو مسلمان اہل قلم کے لیے وقف رہتے تھے، گذشتہ برس منشی جی کے صد سالہ یوم پیدائش کے جشن کے موقع پر ان کے فرزندوں نے یہ یادگار صحیفہ شائع کیا ہے، شروع میں عام دستور کے مطابق وزراء و ارکانِ حکومت کے علاوہ زمانہ کی سلور جوبلی کے موقع پر موصول ہونے والے پیغام درج ہیں، پھر رسالہ زمانہ سے منشی جی کے معاصرین کے مضامین اور تحریریں نقل کی گئی ہیں جن میں

منشی جی اور ان کے ماہنامہ کے خدمات علم و ادب کا اعتراف کیا گیا ہے، تیسرا حصہ نگم صاحب کی نگارشات سے مزین ہے، اور چوتھا حصہ زمانہ کے مضامین، افسانوں اور نظموں کے انتخاب پر مشتمل ہے، یہ دونوں حصے پڑھنے کے لائق ہیں، آخر میں منشی دیا نرائن نگم اور رسالہ زمانہ کے متعلق موجودہ اہل قلم کے مضامین و تاثرات شائع کئے گئے ہیں گو منشی جی کی بے لوث اور عظیم الشان خدمات اس سے زیادہ خراج تحسین کی مستحق تھیں تاہم یہ نمبر بھی غنیمت ہے منشی جی کی قدردانی کا خدا خواہ حق تو اسی وقت ادا ہوگا جب ان کی محبوب زبان کے ساتھ حکومت فراخدلی کا رویہ اختیار کرے اور ان کے اخلاف اس دیا کو بجھنے نہ دیں جو دیا نرائن نے جلایا تھا، یہ دیکھ کر حیرت اور عبرت ہوئی کہ اردو کے اس محسن و شیدائی کی یاد میں شائع ہونے والے مجلہ کے لیے نائب صدر جمہوریہ ہند جناب محمد ہدایت اللہ اور یو۔ پی کے وزیر تعمیرات عامہ و قومی یکجہتی جناب عمار رضوی نے انگریزی اور ہندی میں اپنے پیغام بھیجے جن کے اردو ترجمے شائع ہوئے مجلہ کی قیمت بہت زیادہ ہے۔

ایک سویلین کی سرگذشت :۔ مرتبہ جناب سید اطہر حسین صاحب متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۴ مجلد مع گرد پوش قیمت ۲۰ روپئے پتے (۱) دانش محل امین آباد پارک لکھنؤ (۲) سید اطہر حسین ائی، اے، ایس، سول لائن، فیض آباد۔

جناب سید اطہر حسین ریٹائرڈ ائی، اے، ایس کو اچھا علمی و ادبی ذوق ہے اور انکا دینی و مذہبی مطالعہ بھی وسیع ہے، سرکاری ملازمت کے زمانہ میں بھی انھوں نے تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھا اور اب اردو اور انگریزی میں درجنوں چھوٹی بڑی کتابیں اور کئی شعری مجموعے مرتب کرکے وہ اچھے اہل قلم اور با وقار شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے ہیں، یہ کتاب انکی زندگی کی سرگذشت ہے، شروع کے تین ابواب میں وطن، خاندان، ابتدائی و اعلیٰ تعلیم و نیز ہوسٹل کی زندگی کے دلچسپ واقعات درج ہیں، چوتھے باب سے اپنی ملازمت کی داستان شروع کی ہے

جو آخر تک چلی گئی ہے، ملازمت کے زمانہ میں وہ جہاں رہے جن لوگوں سے ان کا سابقہ رہا اور جو واقعات پیش آئے نیز خود انکی زندگی جس نشیب و فراز سے گذری ان سب کا مفصل تذکرہ کیا ہے ان کو سیر و شکار سے بڑی دلچسپی تھی، ہر باب میں اس کا ذکر بھی ذوق و شوق سے کیا ہے، اطہر صاحب تقریباً سات برس تک مرکزی حکومت سے بھی متعلق رہے، اگیارہویں باب میں اس کی داستان سنائی ہے، ملازمت کے سلسلہ میں انھیں مصر و امریکہ جانے کا اتفاق بھی ہوا دونوں جگہ کے سفر کی دلچسپ روداد تحریر کی ہے مصر کے سفر میں عمرہ اور روضہ اطہر کی سعادت بھی نصیب ہوئی اس کا والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے، وہ ایک لائق کارگذار اور فرض شناس افسر تھے، اس کتاب سے ان خوبیوں اور انکی خوش انتظامی کا پورا اندازہ ہوتا ہے اس حیثیت سے یہ موثر اور سبق آموز ہے لیکن کتابت و طباعت کی بے شمار غلطیاں ہیں، جیسے ترجیح، باقاعدہ، باقاعدگی، جاء، زیتی، مرمت، زراعت، ذخیرہ، ضائقہ، تصاویریں، سیدھے سادے، شہر کی رؤسا، میرے رپورٹ، مسلمانوں کا اقتصادی حالت، باب ہفتم و ہم وغیرہ،

اب جن کے دیکھنے کو ..... ۱- از، جناب انیس قدوائی صاحبہ، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۰، قیمت بارہ روپے پچاس پیسے، پتہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اس کتاب میں مختلف طبقوں کے بعض نامور اشخاص کا قلمی خاکہ درج ہے، ارباب سیاست میں مولانا محمد علی پنڈت جواہر لال نہرو، رفیع احمد قدوائی اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی سیرت و شخصیت کی مصوری کی ہے، سماجی و قومی سرگرمیوں میں حصہ لینے والی خواتین میں مردولا سارابھائی اور قدسیہ زیدی کی شرافت، رحمدلی، اور خلوص و دلنوازی کا ذکر ہے، بلند علمی و ادبی ذوق رکھنے والے تعلقہ داروں میں اپنے والد محترم ولایت علی مبوق اور چودھری محمد علی کی باغ و بہار شخصیت کے جلوے دکھائے ہیں، ماہرین تعلیم اور ارباب علم و قلم میں شفیق الرحمن قدوائی اور ڈاکٹر سید عابد حسین کے متعلق تاثرات قلمبند کئے ہیں، اپنے ایک خاندانی ملازم حافظ جمن کا ذکر خیر بھی شوخی و ظرافت کے

پیرایہ میں کیا ہے، تاثرات و مشاہدات پر مشتمل اس مجموعہ کے تیرہ ۱۳ مضامین میں بعض اشخاص کا ذکر ہے، ان کی زندگی کے نمایاں خط و خال، اہم خصوصیات و عادات، دلچسپ حالات و واقعات اور عام سرگرمیوں اور دلچسپیوں کی تصویر سامنے آجاتی ہے، مصنفہ مرحومہ کو شوخی و ظرافت و رعنائی تحریر اپنے والد بزرگوار سے وراثۃً ملی ہے، اس لیے اس کتاب کو پڑھ کر لوگ محظوظ بھی ہوں گے اور اس سے ان کی واقفیت میں اضافہ بھی ہوگا۔

گلشن صادق :- مرتبہ جناب میر وارث علی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت معمولی صفحات ۱۵۲ مجلد، قیمت چھ روپیہ پتہ نیو سنٹرل بک ڈپو، ۱۳۶۶، ترمک دروازہ، ناسک سٹی،

حضرت سید شاہ محمد صادق سرمست حسینی عہد شاہجہانی کے ایک بزرگ تھے انھوں نے ناسک کو اپنی رشد و ہدایت اور تبلیغ و اشاعتِ دین کا مرکز بنایا تھا، اس کتاب میں جناب میر وارث علی نے ان کے حالات و سوانح عقیدت مندی سے لکھے ہیں، اس میں پہلے حضرت صادق کی ناسک میں تشریف آوری، وہاں کے لوگوں میں انکے اثر و نفوذ کے علاوہ انکے مرشد و مسترشدین، زوجہ و اولاد اور ان امرار و سلاطین کا تذکرہ ہے جو انکے دامن فیض سے کسی درجہ میں وابستہ تھے، جیسے شاہزادہ خرم، ممتاز محل، سردار ملک عنبر وغیرہ، پھر انکی کرامتوں، انکے عرس کی مروجہ رسموں اور انکے خانوادہ سے تعلق رکھنے والے بعض ممتاز اشخاص کا ذکر ہے، آخر میں ناسک اور اسکے قرب و جوار کے چند اور بزرگوں کا حال بھی تحریر کیا گیا ہے حضرت سرمست جیسے بزرگ کے تذکرہ کی ترتیب و اشاعت ایک نیک اور مفید کام ہے، مگر اس میں انکی کرامتوں، ان کے اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں اور عرسوں میں ہونے والی فضول رسموں بلکہ بعض بدعتوں کا تو مفصل ذکر کیا گیا ہے، مگر ان کے ارشادات و تعلیمات اور تبلیغ و اشاعتِ دین کے واقعات نہیں قلمبند کئے گئے ہیں، یہ بڑی کمی ہے صوفیہ و مشائخ سے عقیدت اور حسن ظن ضرور موجب خیر و برکت ہے مگر ان سے استمداد و استعانت غلط ہے، جس کا ذکر مصنف نے ص ۱۳۰ پر کیا ہے شروع میں حمد، عام پیغمبروں اور آنحضرت نیز بعض صوفیائے کبار کا تذکرہ بے محل کیا گیا ہے، اس سے خواہ مخواہ کی طوالت ہوگئی ہے، زبان و بیان کے لحاظ سے کتاب میں بڑی خامی ہے اور بعض لفظوں کا املا بھی درست نہیں ہے۔ "ض"

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی چند کتابوں کے جدید اڈیشن

نقوشِ سلیمانی

سید صاحب کے ہندوستانی، اور اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبہ ہائے صدارت ان کی دوسری تقریریں، تحریریں، تبصروں، اور مقدموں کا مجموعہ جن کا انتخاب خود فاضل مصنف نے اپنی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی کا نام دیکر ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پا گئی، طبع دوم عکسی،

قیمت:- ۲۵ روپے،

خیام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رباعی گو شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہے، اور اس کی رباعیات کا یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ اور بھی بہت کچھ تھا، وہ فلسفی تھا، منجم تھا، ریاضی داں تھا، ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا، جس کی طرف شعر العجم میں خیام کے تذکرہ میں مولانا شبلیؒ نے بھی اشارہ کیا ہے، اس کتاب میں پہلی مرتبہ اس کے سوانح و حالات کے ساتھ اس کی ان ہی حیثیات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں اس کے چند نایاب فارسی و عربی کے فلسفیانہ رسائل اور اس کی مستند رباعیات بھی شامل کر دی گئی ہیں، طبع دوم عکسی، قیمت: ۲۵ روپے،

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈمی الٰہ آباد میں چند خطبے دیے تھے، یہ انہی کا مجموعہ ہے، طبع دوم عکسی، قیمت ۳۰ روپیہ "منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ اپریل ۱۹۸۳ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت بیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(دارالمصنفین کی دو نئی کتابیں)

سیرۃ النبی جلد ہفتم

سیرۃ النبی جلد ششم کے بعد سید صاحبؒ سیرۃ جلد ہفتم بھی جو معاملات سے متعلق تھی لکھنی شروع کر دی تھی، اور اسی پر یہ مقدس سلسلہ ختم بھی ہو جاتا لیکن ابھی اس موضوع پر چند ہی مضامین لکھے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا، اور یہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی، یہ ان ہی متفرق مضامین، اور مباحث کا مجموعہ ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں: اسلام میں حکومت کی حیثیت، عہد نبوی میں نظامِ حکومت و فرماں روائی، سلطنت اور دین کا تعلق وغیرہ، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے پیش لفظ ہے، قیمت:۔ ۱۲ روپیہ،

مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندویؒ،

صوفی امیر خسرو

اس میں ہندوستان کے شہرۂ آفاق محبوب [illegible] فارسی شاعر، نہ سپہر، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں دولرانی خضر خاں اور وسط الحیواۃ جیسی شاہکار مثنویوں کے مصنف اور حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ کے جاں نثار مرید امیر خسرو کو معاصر تذکرہ و تاریخ کی کتابوں [illegible] خود ان کے کلام کے مجموعوں اور مثنویوں کی [illegible] میں ایک صاحبِ حال صوفی کی حیثیت سے [illegible] کیا گیا ہے، بزمِ صوفیہ کے بعد سلوک و عرفان کے مباحث و مسائل پر دوسری اہم کتاب ہے

قیمت ۔۔ ۸

مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن،

منیجر

۱۳۱ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ اپریل سنہ ۱۹۸۳ء عدد ۴

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

شذرات

ایران سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے ایک دعوت نامہ سعدی شیرازی کے ایک سمینار کے لئے آیا ہے، جو اسی مہینہ کلکتہ میں ہو رہا ہے، اس میں شرکت کر کے خوشی ہوگی۔

یہ ایران سوسائٹی ۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر محمد اسحاق مرحوم نے قائم کی تھی، جنھوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے ایک لائق استاد کی حیثیت سے اپنی فارسی دانی اور علم پروری کا لوہا نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں بھی منوا لیا تھا، وہ کئی قابلِ قدر کتابوں کے مصنف بھی تھے، مگر ان کی اصل کمائی یہ ایران سوسائٹی تھی، ۱۹۶۹ء میں ان کی وفات ہوئی تو ان کے دو لائق اور جان نثار رفقاء کار جناب خواجہ محمد یوسف ایڈوکیٹ کلکتہ ہائی کورٹ، اور جناب محمد عبد المجید صاحب نے اس سوسائٹی کے مقصد اور کارکردگی کو چار چاند لگا دیا، اس کی طرف سے ایک ماہی رسالہ انڈو ایرانیکا بڑے آب و تاب سے نکل رہا ہے، جس میں فارسی زبان و ادب سے متعلق معلوم نہیں کتنے یاقوت اور زمرد کے مروارید جمع ہو چکے ہیں، اس کی طرف سے ہر سال ڈاکٹر محمد اسحاق میموریل لیکچرز بھی ہوتے ہیں، اس موقع پر ملک کے نامور اسکالر بیش بہا مقالات پڑھکر سامعین کو محظوظ کرتے ہیں، اس کے اہتمام میں فارسی زبان و ادب کے نامور وں پر بلند پایہ سمینار بھی ہوا کرتے ہیں، بو علی سینا، ملا صدرا، باباؤں، خیام اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری وغیرہ پر اب تک اچھے سمینار ہو چکے ہیں، اس سال سعدی شیرازی پر سمینار ہو رہا ہے، جس میں ملک کے ارباب نظر ان کے گوناگوں کمالات پر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے،

سعدی شیرازی دنیا کے ان ارباب کمال میں ہیں جن کے پاس الہ دین کا چراغ تھا، وہ اس چراغ سے جن نکالا کرتے تھے، جو محض ان کے حکم پر وہ سب کچھ لکھا رہتا تھا جو وہ چاہتے تھے، سعدی شیرازی نے خدا جانے کتنی چیزیں لکھیں، غزلیات، قصائد، مراثی، رباعیات، مثلثات، مضحکات، خبیثات، صاحبیہ اور پندنامہ وغیرہ،

مولانا حالی نے حیات سعدی، علامہ شبلی نے شعر العجم میں بہت تھوڑا بہت محمد حسین آزاد نے سخندان فارس اور امداد امام اثر نے کاشف الحقائق میں سعدی کے متعلق جو کچھ لکھا، اسی کی روشنی میں وہ سمجھے اور سمجھائے گئے، ان بزرگان علم و ادب کے بعد ہندوستان میں سعدی پر پھر خاطر خواہ کام نہیں ہوا، شاید یہ خیال ہو کہ ان کے متعلق جو کچھ لکھنا چاہئے تھا،

وہ لکھا جا چکا، یہ خیال کسی حد تک صحیح ہے مولانا حالی کی حیات سعدی ان کی یادگار غالب کی طرح اُن کے قلم کا شاہکار ہے۔ جس طرح غالب پر بے پناہ لٹریچر شائع ہونے کے باوجود یادگار غالب کا کوئی جواب نہ ہوسکا اسی طرح حیات سعدی کا بھی شاید جواب نہ ہو سکے، اس کے اجمال کی تفصیل آیندہ ہوتی رہے گی، خود علامہ شبلی کا قلم شعرالعجم میں شیخ سعدی کا باب لکھتے وقت رکا، اس کے حاشیہ میں اعتراف کیا کہ مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیات سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا، اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے،

پھر بھی علامہ شبلی نے دوستوں کے اصرار پر شیخ سعدی کی غزل گوئی پر شعرالعجم میں جو تبصرہ کیا ہے اس سے وہ کے اُن اس دعوی کو سمجھنے میں پوری مدد ملے گی کہ اخلاقی شاعری شیخ سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، حکیم سنائی، خیام، اوحدی اور عطار نے اس زمین کو آسمان تک پہنچا دیا تھا، تاہم شیخ نے اس آسمان کو اور بلند کر دیا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اخلاق میں سیکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں، صرف ایک مخزن الاسرار نظامی کے طرز پر ۶۵ مثنویاں لکھی گئیں، اور سب کی سب اخلاق و تصوف پر ہیں لیکن بوستاں و گلستاں کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا، ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ شیخ غزل کے ابوالآبا ہیں،

شیخ سعدی غزل گوئی کے ابوالآبا ضرور ہیں، اس میں شک نہیں کہ ان کی غزلوں میں عشق کی آگ کے جو شعلے نکلتے ہیں، یا ان میں عشق کے جو واردات اور معاملات ہیں، یا ان میں جو دلنشینی اور تاثیر ہے، یا ان میں جو صوفی واعظوں کی ریاکاری کی جو قلعی کھولی گئی ہے، یا ان میں ایک ہی چیز کو جس طرح الٹ پلٹ کر سینکڑوں بار کہی جاتی ہے، یا ان میں ایک معمولی بات میں جو انوکھی دکھائی دیتی ہے، یہ ساری چیزیں غزل گوئی میں پہلی دفعہ آئیں، ان کی انہی جدتوں کی تقلید ہونے لگی، تو حافظ شیرازی کی شہرت کے آگے سعدی غزل گوئی کی حیثیت سے ماند پڑ گئے، اور پھر امیر خسرو، وحشی یزدی، شرف قزوینی، اور خود اردو شعرا میں میر، آتش، جرات، غالب، اصغر اور جگر نے انہی باتوں کو کچھ ایسا دہرایا کہ شیخ سعدی کی جدتیں ایسی پرانی ہو گئیں کہ یہ ان کی معلوم ہی نہیں ہونے لگیں،

انھوں نے مدحیہ قصائد کے بجائے شاندار نصیحت آمیز قصائد ضرور لکھے لیکن قصیدہ نگاری میں انوری، خاقانی، کمال اسمعیل، ظہیر فاریابی اور امیر خسرو کے ہم پایہ نہ ہو سکے، ان کا مرثیہ جو سقوط بغداد پر ہے اس کو پڑھ کر اب بھی آنکھیں نم ہوتی ہیں، مگر وہ مرثیہ نگاروں کی صف اول میں نہیں ہیں، ان کی رباعیات بھی خیام کی طرح

جن میں ان کی ہزلیات خبیثات و مضحکات وغیرہ تو ان کے بلند مرتبہ سے فروتر ہیں انکی لمعات مثلثات، صاحبیہ وغیرہ محض ایسی ہی جانی ہیں کہ یہ ان کی لکھی ہوئی ہیں البتہ پند نامہ میں انکی نظم کریا بہت مقبول ہوئی جو بزرگان دین کی دعاؤں میں شامل ہو چکی ہے

ہاں ان کی گلستان اور بوستان کے آگے واقعی کسی کا چراغ جل نہ سکا البتہ یہ پوچھا جائے کہ ان دونوں میں کون بہتر ہے تو گلستان کو بوستان پر ترجیح دیجائیگی بوستان کی شاعری کا فن مثنوی مولانا روم اور فردوسی کی شاہنامہ کے آگے ماند پڑ جاتا ہو مگر گلستان کی نثر نگاری کی شہرت کے آگے خود شہرت بے جان ہو کر رہجاتی ہے جامی مجد الدین خوانی اور حبیب قاآنی نے اس کے طرز پر طبع آزمائی کی، مگر وہ سعی لاحاصل بن کر رہ گئی،

گلستان میں اس کا مصنف فصاحت و بلاغت کے گل و صنوبر اور پند و موعظت کے سرو و شمشاد کے چمنستان میں بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتا نظر آتا ہے ذرا اس گلفشانی سے تھوڑی دیر کے لئے اپنے کو معطر کر لیجیے،

"تلمیذ بے ارادت عاشق بے زرست و رونده بے معرفت مرغ بے پر و عالم بے عمل
درخت بے بر و زاہد بے علم خانہ بے در، مراد از نزول قرآن تحصیل سیرت خوب ست نہ ترتیل
سورۂ مکتوب عامی متعبد پیادہ رفتہ است و عالم متہاون سوار خفتہ، عاصی کہ دست
بردارد بہ از عابد کہ در سر دارد،

سرہنگ لطیف خوے دلدار — بہتر ز فقیہ مردم آزار"

اسی انداز بیان میں تقریباً دو سو چالیس صفحات لکھے گئے ہیں، کس کا دم خم ہے کہ ایسے دس بیس جملے بھی لکھ سکے

گلستان کی اہمیت عام طور سے اس لئے کم ہو گئی ہے۔ کہ یہ درسی کتاب سمجھی جاتی ہے مگر اس کی مقبولیت کا راز خود سعدی کے الفاظ میں یہ ہے کہ

"موعظتہاے شافی در سلک عبارت کشیدہ است و دارو ی تلخ نصیحت بہ شہد ظرافت آمیختہ تا طبع ملول ایشاں از دولت قبول محروم نماند"

مقالات

جوزف شاخت اور اصول فقہ

از

جناب محمد طفیل صاحب، ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد پاکستان

اسلام اور اس کی تعلیمات پر غور کرنے، انھیں سمجھنے اور اس پر عمل کرنے یا اس کا انکار کرنے سے پہلے مسلمانوں اور غیر مسلموں پر لازم ہے کہ وہ بنیادی ماخذ سے اسلام کا گہرا مطالعہ کریں تاکہ وہ کسی نتیجہ پر پہونچ سکیں، اس قاعدہ کو پیش نظر رکھ کر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں نے بھی اسلام اور اس کی تعلیمات کو اپنے مطالعہ فکر اور تحریر کا موضوع بنایا ہے۔

مسلمانوں نے اسلام کے بارہ میں غیر مسلموں کی تحریروں کو نہ صرف پڑھا بلکہ ان پر کڑی تنقید بھی کی، جن غیر مسلموں نے اسلام کے بارہ میں لکھا، انھیں عام طور پر مستشرقین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اگرچہ بعض اوقات یہ اصطلاح صرف ان غیر مسلموں کے لیے استعمال کی جاتی ہے، جن کا تعلق یورپین ممالک سے ہے، اور انھوں نے اسلام کے بارہ میں کچھ لکھا ہے، لیکن عام طور پر یہ اصطلاح ان سب اصحاب علم کے بارہ میں استعمال ہوتی ہے جو غیر مسلم ہوں اور انھوں نے اسلام کے بارہ میں کچھ نہ کچھ کام کیا ہو، اگرچہ اسلام کے بارہ میں غیر مسلموں نے ابتدا ہی سے غور وفکر شروع کر دیا تھا یہودیوں اور عیسائیوں نے اس دین کو آغاز رسالت ہی سے اپنے

اعتراضات کا ہدف بنایا لیکن وہ گروہ جسے ہم "مستشرقین" کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان کا آغاز صلیبی جنگوں میں غیر مسلموں کی ناکامی کے بعد ہوا تھا۔ صلیبی جنگوں کی ناکامی نے غیر مسلموں میں یہ شعور پیدا کر دیا تھا کہ اب وہ سیاسی طور پر مسلمانوں سے نبرد آزما نہیں ہو سکتے، اس لئے اب ایسے ذرائع اپنانے چاہئیں جن سے مسلمانوں کو مرعوب کر کے ان پر غلبہ حاصل کیا جا سکے، ظاہر ہے کہ ایسا کرنے کے لیے ان کے پاس اسلام کو مسخ کر کے پیش کرنے کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں تھا، چنانچہ انھوں نے اس میدان میں یلغار کی اور اس کے لیے مستشرقین نے نہ صرف اسلام کو مسخ کیا بلکہ اس آڑ میں اپنے ادیان کی تبلیغ کا بھی فریضہ ادا کیا، اس سلسلہ میں لارڈ ایلنبی نے کہا تھا

> "اگرچہ عسکری نقطۂ نظر سے جنگ ختم ہو چکی ہے، مگر جہاں تک دینی تعصب کا تعلق ہے، وہ مستشرقین کی تحریروں میں نہ صرف باقی ہے بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ ہوگا، غیر مسلم، اسلام اور اس کی ثقافت کے بارہ میں جب بھی لکھیں گے مسلمانوں کو پس ماندہ کمزور اور ثقافت سے عاری ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔"

یہی وجہ ہے کہ ہم جب بھی مستشرقین کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں اسلام کے خلاف بپھرے ہوئے پاتے ہیں، یہ حقیقت تاریخی طور پر ثابت ہے کہ استشراق کی تحریک کا مقصد علم کی خدمت یا اسلام کی وراثت کو ضائع کرنے سے بچانا ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ تحریک کلیسا کے زیر اثر پیدا ہوئی، بڑے بڑے پادری اس تحریک کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، اسی طرح عیسائی اور یہودی حکومتوں نے بھی اس تحریک کی سرپرستی کی، مستشرقین نے مخطوطات شائع کرنے کے بہانے سے اسلام کی صحیح فکر کو نشو و نما پانے سے روکا، مسلمانوں کے طرز فکر کی اشاعت کرنے کے بجائے اپنے خیالات پیش کیے اور بعض مقامات پر حقایق سے چشم پوشی کر کے اس میں تحریف بھی کی، بنیادی مآخذ سے اپنی لاعلمی کی وجہ سے وہ حقائق کو آسانی سے مسخ کر سکے اور نتائج اخذ کرنے کی عجلت میں اپنے کو حقائق سے

ہمیشہ دور رکھا، اس طرح انھوں نے بے شمار غلطیاں کیں جن کا اعتراف مستشرقین نے خود بھی کیا ہے، چنانچہ اربری کا کہنا ہے۔

"ہم مستشرقین نے جب اسلام کے بارے میں تحقیق کی تو بے شمار غلطیاں کیں، ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس موضوع میں نہ الجھیں، کیونکہ مسلمان عرب مسلمان ہم سے زیادہ باصلاحیت ہیں کہ اسلام کے موضوعات پر تحقیق کریں، مسلمانوں کو مستشرقین کی ہر تحریر کو دقت نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ جرح تعدیل کے اصولوں پر، ان کے نتائج تحقیق کو قبول کرنے سے پہلے ان کی چھان پھٹک اشد ضروری ہے۔"

اس مختصر تمہید کے بعد ہم اپنے اصل موضوع شاخت اور اصول فقہ کی طرف آتے ہیں، اس موضوع کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے حصہ میں ہم شاخت کے مختصر حالات زندگی اور اس کی تالیفات کا ذکر کریں گے اور دوسرے حصہ میں اصول فقہ کے بارہ میں شاخت کے افکار کا جائزہ لیں گے۔

جوزف شاخت کے مختصر حالات اور علمی کارنامے

جوزف شاخت ۱۹۰۲ء میں جرمنی میں پیدا ہوئے، ان کا تعلق یہودی مذہب سے تھا، انھوں نے جامعہ برسلاؤ اور جامعہ ہیڈلبرگ میں تعلیم پائی کچھ دنوں ایک یونیورسٹی میں درس دینے کے بعد ۱۹۳۲ء میں کونگس برگ یونیورسٹی میں چلے گئے، ۱۹۳۴ء میں جامعہ مصریہ میں منتقل ہوئے، آکسفورڈ یونیورسٹی میں ۱۹۴۱ء میں علوم اسلامیہ کے ریڈر مقرر ہوئے، ۱۹۵۴ء میں الجزائر یونیورسٹی میں علمی تحریکوں کے استاذ ہو گئے، کولمبیا یونیورسٹی میں بھی پروفیسر رہے، وہ بہت سی علمی اور ادبی تنظیموں کے رکن ہوئے انکو مجمع العلمی العربی الدمشق کی بھی رکنیت ملی، کچھ عرصہ تک وہ مجلہ علوم اسلامیہ کے مدیر بھی رہے، اسلامی قانون کی ابتدا، ترقی، اس کی اثر پذیری اور اثر اندازی، ان کا خاص موضوع ہے، اور

یہی ان کی شہرت کا باعث ہوا،

شاخت کی تصانیف | جوزف شاخت نے بے شمار کتب اور لاتعداد علمی مقالات یادگار چھوڑے ہیں، جن کا احاطہ ممکن نہیں ہے، ہم ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) تحقیق کتاب الحیل والمخارج للخصاف (۲) تحقیق کتاب الحیل فی الفقہ للقزوینی، اس کتاب کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا (۳) تحقیق کتاب المخارج فی الحیل للشیبانی، اس کتاب پر حواشی بھی لکھے (۴) طحاوی کی کتاب الشروط سے اذکار الحقوق اور کتاب الشفعہ شائع کیں (۵) استانبول اور قاہرہ کے کتب خانوں کی فہرستیں تین جلدوں میں تیار کیں (۶) دین اسلام کے نام سے منتخب مقالات شائع کئے اور ان کا جرمن میں ترجمہ کیا (۷) رسالہ جالینوس فی الاسماء الطبیہ جرمن ترجمہ کے ساتھ شائع کیا (۸) الرسالۃ الکاملیہ لابن نفیس کو تحقیق کے بعد جرمن ترجمہ کے ساتھ طبع کرایا (۹) ابن بطلان کے خمس رسائل تحقیق اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ پیش کیے (۱۰) اسلامی احکام کی حنفی طریقہ پر تبویب کی (۱۱) فقہ کا ارتقاء کے نام سے انگریزی زبان میں کتاب لکھی (۱۲) ماتریدی کی کتاب التوحید تحقیق کے ساتھ طبع کی (۱۳) اسلامی قانون کا تعارف۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی، مذکورۂ بالا کتابوں کے ساتھ جوزف شاخت نے دائرۂ معارف اسلامیہ، دائرۂ معارف علوم اجتماعیہ اور تاریخ فقہ اسلامی میں اسلام کے بارے میں بہت سے مقالے تحریر فرمائے، مزید براں شاخت نے دنیا کے قریباً تمام معروف علمی رسائل میں مضامین لکھے، ان کے مضامین اسلامی اور مغربی ممالک کے رسائل میں طبع ہوئے اور بڑی دلچسپی سے پڑھے گئے۔

اگر جوزف شاخت کے تحقیقی مضامین اور کتابوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں علوم اسلامیہ کے درج ذیل شعبوں سے دلچسپی تھی، (ا) اصول الفقہ (ب) فقہ حنفی

(ج) علم الکلام (د) عربی مخطوطات۔

شاخت کی تحریریں بہت پختہ اور مقصدیت سے پُر ہوتی ہیں، اس لیے بہت دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں، لیکن ان کو اصلی شہرت، اس حیثیت سے حاصل ہوئی کہ انھوں نے اصول فقہ میں گرانقدر خدمات انجام دیں، اسلامی قانون اور خاص طور سے اسلامی قانون کے اصول کے بارے میں انھیں مستشرقین کا بادا آدم تصور کیا جاتا ہے، کیونکہ اسلامی قانون پر فلسفیانہ اور محققانہ بحثیں جس انداز میں شاخت نے کی ہیں، اس طرح کسی اور مستشرق نے نہیں کی ہیں، ہم اس مقالہ میں شاخت کے افکار کا مختصر جائزہ صرف اس حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے مفروضات قائم کرکے کس طرح غلط فہمی پیدا کی اور اس بنا پر اسلامی قوانین کی ساری بنیادیں متزلزل کر دیں۔

جوزف شاخت نے اسلامی قانون پر بہت سے مقالات کے ساتھ دو مستقل کتابیں بھی تحریر کیں جن کے نام یہ ہیں۔ (1) THE ORIGIN OF MUHAMMADAN JURISPRUDENCE (۲) AN INTRODUCTION TO ISLAMIC LAW

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، پہلی کتاب کا تعلق مسلمانوں کے اصول قانون (فقہ) سے ہے، یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۰ء میں برطانیہ میں طبع ہوئی تھی، بعد میں اس کے کئی اڈیشن چھپے، شاخت کی اس کتاب کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی، غیر مسلموں کے علاوہ، مسلمانوں نے بھی اس کتاب کو بہت دلچسپی سے پڑھا اور اس کی غلطیوں کی نشان دہی کی، شاخت نے اپنی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلا حصہ قانونی نظریہ کا ارتقار دس ابواب پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ قانونی روایات کا ارتقار کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، تیسرے حصے میں قانونی مذاہب کی پیدائش پر نو ابواب ہیں، چوتھا حصہ قانون کے تکنیکی افکار کا ارتقار کے چھ ابواب ہیں، مزید بر ان

کتابیات اور اختصارات کی وضاحت کے ساتھ کتاب کے آخر میں ایک مفید انڈکس بھی شامل ہے، جوزف شاخت نے یہ کتاب لکھ کر اسلامی قانون کو مغربی دنیا میں متعارف کرانے کا اہم کام انجام دیا، مگر اس کی وجہ سے اسلامی قانون سے متعلق مستشرقین کے نظریات شکوک وشبہات اور اعتراضات واضح طور پر سامنے آگئے۔ شاخت نے اسلامی قانون کے بکھرے ہوئے مواد کو ایک جگہ ضرور جمع کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اسلام کے مسلّمات کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ انھوں نے اسلامی قانون اور اس کے اصولوں کے بارے میں جو غلط نظریات اختیار کر لیے ہیں اگر ان سب کا محاسبہ کیا جائے تو مقالہ طویل ہو جائے گا، اس لیے ہم ذیل میں ان کے صرف تین نظریات کا نہایت اختصار کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں۔ مستشرقین کی ایک عادت رہی ہے کہ وہ جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو وہ اس کے مسلّمات کو جھٹلانے یا ان میں تشکیک پیدا کر کے خود اپنا نظریہ گھڑتے ہیں، چنانچہ یہی قاعدہ انھوں نے بھی اصول قانون کے بارہ میں اپنایا ہے، اس حقیقت سے ہر اہل علم واقف ہے کہ اسلامی قانون کے چار بنیادی ماخذ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس ہیں، جوزف شاخت نے ان سب کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے۔

قرآن حکیم مسلمانوں کے لیے ضابطۂ حیات ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے، یہ حقیقت ہے کہ پہلی وحی کے نزول ہی سے مسلمان اس سے ہر طرح استفادہ کرنے لگے تھے، انھوں نے زندگی کے ہر موڑ پر قرآن حکیم سے رہنمائی حاصل کی، جب کہ شاخت کا خیال ہے کہ (ا) اسلامی قانون براہ راست قرآن حکیم سے اخذ نہیں کیا گیا (ب) اسلامی قانون کا خمیر بنی امیہ کے انتظامی عمل سے اٹھایا گیا۔ (ج) بعض اوقات بنی امیہ کا عمل قرآن حکیم کے الفاظ پر بھاری ہوتا تھا، یہ خیال کہ ابتدائی دور میں قوانین بنانے میں قرآن سے استفادہ نہیں کیا گیا، ہماری

سمجھ سے بالاتر ہے، کیونکہ تاریخی شواہد موجود ہیں کہ مسلمانوں نے قرآن حکیم کو قانون کا اولین ماخذ بنایا، نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کے عہد میں قرآن حکیم سے مکمل طور پر استفادہ کیا جاتا رہا، چوروں کے ہاتھ کاٹے گئے، زانیوں کو کوڑے لگائے گئے، شراب پینے والوں پر تعزیر نافذ ہوئی، بدکرداروں کو ملک بدر کیا گیا، نکاح و طلاق نیز وراثت کی تقسیم کے فیصلے قرآن حکیم کے احکام کے مطابق کیے گئے، اس سے ذرا آگے بڑھیے اور معاذ بن جبلؓ والی مشہور روایت پر توجہ دیجیے، کہ نبی کریمؐ نے جب انھیں قاضی بنا کر بھیجا تو ان سے دریافت کیا کہ تم فیصلے کس چیز سے کیا کرو گے، اُس کے جواب میں انھوں نے سب سے پہلے جس ماخذ کا ذکر کیا، وہ قرآن حکیم تھا، چنانچہ انھوں نے بے ساختہ کہا کہ قرآن حکیم سے، نبی کریمؐ نے یا کسی بھی صحابی نے ان کے اس خیال کی تردید نہیں کی، جس سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں ابتدا ہی سے، قرآن حکیم قانون کا اصلی اور بنیادی ماخذ تھا، البتہ اتنی بات قابل تسلیم ہے کہ قرآن حکیم اصولوں کی کتاب ہے اور اس میں جملہ جزئیات کا احاطہ نہیں کیا گیا، اور قرآن حکیم کو قانونی ماخذ بنانے کے لیے جن کلیات کی ضرورت تھی، وہ بعد میں مرتب ہوئے، اور آج تک مرتب ہو رہے ہیں، آج بھی اگر کوئی جدید مسئلہ درپیش ہو اور قرآن حکیم کی کسی آیت سے کوئی کلیہ بنایا جا سکے تو وہ ہمارے لیے ویسے ہی قابل عمل ہوگا، جیسے امام شافعیؒ یا امام ابوحنیفہؒ کا قائم کردہ کوئی کلیہ قابل عمل ہوتا ہے،

شارع علیہ السلام نے اپنی حیات طیبہ کے آخری دور میں ارشاد فرمایا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ایک کتاب اللہ اور دوسری اپنی سنت، جب تک ان پر عمل پیرا رہو گے، کبھی گمراہ نہ ہو گے، اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرآن حکیم عہد رسالت سے ہی قانون کا ماخذ بن گیا تھا، اور مسلمان ہر قانون اسی سے اخذ کرتے تھے، چنانچہ مسلمانوں کے ہاں ایک عام اصول رہا کہ ایسی کوئی بات تسلیم نہیں کی جائے گی جو قرآن حکیم کے احکام یا

اس کی روح کے خلاف پائی جائے۔

شاخت نے یہ لکھا ہے کہ بنی امیہ کی انتظامی روایت سے مسلمانوں کے قانون کا خمیر اٹھا اور دوسرے مقام پر انہی فاضل مستشرق نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ بنی امیہ سے پہلے مسلمانوں کے قانون کو فکشن (فسانہ) کا درجہ حاصل تھا، نیز انھوں نے یہ بھی لکھا کہ بنی امیہ کے انتظامی عمل کو قرآن حکیم پر ترجیح دی جاتی رہی ہے، یہ ساری باتیں کوئی اہل علم نہیں کہہ سکتا، کیونکہ مسلمان قرآن حکیم کے خلاف کسی حدیث کو بھی قبول نہیں کرتے تھے، چہ جائیکہ وہ بنی امیہ کے عمل کو زیر غور لائیں۔ عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ مسلمانوں کے نزدیک اسلامی قانون کی تدوین کا زریں دور ہے، آج بھی اگر مسلمانوں کو کسی قانون یا اس کی تعبیر کی ضرورت پیش آتی ہے، تو وہ اپنے اس عہد زریں کا مطالعہ کرتے ہیں اور اسی کو مثال بناتے ہیں، جب کہ فاضل مستشرق نے اس دور کو اسلامی قانون کا افسانوی عہد قرار دیا ہے، اس کو علمی خیانت بلکہ اسلام کے خلاف تعصب کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

قرآن کے بعد سنت، مسلمانوں کے ہاں قانون کا دوسرا بڑا ماخذ ہے، مسلمان فقہا کو جن امور کے بارہ میں قرآن کریم سے رہنمائی نہیں ملی وہاں انھوں نے سنت کی طرف رجوع کیا، اور اسے نہ صرف ماخذ قانون کے طور پر اپنایا بلکہ سنت کو اسلامی قانون کی عملی تعبیر بھی سمجھا، لیکن فاضل مستشرق نے سنت کو بھی اپنی بحث کا موضوع بنایا اور اس میں شک و شبہ پیدا کر دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ (ا) حدیث نبویؐ دوسری صدی کے وسط تک موجود نہیں تھی (ب) جب حدیث کو جمع کیا گیا، اس وقت وہ اصلی حالت میں موجود نہیں تھی، بلکہ اس میں معاشرہ کی عادات شامل ہو چکی تھیں، یہ دونوں مفروضے حقائق پر مبنی نہیں ہیں کیونکہ حفاظت اور کتابتِ حدیث کا اہتمام جس طرح مسلمانوں نے کیا ہے وہ کسی دوسرے مذہب والوں کو

نصیب نہیں ہوا، اس امر کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ صحابہ کرامؓ، احادیثِ رسول لکھا کرتے تھے، ان کے پاس عہدِ صحابہ میں بھی اپنے اپنے صحیفے موجود تھے، جن میں صحیفۂ ابوہریرۃؓ صحیفۂ حضرت علیؓ اور صحیفہ وہب بن منبہ کے وجود کی تاریخی شہادت ملتی ہے، مزید نبی کریمؐ نے جو خطوط مختلف اوقات میں تحریر کرائے اور جو بعد میں اسلامی قانون کا جز بنے، وہ سارے کے سارے تحریری شکل میں موجود تھے، مزید براں عربوں کا حافظہ مثالی تھا، وہ ساری باتیں اس عہد کی سے حفظ کر لیا کرتے تھے کہ عام انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے

یہ اعتراض کہ جب حدیث نبویؐ کو حیطۂ تحریر میں لایا گیا تو اس وقت اس میں معاشرتی آمیزش ہو چکی تھی، ..... محض ظنی ہے، اس کا تعلق حقیقت سے کچھ بھی نہیں کیونکہ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے، مَن کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار، جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کی نسبت کی، اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا، اس حدیث کی روشنی میں کس کو جرأت اور ہمت ہو سکتی ہے کہ وہ جھوٹی حدیث گھڑے، پھر مسلمانوں نے حدیث کی جرح و تعدیل کے ایسے اصول مرتب کیے جن کی موجودگی میں حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کے بارہ میں فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ ہم آج بھی حدیث کو ان اصولوں پر پرکھ کر کھرا کھوٹا الگ کر سکتے ہیں، چنانچہ ہمیں اس وقت بھی موضوع اور صحیح حدیثیں معلوم ہیں، موضوعات پہ الگ الگ کتابیں موجود ہیں، ان حقائق کی روشنی میں فاضل مستشرق کے مغالطے اور شکوک شبہات بالکل بے بنیاد معلوم ہوتے ہیں جن کا مقصد شکوک و شبہات کو ابھارنے کے علاوہ کچھ نہیں۔

<u>مصادر</u> اس مقالہ کی تیاری میں درج ذیل کتب سے مدد لی گئی:

۱۔ نجیب العقیقی، المستشرقون، دارالمعارف مصر ۱۹۶۵ء

۲۔ دکتور مصطفیٰ سباعی، السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی، دارالقومیہ مصر۔

(۳) زکریا ہاشم زکریا۔ المستشرقون والاسلام، المجلس الاعلیٰ لشئون اسلامیہ قاہرہ۔

(۴) SCHACHT, J: THE ORIGIN OF MUHAMMADAN JURISPRUDENCE OXFORD PRESS 1950 (۵) SCHACHT. J: INTRODUCTION TO ISIAMIC IAW OXFORD PRESS. 1964 ( ) DR. FAZLUR RAHMAN: ISIAM? LONDON. 965 (۷) DR. AHMAD HASAN: THE EARLY DEVELOPMENT OF ISIAMIC JURISPRUDENCE, ISLAMABAD, 1970 (۸) S.R.H. GILANI: THE RECONSTRUCTION OF IEGAL THOUGHT IN ISIAM. IAHORE 1977 (۹) DR. ZAFAR ISHAQ ANSARI: DEVELOPMENT OF FIQH IN KUFAH. M.S..

(۲)

جوزف شاخت اور اسلامی قانون[1]

جوزف شاخت ہمارے دور کے نہایت ممتاز اہل قلم میں سے ہے، اسے اسلامی قانون کے ابتدائی ادوار کے نشوو ارتقا پر سند تسلیم کیا جاتا ہے، اور اس کی تحریروں کے اثرات بڑے نمایاں طور سے اس کے ہم عصر مصنفین کے خیالات پر نظر آتے ہیں، اسلامی قانون کے سرچشمے، OSI GI-

N.S ORIGINS OF MUHAMMADAN JURISPRUDENGE

نامی کتاب میں اس نے اپنے خیالات بڑے مدلل اور مفصل طریقے سے پیش کئے ہیں، یہ علٰحدہ بات ہے کہ دور مذکور کے بارے میں وہ اسلامی قانون کے ارتقا کی پوری تصویر پیش نہیں کر سکا اور

---

[1] مقالہ نگار اپنا نام لکھنا بھول گئے، اس کی اشاعت کے بعد وہ اپنا نام لکھ بھیجیں آیندہ اشاعت میں ان کے نام کا ذکر آجائیگا۔

کتنے ہی اہم سوالات کا جواب اس نے تشنہ چھوڑ دیا تاہم اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ مستشرقین اور قانون اسلامی کے مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے دماغوں کو اس نے بہت متاثر کیا ہے، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی قانون کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں شاخت کے بنیادی خیالات مستعار ہیں، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اسلامی قانون کے بارے میں جس نقطۂ نظر سے سوچنے کی ابتدا گولڈ زیہر نے کی اور اس کے نتیجہ میں مغرب میں جو طرز فکر وجود میں آیا شاخت اس کا سب سے بڑا اور بہترین نمایندہ اور شارح ہے۔ شاخت نے گولڈ زیہر کے خیالات کو بنیاد بنا کر اس پر ایک پوری عمارت تعمیر کر دی، اور گولڈ زیہر کے پیش کردہ نتائج فکر کی تائید و توثیق کی۔

گولڈ زیہر نے حدیث کی داخلی نقد کی بنیاد ڈالی۔ یہ داخلی تنقید محدثین و ناقدین حدیث کی تنقید متن و سند سے قطعاً مختلف ایک بالکل نئی چیز ہے گولڈ زیہر کا دعویٰ ہے کہ معدودے چند احادیث ہی ایسی ہوں گی، اگرچہ ان کا وجود بھی مشکوک ہے جن کا تعلق اس ابتدائی دور سے ثابت کیا جا سکتا ہو جس کی پیداوار انھیں سمجھا جاتا ہے۔ وہ اس سے آگے قدم بڑھا کر یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب احادیث کی بھاری اکثریت سرے سے دور نبوی سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتی بلکہ وہ بعد کے اسلامی ادوار کی پیداوار ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں گولڈ زیہر کا دعوی یہ تھا کہ احادیث چاہے وہ صحیح ترین کتب حدیث میں پائی جاتی ہوں، اور چاہے ان کی صحت علماے اسلام کے نزدیک کتنی ہی ثابت شدہ اور متفق علیہ کیوں نہ ہو، علاوہ ایک قلیل ترین تعداد کے سب موضوع اور جعلی ہیں، حدیث کے بارے میں گولڈ زیہر کے ان خیالات کو اسلامی قانون کے مغربی مولفین میں بڑا حسن قبول حاصل ہوا اور ان کی شرح، تائید، توثیق میں خوب لکھا گیا' استاذ ک ہارگرونیے نے اسلامی قانون پر لکھتے ہوئے بڑی حد تک گولڈ زیہر کے خیالات پر

اپنی بنیاد رکھی، شاخت نے بھی اسلامی قانون کی ابتدا اور اس کی نشو و ارتقا کے بارے میں گولڈ زیہر ہی کی فراہم کردہ بنیادوں پر عمارت اٹھائی اور اس بات کا اقرار بھی کیا کہ اس کی تحقیق کا نتیجہ بہت بڑی حد تک گولڈ زیہر کے افکار و آرا کی توثیق کرتی ہیں لیکن شاخت کا خود اپنا کام اسی حد تک محدود نہیں رہا۔ اس نے کتاب الام کا تفصیلی مطالعہ کیا اور گولڈ زیہر سے بہت آگے بڑھ کر بعض دعاوی پیش کیے جن میں سے خصوصیت کے حامل حسب ذیل امور ہیں

۱۔ کتب احادیث میں درج شدہ اکثر و بیشتر احادیث وہ ہیں جو امام شافعیؒ کے بعد وجود پذیر ہوئیں۔

۲۔ قانونی مواد پر مشتمل احادیث جن کا انتساب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا جاتا ہے، ان کا پہلا بڑا حصہ دوسری صدی ہجری کے وسط میں ظہور پذیر ہوا۔ صحابہ اور تابعین کے آثار ان احادیث سے زماناً متقدم ہیں اور ان احادیث سے پہلے ہی مروج ہو چکے تھے، فقہی مذاہب کی زندہ روایات کو بھی ان احادیث سے تقدم زمانی حاصل ہے۔

۳۔ صحابہ و تابعین کے آثار بھی نشو و نما کے اسی عمل اور دور سے گزرے ہیں جن سے احادیث گزری ہیں اور انھیں بھی اسی نظر سے دیکھنا چاہیے جس سے احادیث کو۔

۴۔ اسناد کے مطالعہ سے بسا اوقات احادیث اور روایات کے زمانے کو دریافت کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ اسناد کا مزاج یہ ہے کہ ان کی سمت سفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوتی ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ اور عالی سے عالی تر مرتبۂ استناد حاصل کرنا چاہتی ہیں، یہاں تک کہ بالآخر وہ ذات نبویؐ پر منتہی ہو جائیں۔

۶۔ قانونی مواد پر مشتمل احادیث کی شہادت صرف [illegible] ہجری پیچھے تک لے جاتی ہے۔

۱۔ ستاھ ہجری کا زمانہ وہ ہے جب اسلامی قانونی فکر کی ابتدا اموی انتظامی امور اور عوامی عرف و رواج کے مواد سے ہوتی ہے، جس کی چھاپ آج بھی بہت سی احادیث پر نمایاں طور سے پائی جاتی ہے۔

شاخت نے احادیث میں پائی جانے والی سنت کے بارے میں امام شافعیؒ کے رویے سے بعض نہایت اہم نتائج نکالے ہیں، اور ان نتائج کو نیز قانونی مواد پر مشتمل احادیث کو اسلامی قانون کے ارتقا اور اس کے اصولوں کو سمجھنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ امام شافعیؒ سے دو صدی پہلے یہ عام اصول تھا کہ صحابہ اور تابعین کے آثار کا حوالہ بطور سند کے دیا جاتا تھا، اور ان کی تعبیر زندہ روایت کی روشنی میں کی جاتی تھی۔ شاخت نے زندہ روایت کے لفظ کو کئی ان تصورات کے لیے استعمال کیا ہے جنھیں فقہ اسلامی کے قدیم مسالک میں وہی مرتبہ حاصل تھا۔ جو شاخت کے خیال میں بعد میں سنت نبویؐ کو دے دیا گیا۔ ان تصورات میں سب سے اہم شاخت کے نزدیک رواج یا عمل یا الامر المجتمع علیہ ہے، زندہ روایت کی روشنی میں تعبیر کا سب سے اہم مظہر کسی فقہی مسلک کے فقہا کا کسی امر پر اجماع ہو جانا تھا۔ شاخت کا کہنا ہے کہ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ حدیث نبویؐ کا کسی مسئلے میں حوالہ دیا جاتا ہو اور اسی طرح کا کوئی حوالہ محض ایک استثناء کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاخت کے خیال میں یہ امام شافعیؒ کا کام ہے کہ اسی استثنار کو اصول کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ مذکورہ عمل کے پیش نظر شاخت کا کہنا ہے کہ صحابہ و تابعین کے آثار کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منسوب احادیث پر تقدم زمانی حاصل ہے۔

فقہ کا اولین ماخذ قرآن کریم ہے۔ شاخت اس سے منکر ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ قرآن کریم اسلام کے ابتدائی قانونی مواد و نظریات کا

اولین اور بنیادی سرچشمہ ہے۔ اس کے خیال میں اسلامی قانون کا ماخذ براہ راست قرآن کریم نہیں بلکہ اسلامی قانون درحقیقت دورِ اموی کے عام رواج اور انتظامی اعمال و افعال کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جس کو اسلامی قانون کی تشکیل کے لیے خام مواد کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ رواج و اعمال کتنی ہی جگہ قرآن کریم کے مضمرات اور بعض اوقات اس کے صریح احکام کی خلاف ورزی پر مشتمل تھے، اس طرح شاخت کے نزدیک اسلامی قانون کی ابتدا دوسری صدی ہجری سے ہوتی ہے۔ جب کہ فقہ اسلامی کے قدیم مسالک باقاعدگی کے ساتھ نمودار ہونا شروع ہوتے ہیں۔ شاخت کا کہنا ہے کہ قواعد فقہیہ بھی اسی دور کی پیداوار ہیں اور انہی کو بعد میں حدیث کی شکل میں پیش کر دیا گیا۔ اس کے خیال میں قواعد فقہیہ سب سے پہلے عراق میں نمودار ہوئے اور یہ فقہ اسلامی کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ انھیں ابھی حدیث کا لباس نہیں پہنایا گیا تھا۔

فقہا و محدثین دونوں اس پر متفق ہیں کہ قانونی مواد پر مشتمل احادیث یعنی احادیث احکام انتہائی مضبوط بنیادوں پر استوار ہیں، اور صحت و اعتماد انتہائی امکانی دولت سے مالا مال ہیں، اس صحت و اعتماد کے حصول کے لیے ہر وہ کوشش عمل میں لائی گئی ہے جو انسان کے بس میں ہے۔ شاخت انہی احادیث کو پایۂ اعتبار سے ساقط قرار دیتا ہے اور انھیں موضوع اور جعلی قرار دیتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ احادیثِ احکام وضع کرنے کا زمانہ دوسری صدی ہجری کا نصف اول ہے، مزید برآں اسناد اور تنقید اسناد محدثین کے نزدیک جعلی اور مشکوک احادیث کی پہچان کا بہترین ذریعہ ہیں، لیکن شاخت کا کہنا ہے کہ علمائے اسلام کے یہ دعاوی بے بنیاد ہیں اور احادیث احکام کے سلسلہ میں ان کو پیش کرنا درست نہیں، اس کا دعویٰ ہے کہ اسناد کی ابتدا نہایت سادہ شکل میں ہوئی، ان کی تکمیل کہیں تیسری صدی ہجری میں

جا کر ہوئی۔ علمائے اسلام جن اسناد کو اول درجے کی اور معتمد ترین قرار دیتے ہیں ان کے بارے میں علماء کے خیالات سے اتفاق کرنا مشکل ہی ہے، اس کا کہنا ہے کہ سلسلۃ الذہب جسے اعلیٰ ترین معیاری سندوں میں شمار کیا جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ امام مالکؒ سے پیشتر کے دور میں پھیلے ہوئے جعل و وضع کے عمل کا براہ راست نتیجہ ہیں۔ شاخت کے خیال میں اسناد انتہائی لاپروائی سے مرتب کر دی جاتی تھیں اور کسی بھی قدیم مستند شخصیت کے منہ میں اپنے پسندیدہ نظریات و خیالات ڈال کر اسے کسی بھی سند میں شامل کر دیا جاتا تھا۔

شاخت اموی انتظامی عمل کو فقہ اسلامی کا سرچشمہ قرار دیتا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول، شارع اور قانون ساز ماننے سے قطعاً منکر ہے، اس کے نزدیک حضورؐ کی حیثیت فقط ایک معلم اخلاق کی ہے، تشریع نہ حضورؐ کا منصب ہے نہ آپ کے فرائض میں شامل۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کی ابتدا، تشکیل اور ارتقا کے نقطۂ نظر سے شاخت کی نظر میں اصل اہمیت دور نبویؐ کو نہیں دور اموی کو حاصل ہے، اس طرح قرآن و سنت اور ان کے نصوص شاخت کے نزدیک اسلامی قانون کی نہ اساس ہیں، نہ ماخذ، نہ سرچشمہ۔ اس طرح شاخت کی نظر میں سارا احدیثی سرمایہ جعلی و وضعی قرار دے کر رد کر دیا جاتا ہے، اور نصوص قرآنیہ کو اگرچہ محرف یا جعلی قرار نہیں دیا جا سکا تاہم فقہ اسلامی کے ماخذ کی حیثیت سے عملاً ان کی اہمیت کا انکار کر دیا جاتا ہے۔

شاخت کے ان نظریات کی بنیاد اسی مفروضے پر قائم ہے کہ پہلی صدی ہجری میں قانون دین اسلام کے دائرہ سے باہر ایک قطعاً اجنبی چیز تھی، دوسری صدی ہجری میں اسے دین اسلام کے دائرے میں شامل کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطمح نظر ہرگز کسی تشریعی نظام کا قیام نہ تھا، آپ کا مقصد فقط اخلاقی اصلاح تھا، مگر قرآن کریم خود شاخت کے ان مفروضات کی

بلند آہنگی کے ساتھ تردید کرتا ہے، قرآن قانون و اخلاق کے اس جوہری اور بنیادی فرق اور علحدگی کا سرے سے قائل نہیں جو خالصتہً مغرب کی پیداوار ہے۔ اور جسے شاخت نے فقہ اسلامی کی تعبیر کے سلسلے میں رہنما اصول کے طور پر برتا ہے، قرآن کریم ہر قانونی حکم کو کسی نہ کسی اخلاقی قدر سے مربوط کرتا ہے اور دونوں کو کسی نہ کسی صفت خداوندی سے وابستہ کر دیتا ہے۔ اور اس طرح ایمان، اخلاق اور قانون کو ایک مسلسل غیر منقطع رشتے میں پرو دیتا ہے۔ اسی طرح قرآن نے خالص مذہبی، اخلاقی، قانونی، عدالتی، فوجداری، دیوانی غرض کہ سارے معاملات کے بارے میں خدا اور رسول کے حکم کے آگے غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کیا ہے۔ خود قرآن رسول کریمؐ کے ہر فیصلے کو چاہے، اس کا دائرہ کار کچھ بھی ہو، آخری اور ناقابل مرافعہ حیثیت دیتا ہے۔ قرآن کریم کا سرسری مطالعہ بھی یہ واضح کر دیتا ہے، کہ قرآن انسان کے دل و دماغ میں یہ جذبہ اور فکر پیدا کرنا چاہتا ہے کہ ہر معاملے میں خدا اور رسول کی طرف رجوع کیا جائے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قانون جو انسان کے خارجی اعمال و افعال کی ضابطہ بندی ہی کا دوسرا نام ہو۔ وہ قرآن کے دائرہ عمل سے باہر رہے، علاوہ بریں شاخت نے اس بات کو بالکل نظرانداز کر دیا کہ اسلامی قانون کی ابتدا اموی دور سے یعنی ۱۰۰ھ ہجری سے کرنے کے نتیجہ میں اس نے ایک ایسا معاشرتی قانونی خلا پیدا کیا جسے وہ کسی طرح سے پر نہیں کر سکتا۔ یہ تصور کہ پوری ایک صدی تک اسلامی معاشرہ بغیر کسی قانون کے رہا، ایک ایسا عجیب و غریب نظریہ ہے کہ اسے کسی درجے میں تسلیم کرنا ممکن نہیں۔ پورے سو سال تک قانون یعنی اسلام کے پیروؤں کے خارجی اعمال و افعال کی ضابطہ بندی کے لیے کوئی چیز موجود نہیں تھی سوائے عرف و عادہ اور رسم و رواج کے ایک ایسی بات ہے۔ جسے کہنے اور ماننے کے لیے بڑی دیدہ دلیری اور واقعات و حالات سے نگاہیں چرانے کی جرأت کی ضرورت ہے، شاخت کا دعویٰ دراصل یہ ہے کہ ان سو سال کے دوران اسلامی

معاشرے نے قانونی ماخذ کے طور پر نہ تو قرآن کو درخور اعتنا سمجھا نہ حدیث کو بلکہ قانونی ماخذ کے طور پر وہ ان رسم و رواج عرف و عادۃ کو جو قبل اسلام کے جاہلی معاشرے کی باقیات تھیں نیز خلافت اسلامیہ سے ملحقہ ملکوں اور قوموں کے رسم و رواج کو قانونی ماخذ کے طور پر استعمال کرتے رہے، یہ دعویٰ کس حد تک واقعات کے مطابق ہے اور کہاں تک اہل بصیرت کے نزدیک قابل قبول خود ارباب فکر اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں، یہ سمجھنا اور سمجھانے کی کوشش کرنا کہ ۱۳ سو سال کا یہ زمانہ جو انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ انقلابی، نتائج خیز، فکر انگیز اور تغیر و تبدل سے لبریز دور ہے، سارے پیش آنے والے چیلنجوں کا جواب قانونی سطح پر دور جاہلیت اور ملحقہ ملکوں کے رسم و رواج کے ذریعے دیتا رہا۔ دیوانے کا خواب نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔ استعیذ اللہ مما یفترون۔

یہودیت اس بے جگری کے ساتھ شاید ہی کبھی اس سے پہلے اسلام کے قلب و جگر پر حملہ آور ہوئی ہو۔ ہماری بے بسی اور بے حسی یہ ہے کہ ہم اسلامی قانون کی تاریخ پڑھنے اور سمجھنے کے لیے آج بھی اعدائے اسلام کی کج فکریوں کے محتاج ہیں۔ ہمارے پاس آج بھی فقہ اسلامی کے ارتقائی دور کو سمجھنے کیلئے مسلمان اہل قلم کی معیاری علمی تحریریں موجود نہیں۔ کیا اس فکری تہی دستی کو دور کرنے کیلئے دارالمصنفین جیسا وقیع ادارہ کچھ کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے؟

حکم اقراء کے ثقافتی پہلو

اور

شاہان عباسی کی عالمگیر تحریک کتب خانہ سازی کے اثرات

از۔ ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی، سینیر لائبریرین، بیرو یونیورسٹی، کانو، نائیجیریا۔

ملک اور بیرون ملک کے نامور اہل علم نے اسلامی عہد کے کتب خانوں کو اپنا موضوع بحث بنایا لیکن سب نے گنے چنے معروف و مشہور کتب خانوں کا ذکر کیا۔ مولانا شبلی اور مستشرق اولگا پنٹو نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا اس نے اس موضوع پر محققین کو قلم اٹھانے پر آمادہ کیا، چنانچہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے بعض نئے پہلو مثلاً وراقت اور انتظام کتب خانہ پر لکھا۔ بعد میں اس موضوع پر لکھنے والوں کا یہی سرمایہ معلومات رہا ہے، چنانچہ مصر و شام کے نامور اہل علم ڈاکٹر شبلی اور ڈاکٹر محمد ماہر حمادہ کی معلومات بھی اولگا پنٹو سے زیادہ نہیں، شاذ و نادر ہی کہیں ان کے یہاں نئی معلومات ملتی ہیں۔

اسلامی عہد میں مسلمانوں کی علمی تاریخ کا باب نہایت شاندار رہا ہے، خاص طور پر عہد عباسی کو اس باب میں امتیاز خاص حاصل ہے، اس دور میں کتب خانوں کی اتنی کثرت رہی ہے کہ اس سے قبل انسانی تاریخ کے کسی دور میں بھی کتب خانوں کی اتنی کثرت و تنوع کا کہیں سراغ نہیں ملتا، اس لیے ان کے ذکر کے بغیر کتب خانوں کی تاریخ نامکمل ہے۔

حسن اتفاق سے اس موضوع پر لکھنے کیلئے قرعۂ فال میرے نام پر نکلا، میں نے اس امر کی کوشش کی

کہ مسلمانوں نے اپنے جملہ علوم وفنون کی اساس قرآن وسنت پر رکھی ہے، اور انہی سرچشموں سے انھوں نے اپنے گوناگوں علوم وفنون کی آبیاری کی اور انھیں تازگی وشادابی حاصل ہوئی۔ فن کتبخانہ بھی مسلمانوں کا خاص فن رہا ہے، اس فن کو پروان چڑھانے کے لیے انھوں نے جیسی دور رس دوررس اور گوناگوں خدمات انجام دی ہیں، عہد اسلامی سے قبل ہمیں کتب خانوں کی تاریخ میں کہیں سراغ نہیں لگتا۔

اس فن کی اساس حکم اقرار اور قیدوا العلم بالکتاب پر قائم ہے، اور اس کی ترقی اسی کا فیضان ہے۔ میں نے اس کی بنیادوں کو قرآن وسنت میں تلاش کیا اور الحمد للہ غور وفکر کے بعد ان کی کڑیاں مجھے ملتی گئیں۔ میں نے اپنے تحقیقی مقالہ میں انھیں واضح کرنے اور مشکلات فن کو حل کرنے کی کوشش کی ہے، اس کوشش میں کس حد تک مجھے کامیابی ہوسکی ہے اس کا کچھ اندازہ قارئین اکرام کو "حکم اقرار کے ثقافتی پہلو اور خلفاء عباسیہ کی عالمگیر تحریک کتب خانہ سازی کے اثرات" سے ہوسکے گا۔ اس مقالہ میں جو خوبی آسکی ہے، اسے اسلامی تعلیمات کا فیضان سمجھئے اور جو لغزش وخطا ہو وہ میری طرف سے ہے۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب،

غار حرا میں اقرا کے حکم نے عربوں کو الکتاب کی (۱) قرأت (۲) کتابت (۳) حفاظت اور (۴) اشاعت کا پابند کر کے علم وعرفان کا دلدادہ وشیدا بنایا، پھر ان کی دعوت پر جس قوم وملت نے اقرار کے نور کی معرفت کو دل میں جگہ دی وہ بھی مذکورۂ بالا چار باتوں کی خوگر ہوگئی، اس طرح نور اقراء سے عالم میں علمی دور کا آغاز ہوا اور تحریک علوم وکتب کے احیاء کا ایسا ترقی پذیر سلسلہ شروع ہوا کہ جب تک اس عالم میں اقرأ کا سلسلہ قائم ہے اسکی تحریک احیائے علوم وکتب کا دریائے فیض رواں رہے گا۔ اقرأ کی اس تحریک احیائے علوم وکتب سے

کتب خانوں کا قیام عمل میں آیا، پھر شاہان عباسی نے خزانۃ الحکمۃ، بیت الحکمۃ، خزانۃ الکتب قائم کر کے بنی نوع انسان کے تمدنی و ثقافتی مشترکہ ورثہ کی حفاظت کے جذبہ کو مزید توانائی بخشی اور کتب خانہ سازی کی تحریک کو عالمگیر تحریک بنایا۔ اس کتب خانہ سازی کی عالمگیر تحریک کے دیرپا اور دوررس اثرات حسب ذیل تھے

(۱) عرب جو اپنی قوت حافظہ پر غیر معمولی اعتماد کی وجہ سے اپنے علمی و ثقافتی ورثہ کو ضبط تحریر میں لانا عار سمجھتے رہے تھے[1] اس تحریک نے ان کے ذہن ہی کو بدل کر رکھ دیا، وہ اس کو فخر سمجھنے لگے، چنانچہ اوائل عہد عباسی میں پورے اسلامی قلمرو کے اندر تصنیف و تالیف اور تدوین علوم کے ترقی پذیر سلسلہ کا نہایت سرعت سے آغاز ہوا۔[2]

یہ عالمگیر و اجتماعی تحریک پورے اسلامی قلمرو میں پروان چڑھی اور ایسی مقبول عام ہوئی کہ اس کے چلانے اور کتب خانوں کو فروغ دینے کے لیے نہ مرکزی نہ صوبہ جاتی و بلدیاتی اداروں کی مدد درکار ہوئی حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک نے مسلم معاشرے کے احساسات اتنے بیدار کیے تھے کہ کتب خانوں کا قیام و اہتمام مسلم معاشرے کے ثقافتی آداب و لوازم میں سمجھا جانے لگا تھا

(۲) عہد عباسی میں کتب خانہ مسلمانوں کی تمدنی زندگی کا لازمی جز بن گیا تھا، اس لئے تذکرہ کی کتابوں میں کتابوں کے شوقین بادشاہوں، امیروں، وزیروں اور عالموں وغیرہ کے

---

[1] تقیید العلم تالیف احمد بن علی الخطیب بغدادی، تحقیق یوسف العش، دمشق، المعہد الفرنسی ۱۹۴۹ء ص ۱۰۱۔ [2] المحدث الفاصل بین الراوی والواعی تالیف الحسن بن عبد الرحمٰن الرامہرمزی، تحقیق محمد عجاج الخطیب بیروت، دار الفکر ۱۳۹۱ھ ص ۶۱۱ - ۶۱۲، تذکرۃ الحفاظ اللذہبی حیدرآباد الدکن، ط۔ ۳ مطبعۃ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ ۱۳۷۵ھ ج ۱ ص ۱۰، تاریخ الخلفاء سیوطی تحقیق محمد محی الدین عبد الحمید کراچی نور محمد کارخانہ تجارت کتب ۱۳۹۰ھ ص ۲۶۱ النجوم الزاہرہ فی اخبار ملوک مصر و القاہرۃ لابن تغری بردی القاہرہ مطبعۃ دار الکتب المصریہ ۱۳۴۸ھ ج ۱ ص ۳۵۱

کتب خانوں کے ذکر کرنے کا اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔ تذکرہ و تاریخ کی کتابوں میں کتب خانوں کا ذکر شاذ و نادر ہی ملتا ہے، شاہ دمشق الملک المعظم جو ایک عالم و نہایت فاضل مصنف تھا، تذکرہ نگاروں نے اس کے سب ہی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے لیکن اس علم دوست، معارف پرور و شیدائے کتب بادشاہ کے کتب خانہ کا کسی نے تذکرہ نہیں کیا، یاقوت نے ابوسعد محمد بن احمد عمیدی نحوی المتوفی سنہ ۴۳۳ھ کی کتاب تنقیح البلاغہ کا مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ اس کے کتب خانہ میں دیکھا تھا[1] اس لیے عمیدی کے ذکر میں اس کے کتب خانہ کا نام آگیا ورنہ پتہ بھی نہ چلتا کہ اس کا بھی کوئی کتب خانہ تھا۔

(۳) عہد عباسی میں بادشاہ، امیر، وزیر کے محل سرا در ذی حیثیت اور پڑھے لکھے لوگوں کے مکان میں کتب خانہ ہونا لوازمِ زندگی میں شمار کیا جاتا تھا، چنانچہ شاہانِ عباسی میں سے ہر ایک خلیفہ کے پاس کتب خانہ موجود تھا، لیکن تذکرہ نگاروں نے دو چار کے سوا کسی خلیفہ کے کتب خانے کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ عوام و خواص میں ان کے کتب خانوں کی بہت شہرت ہوتی تھی، چنانچہ صولی نے ایک موقعہ پر خلیفہ راضی باللہ سے یہ بات کہی تھی۔

یتحدث الناس بان سیدنا	عوام میں چرچا ہے کہ ہمارے بادشاہ
مع جلالتہ علمہ وعلو نعمتہ	نے جلالت علمی اور علوئے نعمت کے باوجود
عمل خزانۃ کتب کما عمل متقدموا	خزانہ کتب بنایا ہے جیسا کہ پیشرو بادشاہ
الخلفاء۔[2]	کتب خانے بناتے چلے آئے ہیں۔

---

[1] ارشاد الاریب الیٰ معرفۃ الادیب لیاقوت بتصحیح د، س، مرجلیوث ط، ۲، مصر مطبعۃ ہندیۃ سنہ ۱۹۲۳ء ج ۲ ص ۲۰۸ [2] اخبار الراضی باللہ والمتقی للہ للصولی القاہرہ طبعۃ میورث، د، سنہ ۱۹۳۵ء ص ۳۴، خزائن الکتب القدیمۃ فی العراق منذ اقدم العصور حتی سنہ ۱۰۰۰ھ، تالیف کورکیس عواد بغداد مطبعۃ المعارف سنہ ۱۹۴۸ء ص ۱۱۶

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ راضی باللہ کے تمام پیشرو بادشاہوں۔

منصور (۱۳۶ھ/۷۵۴ء - ۱۵۸ھ/۷۷۵ء) مہدی (۱۵۸ھ/۷۷۵ء - ۱۶۹ھ/۷۸۵ء) ہادی (۱۶۹ھ/۷۸۵ء - ۱۷۰ھ/۷۸۶ء)
رشید (۱۷۰ھ/۷۸۶ء - ۱۹۳ھ/۸۰۹ء) امین (۱۹۳ھ/۸۰۹ء - ۱۹۸ھ/۸۱۳ء) مامون (۱۹۸ھ/۸۱۳ء - ۲۱۸ھ/۸۳۳ء)
معتصم (۲۱۸ھ/۸۳۳ء - ۲۲۷ھ/۸۴۱ء) واثق (۲۲۷ھ/۸۴۲ء - ۲۳۲ھ/۸۴۷ء) متوکل (۲۳۲ھ/۸۴۷ء - ۲۴۶ھ/۸۶۱ء)
منتصر (۲۴۷ھ/۸۶۱ء - ۲۴۸ھ/۸۶۲ء) مستعین (۲۴۸ھ/۸۶۲ء - ۲۵۱ھ/۸۶۵ء) معتز (۲۵۱ھ/۸۶۶ء - ۲۵۵ھ/۸۶۹ء)
مہتدی (۲۵۵ھ/۸۶۹ء - ۲۵۶ھ/۸۷۰ء) معتمد (۲۵۶ھ/۸۷۰ء - ۲۷۹ھ/۸۹۲ء) معتضد (۲۷۹ھ/۸۹۲ء - ۲۸۹ھ/۹۰۲ء)
مکتفی (۲۸۹ھ/۹۰۲ء - ۲۹۵ھ/۹۰۸ء) مقتدر (۲۹۵ھ/۹۰۸ء - ۳۲۰ھ/۹۳۲ء) قاہر (۳۲۰ھ/۹۳۲ء - ۳۲۲ھ/۹۳۴ء)

کے پاس کتب خانے تھے، لیکن تاریخ کی کتابوں میں منصور، ہارون اور مامون کے سوا کسی کے کتب خانہ کا ذکر نہیں ملتا، یہ اس امر کا نہایت بین ثبوت ہے کہ عباسی دور میں کتب خانہ مسلمانوں کی ثقافتی زندگی کا ایک لازمی جز بن چکا تھا، ہر پڑھے لکھے کا گھر چھوٹے بڑے کتب خانے سے خالی نہیں تھا۔ اس امر میں بڑے لوگوں کی بڑی شہرت تھی، اور ان کے کتب خانے شہرت کی بنا پر ذکر سے مستغنی سمجھے جاتے تھے، اس لیے ان کے کتب خانوں کے متعلق زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں۔

(۴) مسلم معاشرہ میں عوام کے لیے کتب خانے بنانے کا عام معمول بن گیا تھا چنانچہ ابونصر احمد بن حامد اصفہانی المتوفی ۵۲۶ھ جو سلطان محمود سلجوقی کے خزانہ شاہی کا نگران تھا، تذکرہ نگاروں نے اس کا تذکرہ لکھا ہے[1] لیکن اس کے دارالکتب کا ذکر نہیں کیا، وجہ یہی ہے کہ عہد عباسی میں عوام کے لیے کتب خانے بنانے کا عام معمول تھا، اس لیے اس کے بانی و مؤسس کے ذکر کا اہتمام نہیں کیا جاتا تھا، اگر کوئی بہت ہی غیر معمولی کارنامہ ہوتا تو اس کا ذکر گاہ بگاہ

---

[1] وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان لابن خلکان مصر، المطبعۃ المیمنیۃ، ۱۳۱۰ھ ج ۱ ص ۶۰-۶۱

تذکرہ نگاروں کی زبان قلم پر آجاتا تھا، اہل خیر عموماً مسجدیں بنواتے اور ان میں کتب خانے قائم کرتے تھے، بعض اہل خیر کئی کئی مسجدیں مختلف شہروں میں تعمیر کراتے تھے، چنانچہ حسان بن سعید منیعی المتوفی ۴۶۳ھ نے بہت سی مسجدیں مختلف شہروں میں بنوائی تھیں،[1] ان میں کتب خانے بھی قائم تھے، لیکن ان کے غیر معمولی کارنامے کی وجہ سے تذکرہ نگار صرف جامع منیعی نیشاپوری کا ذکر کرتے ہیں اور بیت الکتب کا ذکر صرف عبد الغافر فارسی نے کیا،[2] اور کسی نے نہیں کیا، جس سے ہمارے مذکورہ بالا دعوے کی مزید تائید ہوتی ہے۔

(۵) عہد عباسی میں تیسری صدی ہجری کے نصف اول میں اہل علم کی سہولت و افادہ کیلئے بغداد کے اندر گھروں میں (انفرادی) اور راستوں اور چوراہوں پر عوامی کتب خانے موجود تھے،[3]

(۶) اسلامی قلمرو کے بعض شہروں میں صرف عوامی کتب خانوں کی تعداد دس تک پہنچ گئی تھی، چنانچہ یاقوت نے مرو شاہجہاں کے بیان میں دوسرے اقسام کے کتب خانوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف دس ایسے مشہور عوامی کتب خانوں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے، جن سے دو سو مجلدات بلا زر ضمانت بآسانی مل جاتی تھیں۔[4]

(۷) سلاطین بھی عوامی کتب خانوں کے قیام کو خیر و برکت اور عزت و شرف کا

---

[1] کتاب الانساب للسمعانی لیڈن لے یجے بریل ۱۹۱۲ء ورق ۴۳۵، اللباب فی تہذیب الانساب لابن الاثیر بغداد، مکتبۃ المثنی، ب ت، ج ۳ ص ۲۶۶ [2] السیاق لتالیف عبد الغافر تحقیق The Histories of Nishapur Richard N. Frye Hague Mouton 1965 ورق ۱۱۰ ب و نشر معہ المنتخب من کتاب السیاق لعبد الغافر الفارسی لابراہیم بن محمد الصریفینی [3] کتاب الحیوان للجاحظ تحقیق عبد السلام محمد ہارون مصر، مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی ۱۳۵۶ھ ج ۱ ص ۶۰-۶۱ [4] معجم البلدان مولفہ یاقوت، بیروت دار صادر ۱۳۷۴ھ ج ۵ ص ۱۱۴۔

کام سمجھتے، اور اس میں مسابقت کو پسندیدہ اور نہایت شریفانہ اقدام خیال کرتے تھے، چنانچہ عضدالدولہ نے بصرہ میں جب ابن سوار کے دارالکتب کو دیکھا تو کہا تھا ھذہ مکرمۃ سبقنا الیھا[1] یہ ایسا خیر کا کارنامہ ہے جس میں ابن سوار ہم سے گوے سبقت لے گیا ہو۔ عضدالدولہ کے مذکورہ بالا جملہ میں عوامی کتب خانوں کے قیام کا ایک گونہ عزم و ارادہ بھی پایا جاتا ہے۔

(۸) ہر جامع مسجد اور ہر اُس مسجد میں جس کے اندر درس کا حلقہ قائم ہوتا تھا، عوامی کتب خانہ بنایا جاتا تھا۔[2] پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں جب خلیفہ ناصر لدین اللہ نے روح العارفین نامی کتاب لکھی تو بغداد کی سو سے زیادہ مسجدوں میں اس کا درس دیا جاتا تھا[3] جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بغداد کی سو[4] سے زیادہ مسجدوں میں عوامی کتب خانے قائم تھے، کیونکہ ہر جامع مسجد اور ایسی مسجد میں جہاں تعلیمی حلقے قائم ہوتے تھے، عوامی کتب خانہ قائم کیا جاتا تھا[5] نیز اس سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوجاتی ہے کہ عہد عباسی میں عوامی اور نصابی کتب خانوں کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔

(۹) دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں کتب اور کتب خانوں میں انہاک اتنا بڑھ گیا تھا

---

[1] الکامل فی التاریخ لابن الاثیر، بیروت دار صادر للطباعۃ و النشر ۱۳۸۵ھ ج ۱ ص ۲۰ [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۴۴، تمدن عرب از گستاولی بان ترجمہ سید علی بلگرامی، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۸۹۸ء ص ۳۹۱ و ۳۹۹ الحضارۃ الاسلامیۃ فی القرن الرابع الہجری لآدم متز ترجمہ محمد عبد الہادی ابوریدہ، ط ۳، القاہرۃ، مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر، ۱۳۶۶ھ ج ۱ ص ۲۴۳ [3] المختصر المحتاج من تاریخ الحافظ ابی عبد اللہ ابن الدبیثی ا ۔ محمد الذہبی تحقیق مصطفیٰ جواد، بغداد مطبعۃ المعارف ۱۳۷۱ھ ج ۱ ص ۱۸۰ [5] ابن خلکان جلد ۱، ص ۴۹ تمدن عرب ص ۳۹۱۔ الحضارۃ الاسلامیہ لآدم متز جلد ۱، ص ۲۴۳

اہل علم اس کو بلند ترین عہدہ و منصب اور شاہوں کی قربت و مصاحبت سے بہتر و برتر سمجھنے لگے تھے۔ جاحظ کا بیان ہے: "میں جب اسحاق بن سلیمان ہاشمی المتوفی ۱۹۲ھ کے پاس ان کی گورنری سے معزولی کے بعد گیا اور انھیں کتب خانہ میں، کتابوں کے اندر منہمک دیکھا تو کہا تھا کہ آج کے دن سے زیادہ پُر وقار، بلند تر، بارعب اور باعظمت میں نے ہاشمی کو کبھی نہیں دیکھا تھا، اسلئے کہ اس نے ہیبت کے ساتھ محبت کو اور عظمت کے ساتھ حلاوت کو اور سیادت کے ساتھ عظمت کو جمع کر دیا تھا"[1]

(۱۰) زمانہ طالب علمی سے طلبہ کتب خانہ بنانے کی دھن میں لگ جاتے تھے، چنانچہ صولی المتوفی ۳۳۵ھ نے جب راضی باللہ اور اس کے بھائی ہارون کو پڑھانا شروع کیا اور انھیں منتخب فقہ و ادب اور لغت و تاریخ کی کتابیں خرید کر دیں تو عمل کل واحد منهما خزانة كتب ہر ایک نے اپنا کتب خانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔[2]

(۱۱) کتابیں پڑھے لکھے لوگوں کی زندگیاں بدلتی، ان کے اذہان کو جلا بخشتی، ان کے افکار میں ندرت و وسعت پیدا کرتی تھیں اور بے پڑھے لکھے لوگوں کے محل سراؤں اور دیوان خانوں کی سجاوٹ اور زینت کا بھی کام دیتی تھیں جس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں نے کتب اور کتب خانوں سے تطہیر قلب و نظر اور تزکیۂ ذہن و فکر کے علاوہ آرائش مکین و مکان کا بھی کام لیا تھا، چنانچہ اسکا عملی مظاہرہ عباسی قلمرو سے باہر مشرق کے علاوہ مغرب میں بھی ہوتا رہتا تھا، حضرمی کا بیان ہے کہ میں قرطبہ کے سوق الکتب میں اپنی مطلوبہ کتاب کی طلب و جستجو میں مدت سے منتظر تھا، ایک وقت ایسا آیا کہ وہ کتاب روشن خط اور

---

[1] کتاب الحیوان للجاحظ ج ۱، ص ۶۱-۶۲ [2] الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ لابن الطقطقی بیروت دار صادر ۱۳۸۰ھ ص ۲۶ [3] اخبار الراضی للصولی، ص ۳۹-۴۰۔

عمدہ قسم کے ساتھ نظر آئی مجھے بہت خوشی ہوئی، میں اس کی قیمت بڑھا کر دینے لگا لیکن
بولی لگانے والا میری زیادہ قیمت پر بڑھتا رہا اور حد سے نکل گیا، میں نے آواز لگانے والے سے
پوچھا ذرا بتاؤ کون ہے جو اس کتاب کی قیمت لگانے میں اتنا بڑھ گیا ہے کہ مقابلہ نہیں کیا جا سکتا،
اس نے ایک امیر آدمی کی طرف اشارہ کیا میں نے اس سے جا کر کہا، جناب فقیہہ اگر آپ کو
اس کی ضرورت ہے تو میں اس کو چھوڑتا ہوں اس کی قیمت انتہا کو پہنچ گئی ہے، اس نے
کہا جناب میں کوئی فقیہہ نہیں، نہ مجھے یہ علم ہے کہ اس میں کیا لکھا ہے، میں نے کتب خانہ بنایا ہے
تاکہ شہر کی سربرآوردہ شخصیتوں میں میرا شمار ہونے لگے، اب میرے کتب خانہ کی الماری میں
بس اس کتاب کے رکھنے کی گنجائش ہے، میں نے جب اس کی ظاہری آرائش و زینت دیکھی
تو یہ قلب و نظر میں سما گئی، زیادہ قیمت کی میں نے کوئی پرواہ نہیں کی اللہ تعالیٰ کا احسان
ہے، اس نے رزق و دولت فراوان دے رکھی ہے، اس کے اس جملہ نے مجھے یہ کہنے پر آمادہ
کیا کہ بلاشبہ دولت آپ ہی جیسوں کے پاس آتی ہے وہ اخروٹ انہی کو کھلاتا ہے جن کے دانت
نہیں ہوتے، جو کچھ کتاب میں ہے اس کو میں جانتا ہوں اور اس سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں لیکن
میرے پاس پیسہ اتنا نہیں ہے کہ اسے لے سکتا۔[۵۱]

(۱۲) مسلم معاشرہ کی ذہنی سطح اتنی بلند ہو چکی تھی کہ قیادت و سیادت اپنا بھرم رکھنے
کے لیے کتب خانوں کی محتاج تھی، کسی شخص کی قیادت و سیادت کے متعلق رائے قائم نہیں
ہو سکتی تھی، جب تک یہ نہیں معلوم ہو جاتا تھا کہ اس کی ملکیت میں کتب خانہ ہے، جیسا کہ
مذکورہ بالا واقعہ سے ثابت ہے اس حقیقت کا انکشاف مذکورہ بالا خاص واقعہ کی وجہ سے
ہوا ورنہ پتہ بھی نہ چلتا کہ مسلم معاشرہ میں عزت و شرف کی خاطر جاہلوں کو بھی قابلِ رشک

---

۵۱ نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب تالیف احمد بن محمد احمدی تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید، بیروت
دارالکتاب العربی ۱۳۶۹ھ ج ۲ ص ۱۰۱

کتب خانہ بنانا پڑتا تھا۔

(۱۳) عہد عباسی میں مسلم معاشرے کے اندر اہل علم کو کتابوں کے دیکھنے، مطالعہ کرنے اور خریدنے کا ذوق و شوق اتنا بڑھ گیا تھا کہ ہر عالم اپنی بساط و استطاعت کی حد تک کتاب کبھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا، جب کتاب کی قیمت اس کے بوتے سے باہر ہو جاتی تھی وہ خاموشی اختیار کرتا تھا، حضرمی کا واقعہ اس امر کا واضح ثبوت ہے۔

(۱۴) عہد عباسی میں دربار سے وابستہ اہل علم کے لئے کتب خانہ رکھنا اس لئے بھی ناگزیر تھا، کہ ان کے پاس فرمانرواؤں کی طرف سے علمی سوالات آتے رہتے تھے، جن کے جوابات کے لیے کتابوں سے مراجعت ضروری ہوتی تھی، چنانچہ ابو علی صقلی کا بیان ہے

> میں ابن خالویہ المتوفی سنہ ۳۷۰ھ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ سیف الدولہ کا فرستادہ لغت سے متعلق چند سوالات لیکر آیا، ابن خالویہ انھیں دیکھکر کچھ پریشان ہوئے، پھر اپنے خزانۂ کتب میں آئے، کتابیں نکالیں، تلامذہ میں تقسیم کیں تاکہ ان باتوں کا جواب دیا جائے۔[۵]

(۱۵) عہد عباسی میں مشرق سے مغرب تک کتابوں کی ظاہری زیب و زینت بھی ہونے لگی اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے تزئین و آرائش پر بھی خوب زور دیا جانے لگا تھا جیسا کہ حضرمی کے مذکورہ بالا واقعہ سے ظاہر ہے، نیز کتابوں کی آرائش و زیبائش کا فن اتنا ترقی کر گیا تھا کہ

---

۵ رسالۃ ابن القارح لعلی بن منصور المعروف بابن القارح تحقیق عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی ط ۲ القاہرہ دارالمعارف ۱۳۹۶ھ ص ۳۳ یہ رسالہ، رسالۃ الغفران للمعری کے ساتھ شائع ہوا ہے، نیز ملاحظہ ہو رسالۃ الغفران ص ۵۰۴، و مراتب النحویین تالیف عبدالواحد اللغوی المتوفی ۳۵۱ھ تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم، القاہرۃ، مکتبہ نہضۃ مصر ۱۳۷۵ھ مقدمۃ المحقق ص ۵۔

اس دور کے مطلوب صفحے کی کتاب کی سجاوٹ پر دس دس تولہ سونا لگا دیا جاتا تھا، چنانچہ فقیہ ابوالیث سمرقندی المتوفی ۳۷۳ھ کی کتاب بستان العارفین کے نسخہ کی زرکوبی و طلا کاری میں دس دینار در وراق اور ایک حبہ کے بقدر زر خالص استعمال کیا گیا تھا۔[1]

(۱۶) اہل علم اپنے لئے ہی نہیں اپنی اولاد کے لئے بھی کتب خانہ علیحدہ بنانے لگے تھے، چنانچہ ابوالحسن علی بن عبداللہ نطاکی المتوفی ۵۴۱ھ نے جو بہت اچھے خطاط تھے، تین خزائن کتب بنائے تھے، ایک کتب خانہ اپنے لئے، دوسرا اپنے فرزند ابوالبرکات عبدالقاہر کے لئے اور تیسرا ابوعبداللہ حسن کے لئے بنایا تھا۔[2]

(۱۷) بعض عوامی کتب خانوں میں کتابوں کے علاوہ شائقین کتب کو نقد رقم بھی دی جاتی تھی، چنانچہ ابن سوار، بصرہ، رامہرمز کے کتب خانوں میں استفادہ کرنے والوں کو نقدی بھی دیتا تھا۔[3] ابوالقاسم جعفر موصلی المتوفی ۳۱۳ھ موصل میں اسی طرح کی داد و دہش کرتا تھا۔[4] تاکہ کتب خانوں سے ذوق و شوق میں مزید اضافہ ہوتا رہے اور عوام کتاب اور کتب خانوں سے قریب سے قریب تر ہوتے چلے جائیں۔

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ سرکار ہی نہیں دولتمند طبقہ بھی غیر سرکاری طور پر کتب اور کتب خانوں کے فروغ کے لئے ان عوامل کو پیش نظر رکھتا تھا، جو استفادۂ کتب کی

---

[1] مرآۃ الزمان فی تاریخ الاعیان تالیف یوسف بن قزاوغلی، حیدرآباد الدکن، مطبعۃ دائرۃ المعارف النعمانیہ سنہ ۱۳۷۰ھ ص ۲۴۳، مدارس بغداد فی العصر العباسی مولفہ عماد عبدالسلام رؤف العطار، مطبعہ دار البصری بغداد العلمیہ ۱۹۶۶ء ص ۱۶۷ [2] معجم الادباء ج ۶ ص ۲۲، اعلام النبلاء بتاریخ حلب الشہباء تالیف محمد راغب الطباخ المطبعۃ حلب سنہ ۱۳۴۳ھ ج ۴ ص ۲۰۴ [3] احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم للمقدسی، مطبعۃ بریل لیڈن ۱۹۰۶ء ص ۴۱۳، الحضارۃ الاسلامیہ لآدم متز، ج ۱ ص ۲۴۹ [4] معجم الادباء ج ۲ ص ۴۲۰۔

راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتا ہے، افلاس اور روٹی کا مسئلہ جو آج بھی ایک دین اور نظام حیات بنا ہوا ہے۔ اس تحریک نے دولت مندوں کے ذہن کو ایسی جلا دی تھی کہ وہ کتب و کتاب خانوں کے شائقین اور استفادہ کے خواہش مندوں کی وابستگی و شیفتگی کو برقرار رکھنے کے لئے ان کی ضروریات زندگی بھی نقدی کی صورت میں مہیا کرنے لگے تھے، تاکہ کتب اور کتب خانوں سے دلچسپی و وابستگی کا سلسلہ دائم و قائم رہے۔

(۱۰) اس تحریک نے ایک ایسے نظام کتب خانہ کو جنم دیا جس نے ان تمام کڑیوں کو جن کے قیام اہتمام کے لیے آج مملکتوں کا سہارا لیا جاتا ہے، ٹیکس لگائے جاتے ہیں، محض ایک اخلاقی و روحانی نظام "صدقہ جاریہ" کے ذریعہ مربوط و استوار کر رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نظام کے اندر چھوٹے سے چھوٹے پائنٹ اور ڈپو (مستقر) بیت الحکمت تک ہر ایک، ایک ہی سلسلہ میں منسلک نظر آتا ہے، حالانکہ آج کے دور میں ان کڑیوں کو باہم پیوست رکھنے کے لیے مالیاتی سرچشمہ کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ اسی لیے ریٹ سپورٹیڈ (RATE- SUPPORTed) اور ٹیکس سپورٹیڈ (TAX-SU-PPORTed) لائبریریاں قائم کی جاتی ہیں۔[1] اس مالیاتی سرچشمہ سے دیگر کتب خانوں کو منسلک کرنے کے لئے کبھی بل، ایکٹ اور کبھی آرڈیننس منظور کئے جاتے ہیں، اس کے باوجود خدمت کی کمی کا احساس شدت سے کیا جاتا ہے۔ اسلام نے اشاعت علوم کی جو تحریک چلائی اور جو نظام قائم کیا اس نے اس قسم کے جبری مالیاتی نظام کے ذریعہ ان مختلف کڑیوں کو مربوط و منسلک رکھنے کے بجائے ایک اخلاقی و روحانی نظریہ سے اس کا رشتہ قائم کیا جو صدقہ جاریہ کے نام سے آج بھی عالم میں جاری و ساری ہے، صدقہ جاریہ کے پیچھے جو قوت نافذہ سرگرم عمل نظر آتی ہے، وہ قرآن و سنت کا پیدا کردہ یقین ہے، وہی دراصل وہ قوت نافذہ ہے،

---

[1] انسائکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۱۴ ص، طبع ۱۹۶۶ء شکاگو (امریکہ)

جو ہمیشہ اپنے مظاہر مکانی رکھتی ہے، اس کی فیض بخشیاں بلا قید زمان و مکاں آج بھی ہر جگہ جاری تھیں اور عجیب بات یہ ہے کہ تملیکی نشاط (POSSESIVE HAPPINESS)
کا اصول مظاہرہ بھی اس نظام میں نظر آتا ہے، چنانچہ عہد عباسی میں ذاتی کتب خانوں کا بلا تفریق مذہب و ملت، رنگ و نسل، مسلک و عقیدہ ہر شخص کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھنا اسی اخلاقی قوت نافذہ کا عمل و اثر تھا، انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیمات نے صدقہ جاریہ کے حدود کو بہت وسعت دی اور ..... اس کی جڑیں بہت مضبوط کر دی اور بہت دور تک پھیلا دی تھیں،

(۱۹) ذاتی کتب خانوں نے عوامی کتب خانوں کی خدمات انجام دینا شروع کر دی تھیں وہ بھی اہل علم کی علمی تشنگی دور کرنے، روحانی اور دماغی سامان فراہم کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ابو الفضل عبید اللہ میکالی المتوفی ۴۳۶ھ نے اپنے نہایت نادر و بیش قیمت خزانہ کتب سے علامہ ثعالبی المتوفی ۴۲۹ھ کو بہت بڑی تعداد میں کتابیں دیہات میں لے جانے کی اجازت بھی دے دی تھی، جس کا تذکرہ علامہ ثعالبی نے حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

" مجھے امیر موصوف نے اجازت دی تھی کہ میں ان کی کتابوں کے خزانوں سے زاد راہ کے پھلوں کو ساتھ رکھ لوں تاکہ جس کام کے میں درپے ہوں اس سے اس میں مدد لیتا رہوں، یہ امیر رہنما کی طرح ہیں جو مسافر کی توشہ سے مدد کرتا اور طبیب کی طرح ہیں جو مریض کو دوا کے ساتھ غذا بھی دیتا ہے، اس طرح گویا مجھے ادبی کتابوں کے ساتھ چھوڑ دیا گیا جن سے مطلب کی باتیں نکالتا، اقتباس لیتا، ابواب بندی کرتا، فصلیں قائم کرتا، نوع بنوع ترتیب دیتا تھا، اور ائمہ فن خلیل، اصمعی، ابو عمرو شیبانی، کسائی، فرا، ابو زید، ابو عبید، ابو عبیدہ، ابن الاعرابی

نضر بن شمیل، ابو العباس مبرد، ابو العباس ثعلب، ابن درید، نفطویہ، ابن خالویہ، خازنجی، ازہری اور ان کے علاوہ ظریف ادیب جو فصاحت و بلاغت کے جامع تھے، جیسے صاحب ابو القاسم، حمزہ بن حسن اصبہانی، ابو الفتح مراغی، ابوبکر خوارزمی، قاضی ابو الحسن، علی بن عبد العزیز جرجانی، ابو الحسن احمد بن فارس ذکریا قزوینی کے انوار و فیوضات سے مستفید ہونے لگا۔[۱]

علامہ ثعالبی نے امیر موصوف کا مقابلہ اس طبیب سے کیا ہے جو اپنے دواخانہ سے جسمانی امراض کے لئے دوا و غذا دونوں مریضوں کو پہنچاتا ہے، امیر موصوف نے بھی روحانی و دماغی تسکین کے لیے کتب خانہ بنایا تھا، کتب خانہ بہمہ وجوہ یہ خدمت انجام دیتا تھا، یہ خود بھی محققین کی رہنمائی کرتے ان کی علمی تشنگی کو دور کرنے کے لیے زبان و قلم سے عالم کو فائدہ پہنچاتے اور اپنے کتب خانے سے نادر کتابیں بے تامل شہر ہی میں نہیں دیہات میں لے جانے کے لیے بھی دیتے تھے، اس طرح ان کے کتب خانے سے دور و نزدیک ہر جگہ فائدہ اٹھایا جاتا تھا، گویا اس تحریک نے ذاتی کتب خانوں کو اپنی ہیئت و خدمات میں عوامی کتب خانوں کے ہمسر بنا دیا تھا اور انھیں ادارہ جاتی اور عوامی کتب خانوں کی خدمات میں تبدیل کر دیا تھا جیسا کہ مذکورۂ بالا واقعہ سے عیاں ہے۔

(۲۰) اس تحریک نے کتب خانوں کو ایسا مرغوب خاطر بنایا تھا، رشتۂ ازدواج کے انتخاب کے لیے مال و منال اور حسب و جمال کی طرح کتب خانے کے وجہ انتخاب بننے کا رجحان بھی اہل علم کو ہونے لگا تھا، چنانچہ امام اسحاق بن راہویہ المتوفی ۲۳۸ھ نے سلیمان عبد اللہ زعفرانی المتوفی ۲۲۱ھ کی بیٹی سے شادی اس لیے کی تھی کہ انھیں اس سے امام شافعیؒ کی

---

[۱] فقہ اللغۃ و سر العربیۃ تالیف عبد الملک الثعالبی تحقیق مصطفیٰ السقا وغیرہ، ط ۲ مصر مطبعۃ مصطفیٰ البابی الحلبی ۱۳۷۴ھ، ص ۱۶۹۔

مجلد تصانیف پر مشتمل کتب خانہ دیا گیا تھا۔[1]

اسے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی میں عقد نکاح صرف شرعی اور سماجی ضرورت نہیں سمجھی جانے لگی تھی بلکہ وہ علمی ضرورت بھی بننے لگی تھی، علم، کتب اور کتب خانے ایک مقام سے دوسرے مقام پر اسی نسبت سے منتقل ہوتے اور یوں اس مقام کو بھی شہرت و بقائے دوام حاصل ہوتا تھا۔[2]

اس واقعہ کو چنداں حیرت و استعجاب سے نہیں دیکھنا چاہئے اس ترقی یافتہ دور میں بھی کتب خانہ جہیز میں دینے کا رجحان پایا جاتا ہے، چنانچہ اس دور کی نامور علم دوست شخصیت و اخلاق و شرافت کی یادگار ہمدرد دواخانہ کے سربراہ حافظ حکیم محمد سعید صاحب دہلوی نے اپنی دختر نیک اختر کے جہیز میں ذاتی کتب خانہ دے کر اسلاف کی یاد از سر نو تازہ کی ہے، کثر اللہ فینا امثالہم

(۲) عہد عباسی میں کتب خانوں کی اہمیت و افادیت اتنی بڑھ چکی اور عام ہو چکی تھی کہ علم کے جویا اور رسیا، معذور و محتاج ہونے کے باوجود علم و حکمت کے خزانوں کی جستجو میں سفر کرنے لگے تھے، وہ ان کی علمی ثروت سے بہرہ مند ہوتے، ان کی خدمات کا برملا اعتراف کرتے، عہد کی تعریف کرتے، ان کی ثقافتی سرگرمیوں کا اشعار و خطوط میں تذکرہ کرتے تھے، چنانچہ عربی زبان کا نامور فلسفی و نابینا شاعر ابو العلاء معری (۳۶۳ھ - ۴۴۹ھ) نے معرہ سے بغداد کا سفر مشہور کتب خانہ دار العلم سابور سے استفادہ کی خاطر کیا تھا۔[3] وہ دار العلم کے خازن عبد السلام بصری المتوفی [illegible] کی ہفتہ وار ادبی مجلسوں میں شرکت کرتا تھا، اس نے اپنے اشعار میں عبد السلام بصری کا

---

[1] الانساب ورق ۲۰۰، [2] اللباب ج ۲ ص ۱، [3] ایضاً ج ۱ ص ۲۲۳ [4] انباہ الرواۃ علی انباہ النحاۃ تالیف علی بن یوسف القفطی تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم، القاہرہ مطبعۃ دار الکتب المصریۃ ۱۳۶۹ھ ج ۱ ص ۵

ذکر کیا ہے۔[1] اپنے ماموں کو ایک خط میں بغداد کے ایک سفر کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: "اقدمنی تلدث البلاد مکان دار الکتب بہا"[2] بغداد میں دار الکتب کا قیام ہی مجھے یہاں کھینچ لایا ہے، اس نے اس کو سب سے بہتر جگہ قرار دی ہے[3] اسی طرح معری نے طرابلس الشام کا سفر کیا، اور اس وقت کے عظیم کتب خانوں سے فائدہ اٹھایا[4]

(۲۲) عہد عباسی میں کتابوں سے محبت ان کی اہمیت و افادیت اہل علم کے دل و دماغ میں ایسی بیٹھ گئی اور علمی و کتابی ضروریات کے ترقی پذیر سلسلہ کی تعمیر و تشکیل ان کے قلب و نظر میں ایسی سما گئی تھی کہ وہ اپنی اور بیوی بچوں کی جان پر فقر و فاقہ برداشت کرتے لیکن کتابوں کی جدائی اور اپنے علمی ذخیروں میں کمی کو گوارا نہیں کرتے تھے، چنانچہ ابراہیم حربی المتوفی ۲۸۵ھ کا مندرجہ ذیل واقعہ اس امر کا شاہد عدل ہے۔

ایک مرتبہ ان پر کئی دن فاقے سے گزر گئے، بیوی نے آکر عرض کیا میں اور آپ تو صبر سے بیٹھے رہیں گے لیکن ان دو بچیوں کو کہاں تک بھوکا ماروں، اپنی کتابوں میں سے کچھ دیجیے انھیں بیچیں یا گروی رکھیں۔ موصوف کا بیان ہے میں نے ذرا بخل سے کام لیا اور کہا: "ان کے لیے تم کہیں سے قرض لے لو، مجھے ایک دن کی اور مہلت دو، میرے مکان کی دہلیز کے پاس میرا بیت الکتب تھا جہاں بیٹھ کر لکھتا پڑھتا تھا، رات کو ایک شخص نے آکر دستک دی میں نے کہا کون! وہ بولا، آپ کا پڑوسی! میں نے کہا آئیے، اس نے کہا پہلے چراغ بجھا دیجیے

---

[1] انباہ الرواۃ و سقط الزند للمعری، بیروت، دار صادر للطباعۃ و النشر، ۱۳۷۶ھ ص ۱۷، تجدید ذکری ابی العلا طا ۶ القاہرہ . . . . دار المعارف ۱۹۶۳ء ص ۱۲۱ [2] خزائن الکتب القدیمۃ فی العراق للعواد ص ۱۴۱ [3] رسائل ابی العلاء المعری تحقیق . . . آکسفورڈ کلیرنڈن پریس ۱۸۹۸ء ص ۳۴ [4] انباہ الرواۃ للقفطی ج ۱ ص ۴۹

پھر آدھ گانمیں نے جو اناج بست مدھم کر دیا تھا (اٹھالیا) ایک رومال میں پانچ سو درہم اور کھانے کا سامان رکھکر چلا گیا میں نے بیوی کو بلایا اور کہا بچوں کو کھلا دو۔[1]

ابراہیم حربی نے فقر و فاقہ، پیٹ کی آگ سب کچھ اپنے اور بیوی پر ہی نہیں بچوں پر بھی گوارا کیا، لیکن کتابوں کو بیچنا یا گروی رکھنا اور ذخیرہ میں کمی کر گوارا نہیں کیا، کیونکہ انہی کتابوں نے ان کی کتابِ زندگی کو سنوارا تھا، فکر کی تربیت کی تھی، ان کے ذہن کو جلا بخشی تھی اور ان کے مذاق و مزاج پر حاوی ہو گئی تھیں، بھلا ایسے محسن رفیق کو کون جدا کر سکتا تھا۔

(۲۳) عہد عباسی میں کتابوں سے محبت و شیفتگی اتنی بڑھ گئی تھی کہ اگر کسی کو اپنی زندگی میں کبھی بحالت مجبوری اپنی کچھ کتابیں جدا کرنی پڑتیں تو اہل علم کے دل و دماغ پر جو گزرتی وہ زبان قلم پر اشعار کی صورت میں آجاتی پھر جو اسے پڑھتا وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا، اور ان کتابوں کی خریداری پر پچھتاتا، اس کا جی چاہتا کہ کاش وہ کتابیں اس کے مالک کو واپس کر سکتا، چنانچہ اسی قسم کا ایک واقعہ نامور محدث و مصنف، ادیب و شاعر راوی کتاب المحدث الفاضل ابوالحسن علی بن احمد بن علی ایذجی فالی بغدادی المتوفی ۴۴۸ھ کے ساتھ پیش آیا تھا، گردش ایام سے موصوف کو کچھ کتابیں اپنے ذاتی کتب خانے سے نکالنی پڑیں، ان میں جمہرہ ابن درید کا نسخہ بھی تھا، قاضی ابوبکر بن بدیل تبریزی نے اسے پانچ دینار میں ان سے خریدا تھا، اور تبریز لے گئے، اس نسخہ سے ابو بکر زکریا تبریزی نے الجمہرہ کا نسخہ نقل کیا، دورانِ نقل انھیں اس کی ایک جلد میں فالی کا خط رکھا ملا جس پر فالی کے وہ اشعار لکھے ہوئے تھے جو اس نے اس کتاب کی جدائی پر کہے تھے، وہ کہتا ہے۔

---

[1] تاریخ بغداد للخطیب، مصر، مطبعۃ السعادۃ، ۱۳۴۹ھ ج ۶ ص ۳۲

[2] ایضاً ص ۳۳۔

انست بها عشرين حولا وبعتها فقد طال شوقي بعدها وحنيني

میں بیس برس نسخہ جمہرہ سے محبت کرتا رہا، اور جب میری محبت و اشتیاق بڑھ گیا اس موقع پر مجھے اسے بیچنا پڑا۔

وما كان ظني انني سابيعها ولو خلدتني في السجون ديوني

مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ میں اسکو بیچ ڈالونگا اگرچہ مجھے اسکی وجہ سے دائمی قرض کی قید میں رہنا پڑتا

ولكن لضعف وافتقار وصبية صغار عليهم تستهل شئوني

لیکن کمزوری، احتیاج اور چھوٹے چھوٹے بچوں کی وجہ سے جن پر میری آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں

فقلت ولم املك سوابق عبرة مقالة مكوي الفؤاد حزين

اب میں کہتا ہوں اور مجھے اب آنسوؤں پر قابو نہیں رہا، ایک غمگین اور سوختہ جگر کی بات

وقد تخرج الحاجات يا ام مالك كرائم من رب بهن ضنين

اے ام مالک حاجتیں نفیس چیزیں مالکوں سے نکلوا دیتی ہیں، جنھیں وہ جدا کرنا نہیں چاہتے مگر نکالنا پڑتی ہیں۔ زکریا تبریزی نے جب یہ رقعہ قاضی ابوبکر تبریزی کو دکھایا اس نے یہ شعر پڑھے تو کہنے لگا اگر اس کو پہلے دیکھا ہوتا تو میں یہ نسخہ قالی کو واپس کر دیتا، لیکن اب قالی دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔[1]

(۴۲) اس تحریک نے عہد عباسی میں کتابوں کی قدر ایسی بڑھائی تھی اور ذخیرۂ کتب کو ایسا بیش قیمت سرمایہ بنا دیا تھا کہ اسے گروی رکھا جاتا تھا۔[2] گویا کتابیں عہد عباسی میں زر خالص کی حیثیت رکھتی تھیں اس وجہ سے چور انہیں چراتے[3] اور اوباش انھیں لوٹا کرتے تھے۔[4] (باقی)

۱؎ معجم الادباء ج ۵ ص ۳۰۔ ۲؎ تاریخ بغداد للخطیب ج ۴ ص ۲۳۲۔ ۳؎ ایضاً۔ ۴؎ المنتظم فی تاریخ الملوک والامم لابن جوزی ج ۶ ص ۱۰۰ و البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۱۱ ص ۳۱۲۔ ۵؎ معجم الادباء ج ۳ ص ۱۰۲

علّامہ محمّد انور شاہ کشمیریؒ کی قرآن فہمی

از

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری شعبۂ عربی امر سنگھ سری نگر (کشمیر)

علّامہ محمد انور شاہ کشمیری حدیث و فقہ کے جلیل القدر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے اکابر مفسروں اور قرآنی علوم کے غواصوں میں سے بھی تھے، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قرآنی مشکلات سمجھنے کے لئے کبھی کبھی حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف رجوع کرتے تھے بلکہ علامہ عثمانی کو شاہ صاحبؒ کی قرآن فہمی پر ناز تھا، انھوں نے فتح الملہم میں اُن کے افادات و تحقیقات پورے اہتمام عقیدت کے ساتھ نقل کئے ہیں، اسی طرح اپنی اردو تفسیر میں بھی ان کی رائے کو آخری رائے کے طور پر درج کیا ہے، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کی تشریح کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحب کی عارفانہ تشریح کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس بحث میں میرے نزدیک قول فیصل وہی ہے، جو بقیۃ السلف بحر العلوم مولانا انور شاہ صاحب اطال اللہ بقاءہ نے فرمایا"[۱]

اسی طرح معراج سے متعلق مباحث میں حضرت علامہ کشمیریؒ کے افادات نہ صرف اپنی تفسیر میں نقل کئے ہیں، بلکہ فتح الملہم میں بھی من وعن درج کئے ہیں[۲]، اسی طرح رفع نزول حضرت عیسیٰؑ مقدس

۱؎ مقالات عثمانی: ص ۲۰۰، طبع اول لاہور ۱۹۶۲ء۔

۲؎ فتح الملہم بشرح صحیح مسلم: ج ۱ ص ۳۲۵،

حضرت داؤد وغیرہ جیسی مشکلات قرآنی میں بھی علامہ کشمیری ہی کے علوم و افکار سے خوشہ چینی کی ہے۔[۱]

علامہ کشمیریؒ نے مستقل طور پر کوئی تفسیر نہیں لکھی ہے، تاہم مشکلات القرآن کے نام سے تفسیر میں ان کی ایک مستقل تصنیف ہے، وہ ایک خاص طریقہ پر قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے تھے، نظاہر ان کی زندگی کے سارے لمحات قرآن و حدیث کے تدبر و تفکر کرنے میں ہی گذرے ہیں، تاہم رمضان کا پورا مہینہ وہ اسی کے لئے مخصوص رکھا کرتے تھے، وہ ایک دن میں ایک پارہ ختم کرتے تھے، اس طرح تیس پاروں کا مطالعہ پورے ایک مہینہ میں مکمل کرتے تھے بعض اوقات مقدس مہینہ پورا ہونے کے قریب ہوتا تھا، اور قرآن کا مطالعہ ادھورا رہ جاتا تھا مجبوراً آخر ایام میں مطالعہ کی رفتار تیز کرتے تھے۔[۲] مطالعہ ہی کے دوران جس آیت کو مشکل سمجھتے پہلے مفسرین کرام کی تحقیقات پر نظر رکھ کر اس پر غور کرتے تھے، اگر کسی مفسر کی تفسیر تسلی بخش نظر آتی تھی تو اس کا حوالہ دینے پر اکتفا کرتے تھے، اگر کسی بھی مفسر سے اطمینان نہیں ہوتا تھا تو خود غور و فکر کرکے کسی مفہوم پر پہنچنے کی کوشش کرتے تھے، اور اطمینان ہونے پر اس مفہوم کو قلمبند کرتے تھے۔ اس طرح کافی مدت کی تحقیق اور تفکر کے بعد ان کی بیاض میں ۱۰۹ مشکلات کی تفسیر جمع ہوئی، اس مجموعے کی تسوید و تبییض میں مولانا احمد رضا بجنوری ہاتھ بٹاتے تھے، مولانا موصوف ہی نے حوالجات کے مطابق اصلی نقول و اقتباسات کی طرف مراجعت کی ہے، اور ان کو حواشی پر درج کیا ہے، مزید برآں مولانا محمد انور شاہ کشمیری کے دوسرے ممتاز شاگرد مولانا محمد یوسف بنوری محدث نے مجموعے کی ابتدا میں عربی زبان میں ایک مبسوط مقدمہ درج کیا ہے، جس میں قرآن اور قرآنی علوم سے متعلق علامہ کشمیریؒ کے افادات ملفوظات اور تحقیقات پیش کئے ہیں، مثلاً

---

[۱] تفسیر عثمانی ص ۵۰۹ [۲] یتیمۃ البیان مقدمہ مشکلات القرآن ص ۵۵،

ناسخ و منسوخ کی حقیقت، قرآنی مقاصد کا تعین، اعجاز القرآن وغیرہ، محدث بنوری نے اپنی طرف سے بھی کئی مضامین کا اضافہ کیا ہے جن میں تنقیدی اشارات قابل مطالعہ ہیں، جو سرسید احمد خاں کی تفسیر، مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمان القرآن اور علامہ عنایت اللہ مشرقی کے تذکرہ سے تعلق رکھتی ہیں،

مقدمہ مولانا بنوری کو مستثنیٰ کر کے مشکلات القرآن ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، اس کو شائع کرنے کا اہتمام مرحوم خواجہ حسن نظامی نے کیا تھا، مگر کچھ خاص وجوہ کی بنا پر وہ اسے شائع نہیں کر سکے، اس لیے دوسری تصانیف کی طرح علامہ کشمیری کی یہ تصنیف بھی مجلس علمی ڈابھیل ہی سے شائع ہوئی، مشکلات القرآن کے طرز کی کتاب قدما میں شیخ الاسلام حضرت عزالدین ابن عبدالسلام نے لکھی ہے، اب وہ بھی شائع ہوئی ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی اردو تفسیر میں ان دونوں کتابوں سے استفادہ کیا ہے،

مشکلات القرآن کے علاوہ مولانا محمد انور شاہ نے جو رسالے لکھے ہیں، اُن میں بھی قرآنی آیات کے معانی و مطالب اور اسرار و رموز جگہ جگہ موجود ہیں، ان کے بعد اُن کے امالی کا نام آتا ہے جن میں یہ گراں قدر جواہرات جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں، فیض الباری، انوار المحمود اور العرف الشذی میں یہ عمدہ مباحث کثیر تعداد میں موجود ہیں، اس طرح اگر مشکلات القرآن کے ساتھ ان رسائل و امالی سے تفسیری مباحث جمع کئے جائیں تو ویسی ہی ایک تفسیر تیار ہو سکتی ہے جیسی مولانا محمد اویس ندوی نگرامی مرحوم کی ترتیب دی ہوئی تفسیر ابن قیم ہے،

ان تمہیدی سطور کے بعد ہم قرآنی علوم سے متعلق علامہ محمد انور شاہؒ کے چند افادات و افاضات پیش کریں گے اور آخر میں چند آیات کی اُن کی تفسیر بھی درج کریں گے،

قرآن کے معانی کی وسعت اور تفسیر بالرائے کا مفہوم

علامہ محمد انور شاہؒ کے افادات پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کے قائل نہیں تھے، کہ قرآن مجید پر غور و فکر کا کام اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے، اور متقدمین نے تفسیروں کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے وہی کافی ہے، علامہ ممدوح فرماتے ہیں کہ قرآن کا ایک ایک لفظ عجائب اور حقائق کا ایک عالم اپنے اندر رکھتا ہے، اس لحاظ سے تفکر قرآن اور تدبر قرآن کا سلسلہ قیامت تک باقی رہے گا، اُن کے ہاں تفسیر بالرائے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان قرآنی علوم میں غواصی کرنے سے باز رہے، جو ایسا سمجھتے ہیں وہ علامہ کشمیریؒ کے نزدیک غلطی کے مرتکب ہیں،

ومن حجر علی العلماء ان	علماء کو قرآن کے معانی واضح
لا یبرزوا معانی الکتاب بعد	کرنے سے کس نے روکا ہے؟ ہاں
الامعان فی السیاق والسباق	شرط یہ ہے کہ وہ سیاق وسباق
والنظر الی حقائق الالفاظ	کو گہرائی سے دیکھیں، اور سلف صالحین
المراعیۃ لعقائد السلف[1]	کے عقائد کی رعایت رکھتے ہوئے
	الفاظ کے حقائق کو ملحوظ رکھیں،

ان کی رائے میں قرآن کا اعجاز ہی یہ ہے کہ اس نے علماء کو اس کے فوائد و لطائف پر غور کرنے اور مشکلات و دقائق کو حل کرنے کے لئے راہیں چھوڑ رکھی ہیں، علماء تھک کر چور ہو جائیں گے، مگر اس کے باوجود اس کی کنہ تک نہیں پہنچ پائیں گے، اسی لئے علامہ محمد انور شاہؒ دعوی کرتے ہیں کہ آج تک جس نے بھی قرآن کے اسرار اور حقائق پانے کی کوشش کی، اس کی کمر ٹوٹ گئی پھر بھی مقصد پورا نہیں ہو سکا،

---

[1] فیض الباری علی صحیح البخاری ج ۴ ص ۸۷،

اما معانیہ الغامضۃ و	جہاں تک قرآن حکیم کے گہرے معانی
مزایاہٗ الرائقۃ ومرامیہ	عمدہ ترین پہلوؤں اور وسیع و شاندار
الناعمۃ فقد انقصمت	میدانوں کا تعلق ہے، تو ان کے حصول
ظہور الفحول عن ادراکہا	سے بڑے بڑے فضلاء کی کمر ٹوٹ گئی ہے
وعجزت الافکار عن التطوف	اور بلند و بالا خیالات ان کے گرد گھومتے
حول حریمہا[1]	گھومتے چور ہو گئے ہیں،

مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن پر غور و تدبُّر اور اس کے معانی و مطالب میں غوطہ زنی بے کار ہے، علامہ کشمیری کے نزدیک یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ جو شخص بھی قرآن سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ ضرور شفایاب ہوتا ہے، اور وہ اپنا مدعا و مقصد پالیتا ہے، چاہے وہ عالم ہو یا عامی، ہر ایک شخص اپنے ذوق اور ہمت کے مطابق قرآن حکیم سے مستفید ہوتا ہے، اور یہی اس ربانی کلام کا سب سے اہم اعجاز ہے، اور یہی ولقد یسرنا القرآن للذکر کا مفہوم بھی ہے فرماتے ہیں :-

جو شخص حقیقت سے بے خبر ہے وہی قرآن کی اس آیت ولقد یسرنا القرآن للذکر پر اعتماد کر کے سمجھ بیٹھتا ہے کہ قرآن کے حقائق و معارف سہل الحصول ہیں، مگر نادان نہیں جانتا کہ قرآن کے آسان ہونے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ جو کچھ وہ سمجھا وہی حرف آخر ہے، بلکہ تیسیر کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا فیض اور اس کی حقیقت ہر اعلیٰ و ادنیٰ کے لئے مشترک ہے۔ البتہ استفادہ بقدر علم ہوتا ہے، یہ قرآن کے اعجاز کا کمال ہے کہ جاہل اس کو سنتا ہے

---

[1] فیض الباری علی صحیح البخاری ج ۴ ص ۱۸۷،

اور اپنی گنجائش کے مطابق اس سے حظ حاصل کرتا ہے، صاحب علم اس کو پڑھتا ہے تو اپنے علم و فہم کے مطابق اپنا دامن بھر دیتا ہے، اس کے برعکس انسان کا کلام ہے، جس میں یہ خوبی نہیں ہوتی ہے، مثلاً اگر کسی انسان کا کلام حیوانات کی بولی سے متعلق ہوتا ہے، تو جہلا اس میں دلچسپی لیتے ہیں جب کہ بلغا، اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے، دوسری طرف کوئی بلیغ کلام ہوتا ہے تو بلغا، اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور جہلا کوئی التفات نہیں کرتے، اس کے برعکس قرآن حکیم بلاغت کے ذروۂ کمال پر ہے، اور اسی لئے تمام خلائق بقدر ظرف اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

ھذا الکتاب بلغ فی مراتب	قرآن مجید بلاغت کے انتہائی مرتبہ
البلاغۃ اقصاھا ولو نزل تجاہ	پر فائز ہے، اس کے علوم کی بارش
علومہ ما طراً علیٰ کافۃ	تمام لوگوں پر، چاہے وہ عقلمند ہوں
الناس عقلائھم وسفہائھم	یا نادان، یکساں طور پر ہمیشہ برستی
سواءً بسواء وھذا معنی التیسیر	رہے گی، تیسیر کے معنی بھی یہی ہیں۔

لا ما فھموہ[۵۱]

علامہ محمد انورشاہؒ کے نزدیک قرآن حکیم کسی خاص طبقے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر ایک شخص اس سے مستفید اور مستفیض ہوتا ہے، اسی مفہوم کو مولانا امین احسن اصلاحی ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

قرآن، اللہ کی کتاب ہے اس میں تمام علم اولین و آخرین ہے، اسے رہتی دنیا تک باقی رہنا ہے، اور خلق کی رہنمائی کرنا ہے، اس کے عجائب کبھی ختم ہونے والے نہیں،

---

۵۱ فیض الباری علیٰ صحیح البخاری: ج ۱ ص ۲۲۹

ہیں، یہ جس طرح آج سے کم و بیش چودہ سو سال پہلے دنیا کی رہنمائی کے لئے تمام صفات
اور صلاحیتوں سے بھرپور تھی، اسی طرح آج بھی ہے، اور اسی طرح قیامت تک
رہے گی، قوموں کے بعد قومیں اٹھیں گی، اور ان میں سے جو اس کی طرف رجوع
کریں گی، وہ سب اپنے اپنے ظرف کے بقدر اس میں سے حصہ پائیں گی لیکن سب کے
حصہ پانے کے بعد بھی اس کے ذخیرۂ علم و حکمت میں کوئی کمی نہیں ہوگی، سمندر سے
ایک سوئی کی نوک پانی کی جتنی مقدار اٹھا سکتی ہے، قیامت تک سب مل کر
بھی اس سے زیادہ .... س کے ذخیرۂ علم کو کم نہیں کر سکتے، یہ سارا
خزانۂ علم اس کتاب کے اتارنے والے نے اس کے الفاظ اور اس کے نظام کے اندر
ودیعت کر دیا ہے[1]"

علامہ محمد انور شاہ کے نزدیک افادہ اور افاضہ کا دروازہ بالکل کھلا ہے۔ مگر اسی کے
ساتھ اس کے غوامض کا احاطہ کرنا ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ تدبر کی کوشش قیامت تک جاری
رہے گی،

اس کوشش کو قیامت تک وسعت دینے کے باوجود ان کے نزدیک یہاں ایک اہم قید و بندش
بھی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ قرآنی علوم میں غواصی کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام کی رُوح
عربی زبان کے اصول و قواعد اور شریعت اسلامیہ کے احکام و عقائد کو مدنظر رکھے، اور کسی
طرح ان سے تجاوز نہ کرے، گویا وہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد
کو دہراتے ہیں :

تفسیر قرآن و حدیث را اوّلاً علم صرف و نحو — قرآن اور حدیث کی تفسیر و تشریح

---

[1] تدبر قرآن : ج ۱ ص : ل

واشتقاق ولغت ومعانی وبیان و	کے لئے سب سے پہلے علوم آلیہ جیسے
علم فقہ واصولِ فقہ وعقائد یعنی	صرف ونحو زبان وادب اور معانی
علم کلام وعلم حدیث وآثار وتواریخ	وبیان اور علوم دینیہ ونقلیہ جیسے
ضروراست بدونِ معرفت ایں علوم	فقہ واصولِ فقہ، عقائد وکلام اور
درآمدن درمعانی قرآن وحدیث ہرگز	تاریخ وحدیث کا جاننا بہت ضروری ہے
جائز نہ[1]	ان علوم کی معرفت کے بغیر قرآن کے
	معانی ومطالب میں دخل دینا جائز نہیں ہے

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ قطعاً قرآن پر ظلم اور زیادتی ہے، کہ پہلے ذہن میں کوئی مقصد اور خاص مدعا رکھا جائے، اور پھر قرآنی آیات کی کھینچ تان کرکے بزعم خود اس کی تائید کی جائے، اسی کو تلاعب بالقرآن اور تفسیر بالرائے کہا جاتا ہے جس سے حضور اکرمؐ نے سختی سے منع فرمایا ہے اور ایسا کرنے والے کا ٹھکانا جہنم قرار دیا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے

من فسر القرآن برائیہ فلیتبوأ	جس نے اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر
مقعدہٗ فی النار[2]	کی اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانا جہنم
	میں بنائے،

ان حدود کی پاسداری، ان کا احترام واعتقاد اور کتاب اللہ کی عظمت وجلالت کا تصور خود اصحاب رسول میں پوری طرح موجود تھا جس کے لئے علامہ جلال الدین سیوطی کی الاتقان فی علوم القرآن دیکھی جا سکتی ہے، علامہ محمد انور شاہؒ ان حدود وشرائط کو زیر نظر رکھنے پر جگہ جگہ زور دیتے ہیں، خاص طور پر ان کے یہاں احادیث کی طرف رجوع کرنا ناگزیر ہے۔

---

[1] فتاوی عزیزی ج ۱ ص ۱۲۵ مطبوعہ دہلی ۱۳۱۱ھ، [2] صحیحین

کیونکہ قرآن کی عظمت وجلالت نہایت بلند ہے، زیادہ بلیغ کلام میں احتمالات بھی زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے مقصد اصلی کے حصول کے لئے حدیث کی راہنمائی بہت ضروری ہے، وہ خود بھی تفسیری مباحث میں ان قیود کو بدرجۂ اتم مدنظر رکھتے ہیں۔ مشکلات القرآن میں بعض آیات کی تفسیر بیس بیس صفحات میں پھیلی ہوئی ہے، اور بعض قرآنی مشکلات کو سمجھانے کے لئے انھوں نے مختلف علوم سے استفادہ کیا ہے مگر یہ سب کچھ اس طرح تکمیل تک پہنچایا ہے، کہ کسی طرح کی لفظی یا معنوی تحریف کا نام ونشان بھی نہیں ملتا ہے، جیسا کہ ان کے چند معاصرین جیسے سر سید احمد خاں، محمد علی لاہوری اور عنایت اللہ مشرقی کی تفسیری کتابوں میں ہم دیکھتے ہیں، سورۂ کہف کی آخری آیات میں ذو القرنین، سد ذی القرنین اور یاجوج وماجوج کا ذکر ہے، علامہ انور شاہؒ نے ان پر بحث کرکے تفاسیر اور تراجم قرآن کے علاوہ تاریخ اور جغرافیہ کی بہت سی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، بلکہ عقلی دلائل پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ہے، مگر اپنا مدعا اس طرح واضح کیا ہے کہ نہ کسی عقیدے کی تردید ہوتی ہے جو تواتر سے ثابت ہے، اور نہ کسی ایسے مسئلے کی تکذیب یا غلط تاویل ہوتی ہو جس کے ایک معنی پر امت کا اجماع ہوچکا ہے، چنانچہ اس تفسیر میں عقلی ونقلی دلائل پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

واعلم أن ما ذكرته ليس	جاننا چاہئے کہ میں نے جو کچھ بیان
تاويلا في القرآن بل زيادة	کیا وہ قرآن کی تاویل نہیں ہے،
شيء من التاريخ والتجربة	بلکہ یہ الفاظ کو اپنی جگہ سے ہٹائے
بدون اخراج لفظه من	بغیر تاریخ اور تجربہ میں کچھ اضافہ
موضوعه۔[52]	کرنا ہے،

---

[51] فیض الباری ج ۱ ص ۲۳۹ [52] عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام ص ۲۰۰

ان کے یہاں تاویل اور تفسیر بالرائے کا اس وجہ سے بھی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ تمام علمائے عاملین کی طرح کتاب اللہ سے مرعوبیت کی حد تک متاثر تھے، اور انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء کے مظہر تھے، مولانا سید مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں :

"مولانا انور شاہ صاحب کشمیری کتابوں میں اگر کسی کتاب سے مرعوب اور حد سے زیادہ مرعوب تھے، تو وہ اللہ کی کتاب قرآن تھا"[1]

وہ قادیانیوں سے اس وجہ سے بھی متنفر تھے کہ انھوں نے قرآن مجید کی لفظی و معنوی تحریف میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، قادیانیوں کا دعویٰ ہے کہ نزول عیسیٰ سے مراد ظہور شخص نہیں ہے، بلکہ روحانی علوم کا ظہور ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انھوں نے یہ خیال سرسید سے چرایا ہے، اس کے بعد تابع اور متبوع دونوں کو تحریف قرآن کا مرتکب قرار دیا ہے فرماتے ہیں :-

فکل ما قالہ التابع والمتبوع	پس یہ ساری باتیں جو تابع اور
فقد سرقاہ من تفسیر	متبوع (مرزائے قادیان اور ان کے
القرآن للسر احمد خان و	پیرو کار) دونوں نے کہی ہیں اصل
کان یرید التوفیق والصلح	میں انھوں نے اسے سرسید احمد خاں
بین النصرانیۃ والاسلام و	سے چرایا ہے، سرسید نصرانیت اور
انکر المعجزات رأساً وانکر	اسلام کے درمیان موافقت اور
کثیراً من المتواترات کوجود	مصالحت چاہتے تھے، اس مقصد کے لئے
الملائکۃ و نعیم الجنات و	انھوں نے معجزات کا سرے سے

[1] حیات انور ص ۹۲۔

انکر الحدیث و ألحد فی الآیات وحرّف القرآن بما شاء[1]

انکار کیا اور بہت سے متواترات شرعیہ جیسے وجود ملائکہ، جنت، ذخیرۂ حدیث وغیرہ کا بھی انکار کیا، یہاں تک کہ قرآنی آیات میں بھی کج روی کی اور جس طرح چاہا قرآن کی تحریف و تنسیخ کی،

سرسید مرحوم کے بارے میں یہ خیالات تحقیق پر مبنی ہیں، انھیں معاصرانہ چشمک یا قدیم و جدید خیالات و تصورات کی کشمکش قرار دینا صحیح نہیں خود مولانا حالی نے بھی سرسید کی نصرانیت اور اسلام کے درمیان موافقت اور مصالحت کا دروازہ کھولنے کی گہری خواہش کا اعتراف کیا ہے[2] اسی طرح علامہ انور شاہؒ نے تفسیر سرسید کے بارے میں جس خیال کا اظہار کیا ہے اس میں بھی وہ منفرد نہیں ہیں، مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلویؒ جیسے متقی اور معتدل مزاج عالم بھی یہ لکھنے پر مجبور ہوئے :-

تفسیر القرآن بالاردو الی سورۃ النحل للسید احمد خاں بن محمد متقی الدهلوی ولیس له قصد فیه الا تحریف الآیات وتسویتها علی مذهبه

اردو زبان میں سرسید احمد خاں دہلوی کے قلم سے سورۂ نحل تک کی تفسیر بھی ہے اس میں قرآنی آیات کی تحریف اور قرآن کو اپنے خاص سانچے میں ڈھالنے کے سوا سرسید خاں کا اور کوئی مقصد ہی

---

[1] عقیدۃ الاسلام ص ۱۸۰، ۱۸۱ مطبوعہ دیوبند

[2] اس کے لئے حیات جاوید میں سرسید کے مذہبی مباحث و مضامین پر تبصرہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے،

بحيث لو كان شارده من بعيد اقتنصها او وجد موضعا له فيه ادنى مجال يسارع اليه كما فعل الزمخشري في الكشاف والفرق بينهما ان الزمخشري كان علامة في العلوم العربية والسيد احمد كان جاهلاً فيها يتكلم في التفسير بغير رعاية الاصول الشرعية والقواعد العربية ولذلك رد عليه بعض العلماء في كتبهم[1]

نہیں ہے، اس مقصد کے لئے انھیں اگر دور دراز کا رستا وہیں کرنی پڑتی ہو تو اس سے بھی دریغ نہیں کرتے، اور اگر کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ موقع ملتا ہے تو وہ فوراً جھپٹ پڑتے ہیں، اس میں ان کی مثال زمخشری صاحب کشاف سے ملتی ہے، جس نے کشاف میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے فرق صرف یہ ہو کہ زمخشری عربی علوم کے جلیل القدر عالم تھے، جب کہ سید احمد خاں ان علوم سے ناواقف ہیں، وہ اصول شریعت اور عربی قواعد کا خیال رکھے بغیر تفسیر کرنے بیٹھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے اپنی کتابوں میں ان کی تردید کی ہے،

قرآن کا ادبی اعجاز | علامہ انور شاہ کشمیریؒ بھی قرآن حکیم کی ادبیت سے بے حد متاثر تھے، اور ان کے نزدیک قرآن کا ادبی کمال ہی اس حقیقت کا کافی ثبوت ہے، کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے، ان کے نزدیک قرآن فہمی کے لئے نہ صرف وسیع المطالعہ ہونا ضروری ہے، بلکہ

---

[1] الثقافة الاسلامية في الهند: ص ۱۶۸

عربی زبان کے اسلوب اور اس کی نزاکتوں پر بھی گہری نظر ہونی چاہئے، وہ فرماتے ہیں: کہ علمائے اسلام پر یہ بڑا فرض ہے کہ وہ قرآن کے ادبی کمالات کو اس طرح پیش کریں کہ اس کی تعبیر عام فہم ہو جائے، علامہ انور شاہؒ بلاغتِ قرآن سمجھنے میں اپنا علٰحدہ مقام و مرتبہ رکھتے ہیں، وہ فخر کے ساتھ کہتے تھے کہ اگر مثل مشہور ہے کہ قرآن کا اعجاز دو لنگڑوں کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تو میں اُن کا تیسرا ہوں،

لم یدر اعجاز القرآن الا الاعرجان وانا ثالثھما[۱]

قرآنی آیات کی تشریح و تفصیل کے وقت ایک ماہرِ فن کی طرح مترادف اور متقارب الفاظ کا جزئی فرق ملحوظ رکھتے ہیں، جیسے فقہ، فہم، علم، معرفت، تصدیق وغیرہ یا وفات، موت، اور خلود۔ انھوں نے اس قسم کے سارے الفاظ کی لغوی اور ادبی نزاکتوں کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے، اور واضح کیا ہے کہ قرآن میں یہ الفاظ اپنے اپنے مقام پر کیسی اہمیت اور معنویت رکھتے ہیں، انھوں نے اُن مترجمین کو متنبہ کیا ہے جو قرآن میں وفات کا ترجمہ ہر جگہ موت سے کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ وفات اور موت کے لغوی فرق سے صرف نظر کر کے ان کی معنوی یکسانیت کے قائل ہیں، وہ بھی اس آیت میں یہ یکسانیت برقرار نہیں رکھ سکتے ہیں! اللّٰہ یتوفی الانفس حین موتھا" اسی طرح ان کے ہاں قرآن میں خلا من کا ترجمہ ہر جگہ موت سے کرنا درست نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم کے اسلوب کا ایک بڑا معجزہ یہ بھی ہے کہ وہ لفظ کے ساتھ اس کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے،

ومما ینبغی ان لایذھل	آدمی کو اس حقیقت سے غافل نہیں
عنہ ان القرآن لایودی	رہنا چاہئے کہ قرآن فقط مراد اور

---

[۱] یتیمۃ البیان مقدمۃ مشکلات القرآن: مولانا بنوری ص ۶۵

المراد فقط بل ینبہ علی الحقائق | معنی ہی ادا نہیں کرتا ہے بلکہ حقائق کی
ویرمز الیھا[۱] | طرف متوجہ کر کے ان کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے

یہی وجہ ہے کہ وہ مترجمین قرآن کی توجہ اس طرف دلاتے ہیں کہ وہ الفاظ قرآن کے معانی اسالیب اور نظم و ربط کا پورا لحاظ رکھا کریں، ورنہ معمولی تساہل و تغافل سے وہ حقائق ہی مسخ اور محرّف ہو جاتے ہیں جن کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہوتا ہے اور بعض اوقات ایسے ہی مواقع پر کسی ملحد کو الحاد پھیلانے کا موقع ہاتھ آتا ہے جیسا کہ ایک بدبخت نے مسیح موعود کا خواب دیکھکر توفی اور خلو کے معنی میں کیا ہے[۲] ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ قرآن حکیم میں ایک لفظ بھی زائد نہیں ہے اور اگر اس کا کوئی حرف اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو مقصود ہی بگڑ جائے گا، قرآن کا کسی جگہ ایجاز، دوسری جگہ اطناب ایک مقام پر واقعات و قصص کے اجزا کا مقدم اور کسی جگہ مؤخر کرنا اپنے اندر زبردست اسرار و حکم اور لطائف و بصائر رکھتے ہیں، اور ان کے ادراک کے لیے لطافت فکر اور امعانِ نظر کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح ان واقعات کی تکرار بھی مصالح ہی پہ مبنی ہوتی ہے، قرآن کوئی تاریخ یا جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے کہ ویسا ہی انداز و اسلوب اختیار کرے، بلکہ یہ ایک کتاب ہدایت ہے، یہ کسی واقعہ کا ذکر ایک جگہ اجمال کے ساتھ کرتا ہے اور دوسری جگہ تفصیل سے۔ گویا سابقہ اجمال واقعہ کا متن ہوتا ہے اور دوسری جگہ اس اجمال کی تفصیل و توضیح ہوتی ہے پھر وہ امور جن میں ہمیں اپنی عدم مناسبت سے ربط نظر نہیں آتا، اس طرح مربوط و منسلک ہوتے ہیں، جنھیں اللہ علّام الغیوب کے سوا کوئی دوسرا جان نہیں سکتا ہے، اس کی

---

[۱] فیض الباری ج ۳ ص ۵۲ [۲] ایضاً

مثال اس طرح ہے کہ احکام فقہیہ کے مناسبات گو ہم نہیں سمجھتے ہیں، مگر مجتہد فقیہ کی نظروں میں ان میں پورا سلسلہ اور ربط ہوتا ہے، ہمارے نزدیک یہ احکام منتشر اجزاء سمجھتے ہیں، جبکہ مجتہد کے نزدیک ایک اصل اور کل کے ماتحت منضبط ہوتے ہیں، تو جب ہم یہ فن سمجھنے سے عاجز اور قاصر ہیں تو قرآن جیسی الہامی کتاب کا ربط و نظم ہم آسانی کے ساتھ کہاں سمجھ سکتے ہیں[1] وہ قسموں کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ ان سے مخلوقات بالخصوص انسان کی توجہ قدرت کے عجائبات کی طرف مبذول کرنا مقصود ہے، وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جو باتیں اللہ کے نزدیک ناپسند ہوتی ہیں، وہ انھیں ذکر بھی نہیں فرماتا، اور جہاں ان کا ذکر کرنا ضروری ہے، وہاں معجزانہ اسلوب و بلاغت کے ساتھ ان کا ذکر ہوتا ہے، مثلاً وعلی الذین یطیقونہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہاں مطلب لم یصوموا ہے[2] مگر چونکہ یہ اللہ کو پسند نہیں ہے، اس لئے اس ناپسند بات کو ذکر تک نہیں فرمایا، وہ اسے قرآن کی اعلیٰ اور عظیم ترین ادبی خوبی قرار دیتے ہیں،

واجد صنیع القرآن انہ اذا	میں قرآن کا ایک انداز یہ بھی پاتا
کرہ شیئاً ترک ذکرہ و	ہوں کہ جب کسی چیز کو وہ ناپسند کرتا
ذلک لکونہ فی الذروۃ	ہے تو اس کا ذکر بھی چھوڑتا ہے کیونکہ

[1] تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو: نفحۃ العنبر من ھدی الشیخ الانور تالیف مولانا سید محمد یوسف بنوری محدث مضمون زیر عنوان الشیخ ودابہ فی حل مشکلات القرآن والتقاط فوائد من کلامہ فیما یتعلق بالقرآن وشدۃ عنایتہ بالقرآن ص ۴۶ تا ص ۵۰،

[2] فیض الباری علی صحیح البخاری ج ۴ ص ۲،

العلیا من الفصاحۃ فلا یترک مساغاً للطبائع المتکاسلۃ[51] — قرآن فصاحت کے انتہائی بلند مقام پر فائز ہے، وہ سست اور کاہل طبیعتوں کے لئے کوئی راستہ نہیں چھوڑتا ہے،

قرآن کے مقاصد شاہ صاحبؒ علم و تحقیق کے مرد میدان تھے، اس میں کسی توہم اور روایت پرستی کو نزدیک نہیں آنے دیتے تھے، وہ سائنسی معلومات سے بھی پوری دلچسپی لیتے تھے، مگر اتنے مرعوب نہیں تھے کہ اسلامی عقائد اور فوق العقل حقائق کی کتربیونت کر کے انہیں نت نئی تحقیقات کے تابع بنائیں، وہ سائنسی معلومات ہی کو قرآن کے تابع بناتے ہیں، انکی یہ تحقیقی حس علوم جدیدہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کی حد میں متقدمین علمائے اسلام اور ان کی تصانیف کو بھی لاتے ہیں، انہیں جب کوئی موجودہ انکشاف قرآن وحدیث کے کسی مسلمہ جزء کے خلاف نظر آتا ہے تو وہ اس انکشاف کو ادھورا اور ناتمام قرار دے کر حقیقتِ قرآن وحدیث کو اٹل اور غیر متبدل ہونے پر زور دیتے ہیں، اسی طرح اگر انہیں متقدمین کے تفسیری ذخائر میں کوئی بات غیر معقول نظر آتی ہے تو وہ اسے بھی مسترد کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے ہمارے قدیم مفسرین قرآن رحمہم اللہ کی تفسیروں میں فضول حکایات اور اسرائیلی قصص کا انبار پایا جاتا ہے، علامہ کشمیریؒ اسے بھی مسترد کرتے ہیں، آیۃ شریفہ:-

"وَمَا اَرْسَلْنَا مِن قَبْلِکَ مِن رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ"

کے تحت فرماتے ہیں:

---

[51] فیض الباری علی صحیح البخاری ج ۳ ص ۷،

وما ذکرہ المفسرون من القصص ھٰھنا فکلھا باطلٌ[۱]	مفسرین نے یہاں جن قصوں کا ذکر کیا ہے وہ سب بے اصل ہیں،

وہ قدیم و جدید دونوں دور کے معلومات سے قابل قدر چیزیں اختیار کرنے میں کوئی تنگ نظری نہیں برتتے ہیں، اور جن چیزوں کو رد کرنے کے قابل سمجھتے ہیں انھیں رد بھی کرتے ہیں، اسی طرح جہاں انھیں تطبیق اور توفیق کی گنجائش نظر آتی ہے، وہاں بغیر کسی تردد کے یہ اہم تجدیدی خدمت بھی انجام دیتے ہیں، گویا ان کی نظر الحکمۃ ضالۃ المؤمن حیث وجدھا فھو احق بھا پر پوری طرح جمی رہتی ہے آسمانوں کے وجود اور عدم وجود کے بارے میں فرماتے ہیں،

انکر وجودہ المتنورون وقالوا لیس فوقنا الا جو ھواً لطیفاً غیر متناہٍ والنجوم تجری فیھا سابحۃ بنفسھا،[۲]	روشن خیال حضرات نے آسمان کے وجود سے سرے سے ہی انکار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اوپر لطیف غیر متناہی جوہر کے سوا کچھ اور نہیں ہے، اس جوہر میں تارے خود بخود گردش کرتے ہوئے تیرتے ہیں،

آگے مذہب اور سائنس میں اس طرح تطبیق دیتے ہیں،

قلت ولا دلیل علیہ عندھم لِمَ لا یجوز ان یکون ھذا الجو علی طبقاتٍ کلّ طبقۃ منھا	میں کہتا ہوں کہ یہ آسمان کے عدم وجود پر کوئی دلیل نہیں ہے ایسا کیوں نہ کہا جا سکتا ہے کہ یہی فضا

---

[۱] فیض الباری جلد ۱ ص ۲۲ [۲] ایضاً ص ۳۔

تسمّٰی سماء، حتی تکون سبع سمٰوات کما اخبر بہ النص[1]	مختلف طبقات پر مشتمل ہے، اور پھر ہر طبقے کا نام آسمان رکھا جائے، اس طرح یہ سات آسمان ہو جائیں جیسا کہ قرآن نے خبر دی ہے،

اسی طرح وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ کے معنی بیان کرتے ہوئے قائلینِ ارتقاء کی اس تحقیق کو کہ سب سے پہلے پانی وجود میں آیا ہے، مذہب کے عین موافق قرار دیتے ہیں، اور افسوس کرتے ہیں کہ سینکڑوں سال بھٹکنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے جس کی خبر قرآن چودہ[۱۴۰۰] سو سال قبل دے چکا ہے،

(باقی)

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۳۔۴۔

دارالمصنفین کی بعض عربی تصنیفات

بدء الاسلام: مولانا شبلی کے زمانۂ قیام علی گڑھ کا سیرت پر عربی میں ایک مختصر رسالہ،

الرسالۃ المحمدیہ: مولانا سید سلیمان ندوی کے سیرت نبوی پر خطبات مدراس کا عربی ترجمہ،

تفسیر ابو مسلم الاصفہانی: تفسیر امام رازی میں ابو مسلم اصفہانی کے جو تفسیری اقوال درج ہیں، ان کو مولانا سعید انصاری مرحوم سابق رفیق دارالمصنفین نے اس کتاب میں اکٹھا کر دیا ہے،

الانتقاد علی التمدن الاسلامی: جرجی زیدان کے سلسلۂ تاریخ تمدن اسلامی پر مولانا شبلی کی معرکۃ الآرار تنقید

ان عربی کتابوں کے لئے دفتر سے خط و کتابت کریں،

"منیجر"

اسلام اور مستشرقین پر مضامین
سے متعلق
کچھ خطوط

پیرس		۱۰ رجمادی الاولیٰ ۱۴۰۳ھ

محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

فروری ۱۹۸۳ء کے معارف میں ص ۹۹ پر پکتھال مرحوم کو سیلؔ، بلؔ اور راڈویلؔ کے ساتھ مستشرقین اور اعداے اسلام کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے، محمد پکتھال انگریز تھے، لیکن مسلمان اور نہایت مخلص مسلمان تھے، غالباً حج یا کم ازکم عمرہ بھی کیا تھا، جب ان کو برطانوی ہند کی حکومت نے ملک بدر کیا (کہ وہ قومی تحریک کا ساتھ دیتے اور بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انگریزی حکومت کی مخالفت کرتے تھے) تو انہیں حیدرآباد بلا لیا گیا اور اولاً ایک مدرسۂ فوقانیہ (ہائی اسکول) کے صدر (پرنسپل) بنائے گئے، اور ان کی وجہ سے مدرسہ کے سارے مسلمان اساتذہ اور طلبہ نمازی بن گئے تھے، پھر انہی نے اسلامک کلچر کا سہ ماہی رسالہ نکالنا شروع کیا، جس کی اسلامی خدمات سے کون واقف نہیں، ترجمہ آسان چیز نہیں، پکتھال نے غلطیاں کی ہوں گی، مگر آپ کے فاضل مضمون نگار قرآن مجید کا ترجمہ کریں اور مستند اردو تراجم سامنے نہ رکھیں تو شاید پکتھال مرحوم سے

دس گنا زیادہ غلطیاں کریں، پکتھال مستشرق نہیں مسلمان تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

الفقیر الی اللہ

محمد حمید اللہ

(۲)

لاہور ۔ ۷ مارچ ۱۹۸۳ء

مخدوم و محترم ! السلام علیکم

معارف کی تازہ اشاعت سے معلوم ہوا کہ آپ منٹگمری واٹ کی غلط بیانیوں کا جواب لکھنے میں مصروف ہیں، خدا وند تعالیٰ آپ کو کامیاب فرمائے، اس بارہ میں میری گذارش ہے کہ یہ تردید انگریزی میں لکھی جائے تو نہایت مناسب ہوگا، منٹگمری صاحب دوسرے درجہ کے مستشرق ہیں، ان کی معلومات کا انحصار تمام تر عربی کتب کے انگریزی و فرانسیسی تراجم پر ہے، وہ ایک زمانہ میں فلسطین میں پادری کے طور پر کام کرتے رہے ہیں، ان کے ایک شاگرد نے جو دو سال قبل ان کی نگرانی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے آئے ہیں، مجھ کو بتلایا ہے کہ وہ بمشکل تمام عربی کی عبارت کو صحت اعراب کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔

ویلفرڈ کینٹویل اسمتھ (میک گل یونیورسٹی کنیڈا) کا بھی یہی حال ہے، وہ بھی پیشے کے لحاظ سے عیسائی مبلغ ہیں، تقسیم ہند سے قبل لاہور کے فارمن کرسچین کالج میں بطور استاد کام کرتے رہے تھے، اس لیے لاہور کے علمی حلقے ان کے خیالات ورجحانات سے اچھی طرح واقف ہیں، ہمارے یہاں یہ عام خیال پایا جاتا ہے کہ وہ مسلم طلبہ کی احتیاج اور ناداری سے ناجائز فائدہ اٹھاکر ان کو عیسائیت کی طرف

مائل کر لیتے ہیں یا اسلام سے دور کر دیتے ہیں۔

انگریز اور امریکی فضلاء کے مقابلہ میں جرمن مستشرقین کا کام نسبتہً قابل تحسین ہے،
وہ آئے دن اسلامی علوم و فنون کے ذخیرہ میں اضافہ کرتے رہتے ہیں، ان کا تازہ
کارنامہ صلاح الدین خلیل الصفدی (م ۷۶۴ھ) کی الوافی بالوفیات
کی طباعت و اشاعت ہے، الصفدی.... کے شاگرد تھے اور ان کی یہ تصنیف عربی
زبان میں سوانح اور تراجم کی سب سے بڑی کتاب ہے، جس میں ہزاروں فرمان(روا)
ادیبوں اور عالموں کے حالات ہیں، اس کتاب کی تیس جلدیں ہیں، جن میں سترہ جلدیں
ہلموٹ ریٹر، اس کے تلامذہ اور رفقاء کی علمی کاوشوں سے نہایت خوبصورت ٹائپ
میں عمدہ کاغذ پر چھپ کر شایع ہو چکی ہیں، کتاب کے مقدمہ میں اصول تاریخ پر بھی
بحث ہے، الصفدی نے تبرک کے طور پر پہلی پانچ جلدوں میں ان مشاہیر کے حالات
لکھے ہیں جن کے نام لفظ محمد سے شروع ہوتے ہیں، چھٹی جلد میں حروف تہجی
کے اعتبار سے مشاہیر کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جو سترہویں جلد میں لفظ عبداللہ تک
پہونچ گیا۔

اس ضمن میں ایک جرمن نژاد مستشرقہ مسز این میری شمیل کا ذکر بھی ضروری ہے،
موصوفہ کو مولانا رومؒ اور علامہ اقبالؒ کے افکار اور اشعار اور پھر خواجہ میر دردؒ کے
طریقۂ محمدیہ سے والہانہ شغف ہے، انھوں نے اقبالؒ کے سوانح اور شاعری پر
انگریزی میں ایک کتاب Gabriel's Wing کے نام سے لکھی ہے،
جاوید نامہ کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ
(۱۱ تا ۱۹۴۷ء تک ایک کتاب — Islam in The Indian

SUB CONTINENT, کے نام سے تحریر کی ہے

معارف مئی ۱۹۸۲ء میں ص ۳۳۸ پر دار المصنفین کے سیمینار میں شریک ہونے والے ایک گرامی قدر فاضل کا یہ ارشاد کہ استشراق یا مستشرقین کی وجہ سے اسلام کے علوم و فنون میں مزید تحقیق و تدقیق کا دروازہ بند ہو گیا ہے، ہماری سمجھ سے باہر ہے، گذارش ہے کہ علم کا قافلہ ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے، وہ کسی مستشرق کے روکنے سے رک نہیں سکتا، آئے دن نئی نئی کتابیں شایع ہوتی رہتی ہیں اور ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، چند برس ہوئے کہ روما یونیورسٹی کے ایک بورڈ نے مشہور اطالوی مستشرق پروفیسر جبرلی کی نگرانی میں الادریسی (م ۵۶۰ھ) کے مشہور عالم جغرافیہ نزهة المشتاق فی اختراق الآفاق کا کامل ایڈیشن بڑی آب و تاب سے شایع کیا ہے، اس سے پہلے اس جغرافیہ کے بعض اجزا اطالیہ، فرانس اور ہسپانیہ سے شایع ہوئے تھے، اسی طرح بعض قدیم یادداشتیں اور دستاویزیں چھپ کر منظر عام پر آتی رہتی ہیں، جن سے بعض غلط العام مشہور واقعات اور نظریات کی تصحیح ہوتی رہتی ہے، میں اپنے مدعا کی وضاحت میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

(۱) ہمارے صدر شعبہ ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب کی تحقیق ہے کہ سر سید کی تکفیر کرنے والے سرکاری مولوی تھے، جو کہ بریلی، بدایون اور مراد آباد میں صدر الصدور تھے، جب کہ علمائے دیوبند سے ان کے مخلصانہ روابط تھے۔ (۲) مولانا عبد العزیز میمن مرحوم بعض قرائن و شواہد کی بنا پر بتاتے تھے کہ پچھلی صدی میں شاہ اسماعیل شہیدؒ اور اکابر دیوبند کے خلاف جو سب و شتم کی مہم شروع ہوئی تھی اس کے پیچھے انگریزوں کا ہاتھ تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز جہاد سے لرزہ براندام رہتے تھے، جب کہ یہ اکابر

نہ صرف جہاد کے داعی تھے، بلکہ جہاد میں عملاً حصہ لے چکے تھے، اس لیے ان کو بدنام کرنے کے لیے مختلف حیلوں اور حربوں سے کام لیا گیا۔ (۳) ہمارے ہاں مفتی محمد عبدہٗ کو انگریزی استعمار کا دشمن سمجھا جاتا ہے، لیکن اب مصر کے بعض برطانوی ہائی کمشنروں کی یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے انگریز حاکموں سے دوستانہ تعلقات تھے۔
(۴) پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے زمانہ میں مصر کے مشہور مصلح عالم اور المنار کے فاضل مدیر سید رشید رضا کا انگریزوں سے نامہ و پیام اب کوئی سربستہ راز نہیں رہا، (۵) گذشتہ ساٹھ ستر برس سے عرب سیاست داں اور عرب دانشور عثمانی ترکوں کے عہد حکومت کو تاریخ اسلام کا تاریک دور بتلاتے رہے ہیں، ان کے غیظ و غضب کا نشانہ خاص طور پر سلطان عبد الحمید ثانی (عہد حکومت ۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء) رہے، جن کو وہ ظالم، جابر اور عربوں کا بدترین دشمن قرار دیتے رہے ہیں، اب چند برسوں میں اسرائیل سے پے در پے شکست کھا کر ان کو دنیائے اسلام کا محافظ اور پاسبان کے لقب سے یاد کرنے لگے ہیں، کیونکہ انھوں نے ارض فلسطین میں یہودیوں کو آباد کرنے سے سختی سے انکار کر دیا تھا، اس برصغیر میں بہت کم اہل علم کو معلوم ہوگا کہ صحیح بخاری کی تحقیقی اشاعت بھی سلطان عبد الحمید مرحوم کے علمی شغف کی مرہون منت ہے، ایک شاہی فرمان کے ذریعہ انھوں نے شیخ الازہر علامہ حسونۃ النواوی کو حکم دیا تھا کہ صحیح بخاری کے مختلف قلمی نسخوں کو پیش نظر رکھ کر ایک صحیح نسخہ پیش کیا جائے، چنانچہ شیخ الازہر نے اپنے بعض رفقاء کی معاونت سے یونینی کے نسخہ کو جس کی سماعت اور تصحیح امام عربیت اور الفیہ کے مشہور مصنف ابن المالک الطائی نے کی تھی، کئی برسوں کی محنت کے بعد ۱۳۲۲ھ میں ٹائپ میں قاہرہ سے شایع کیا، یہ ایڈیشن تقریباً با اعراب ہے، اور حاشیہ میں اختلاف نسخ

بھی مذکور ہے، تیس پینتیس برس ہوئے کہ اسی ایڈیشن کو نہایت خوبصورت ٹائپ میں نو جلدوں میں مصر کے مشہور محقق عالم قاضی احمد محمد شاکر مرحوم نے شایع کرایا تھا،

فقط والسلام

شیخ نذیر حسین

مدیر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی لاہور

(۳)

فرانس ۷ رفروری ۱۹۸۳ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

دار المصنفین میں اسلام اور مستشرقین پر سیمینار میں پیش کردہ مقالات کی جو روداد آپ کے قلم سے معارف کی کئی اشاعتوں میں شایع ہوئی ہے، وہ بہت قابل تعریف ہے، اس پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، لیکن انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی میں قرآن پاک کی دوسری بین الاقوامی کانگریس کی آپ کی رپورٹ جو جنوری ۸۳ء کے معارف میں آپ کے قلم سے نکلی ہے، وہ اتنی مفصل نہیں جتنی کہ اول الذکر کی تھی، اس سلسلہ میں ایک بات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، ڈاکٹر مشیر الحق نے مسٹر کینٹویل اسمتھ کے مقالہ کے اندر جو بحث اسلام اور محمڈن ازم پر کی ہے اور ان دونوں اصطلاحات کے استعمال کے حق اور ان کے خلاف جن خیالات کا اظہار مختلف اصحاب نے کیا اور ان کا ذکر آپ نے اپنی روداد میں جون ۸۲ء کے معارف میں کیا، ان کو پڑھ کر مجھے بڑا تعجب اور افسوس ہوا، کیونکہ محمڈن ازم کی اصطلاح کے خلاف کوئی قطعی اور دوٹوک فیصلہ کسی صاحب نے بھی نہیں کیا، جن میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ذات[1] گرامی بھی شامل ہے، جن اصحاب کی نظر قرآن کریم پر گہری ہے،

[1] حضرت مولانا نے مباحثہ کے دوران میں اس کی مکمل وضاحت کردی تھی، یہ جون کے معارف کے آخر میں درج بھی ہے

وہ محمڈن ازم کی اصطلاح کو نہ صرف غلط، بلکہ قابل نفرت اور اہانت آمیز سمجھتے ہیں، اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلعم اسلام کے بانی نہیں تھے بلکہ کوئی نبی بھی اپنے دین کا بانی نہیں ہوتا، بلکہ وہ رسول ہوتا ہے، یعنی وہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ دین کو اپنی امت تک پہونچانے والا ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ دین یعنی اسلام کو حضورؐ کے اسم گرامی سے وابستہ کرنا حقیقت کے خلاف ہے، مزید برآں مستشرقین، قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی وحی کے بجائے حضور اکرمؐ کو اس کا مصنف قرار دیتے ہیں، اسی لیے اسلام کو محمڈن ازم سے تعبیر کرتے ہیں، اگر ہم اس اصطلاح کو قبول کرلیں تو ان کے اس غلط خیال کی گویا تصدیق کریں گے، پھر اس اصطلاح میں طنز اور اہانت کا پہلو بھی مضمر ہے، جیسا کہ مستشرقین کی تحریروں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے، اس سلسلہ میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ گب کی کتاب محمڈن ازم کا جو نیا ایڈیشن ابھی حال ہی میں شایع ہوا ہے اس میں اس کا نام بدل کر اسلام کر دیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اب مغربی غیر مسلم پبلشر بھی تسلیم کرنے لگے ہیں کہ محمڈن ازم کی اصطلاح غلط اور اہل اسلام کے لیے قابل نفرت و مذمت ہے، معارف کے دو مضامین میں گیلوم لکھا گیا ہے، یوم ہے گیلوم نہیں۔

مجھے یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ آپ مونٹگمری واٹ کی کتابوں کا تنقیدی جائزہ لے رہے ہیں، خدا کرے آپ کی کتاب جلد مکمل ہوکر شایع ہو جائے، مونٹگمری صاحب کی کتابیں بہت سطحی قسم کی ہیں، وہ حقیقت میں بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا ہے، وہ مسلمانوں کا بظاہر ہمدرد بن کر اسلام کے خلاف نشتر زنی کرتا ہے، وہ خود فریب خوردہ اور فریبی ہے اسے ایکسپوز کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ والسلام

محمد طفیل

.103,105 Av. GABRIEL PERI
9 2260 FONTENAY AUX-ROSES, FRANCE

تلخیص و تبصرہ

بیت المقدس ماضی و حال و مستقبل کے آئینہ میں

زیر نظر مضمون استاذ روحی الخطیب میئر بیت المقدس نے ماہانہ عربی رسالہ دعوۃ الحق کے خاص نمبر "القدس" اگست ۱۹۸۱ء (مراکش) کے لیے لکھا تھا، ناظرین معارف کی خدمت میں اس کی تلخیص پیش کی جاتی ہے، (عبد المبین ندوی۔ ناظر کتبخانہ دار المصنفین)

بیت المقدس کا ماضی تاریخ و احادیث اور صحف سماوی سے ثابت ہے کہ یہودیت عیسائیت اور اسلام سے قبل بیت المقدس خالص عربوں کا مسکن تھا، اور یہاں کنعانی قبائل کی حکمرانی تھی، پھر ان کے بعد یبوسی قبائل کی حکومت قائم ہوئی، جو یبوس[1] سے مشتق ہے، یہ بیت المقدس کا قدیم نام ہے آج سے تقریباً ۵ ہزار سال پہلے اس کا یہی نام کتب تاریخ میں ملتا ہے اس زمانہ کے فرمانرواؤں میں ملک "صادق" کا نام زیادہ مشہور ہے، جو کنعانیوں میں سے ایک طاقتور شخص تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق سے مصر جاتے ہوئے جب یہاں سے گذرے تھے، اسی بادشاہ کی حکومت تھی یہ واقعہ تقریباً ۱۹۰۰ ق، م کا ہے، توریت سے پتہ چلتا ہے انھوں نے سلطان صادق کو یہاں سے گذرنے پر اس وقت دس سکے چنگی میں دیئے تھے۔

---

[1] معجم البلدان میں ہے کہ یبوس شام کے ایک پہاڑ کا نام ہے، استاذ محمود مہدی نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے یبوس نے بیت المقدس پر حکومت کی جو جزیرۃ العرب سے ہجرت کرکے شام آئے تھے، (ع-م-ن)

بیت المقدس کو تاریخی، مذہبی اور سیاسی حیثیت سے اہمیت حاصل ہے، بارکنا حولہ لنریہ من اٰیٰتنا فرما کر خدا نے اسے سارے عالم کے لئے برکت و ہدایت کا ذریعہ بنایا اور شعائر الٰہیہ کے ظہور کا مرکز قرار دیا، اور یہ ان تین مقامات میں سے ایک ہے، جن کے لئے شد رحال جائز بتایا گیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صرف تین مسجدوں کے لئے سفر بالقصد جائز ہے، میری یہ (مسجد نبویؐ) خانہ کعبہ، اور بیت المقدس، علاوہ ازیں مسجد اقصیٰ میں ایک نماز کا ثواب دوسری مسجدوں کی ایک ہزار نماز کے ثواب کے برابر ہے حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ بیت المقدس کو انبیاء نے تعمیر کیا، اور ان ہی نے اسے آباد کیا، اس میں ایک بالشت بھر زمین ایسی نہیں بچی جس میں کسی نبی نے نماز نہ پڑھی ہو، یا اسمیں کوئی بادشاہ نہ کھڑا ہوا ہو۔

بیت المقدس پر فرعونیوں، عبرانیوں، بابلیوں، ایرانیوں، یونانیوں، رومیوں صلیبیوں اور سلجوقیوں وغیرہ کے پے در پے حملے ہوتے رہے، اور اسلامی عہد میں بھی عربوں کے بعد ترکوں ایوبیوں، اور سلجوقیوں، کا اس پر قبضہ ہوا، اس کے بعد انگریزوں کا تسلط ہوا، مگر اروق ہاشمیوں کے عہد میں پھر بیت المقدس پر اسلام کا پرچم لہرایا، اس کے بعد سے برابر مسلمانوں کے زیر نگیں رہا مگر ۱۹۶۷ء میں مصر اسرائیل جنگ ہوئی تو یہود اس پر مسلط ہو گئے۔

حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ کے زمانہ (۱۰۴۵ - ۹۰۵ م) میں یہاں یہودیوں کی حکومت صرف ستر برس تک رہی، اور وہ بھی پورے فلسطین پر نہیں بلکہ اس کے کچھ ہی حصوں پر رہی، اسکے بعد بھی وقتاً فوقتاً یہاں ان کی حکمرانی رہی، اگر ان کی حکومت کا پورا زمانہ شمار کیا جائے تو یہ چار سو سال سے زیادہ نہ ہوگا، اس کے مقابلہ میں قدیم تاریخی ماخذ سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ عرب کنعانی قبائل اور انکی شاخیں فلسطین اور اس کے گرد و نواح میں مستقل طور

آباد تھیں، اور ولادت نبویؐ سے تین سال قبل بھی وہ اس سرزمین پر غالب و سربلند تھیں اپنے مخالفین کے دور حکومت میں بھی وہ یہاں مقیم رہے، عربوں کی حکومت کو ان سے بڑی تقویت ملی۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۸ء کے ...... درمیان برطانوی حکومت نے بیت المقدس کے دروازے یہودی مہاجرین کے لیے کھول دیئے۔ اور فلسطین کے گردونواح میں عرب حکومتوں سے زمین کا پٹہ دلا کر ان کے لیے آسانیاں فراہم کیں، اس زمانہ میں عرب مسلمانوں اور عیسائیوں کی تعداد تیس ہزار تھی، جب کہ یہودیوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی، مگر ۱۹۴۸ء میں یہاں کی آبادی ایک لاکھ ہوگئی، جس میں عربوں اور یہودیوں کا تناسب آبادی کے لحاظ سے برابر ہوگیا، مگر عرب ۴۰ فیصدی اور یہودی صرف ۱۰ فیصدی جائداد کے مالک تھے۔

۱۹۴۸ء کے بعد برطانیہ، امریکہ اور دوسرے ملکوں کی کوشش اور امداد سے یہودیوں نے فلسطین کی ۸۰ فیصدی آراضی پر قبضہ کرلیا، اور اس کے بعد ہی ۶۰ ہزار عرب بیت المقدس سے جلاوطن کر دیئے گئے، جن کی منقولہ و غیر منقولہ جائداد یہودیوں کے قبضہ میں چلی گئی، اور اقوام متحدہ کی اس تجویز کے باوجود بھی عربوں کی جائداد نہ تو انھیں واپس کی گئی، اور نہ ہی انھیں اس کا کوئی معاوضہ دیا گیا، اس وقت عربوں اور خصوصاً اردن کی فوجیں اس پوزیشن میں تھیں کہ اپنے مقبوضہ علاقوں کو واپس لے لیں، مگر بڑی طاقتوں کی مزاحمت اور دخل اندازی سے ان کو خالی نہیں کرایا جاسکا، ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۸ء کے بیس سال کے عرصہ میں یہودیوں کی تعداد ایک لاکھ سے بڑھ کر ایک لاکھ ۹۰ ہزار ہوگئی، جب کہ عربوں کی تعداد لگ بھگ ۴۰ ہزار سے ۵۰ ہزار رہی ہوگی، اس اثناء میں ہزاروں عرب قتل و غارت گری کا نشانہ بنے، ان کی جلاوطنی سے روز بروز ان کی تعداد گھٹتی گئی، اور یہودیوں کی تعداد گذشتہ سات سال کے عرصہ میں بڑھ کر دو لاکھ ۴۰ ہزار تک پہونچ گئی ہے، وہ ۱۹۴۸ء میں ۱۰ فیصدی جائداد کے

مالک تھے، مگر ۱۹۳۰ء میں ۹۰ فیصدی زمین ان کے قبضہ میں آگئی۔

بیت المقدس کی موجودہ صورت حال | اس وقت بیت المقدس جس المناک دور سے گذر رہا ہے، اسکی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے، یہ اسرائیل اور یہودیوں کے ناپاک منصوبوں کا سراسر ہدف بنا ہوا ہے، یہاں وحشت و بربریت اور درندگی کا جو مظاہرہ ہو رہا ہے اس سے صیہونیوں کا وہ جذبہ ظاہر ہے، جو وہ انتہائیت کے ساتھ رکھتے ہیں، انھوں نے اپنی سامراجیت میں بڑی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری سے اس مقدس سرزمین کو تہس نہس کر دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔

یہاں ہر نئے دن کا آفتاب نئے نئے مشکلات لیکر طلوع ہوتا ہے، صیہونی تحریک دین کا لبادہ اوڑھ کر یہودیت کے بھیس میں ظاہر ہو رہی ہے، ہم اس کے انبیاء کا احترام کرتے ہیں مگر اس نے یہودیت کے نام پر ہر طرح کا ظلم و جبر ہم پر روا رکھا ہے۔

اسرائیلی فوجیں اردن کی فوجوں پر مشق ستم کر رہی ہیں، اور عرب قبائل کو ہر طرح سے ہلاک و برباد کر رہی ہیں اور عربوں کی مرضی کے خلاف نیز اقوام متحدہ کے ریزولیشن کے علی الرغم اپنی جارحانہ پالیسی اختیار کئے ہوئے ہیں، ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۷ء کے درمیان جو ۶۰ ہزار عرب جلاوطن کیے گئے تھے، ان کے مکانوں میں دوسرے ملکوں سے آنے والے صیہونیوں کو غیر قانونی طور پر قبضہ دلا دیا گیا ہے۔

اسرائیل نے منظم سازش کے تحت عربوں کی سیکڑوں تاریخی یادگاروں اور تہذیبی و تمدنی عمارتوں نیز انکی بستیوں اور تجارتی منڈیوں کو مسمار کر دینے کا پروگرام بنایا ہے۔

یہاں تک کہ جو زمین قدیم زمانہ سے بیت المقدس کے لئے جزو لاینفک بنی ہوئی تھی وہ بھی اس سے علٰحدہ کر لی گئی ہے، وہاں کے سیکڑوں باشندوں کو ملک بدر کر کے ان کی تہذیب و تمدن، روایات و عمارات اور افراد و اشخاص کو مکمل صیہونی رنگ میں رنگ دینے کی

کوشش جاری ہے۔

ادھر چار برسوں کے اندر بیت المقدس میں عربوں کی باقیماندہ اراضی کو بھی اسرائیل نے فیڈریشن کے نام پر غصب کر لیا ہے، اور اس کے آبادکاری کے وزیر شاریف کی طرف سے ہ نئی کالونیوں کی تعمیر کا اعلان بھی ہو چکا ہے، ۳۵ ہزار صیہونی جس رہایش گاہ میں قیام کرتے تھے اس میں ایک لاکھ ۲۲ ہزار مزید نئے صیہونیوں کے قیام کا انتظام کیا جا رہا ہے اس کا مقصد اپنے اس منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہونچانا ہے، جس سے بیت المقدس مکمل طور سے یہودی بستی بن جائے۔

بیت المقدس کو نیویارک اور لوس انجلوس کے طرز تعمیر کے مشابہ بنانے کی کوشش ہے، اس کا مقصد بیت المقدس کی تاریخ کو مسخ کرنا ہے، جو نئی تعمیرات ہو چکی ہیں ان کا مشاہدہ کرنے والے بیان کرتے ہیں کہ ان سے سنجیدہ اور روحانیت کا ذوق رکھنے والوں کو بیت المقدس سے گھن آنے لگتی ہے،

اٹلی کے ایک یہودی انجینیر پروفیسر بروشفی کی رائے ہے کہ اس طرح کی تعمیر شکست فاش کا نتیجہ اور مکمل خودکشی کے مترادف ہے، اس قسم کا تنظیمی منصوبہ انتہائی گھناؤنا ہے، اور اس ناجائز قبضہ کے باقی رہنے کا کوئی جواز اور حق نہیں ہے،

یونیورسٹیوں کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے نام پر بھی اسرائیل نے مختلف منصوبے بنا رکھے ہیں، انگریزی میگزین اکنامسٹ نے اسے مسلح سیمنٹ کے "جنگل" کے نام سے موسوم کیا ہے، چنانچہ زیتون پہاڑ کے شمالی حصہ کے وسیع رقبہ میں بڑے بڑے ہوسٹلوں کی بنیاد رکھی گئی ہے، جامعۂ عبریہ میں ۱۵۰۰۰ طلبہ اور اساتذہ کی گنجایش ہو تاکہ بیت المقدس کے مقامی و غیر مقامی عیسائی، اور دوسرے مذہبی جذبات و احساسات رکھنے والے مشتعل

ہوتے رہیں۔

اسرائیلی تنظیم نے خندقیں کھدوانے اور تاریخی انکشاف کے پروگرام کے تحت بیت المقدس کے بعض تمدنی علاقے منہدم کر دیے ہیں، اور کھدائی کا سلسلہ مسجد عمر کے حدود تک جا پہونچا ہے جس سے اس کے صحن کی دیواروں کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا ہے، بیت المقدس کی فصیلوں کے اندر کے پانچ عربی محلوں کو بھی منہدم کرنے کی دھمکی دی جا رہی ہے، یہ وہ تاریخی آثار تھے جن سے بیت المقدس کی حفاظت ہوتی تھی، اس کے حدود کی توسیع کے پلان کے تحت اس کے قریب کی ایک بستی بھی منہدم کر دی گئی ہے، جو حضرت سموئیل علیہ السلام کی بستی کہلاتی تھی، بیت المقدس کے قریب مزید دس بستیوں کی اراضی بھی ان کے باشندوں کے علی الرغم غصب کر کے صنعتی اداروں کے قیام کے لیے مخصوص کر دی گئی ہیں جن میں ایک ہزار صنعتی اداروں اور کمپنیوں کی گنجائش ہوگی۔

حد یہ کہ بیت المقدس کی گزشتہ تاریخ کو مسخ کرنے کی غرض سے وہاں کی سڑکوں، شاہراہوں اور پارکوں تک کے ناموں کو بھی بدل دیا گیا ہے، اور جن قبائل نے یہودی اسکیموں کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا یا جنھوں نے زمانۂ قدیم سے چلی آتی والی بیت المقدس کی تاریخی روایات سے اپنے کو وابستہ رکھنا پسند کیا، وہ سب ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، اسی طرح قبیلوں اور محلوں کے تاریخی نام بھی بدل کر اسرائیلی و صیہونی نام رکھ دیے گئے ہیں۔

اردنی حکومت کے جاری کردہ احکام و قوانین کو ان کے دفتروں اور محکموں میں مسترد کر کے اسرائیلی احکام و قوانین فلسطینی باشندوں پر تھوپ دیے گئے ہیں اور شرعی و اسلامی احکام کا نفاذ مسلم حکمرانوں کی بے بسی اور مسلم قیادت کے فقدان کی وجہ سے بالکل موقوف ہو گیا ہے،

معاشی یکسانیت و وحدت ایکٹ کے تحت اردنی عملہ کی جگہ اسرائیلی عملہ مسلط

کر دیا گیا ہے، عربوں کے بینکوں کو مقفل کر کے یہودی بینکوں کے ساتھ لین دین کا معاملہ کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے، اور عرب کی مصنوعات پر جو شہر میں درآمد کی جاتی ہیں خواہ وہ قریب ہی کے شہروں، دیہاتوں اور قصبوں سے کیوں نہ منگائی گئی ہوں، بھاری ٹیکس عائد کر دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس یہودی مصنوعات کی درآمد برآمد میں ہر قسم کی سہولت روا رکھی جاتی ہے، اور مخصوص صورتوں کے سوا تمام تر یہودی مصنوعات ہی کی برآمد کی اجازت ہے صیہونی منصوبوں کے تحت جن اسلامی مرکزوں اور گرجاؤں پر ظلم و زیادتی کے گوناگوں اقدامات کئے گئے ہیں، ان میں کچھ یہ ہیں۔

۱۔ مسجد اقصیٰ میں آتش زنی کا واقعہ ۲۱ راگست ۱۹۶۹ء کو رونما ہوا۔

۲۔ حرم بیت المقدس کے وسیع صحن کے اندر یہودی عبادت کرتے اور دعائیں مانگتے ہیں، یہ یہودی ہیکل بنانے کا پیش خیمہ ہے،

۳۔ متعدد مسجدیں منہدم کر کے انھیں . . . غیر دینی کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے

۴۔ قبطیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی بیت المقدس کے حدود کے اندر اپریل ۱۹۷۱ء میں کی گئی۔

۵۔ کلیسا کے عیسائیوں پر برابر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بعض جائیدادیں یا تو کم اور سستے داموں پر فروخت کر دیں، یا پھر طویل مدت کے لئے اجرت پر چھوڑ دیں صیہونیوں کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ لوگوں کی جائداد اور مذہبی ادارے اپنی ملکیت میں حاصل کریں مدرسۃ الایتام السوریۃ پر اسی خیال سے نظر ہے، روسی کلیسا کی اراضی پر بھی جو "المسکوبیۃ" کے نام سے مشہور ہے قبضہ کر لیا گیا ہے، روم کی وسیع اراضی ارثوذکس اور لاطین کے شہروں پر بھی ناجائز قبضہ کر لیا گیا ہے،

بیت المقدس کے حدود کے جن طبی اور رفاہ عام کے اداروں نے یہودی اثرات قبول نہیں کئے تھے، انھیں بھی اپریل ۱۹۷۳ء میں وہاں سے منتقل کر دیا گیا، اور فلسطینی عوام کو یہودی طبی اداروں ہی کی جانب رجوع کرنے کے لئے کہا جاتا ہے۔

عربوں کے سرکاری دینی مدارس بھی اسرائیلیوں کے دجل و فریب سے محفوظ نہیں رہے بلکہ ان میں بھی اسرائیلی نصاب تعلیم رائج ہو گیا ہے، اور ان کتابوں کی تعلیم نصاب سے خارج کر دی گئی ہے، جن سے عربی تاریخ و تہذیب کی صحیح نشاندہی ہوتی ہے۔

بلدیاتی دفتروں میں یکساں قانون نافذ کرنے کی غرض سے ۱۹۶۹ء میں جنرل اسمبلی کے انتخاب کرائے گئے، اور عربوں کو بھی اس میں حصہ لینے پر مجبور کیا گیا جس میں وہ نہایت کمزور ثابت ہوئے، جب ۱۹۶۹ء میں ان کا کوئی نمایندہ منتخب نہیں ہو سکا تو آیندہ انتخابات میں بھی عرب نمایندہ کے منتخب ہونے کی کوئی توقع نہیں ہے، اسرائیل نے الکشن بورڈ ہی کو کالعدم قرار دے دیا ہے۔ اور سیاسی خوف و دہشت پھیلا کر بہت سے عرب نمایندوں کو بیت المقدس سے باہر کر دیا ہے، جن میں سرفہرست شیخ عبد الحمید سائح صدر اسلامک بورڈ محکمۂ شرعیہ ۱۹۶۷ء دبیت المقدس محسن النطون بک عطاء اللہ سابق ڈائرکٹر اسلامی بینک و سابق وزیر داخلہ ڈاکٹر داؤد الحسینی سابق نائب صدر دبیت المقدس ڈاکٹر نبیہ معمر سابق ڈائرکٹر میڈیکل ہیں، اس کے علاوہ بہت سے طلبہ، اساتذہ، تجار اور کمپنیوں کے مالک ملک سے در بدر کر دیئے گئے ہیں۔

بیت المقدس کو اسرائیل کا پایہ تخت بنانے کے ساتھ ہی تل ابیب سے وزارتوں کے دفاتر دفاع اور عدلیہ کے محکمہ جات وہاں منتقل ہو گئے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی سازشوں کا طوق عربوں کے گلے میں ڈال رہے ہیں۔

۱۔ اسرائیل کی سازش یہ بھی ہے کہ بیت المقدس کے دائرہ کو اتنا وسیع کر دیا جائے کہ شمال میں بیت لحم اور بیت جالا، اور جنوب میں بیت ساحور اور ۲۹ مزید عرب بستیاں جہاں تک انکا دائرہ پہونچے اور مغرب میں بیت اکسا سے خان احمر کے جنوبی حصہ تک کے علاقے اس کے اندر آجائیں۔

۲۔ ان کی سازش یہ بھی ہے کہ تجارتی منڈیاں قائم کرکے بیت المقدس کے مشرقی و مغربی علاقوں کو اسرائیل کی ملکیت میں لے لیا جائے۔

۳۔ خان احمر اور اس کے قریبی علاقوں کے علاوہ، ہزار ایکڑ آراضی پر قبضہ کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا گیا ہے، جو اریحا اور بیت المقدس کے راستہ میں واقع ہیں اس کو صنعتی شہر بنانے کا پلان ہے، اس طرح اسرائیل نے بیت المقدس کے چاروں طرف اپنا ایسا گھیرا ڈال دیا ہے، جس سے عربوں کی طاقت متزلزل ہوگئی ہے۔

بیت المقدس کا مستقبل | ایک طرف رمضان ۱۹۶۷ء کی دسویں جنگ، دوسری طرف پٹرول کے چشموں کا پھوٹ پڑنا جنگی حیثیت اسلحہ جیسی ہے، ان دونوں نے مل کر یہودی اسکیم کے دائرہ کو بیت المقدس ہی نہیں بلکہ تمام مقبوضہ علاقوں اور عرب پڑوسی ملکوں تک پھیلا دیا ہے، مذکورہ جنگ اور پٹرول کے ہتھیار نے ہمارے مسئلہ کو اوراجھا، دیا ہے، چنانچہ اقوام متحدہ میں جو مسئلہ تار عنکبوت کی حیثیت رکھتا تھا، اس کو دنیا کی دو بڑی طاقتوں امریکہ اور روس نے بہت زیادہ آگے بڑھا دیا ہے، اور وہ دونوں طاقتیں اپنی مشترکہ کوششیں عرب اسرائیل کے درمیان پر امن طریقہ پر مصالحت کے لئے صرف کر رہی ہیں، نیز وہ کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کی دفعہ ۲۴۲ کو عملاً نافذ کرنے کے لئے بھی کوشاں ہیں۔ جس کے الفاظ یہ ہیں۔

۱۔ سلامتی کونسل مشرق وسطیٰ کے خطرناک موقف پر اپنے مستقل تلق و اضطراب کا اظہار

کرتی ہے۔

۲۔ جنگی علاقوں میں اجازت کے بغیر داخلہ پر پابندی عائد کرتی ہے، اور ان علاقوں پر قبضہ و تسلط کی سخت ممانعت کرتی ہے، اور اس بات پر زور دیتی ہے کہ عدل و انصاف کا راستہ اختیار کر کے ہی ہر ملک پُر امن طریقہ سے زندگی گذار سکتا ہے۔

۳۔ اور اس بات پر بھی زور دیتی ہے کہ تمام ممالک اقوام متحدہ کا معاہدہ قبول کرتے ہوئے اس کی دفعہ نمبر ۲ کے رو سے کسی تصرف کے مجاز ہوں گے۔

۴۔ سلامتی کونسل اس بات کی تاکید کرتی ہے کہ کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کے اصولوں کی پابندی ہی مشرق وسطیٰ میں مستقل عدل و سلامتی اور تمام امن کی ضامن ہو سکتی ہے، جس کے نتیجہ میں یہ دونوں باتیں ضروری ہیں۔

(۱) ۱۹۶۷ء کی جنگ میں اسرائیل نے جن علاقوں پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے ان سے وہ مکمل انخلا کا اعلان کر دے۔

(۲) جنگ کی موجودہ فضا ختم کرنے کے لئے اسرائیل اپنے تمام مطالبات سے دستبردار ہو جائے، تنظیم آزادی فلسطین کی رہنما قیادت کو قبول کرے تاکہ پر امن ماحول اور سیاسی آزادی کی راہ ہموار ہو، اور ہر حکومت و مملکت کو اپنے اپنے حدود میں امن و سلامتی کا حق حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے جملہ حقوق و اختیارات بھی تسلیم کئے جائیں، تاکہ وہ داخلی امن و سلامتی کے ساتھ زندگی گذار سکے اور اسے فوجی طاقتوں کی دھمکیوں کا کوئی خطرہ لاحق نہ رہے۔

سلامتی کونسل کے نزدیک مندرجۂ ذیل امور کا لحاظ کرنا بھی ضروری ہے۔

الف :۔ آبی علاقوں میں ہر ملک کے جہازوں کو آزادی سے گذرنے کی ضمانت دی جائے۔

ب :- پناہ گزینوں کے مسائل حل کرنے کے لیے منصفانہ جدوجہد کی جائے۔

ج :- اس بات کی ضمانت ہو کہ کسی ملک کی بے عزتی نہیں کی جائے گی، سیاسی آزادی کا حق حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ ہر ملک اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ تیار کرنے یا ذاتی کارخانہ قائم کرنے کا مجاز و حقدار ہوگا۔

انجمن اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل نے ۱۹۶۷ء سے لیکر آج تک جو تجویزیں پیش کی ہیں ان میں اقوام متحدہ کو آج بھی اس بات پر اصرار ہے کہ بیت المقدس کو اسرائیل کے ساتھ ضم نہ کیا جائے، اور اسرائیل نے جو تجاویز و قوانین بنائے ہیں، جن میں آراضی و املاک کے مطالبے اور مقبوضہ بیت المقدس میں اپنے باشندوں کو بسانے اور منتقل کرنے کی تجویزیں بھی شامل ہیں، وہ سب ایک سال قبل مسترد کی جا چکی ہیں، اس میں کسی تبدیلی کی گنجایش نہیں۔ ان تمام اصولوں اور تجاویز کی وجہ سے نیز عربی زاویۂ نگاہ دیکھتے ہوئے دوسرے یوروپین ممالک پٹرول سے پیدا ہونے والی صورت حال سے خائف ہیں، خود امریکہ کو بھی اطمینان نہیں کہ کب کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے، جس طرح چین اور ویتنام میں اسے بھگتنا پڑا ہے اسی طرح اسرائیل سے بھی امریکہ بہتر معاملہ کرنے پر مجبور ہوگا، اسرائیل و امریکہ آپس میں چاہے جتنی ایک دوسرے کی مذمت کریں، اور اسرائیل ۱۹۶۷ء کے مقبوضہ علاقوں کو خالی کرنے میں خواہ کتنا ہی پس و پیش کرے لیکن اسے وہاں سے پیچھے بہر حال ہٹنا پڑے گا، جس میں بیت المقدس بھی شامل ہے، اور یہ صیہونیت کی جڑیں اکھاڑنے کا پہلا قدم ہوگا، اور حق و شرافت نیز عربی قیادت کی دوبارہ واپسی ہوگی۔

"ع - م - ن"

مطبوعاتِ جدیدہ

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ

مرتبہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۳۲۰، مجلد مع رنگین گردپوش قیمت ۲۰ روپیہ، پتہ مکتبۂ اسلام، ۳ گوئن روڈ لکھنؤ۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی بدولت اس زمانہ میں گنگوہ و نانوتہ کی شمع ہدایت روشن اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکیؒ اور مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ کا روحانی فیض جاری تھا، وہ علم و عمل اور شریعت و طریقت کے جامع، علمی و روحانی ماحول کے پروردہ اور قدیم دینی نظام تعلیم و تربیت کے ساختہ پرداختہ تھے، اس لئے ان کی سیرت و سوانح نگاری اور علمی و باطنی کمالات کی مرقع آرائی بہت نازک اور دشوار کام تھا جس کو وہی شخص انجام دے سکتا تھا جو علم و عمل اور فضائل و مکارم میں ممتاز اور اعلائے کلمۃ اللہ، احیائے سنت اور دین و ملت کی سربلندی کے لیے بے چین و بیقرار ہو اور وہ شیخ کی مسلسل صحبت و ہم نشینی کے علاوہ ان کا کمل ادا شناس ان کے مزاج و طبیعت میں پوری طرح دخیل، چھوٹے بڑے ہر معاملہ میں ان کا مشیر و شریک اور نرم و گرم ہر موقع پر ان کا دمساز اور خاص معتمد علیہ رہا ہو، اس کی پرورش و پرداخت بھی عربی مدرسہ میں ہوئی ہو اور اس کی زندگی دین، دینی علوم اور عربی مدارس کی خدمت و ترقی کے لئے وقف رہی ہو، اور طلبہ، علما اور مشائخ سے ہمیشہ وابستہ رہنے کے ساتھ ہی درس و افادہ اور اصلاح و ارشاد اس کا خاص معمول رہا ہو، اور شیخ کی طرح اس کا خاندان بھی کئی پشتوں سے علم و عرفان اور

رشد و ارشاد کا گہوارہ رہ چکا ہو ذوق اردو اور عربی کا اچھا اہل قلم اور تصنیف و تالیف کا بہترین سلیقہ اور وسیع تجربہ بھی رکھتا ہو، ان حیثیتوں سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بہت ممتاز ہیں، ان پر فرط اعتماد کی وجہ سے حضرت شیخ اپنی اہم اور عربی تصنیفات کے مقدمے ان ہی سے لکھاتے تھے، اس لئے شیخ کی داستان زندگی قلمبند کرنے کا ان سے زیادہ کوئی مستحق نہ تھا، ع داستان فصل گل خوش می سراید عندلیب

انھوں نے زیر نظر کتاب کے گیارہ ابواب میں حضرت شیخ کے حالات و کمالات، سیرت و شخصیت عبادت، ریاضت اور روزمرہ اشغال و معمولات کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دی ہے، پہلے باب میں وطن، خاندان اور بعض اہم خاندانی بزرگوں کا تذکرہ ہے، اس میں شیخ کے خاندان کے مفتی الٰہی بخش کی حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے بیعت اور حضرت سید احمد شہیدؒ سے تعلق اور ان کی تحریک سے وابستگی کا بھی ذکر ہے، دوسرے باب میں شیخ کی پیدائش، طفولیت، تعلیم، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے تلمذ و بیعت اور والد محترم مولانا محمد یحییٰ کے انتقال کی تفصیل درج ہے، تیسرے باب میں شیخ کے مسند درس پر رونق افروز ہونے، مولانا سہارنپوری کی ان پر خاص شفقت، بذل المجہود کی تصنیف میں معاونت، دوسفر اور دو حج کا ذکر ہے، اس باب کا یہ حصہ بڑا موثر اور علمی و دینی اور دعوتی کام کرنے والوں کے لیے نہایت سبق آموز ہے جس میں حضرت شیخ کی تدریسی زندگی کے شروع ہی میں بیش قرار مشاہرں پر ان کی پانچ جگہوں کے لئے طلبی کا ذکر ہے جنھیں مسترد کر کے وہ مظاہر العلوم کے بوریائے فقر ہی پر فروکش رہے، چوتھے باب میں سہارنپور کے مستقل قیام، درس و تدریس اور ارشاد و تربیت میں انہماک اور اس سلسلہ کے معمولات، مزید چار حج اور شیخ کے متعدد اعزہ کی وفات کا تذکرہ ہے، شیخ نے ان پے در پے حوادث میں جس بے مثال صبر و شکیب اور غیر معمولی ثبات و استقلال کا ثبوت دیا وہ ان کی سیرت کا نہایت تابناک پہلو ہے، پانچویں باب میں شیخ کے اہتمام رمضان ان متبرک دنوں کے معمولات اور ان کے یہاں کے غیر معمولی اجتماعات کی روح پروری کا حال

بیان کیا ہے، چھٹے باب میں آپ کے مدینہ طیبہ میں مستقل قیام فرمانے اور وہاں کے شب و روز کے مشاغل و معمولات اور دوسری ضروری باتوں کے علاوہ اس عرصہ میں ہونے والے ہند و پاک کے سفر کی روداد لکھی ہے، ساتویں باب میں انگلستان اور جنوبی افریقہ میں شیخ کے دعوتی و تربیتی سفر کی سرگزشت قلمبند کی ہے، آٹھویں باب میں شیخ کی علالت، مرض الموت اور وفات کی تفصیل اور جسمانی یادگاروں کا تذکرہ ہے، نویں باب میں شیخ کے وہبی کمالات اور نمایاں اوصاف و خصوصیات بیان کیے گئے ہیں، جیسے علوے ہمت، دینی حمیت، مسلک صحیح کی حفاظت، اسلاف و مشائخ سے وابستگی و وفاشعاری، اکرام ضیف، خدام و احباب سے شفقت و محبت کا برتاؤ، مدارس دینیہ سے تعلق، دینی اور علمی کوششوں کی حوصلہ افزائی، بلند شعری و ادبی ذوق اور پسندیدہ اشعار وغیرہ، دسویں باب میں شیخ کے تصنیفی ذوق اور علمی و تحقیقی تصنیفات پر تبصرہ کیا گیا ہے، اگیارہواں باب شیخ کے ارشادات، ملفوظات اور منتخب تحریروں کے لیے خاص ہے۔ فاضل مصنف نے حضرت شیخ کے اہم حالات، نمایاں واقعات، حسین زندگی، پاکیزہ سیرت اور دلکش شخصیت کے خط و خال نمایاں کر کے ان کے علمی و دینی کمالات، اصلاحی و تربیتی خدمات اور روحانی فیوض و برکات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے، ان کی رعنائی تحریر، حسن بیان، سلیس و شگفتہ زبان اور دلآویز پیرایہ نے اس خاکہ میں ایسا رنگ بھر دیا ہے کہ شیخ کی چلتی پھرتی مجسم تصویر سامنے آگئی ہے، ایک مخلص و مقبول بندہ کی سرگزشت اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کا گہربار قلم۔ ع ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا۔

گو سلسلۂ بیان میں کہیں کہیں کرامات، منامات اور مبشرات کا بھی ذکر آگیا ہے مگر مولانا نے عہد حاضر کے مذاق کی رعایت کی بنا پر ان کے لیے کوئی باب مخصوص نہیں کیا ہے، تاکہ اس عندلیب کی خوش نوائی پورے چمن میں روح پھونک دے، اور یہ کتاب قدر دانوں اور متوسلین کے علاوہ دوسرے علمی و فکری طبقوں کے لیے بھی پیغام عمل ہو۔

دستور حیات :- مرتبہ، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۴۰ مجلد قیمت ۱۶ روپیہ۔ پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

اس کتاب میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مسلمانوں کے عقائد، عبادات، اعمال اور اخلاق نیز اذکار و ادعیہ قلمبند کی ہیں پہلے توحید، تقدیر، قرآن مجید، نبوت، معاد، جزاو سزا، حساب، پل صراط، جنت و دوزخ، شفاعت، معراج، مرتکبینِ کبائر کا انجام، صحابہ کرام کی عدالت و فضیلت اور ان سب میں خلفائے راشدین کی درجہ بدرجہ افضلیت اور کراماتِ اولیا، وغیرہ کے متعلق اہل سنت والجماعت کے نقطۂ نظر کی رو سے اسلامی عقائد بیان کئے ہیں، توحید کے اسلامی تصور کی وضاحت کے ضمن میں شرک کی حقیقت، اس کے مظاہر، جاہلی رسم و رواج، بدعت کا مفہوم اسکی مضرتیں اور شریعت سے اس کا تضاد دکھایا ہے، خدا کی ذات، صفات اور افعال کے علم کی عظمت واہمیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے حصول کا صحیح اور معتبر طریقہ وہ ہے، جو انبیاء علیہم السلام نے بتایا ہے، اور جن لوگوں نے اس معاملہ میں اپنی ذہانت اور علم و عقل پر بھروسہ کیا ان کی کوششیں بیکار گئیں، اس کی مثال حکمائے یونان کا الٰہیاتی فلسفہ ہے، جس کے جال میں افسوس کہ کتاب وسنت کے حامل بہت سے مسلمان بھی پھنس گئے، پھر اسلامی عبادات کی اہمیت، نماز کا درجہ اور اسے ادا کرنے کا مسنون طریقہ بتایا ہے، اور اس کے ارکان، فرائض اور دعاؤں کے علاوہ زکوٰۃ، روزہ اور حج کے فضائل وآداب بھی تحریر کئے ہیں اور خاص وقتوں کی دعائیں، عام اذکار اور رسول اللہؐ کی اہم دعائیں بھی نقل کی ہیں، جہاد کا مقصد اور اس کی اہمیت بھی بتائی ہے، اور تہذیبِ اخلاق اور تزکیہ نفس پر خاص طور سے زور دیا ہے اور ان کو رسول اللہؐ کی بعثت کا اہم مقصد قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں آپ کے اوصاف وکمالات اور اخلاق و شمائل کے علاوہ مختلف عنوانات کے تحت قرآن و احادیث کی اخلاقی تعلیمات و ہدایات بھی پیش کی ہیں، آخر میں طہارت، حجاب اور

پاکدامنی کو اسلامی تمدن کی اہم خصوصیات بتاکر مغربی تمدن سے اس کا فرق و تضاد واضح کیا ہے، شروع میں مولانا نے اسلام کے خاص مزاج اور ان نمایاں خصوصیات کو بیان کیا ہے، جن پر اس کی شخصیت اور نمو و بقا کا انحصار ہے اور جو اسے دوسرے مذاہب اور فلسفوں سے ممتاز کرتی ہیں، اس سلسلہ میں عقائد کی اہمیت خاص طور پر واضح کی ہے، اور بتایا ہے کہ ان کے اور اپنی دعوت و پیام کے معاملہ میں انبیاء علیہم السلام نے کوئی مفاہمت، مداہنت اور ترمیم وغیرہ کبھی گوارا نہیں کی، آخر میں فاضل مصنف نے دین کے مزاج، اس کی امتیازی خصوصیات ایمانی اوصاف اور اسلامی اخلاق سے آراستہ زندگی اختیار کرنے کے لیے اپنے زرین مشورے اور بیش قیمت اور مفید تجربے بیان کیے ہیں، جن پر اگر واقعی عمل کیا جائے تو اسلام کو مطلوب عقائد، اعمال اور اخلاق مسلمانوں کے اندر پیدا ہو سکتے ہیں، یہ مفید کتاب دراصل مسلمانوں کے نظام زندگی کا خاکہ اور ان کا دستور العمل ہے، اس لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ہوگا، مولانا نے یہ کتاب عربی میں لکھی تھی ان کے لائق اور ہونہار عزیز مولوی سید سلمان حسینی ندوی نے اس کا ان ہی کے طرز و اسلوب اور رنگ و آہنگ میں ایسا رواں، سلیس اور شگفتہ ترجمہ کیا ہے کہ اس پر طبعزاد ہونے کا گمان ہوتا ہے،

ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

ارمغان حرم:۔ مرتبہ، جناب عبدالرحمٰن محسن انصاری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۸ قیمت چار روپیہ پتہ۔ مکتبہ اسلامی، ۳۱، سی، محمد علی روڈ بمبئی ۳....۴

جناب محسن انصاری ادیب و شاعر بھی ہیں اور دیندار مسلمان بھی، وہ حج و زیارت کعبہ کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں، قطعات کا یہ مختصر مجموعہ اس سفر کی یادگار اور سوغات ہے جو محسن صاحب کے تاثرات و مشاہدات اور قلبی واردات و کیفیات پر مشتمل ہے، اس سے ان کے ایمانی جذبات و احساسات، سوز و گداز قلب کے علاوہ شعری حسن و جاذبیت کا اندازہ

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی چند کتابوں کے جدید اڈیشن

نقوشِ سلیمانی

سید صاحب کے ہندوستانی اور اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبات صدارت
ن کی دوسری تقریروں، تحریریں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ، جن کا انتخاب خود فاضل مصنف نے
ی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستان کی
بت سے ہندوستانی کا نام دیکر ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ ان کا یہ خواب
رمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پا گئی، طبع دوم عکسی،

قیمت:۔ ۲۵ روپیے،

خیام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رُباعی گو شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہے، اُ
ن کی رباعیات کا یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ
بھی بہت کچھ تھا، وہ فلسفی تھا، منجم تھا، ریاضی داں تھا، ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا،
ن کی طرف شعر العجم میں خیام کے تذکرہ میں مولانا شبلیؒ نے بھی اشارہ کیا ہے، اس کتاب میں پہلی
بہ اس کے سوانح و حالات کے ساتھ اس کی ان ہی حیثیات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی
ڈالی گئی ہے، آخر میں اس کے چند نایاب فارسی و عربی کے فلسفیانہ رسائل اور اس کی مستند رباعیات
شامل کر دی گئی ہیں، طبع دوم عکسی، قیمت: ۲۵ روپے۔

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈیمی الٰہ آباد میں چند خطبے
ے تھے، یہ انہی کا مجموعہ ہے، طبع دوم عکسی، قیمت ۳۰ روپیہ "منیجر"

بزم تیموریہ

بزم تیموریہ کا پہلا ایڈیشن تمام عظیم مغل سلاطین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، [شاہجہاں، او]رنگزیب عالمگیر اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق، علم دوستی اور علم پروری، اور ان سب کے درباروں کے اہل ذوق امراء، علماء، فضلاء اور شعراء کے تذکرہ اور ان کے علمی و ادبی و شعری کمالات اور ان کے نثر و نظم کے بہترین اقتباسات پر مشتمل تھا، اس کے دوسرے اڈیشن میں اتنی اصلاح و ترمیم تغیر و تبدل اور اس کثرت سے اضافے ہوئے، کہ اس کا حجم بہت بڑھ گیا، اس لئے قدردانوں اور مستفیدین کی سہولت کے لئے اس کو تین جلدوں میں کر دیا گیا، اس میں بعض نئے ماخذوں کی مدد سے ان سلاطین، شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور علم پروری کی تفصیلات ایسے دلچسپ اور دلپذیر انداز میں درج کی گئی ہیں کہ بانی سلطنت تیموریہ شہنشاہ بابر سے لیکر آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تک کے عہد کے علم و ادب اور شعر و سخن کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، پہلی جلد میں پہلے تین مغل سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسری جلد جہانگیر و شاہجہاں اور ان کے دربار کے امراء کی علم دوستی اور ان کے دور کے شعراء، ادباء، فضلاء اور ارباب کمال کے تذکرہ اور ان کے علمی کمالات پر مشتمل ہے، تیسری جلد صاحب رقعات اورنگزیب عالمگیر اور آخری دور کے مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر وغیرہ اور تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں مثلاً گلبدن بیگم، نورجہاں بیگم، جہاں آرا صاحب مونس الارواح، اور زیب النساء بیگم وغیرہ اور ان کے متوسل ارباب کمال کے حالات اور کارناموں پر مشتمل ہے، جلد اول قیمت ۲۰ روپے، دوم ۱۲ روپیے، سوم ۱۳ روپیے

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن (ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ)

رجسٹرڈ نمبر ل ۵۲۰۰ مئی ۱۹۸۳ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت بیس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(دارالمصنفین کی دو نئی کتابیں)

سیرۃ النبی جلد ہفتم

سیرۃ النبی جلد ششم کے بعد سید صاحبؒ سیرۃ جلد ہفتم بھی جو معاملات سے متعلق تھی لکھنی شروع کر دی تھی، اور اسی پر یہ مقدس سلسلہ ختم بھی ہو جاتا، لیکن ابھی اس موضوع پر چند ہی مضامین لکھے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا، اس لیے یہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی، یہ ان ہی متفرق مضامین، اور مباحث کا مجموعہ ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں، اسلام میں حکومت کی حیثیت، عہد نبوی میں نظامِ حکومت و فرماں روائی، سلطنت اور دین کا تعلق وغیرہ، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے پیش لفظ ہے، قیمت:- ۱۲ روپیہ،
مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندویؒ،

صوفی امیر خسرو

اس میں ہندوستان کے شہرۂ آفاق محبِ وطن فارسی شاعر، نہ سپہر، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، دولرانی خضر خاں اور وسط الحیات جیسی شاہکار مثنویوں کے مصنف، اور حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاؒ کے جاں نثار مرید حضرت امیر خسرو کو معاصر تذکرہ و تاریخ کی کتابوں اور خود اُن کے کلام کے مجموعوں اور مثنویوں کی روشنی میں ایک صاحبِ دل صوفی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، بزمِ صوفیہ کے بعد سلوک و عرفاں کے مباحث و مسائل پر دوسری اہم کتاب،

قیمت ۔ ۔ ۸

مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن،

"منیجر"

جلد ۱۳۱ ماہ رجب المرجب ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۸۳ء عدد ۵

مضامین

مقالات

اسلام اور مستشرقین کی بیرونی ڈاک

شذرات

گذشتہ مہینہ معارف میں ذکر آیا تھا کہ اپریل میں کلکتہ کی ایران سوسائٹی کی طرف سے سعدی شیرازی پر ایک سمینار ہونے والا ہے، اس میں شریک ہو کر بہت محظوظ ہوا،

معارف کے صفحات میں بارہا ذکر آیا ہے کہ کلکتہ کی ایران سوسائٹی کو یہ امتیاز حاصل ہو کہ اس کی علمی سرگرمیوں سے وہاں کے ہر طبقہ کے لوگوں کو دلچسپی ہے، توقع کے مطابق سعدی شیرازی سے مسلمانوں، ہندوؤں، عیسائیوں اور پارسیوں نے پوری دلچسپی دکھائی، اس کا افتتاح بہار کی قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر جناب رادھانند جھا نے کیا، ایک بنگالی ہندو اہلِ علم جناب اس، بی، رے نے سعدی کی ایک فارسی نظم ہم نشینی کا ترجمہ بنگالی زبان میں سنایا، ایران سوسائٹی کے سابق صدر ودسی، بی، اگی موقع بموقع سعدی کو برابر خراجِ عقیدت پیش کرتے رہے، ڈاکٹر تریگنا سین سابق وزیر تعلیم حکومت ہند نے سعدی کی انسان دوستی اور آفاقی محبت کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اُن کی تصانیف کے کچھ ترجمے بنگلہ زبان میں بھی ہوئے ہیں، راجستھان یونیورسٹی کے استاد جناب دھریندر ناتھ کو سعدی کے بہت سے اشعار اور گلستان کے بہت سے جملے از بر تھے، انھوں نے اپنے مقالہ میں گلستان اور پنچ تنترا کا موازنہ بھی کیا، ایران سوسائٹی کی طرف سے جو سوونیر تقسیم کیا گیا، اس میں مغربی بنگال کے ایک نوجوان مصور وسیم ریاض کی بنائی ہوئی ایک شبیہ بھی تھی،

سمینار میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی بڑی اچھی نمایندگی تھی، علی گڑھ سے ڈاکٹر نذیر احمد، دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر نور الحسن، جواہرلال یونیورسٹی سے ڈاکٹر عبدالودود اظہر،

اور ڈاکٹر محمود عالم، کشمیر یونیورسٹی سے پروفیسر شمس الدین، عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر شریف النساء، وشوا بھارتی یونیورسٹی سے ڈاکٹر حافظ محمد طاہر، بہار یونیورسٹی سے ڈاکٹر مجتبیٰ انصاری، الہ باد یونیورسٹی سے ڈاکٹر غلام مرتضیٰ اور آسام یونیورسٹی سے ڈاکٹر عبدالقادر جعفری آئے، کلکتہ یونیورسٹی کی نمایندگی جناب ڈاکٹر عطا کریم برق کے علاوہ پروفیسر مجیب الرحمٰن، ڈاکٹر محمد امین اور ڈاکٹر محمد فیروز نے کی، ظاہر ہے کہ ایسی نمایندگی کے بعد سمینار کا کامیاب ہونا ضروری تھا، ایرانی سفارت خانہ کے نمایندوں آقاے بیدار مغز اور آقائے ذوالانوری کی وجہ سے اس کی کامیابی میں مزید اضافہ ہوا، مغربی بنگال کی قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر جناب ہاشم عبدالحلیم اس کے وزیر جناب ابوالمنصور حبیب اللہ، کلکتہ کی ممتاز خاتون لیڈی مکرجی اور شہر کے اور دوسرے اکابر کی تشریف آوری سے اس کی رونق اور بڑھی،

ایران سوسائٹی کے ہر کارکن کو یہ فکر تھی کہ سمینار اس کے دیرینہ معیار کے مطابق کامیاب ہو، جہاں اس کے صدر جناب خواجہ محمد یوسف صاحب اپنی خندہ پیشانی، دل نوازی اور خاطر داری کے خزانے بکھیرتے رہے، وہاں اس کے جنرل سکریٹری محمد مجید صاحب اپنی مستعدی اور ذہنی بندی کے ساتھ ہر طرف دکھائی دیتے رہے، ان میں ایک گلستاں تو دوسرا بوستان بنا رہا، اسی میں جناب ابو علقمہ شبلی اور مولنا ابو محفوظ الکریم معصومی نے اپنی اپنی برمحل نظموں سے سامعین کو محظوظ کر کے داد حاصل کی، ذہنی ضیافتوں کے ساتھ کام و دہن کے لذت آشنا ہونے کا سامان بھی رہا، جس میں حاجی عبدالقیوم مالک امینہ ہوٹل کا پرتکلف لنچ اور جناب روسی گگی کی طرف سے لذیذ اور خوش ذائقہ الوداعی ڈنر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے،

اس سمینار میں ڈاکٹر نذیر احمد نے اس پر اظہار افسوس کیا، کہ ایران و ہندوستان میں سعدی پر جس خاطر خواہ طریقے پر تحقیقی کام ہونا چاہئے تھا، وہ اب تک نہیں ہو سکا ہے،

ایرانی سفارت خانہ کے ایک نمائندہ کلیات سعدی کا ایک ضخیم اڈیشن برابر دکھاتے رہے، مگر اس سے اطمینان نہ ہو سکا، ہندوستان میں غالب اور اقبال پر گذشتہ نصف صدی کے اندر جتنا کام ہوا ہے، سعدی پر آٹھ سو سال میں اتنا کام نہیں ہو سکا، حالانکہ سعدی کی مقبولیت کی عالمگیریت اور آفاقیت مسلّم ہے، ان کی وفات کب ہوئی، انھوں نے واقعی کتنی عمر پائی، انھوں نے کن کن اساتذہ سے تعلیم پائی، ان کے معاصرین کون کون تھے، ان کی ملاقاتیں کن کن معاصرین سے ہوئیں وغیرہ، اس قسم کی مستند معلومات نہ ہونے کی وجہ سے مقالہ نگاروں سے اگر غلطیاں ہو جائیں، تو تعجب انگیز نہیں، اس سمینار کے مقالوں کا مجموعہ شائع کیا جائے گا، تو سعدی شیرازی سے متعلق بہت کچھ مفید معلومات فراہم ہو جائیں گے، جو ایران سوسائٹی کلکتہ کی زریں کلغیوں میں ایک کا اور اضافہ ہوگا،

کھلے اجلاس میں تو نہیں لیکن نجی گفتگوؤں میں گلستاں کا باب پنجم زیر بحث رہا جس میں عشق و جوانی کے نام سے بعض ایسے مذموم اور قبیح واقعات لکھے گئے ہیں، جو ذوق سلیم پر گراں گزرتے ہیں، اخلاقیات کی اس عدیم المثال کتاب میں اس باب کی کیا ضرورت تھی خصوصاً جب سعدی خود لکھتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات بخت نافرجام و عقل ناتمام کے نتیجے ہوتے ہیں، شاید سعدی نے یہ سب کچھ لکھ کر اپنی طبیعت کے اس رنگ کا ثبوت دیا، کہ "مزاج تو از حال طفلی نہ گشت" یا ایک معلم اخلاق کی حیثیت سے انھوں نے اپنے زمانے کے معاشرے کے ان پھوڑوں پر جراحی کا فرض انجام دینے کی کوشش کی ہو، کیونکہ ان کو خود اعتراف ہے کہ ان کی گفتار کی طرب انگیزی اور طیبت آمیزی طعن درازی کی علت بن جائے گی، مگر اس سے بے فکر ہو کر انھوں نے تلخ نصیحت کے دارو

کو ظرافت کے شہد میں اس لیے ملایا کہ طبع لول دولت قبول سے محروم نہ ہو، پھر بھی یہ عجیب بات ہے کہ سعدی نے اپنے باب ہجم کی نثر میں جو کچھ لکھا ہے، اسی کی آواز بازگشت فارسی اور اردو شعراء کی غزلوں میں برابر سنی گئی، اس ذوق کے علل واسباب کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سمینار کے بعد کلکتہ میں مزید ایک ہفتہ قیام رہا۔ دارالمصنفین کے لائف ممبر جناب حاجی منظور علی صاحب مالک رائل ہوٹل نے میری اور میرے رفقاء کار مولوی ابوالبقا ندوی اور حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی کی خاطرداری اور مہمان نوازی کی کوئی کسر باقی نہیں رکھی، وہ دارالمصنفین کے قدرداں ہونے کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے بڑے پرستار ہیں، ان کی کتابوں کو عمدہ کتابت اور طباعت کے ساتھ شائع کرکے ان کی اہمیت اور افادیت کو عام کر رہے ہیں، ان کے گھر پر منتخب کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ بھی ہے جس سے ان کی خوش مذاقی ظاہر ہوتی ہے، ان کے ساتھ ایک رات کلکتہ کے مشہور علاقہ چورنگی سے گذرا تو اس کی بے رنگی دیکھ کر دکھ ہوا کہ اب اس کے حسن کی ساری رنگارنگی جاتی رہی، اب مشکل ہی سے زبان پر یہ شعر آئے،

دیدم بہ جہاں شہر بسے خرم وآباد　　شہرے بدلآرائے کلکتہ ندیدم

کلکتہ کے مشہور طبیب جناب مولانا محمد زماں حسینی صاحب کی پرکیف صحبتوں اور ان کی عالمانہ گفتگوؤں سے برابر محظوظ ہونے کا موقع ملا، ان کے صاحبزادے مولوی محمد عرفان الحسینی سایہ کی طرح ساتھ رہے، پروفیسر مقبول احمد اور پروفیسر حبیب الرحمٰن نے قیام گاہ پر آکر اپنی علمی باتوں سے مجلس گرم کی، جناب احمد سعید ملیح آبادی اڈیٹر روزنامہ آزاد ہند عزیزانہ محبت سے پیش آئے، اپنے اخبار میں دارالمصنفین کی علمی خدمات کو نمایاں کرکے ممنون کیا، ان کا اخبار اب انگریزی اخباروں کی طرح بڑے سائز میں آفسٹ پر چھپتا ہے،

ان کے دفتر کی نئی بلند اور مزین عمارت دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اردو صحافت نگاری اب بھی اپنا اعجاز دکھا سکتی ہے، وہ اپنی فطری صلاحیتوں اور خوش اخلاقی کی وجہ سے ہر طبقہ میں مقبول ہیں، کلکتہ سے ایک دوسرا روزنامہ اخبار مشرق بھی آب و تاب سے آفسٹ کی چھپائی کے ساتھ نکلتا ہے، اس کے جواں ہمت اڈیٹر جناب محمد وسیم الحق برابر قیام گاہ پر آتے رہے، ان کی برق وشی مستعدی اور تن دہی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اگر اردو صحافت نگاری اچھے اور مخلص لوگوں کے ہاتھوں میں آجائے، تو اس کا مستقبل ملک کے اور اخباروں کے ساتھ کم روشن نہیں، اس کے اداریے جناب احسن مفتاحی بھی لکھا کرتے ہیں، جن کے قلم میں زور کے ساتھ صحافت نگاری کی متانت بھی ہے، اس اخبار کے ذریعہ سے بھی دار المصنفین کی علمی خدمات وہاں کے لوگوں کے سامنے آئیں، اس کے دفتر کی کارکردگی کو دیکھکر مسرت ہوئی، خدا کرے کلکتہ کے یہ دونوں اخبار اپنی اچھی اور متوازن صحافت نگاری سے مغربی بنگال کے مسلمانوں کی مفید خدمات انجام دیتے رہیں، مسلمانوں میں اس وقت مؤثر قیادت اور تنظیم کی بڑی کمی ہے، اس کو اردو کے اخبارات ہی اپنی طاقتور صحافت نگاری سے پورا کر سکتے ہیں،

مغربی بنگال کی اردو اکیڈمی دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا، یہاں سے جو کتابیں اچھی کتابت اور طباعت سے شائع ہو رہی ہیں، ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں، صلیبیں میرے دریچے میں، مضامین وحشت، سبزۂ گل، رود ادب اور بنگالی کلچر، میزان، افسانے، سطح آئینہ، بھول آنگن کے، اور میر باقر مرشد آبادی وغیرہ، اس کی طرف سے کتابت کا ایک اسکول بھی کھلا ہوا ہے، اس کے طلبہ کو ڈیڑھ سو ماہانہ وظیفہ ملتا ہے، اور اس کے اساتذہ کی تنخواہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ ہے، اکیڈمی کے کتب خانہ میں پندرہ ہزار اردو کی کتابیں جمع کر لی گئی ہیں،

زکریا اسٹریٹ میں محمد علی لائبریری ہے، اس کے سرگرم سکریٹری جناب محمد خلیل صاحب نے اپنی کوششوں سے اس کو ایک ثقافتی مرکز بنا دیا ہے، ایک شام یہاں بھی مدعو تھا، مولانا محمد علی جوہر سے بڑی والہانہ عقیدت ہے، اس لئے ان پر بولنے کا موقع ملا تو دیر تک اپنی عقیدت کا اظہار کرتا رہا، اس کے کتبخانہ میں بھی اردو کی بہت سی کتابیں جمع کر لی گئی ہیں،

حکومت مغربی بنگال کے لائق وزیر جناب ابوالمنصور حبیب اللہ سے معلوم ہوا کہ اس ریاست میں اردو میڈیم کے
چالیس ہائی اسکول ہیں خود کلکتہ کے کئی اسکولوں میں ہائی اسکول کی تعلیم اردو میں ہوتی ہے، انجمن مفید الاسلام
کے ایک ہائی اسکول میں لڑکیوں کی تعلیم صرف اردو میں ہوتی ہے، اس میں بنگلہ زبان مطلق پڑھائی نہیں
جاتی ہے، اس انجمن کے سکریٹری جناب غلام رسول صاحب میں بڑی مذہبیت ہے، اس لئے اس اسکول
میں پردہ اور مذہبی تعلیم کا بڑا اہتمام کیا ہے، اس کی پرنسپل مسز سالک صاحبہ نے عمرانیات میں پی ایچ ڈی
کی ڈگری حاصل کر لی ہے، بہت اچھی علمی گفتگو کرتی ہیں، اس اسکول سے اسلئے بھی دلچسپی زیادہ ہوئی کہ اس کو قائم
کرنے میں میرے عم محترم جناب سید صلاح الدین صاحب کا بڑا نمایاں حصہ رہا ہے، اس کے موجودہ مخلص کارکنوں
میں جناب محمد اسحاق عرف مولانا ہیں، جن کی دبی ہوئی علمی صلاحیتیں اب اچھی طرح ابھر رہی ہیں، کلکتہ کے
جریدوں اور اخباروں میں اچھے مضامین لکھ کر نمایاں ہو رہے ہیں، اس محلہ میں اپنے ایک عزیز جناب
منصور علی اور ان کے خاندان والوں سے شاید ساٹھ برس کے بعد مل کر بڑی خوشی ہوئی،

یہ معلوم کر کے خوشی نہیں ہوئی کہ جن ہائی اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے، وہاں کے طلبہ بنگالی زبا
ڑھنے سے گریز کرتے ہیں، یہ کسی لحاظ سے مناسب نہیں، ایک زبان کی حیثیت سے مسلمان طلبہ بنگلہ بھی ضرور پڑھیں،
س سے ان کو ذاتی، مادی، اقتصادی اور سرکاری فوائد بھی حاصل ہوتے رہیں گے، بنگال میں رہ کر وہا
ی اس ترقی یافتہ زبان سے ناواقف رہنا غیر دانشمندی ہے،

جناب حاجی غلام رسول صاحب نے اپنی مذہبی اور ایمانی حمیت کی وجہ سے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے کئی
ینی مدارس کھول رکھے ہیں، ان کو بھی دیکھنے کا موقع ملا، نرکل ڈانگہ اور چترنجن ایونیو میں ان کے مدارس میں
ن کے بچوں کو بھی مخاطب کرنے کا موقع ملا، دعا ہے کہ وہ آگے چل کر اپنے مذہب کے خمیر اور سفیر بن کر رہیں، بنگلہ
سلامی پیپر کا شانتی ٹرسٹ میں بھی جناب سید علی صاحب نے مدعو کیا، اس کی طرف سے بنگلہ زبان میں کلام پاک کا
ترجمہ ہوا ہے، اس کو دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی، یہاں سے بنگالی مسلمانوں کے لئے بنگلہ زبان میں جو ۴۰ چھوٹے

بڑے مفید رسائل اور کتابچے شائع ہوگئے ہیں اُن کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس خدمت کو انجام دینے کی سخت ضرورت تھی جو اس ادارہ کی طرف سے جاری ہوا اللہ تبارک وتعالیٰ اس نیک کام میں ہر طرح برکت دے،

کلکتہ کے اسلامیہ اسپتال کے ہر کمرہ کو جناب گلزار احمد نے بڑے شوق سے دکھایا، یہ کلکتہ کے مسلمانوں کا بہت بڑا اخلاقی کارنامہ ہے اس سے وہاں کے لوگوں اور خصوصاً مسلمانوں کو جو طبی سہولت حاصل ہے اس سے اس کے بانیوں اور کارکنوں کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہوں گی، دعا ہے کہ اس کارِ خیر کا چشمہ برابر جاری رہے، (آمین)

اس سفر میں جناب حاجی عبدالقیوم، جناب منظور علی، جناب مولانا حکیم محمد زماں حسینی، جناب محمد خلیل، جناب محمد اسحٰق اور مولوی محمد عرفان الحسینی کی مساعی جمیلہ سے حسب ذیل حضرات نے دارالمصنفین کی رکنیت دوامی قبول کی، جن کے لئے ہم اُن کے شکر گذار ہیں، (۱) جناب حاجی غلام رسول (۲) پروفیسر مقبول احمد سرحن (۳) جناب گلزار احمد (۴) جناب حاجی منصور احمد (۵) جناب محمد صادق (۶) جناب فیضان احمد (۷) جناب محمد خلیل (۸) جناب مبارک حسین (۹) جناب محمد یوسف نجشی، جناب محمد خلیل، جناب حسن زماں اور ڈاکٹر محمد عتیق دریابادی نے معارف کے کچھ خریدار بنوا کر ممنون کیا

اس سفر کا تتمہ جناب خواجہ محمد یوسف صاحب ایڈوکیٹ (صدر ایران سوسائٹی) کے دولت کدہ پر ایک پر تکلف اور شیریں مجلس پر ہوا جس میں کلکتہ کے منتخب اہل علم کے درمیان مٹھائیوں کے انبار میں علمی گفتگو ہوتی رہی، پروفیسر عطا کریم برق صدر اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی نے اپنی شیوا بیانی سے محظوظ کیا، اور جب حاجی منظور علی حاجی عبدالقیوم اور خواجہ محمد یوسف صاحبان نے ہر قسم کے اخلاقِ حسنہ کے ساتھ اسٹیشن سے رخصت کیا تو ان حضرات اور کلکتہ کے دوسرے لوگوں کی خاطر داری کی یادیں رفیقِ سفر بنی رہیں،

کلکتہ کے مشہور مضمون نگار جناب آغا رشید دہلوی آج کل وہاں علیل ہیں، اُن کی عیادت کرکے اُن کی صحت کی دعا کی، مولانا ابو سلمہ شفیع اور اُن کے لڑکے مولوی ابو طلحہ ندوی کی پذیرائی بھی یاد رہے گی،

مقالات

اسلام اور مستشرقین

از پروفیسر سید حبیب الحق ندوی، ڈربن یونیورسٹی، جنوبی افریقہ

حرف آغاز | اسلام، اسلامی تاریخ اور امت مسلمہ کی رہبری کا سرچشمہ چونکہ قرآن مجید یعنی کلام الٰہی رہا ہے اس لیے اسلام اور مستشرقین کے مطالعہ میں بھی اگر اسی مرجع و مصدر کی جانب رجوع کیا جائے تو زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ لفظ مستشرق کی لغوی و نحوی تفسیر و تحلیل کی جا سکتی ہے، اور باب استفعال سے خواص کی تعیین کے بعد استشراق پر جرح و تعدیل بھی ممکن ہے۔ مگر راقم الحروف اس پورے مسئلہ کو نئے زاویہ سے حل کرنے کی تائید میں ہے، اور وہ قرآنی زاویہ ہے۔ اگر آج بھی قرآن کریم امت مسلمہ کی فکر کا نقطۂ آغاز اور منتہا سے پرواز بن جائے جس طرح قرون اولیٰ کے مومنین باصفا اور مخلصین لہ الدین کا تھا تو نہ صرف سیاسی و سماجی، معاشی و ثقافتی میدانوں میں فتح و فیروزمندی کا علغلہ پھر سکتا ہے، بلکہ علوم و فنون اور سائنس میں بھی شادمانی و کامرانی کا مژدۂ جانفزا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ لا سکتا ہے۔ بعض احباب کو یہ تجویز عجوبہ معلوم ہو سکتی ہے، اور وہ یہ سوال بھی کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم اور مستشرقین کا باہمی ربط کیا ہے؟ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ اسی ربط کے انکشاف کے بعد ہمارا سارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے، اور آج جو خلفشار علمی دنیا میں مستشرقین نے مچا رکھا ہے، یا ان کے شاگردان رشید ان مسلم اعتذاریوں نے برپا کر رکھا ہے، اس کا علاج بھی ممکن ہے۔

اگر قرآن کریم اسلامی نظام حیات کا منشور ازلی ہے تو اسے اس مسئلہ کو حل کرنا چاہیے قرآ
امت مسلمہ کی ہدایت کے لیے بہت سے احکام نازل ہوئے مسلم حکمرانوں اور دانشوروں
جب جب ان احکام سے روگردانی کی خسارہ میں رہے، اور زمانہ اس پر شاہد ہے، وَالْعَصْرِ
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ، امت مسلمہ کی حکومتوں کے لیے جو خارجہ پالیسی قرآن نے متعین
فرمائی تھی وہ ہمیشہ برحق ثابت ہوئی، اور آج تو اظہر من الشمس ہے، علم و دانش، ریسرچ و تحقیق
کے میدان میں بھی یہی پالیسی ازلی و ابدی حیثیت رکھتی ہے، مسلم حکمرانوں نے ان احکام الٰہیہ
نظر انداز کیا اور اس کی سزا پائی، علم و دانش کے میدان میں بھی احکامِ الٰہیہ کی سرتابی کے نتائج
مختلف نہیں ہو سکتے،

اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ امت مسلمہ کو یہ فرمان دیا تھا:

(الف) وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ۔

(البقرہ - ۱۲۰)

یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کے طریقہ پر نہ چلنے لگو، صاف کہدو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے، ورنہ اگر اس علم کے بعد جو تمھارے پاس آچکا ہے، تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمھارے لیے نہیں ہے،

(ب) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ،

بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۤءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (مائدہ : ۵۱)

یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے، یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مستشرق یا مستشرقین کون ہیں، اور ان کی نسل کہاں سے
ہے؟ اس کا جواب بھی اظہر من الشمس ہے، مستشرقین روز اول سے آج تک یہود و نصاریٰ
ہے ہیں، خواہ مشرق میں ہوں خواہ مغرب میں، آٹھویں صدی عیسوی سے ۱۹۸۳ء تک مستشرقین کی
یخ محض مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى کی تفسیر و تعبیر
ہے، بلکہ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ انھی آیات کی تعبیر رہی ہے، سیاسی میدان ہو یا علم و
ش و ثقافت کا میدان، اسلام دشمنی مستشرقین کی پالیسی کا جزء اعظم رہا ہے، مسلم اعتذاری سکول
فیاض ارکین خواہ کسی قدر مستشرقین کے کارناموں کی تحسین پیش کریں، ان کی تقصیرات کو
ن عفو میں جگہ دے کر ان کو صدارت کی کرسی پر بٹھا کر انھیں ہار پہنائیں مگر وہ لَنْ تَرْضٰى کے
ی میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے، انھیں حق ہے کہ ہمیں متقشف متعصب اور غیر منصف قرار دیں، مگر
قرآن کے معنی میں تبدیلی کا انھیں حق نہیں، جس کی وسعتوں میں ازلیت ہے اور ابدیت بھی، قرآن کریم
، دعویٰ کے اثبات کے لیے ہمیں چودہ سو سالہ تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی پڑے گی اس کے
بر معنی لَنْ تَرْضٰى کی تشریح ممکن نہیں۔

لام اور مستشرقین: ابتدائیہ | فرمان الٰہی یعنی اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ عقائد اسلامیہ کا
طۂ آغاز رہا ہے، اور منتہائے پرواز بھی، یہ تحریک حضرت آدمؑ سے شروع ہوئی اور حضرت محمد صلعم

اگر قرآن کریم اسلامی نظام حیات کا منشور ازلی ہے تو اسے اس مسئلہ کو حل کرنا چاہیے۔ قرآن میں امت مسلمہ کی ہدایت کے لیے بہت سے احکام نازل ہوئے، مسلم حکمرانوں اور دانشوروں نے جب جب ان احکام سے روگردانی کی خسارہ میں رہے، اور زمانہ اس پر شاہد ہے، وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ، امت مسلمہ کی حکومتوں کے لیے جو خارجہ پالیسی قرآن نے متعین فرمائی تھی وہ ہمیشہ برحق ثابت ہوئی، اور آج تو اظہر من الشمس ہے، علم ودانش، ریسرچ وتحقیق کے میدان میں بھی یہی پالیسی ازلی وابدی حیثیت رکھتی ہے، مسلم حکمرانوں نے ان احکام الٰہیہ کو نظرانداز کیا اور اس کی سزا پائی، علم ودانش کے میدان میں بھی احکامِ الٰہیہ کی سرتابی کے نتائج مختلف نہیں ہو سکتے،

اللہ نے اپنے رسولؐ کے ذریعہ امت مسلمہ کو یہ فرمان دیا تھا:

(الف) وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۔ (البقرہ ۔ ۱۲۰)	یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کے طریقہ پر نہ چلنے لگو، صاف کہدو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے، ورنہ اگر اس علم کے بعد جو تمھارے پاس آچکا ہے، تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمھارے لیے نہیں ہے،
(ب) يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى أَوْلِيَاءَ	اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ،

بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (مائدہ : ۵۱)

یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں ہے، یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مستشرق یا مستشرقین کون ہیں، اور ان کی نسل کہاں سے
ہے؟ اس کا جواب بھی اظہر من الشمس ہے، مستشرقین روز اول سے آج تک یہود و نصاریٰ
ہے ہیں، خواہ مشرق میں ہوں خواہ مغرب میں، آٹھویں صدی سے ۱۹۸۳ء تک مستشرقین کی
یخ محض مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى کی تفسیر و تعبیر
ی ہے، بلکہ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ انھی آیات کی تعبیر رہی ہے، سیاسی میدان ہو یا علم و
ش و ثقافت کا میدان، اسلام دشمنی مستشرقین کی پالیسی کا جزو اعظم رہا ہے، مسلم اعتذاری اسکول
ے فیاض اراکین خواہ کسی قدر مستشرقین کے کارناموں کی تحسین پیش کریں، ان کی تقصیرات کو
من عفو میں جگہ دے کر ان کو صدارت کی کرسی پر بٹھا کر انھیں ہار پہنائیں مگر وہ لَنْ تَرْضٰى کے
نی میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے، انھیں حق ہے کہ ہمیں متقشف، متعصب اور غیر منصف قرار دیں، مگر
قرآن کے معنی میں تبدیلی کا انھیں حق نہیں، جس کی وسعتوں میں ازلیت ہے اور ابدیت بھی، قرآن کریم
ے دعوی کے اثبات کے لیے ہمیں چودہ سو سالہ تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی پڑے گی اس کے
یر معنی لَنْ تَرْضٰى کی تشریح ممکن نہیں۔

لام اور مستشرقین: ابتدائیہ | قران الٰہی یعنی اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ عقائد اسلامیہ کا
نقطۂ آغاز رہا ہے، اور منتہائے پرواز بھی، یہ تحریک حضرت آدمؑ سے شروع ہوئی اور حضرت محمد صلعم

(۵۷۰ - ۶۳۲ء) پر ختم ہوئی، ایک طرف تکمیل دین (اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ) کا منشور جاری ہوا، دوسری طرف یہ اعلامیہ بھی جاری کر دیا گیا کہ اسلام کے علاوہ کوئی دین اللہ کے لیے مقبول نہیں، وَمَن یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَن یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ۔ (آل عمران ۸۵) نیز ہر مومن کا شعار ہے کہ من حیث مسلم اپنے خالق اور باری کے دربار میں واپس ہو۔ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (آل عمران - ۱۰۲) اسلام کی یہ داخلی اور خارجی پالیسی یہود و نصاریٰ کے لیے ہمیشہ ناقابل قبول رہی، اسی لیے وہ اسلام دشمنی پالیسی کے سربراہ رہے۔

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے بعد سے خلفائے راشدین کے دور تک یہود و نصاریٰ کی اسلام دشمن پالیسیاں اظہر من الشمس رہی ہیں، تاریخ اسلام کا ہر طالب علم ان سے واقف ہے، ان تفصیلات سے یہاں بحث نہیں کی جائے گی، یہ مقالہ یہود و نصاریٰ کے علمی و فکری، ذہنی و نفسیاتی رجحانات کی ایکسرے رپورٹ ہے جو ساتویں صدی عیسوی سے ۱۹۸۳ء تک علیٰ حالہ قائم ہے، نیز ان علمی روایات کی سراغ رسانی مقصود ہے جو یہود و نصاریٰ بالفاظ دیگر مستشرقین کی اسکالرشپ، ریسرچ، تالیفات و تصنیفات کا طرۂ امتیاز ہے۔

جدید مستشرقین کا نسب نامہ یا شجرۂ نسب جان آف دمشق (۷۰۰ یا ۷۴۹ء) سے جا ملتا ہے، جس نے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف نفرت اور دشمنی کی تحریک کا آغاز کیا اور تحریری مناظرات کا منفیانہ دور شروع کیا اور بزنطینی تاریخی روایات کا مصدر اول تسلیم کر لیا گیا، دمشقی جان نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت اسلام کے خلاف تحریک چلائی، اس نے اسلام کو وثنی (Pagan) مذہب قرار دیا اور کعبہ کو بت سے تعبیر کیا، چونکہ اسلام کی تمسیخ کیلئے آنحضرت صلعم کی سیرت، شخصیت و دعوت کی تمسیخ ضروری تھی، اس لیے اس نے آپ کی حیات طیبہ اور سوانح پر حملہ شروع کیا، آپ کی نبوت کا انکار کر کے آپ کو دیومالائی قصوں کا ہیرو بنا دیا، داستان سازی کے اس صنعت خانہ میں

آنحضرتؐ کے بارے میں طرح طرح کے افسانے اور مضحکہ خیز وحشی خرافات گھڑے گئے، یہی کہانیاں لاطینی یا بیزنطینی تاریخ اور بعد میں چرچ کی اسلامی تاریخ کا حصہ بن گئیں اور مستشرقین کی اسکالرشپ کا مصدر اصلی بھی، جان اور اس کے پیروؤں نے آنحضرتؐ کو بے دین قرار دیا نیز نبی کاذب کا خطاب دے کر اسلام کو ایک فاسد دین قرار دے دیا، اس نے آنحضرتؐ پر الزام لگایا کہ آپؐ نے ایک پادری کی معیت میں بائبل کو مسخ کر کے اسلام نام کا ایک نیا مذہب ایجاد کیا، اسلام میں محمدؐ کی پوجا کی جاتی ہے۔

جان وہ پہلا مسیحی مشرقی مشنری تھا جس نے آنحضرتؐ کی مقدس شخصیت پر جنسی اتہامات کا طومار کھڑا کیا، جو بعد میں مغربی اسکالرز کی تحقیق و ریسرچ کا دلچسپ موضوع بن گیا، اس نے زینب بنت جحشؓ اور زید بن حارثہؓ کے واقعہ کو ایک افسانہ بنا دیا، یہی افسانے یورپ میں کلاسیکی موضوعات بن گئے اور آج تک مستشرقین کے محبوب عناوین ہیں، ساتھ ہی جان نے تعدد ازدواج، طلاق اور اس قسم کے دیگر مسائل کو اچھالا جو اس کی کتاب De Haere sibus کے آخری باب کے اہم موضوعات ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی میں جان کے پیروؤں نے ان ہی بنیادوں پر اسلام دشمن لٹریچر کا انبار کھڑا کر دیا، یہی منفیانہ لٹریچر مغربی اسکالرشپ کے لیے حوائجات کا کام دینے لگے، بلکہ مڈل ایجز (ازمنہ وسطیٰ) سے لے کر مغربی نشاۃ ثانیہ اور نشاۃ ثانیہ سے لے کر انتہائے بیسویں صدی تک مستشرقین کے لیے مصادر کا کام دیتے رہے، اسلام دشمن ادب کے اسی انبار میں ایک نامی گرامی رسالہ قابل ذکر ہے، یہ رسالہ عبدالمسیح بن اسحاق الکندی کی طرف منسوب ہے، چونکہ اس کا اثر مستشرقین پر آج تک موجود ہے اس لیے مغربی اسکالرز نے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا، انیسویں صدی میں ولیم اس کا عربی متن پروٹسٹنٹ مشنری اسکول کے استعمال کے لیے ۱۸۸۰ء میں

لندن سے شایع کیا گیا، ولیم میور نے اس کا تلخیصی ترجمہ زیرعنوان The Apology of AL-KINDI لندن سے ۱۸۸۲ء میں شائع کیا۔ یہ رسالہ مڈل ایجز میں رہنما اصول کا کام دیتا رہا مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے، رسالہ کے مرکزی مضامین میں آنحضرت صلعم کی نبوت کا انکار، قرآن کا مذاق (اسے خبط خیالات کا غیر مربوط مجموعہ قرار دیا) سیرت محمدیہ کو جنس اور جنگ سے ملوث کرنا اور دیگر خرافات شامل تھے۔ یہ رسالہ یورپ میں مڈل ایجز کی اسکالرشپ کو غذا فراہم کرتا رہا آج بھی رسالہ کا آسیب مستشرقین کے سر پر سوار ہے، یہی رسالہ بیزنطینی مولفین کا مصدر بھی رہا بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بیسویں صدی کی اسکالرشپ اپنی بھاری بھرکم تنقیدی اصطلاحات معروضی اور سائنسی جرح وتعدیل کے زبان دراز دعووں کے باوجود اس رسالہ کی گرفت سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔

آٹھویں صدی کے اواخر اور نویں صدی کے اوائل میں عروج اسلام پر تھیوسوفین (۷۵۲ء تا ۸۱۸ء) نے کرانکل لکھی، اس تاریخ ــــ The Chronicles of Theosophane, the confessor کو اناسٹیس Anastasius نے اپنی تاریخ چرچ کا حصہ بنایا اور یہ خونیں کتب مستشرقین کے مصادر (Sources of reference) بن گئے، کرانکل درحقیقت مڈل ایجز میں شایع شدہ خرافات کا مجموعہ ہے، اس کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں آنحضرتؐ کی تعلیم سے بحث کی گئی ہے، مؤلف نے ثابت کیا ہے کہ محمدؐ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور ان کو اُمّی کہنا کذب ہے، اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اگر محمدؐ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ ثابت کر دیا جائے تو منطقی طور پر یہ دعویٰ ثابت ہو جائے گا کہ انھوں نے یہودی اور عیسائی الہامی کتب اور مصادر کا بغور مطالعہ کیا اور ان ہی معلومات کی مسخ شدہ صورت کا نام اسلام ہے یہ کہانی اسلئے وضع کی گئی کہ اسلام کی اصلیت (یہودی الاصل یا عیسائی الاصل) Origins of Islam

کو ثابت کیا جائے، آج مغربی امریکی جامعات (یونیورسٹیوں) کا محبوب ترین موضوع درس اصلیت اسلام ہے، جس میں ان ہی قدیم مضامین کی تجدید کی جاتی ہے، اسی کی ذیل میں آنحضرتؐ کے جنونی دورے (Epileptic fits) کی داستان بھی گھڑی گئی، اس قسم کے بے شمار افسانے مذکور ہیں جن کے اعادہ کی گنجایش نہیں۔

نویں صدی عیسوی میں شاہ مِیسَل (۸۶۷ء تا ۸۸۶ء) کی فرمایش اور حکم پر ایک بزنطینی مؤلف نے آنحضرتؐ کے خلاف ایک کتاب Refutatio Mohammad لکھی، جس میں آپؐ کو نبی کاذب کے علاوہ ابن ابلیس (العیاذ باللہ) بھی قرار دیا، قرآن کو کذب اور خرافاتی داستانوں کا مجموعہ قرار دے کر غیر الہامی ثابت کرنے کی کوشش کی اور اسلام کے اساسی عقیدہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کا شدید مذاق اڑایا، مسلمانوں پر الزام لگایا کہ وہ اصل خدا کی پرستش سے دور ہیں، اسلام چونکہ عیسیٰؑ بن مریمؑ کے عقیدہ کا حامی ہے اور عیسیٰ ابن اللہ کی شدت کے ساتھ تردید کرتا ہے اس لیے مؤلف کی نظر میں یہ مذہب اور اس کے پیامبر و داعی سب کاذب ہیں، دسویں اور گیارہویں صدیاں ان ہی افسانوں کی بازگشت ہیں۔

مستشرقین کا جو گروہ اسپین کی سرزمین سے اٹھا، وہ ان ہی مصادر کا پروردہ تھا، اسلامی علوم و فنون تہذیب و ثقافت کا سکہ تقریباً نو سو سالوں تک اندلس میں قائم رہا، مگر مستشرقین اسپین نے کبھی اس بات کی سعی نہیں کی کہ بزنطینی مصادر کے بجائے براہ راست اسپین کی اسلامی تہذیب کا مطالعہ کریں، انھوں نے کرانکل کے افسانوں پر اپنی اسکالرشپ کی بنیاد ڈالی، دو مثالیں کافی ہیں، قرطبہ کا پوپ (St Eulogius) جو عرصۂ دراز تک مسلم کلچر کا مطالعہ کرتا رہا، اور مسلم علماء و فضلاء کے ساتھ رہا، اپنی تالیف Liber Apologeticus Marlirum کی بنیاد کرانکل اور لاطینی مسودات و مخطوطات

رکھی جس کا اعتراف خود بھی کیا ہے، اس نے آنحضرتؐ اور اسلام کے خلاف شدت نفرت کا مظاہرہ کیا ہے، بلکہ حیوانی زبان تک استعمال کی ہے، یہ کتاب بھی دیومالائی قصوں سے سجائی گئی، کچھ افسانے تو خود ساختہ ہیں اور کچھ کرانکل وغیرہ کے رہین منت ہیں، اسی طرح سان پیڈرو پاسکل (San Perdo Pascal) نامی دوسرے اندلسی اسکالر کی تالیف Sobre ElSeTonMahometana کندی کے رسالہ کا چربہ ہے، ان دونوں مؤلفین کے دلوں میں اسلام کے خلاف نفرت کا آدہ سلگ رہا تھا، ان کے خیال میں اسپین پر اسلامی حکومت عیسائیوں کے لیے عذاب الٰہی تھی، اسلام ان کی نظر میں عیسائیت کا بدترین جانی دشمن تھا، اس سلگتی آگ کو چرچ کی تواریخ نے مزید شعلہ بداماں بنا دیا، چونکہ یہی کتب، تالیفات و مصادر، عام قاری، علماء اور اسکالرز کے مراجع تھے، اس لیے نفرت وحسد کی آگ بھڑکتی ہی چلی گئی، ونسنٹ ڈی بو (Vincent de Beauvais) متوفی ۱۲۶۴ء نے ان تمام داستانوں کو اپنی تالیف Speculum Historicale میں جمع کر دیا، اور آنحضرتؐ کو وحشی Pagan اور ذلیل (Low born) ثابت کیا، ان کا خیال ہے کہ آنحضرتؐ نے تلوار کے زور سے طاقت حاصل کی اور وحی کے نام پر دھوکہ دے کر اس کو برقرار رکھا۔

کارزار صلیب اور مستشرقین اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو نفرت پھیلائی گئی، اس کا نقطۂ عروج کارزار صلیب تھا، مسلمانوں اور اسلام کو مٹانے کے لیے صلیبی جنگیں تقریباً پانچ سو سالوں تک جاری رہیں، اور پانچ صدیوں میں وقفہ وقفہ سے یورپ کی مشترکہ عسکر قوت مسلم شرق اوسط پر زندگی کے لیے موت اور آبادی کے لیے ویرانی کے دیو کی طرح منڈلاتی رہی، ۱۵۹۹ء میں پہلی خون آشام جنگیں ہوئیں، دوسری صلیبی جنگ ۱۱۴۷ء میں لڑی گئی اور تیسری معروف صلیبی جنگ سلطان صلاح الدین اور شہنشاہ انگلستان رچرڈ دی

درمیان ۱۱۸۹ء سے ۱۱۹۳ء تک جاری رہی، چوتھی صلیبی جنگ ۱۲۰۲ء تا ۱۲۰۴ء کے درمیان لڑی گئی اور ۱۲۱۷ء میں پانچویں صلیبی جنگ پیش آئی، چھٹی صلیبی جنگ کا واقعہ ۱۲۲۸ء میں پیش آیا، جب یہ تمام کاوشیں ناکام ہوگئیں تو مسلمانوں کی تاراجی کے لیے اہل صلیب نے منگول قوت کے ساتھ عسکری اتحاد ۱۲۴۹ء اور ۱۲۵۰ء کے درمیان قائم کیا، اسی اتحاد کا نتیجہ تھا کہ زوال بغداد کا واقعہ ۱۲۵۸ء میں پیش آیا، آٹھویں صلیبی جنگ ۱۲۴۸ء میں پیش آئی نویں صلیبی جنگ ۱۲۷۰ء اور آخری دسویں صلیبی جنگ ۱۴۶۴ء میں پیش آئی، ان صلیبی جنگوں اور خون آشامیوں کا تعلق مستشرقین سے بڑا گہرا ہے، کیونکہ پانچ صدیوں میں یورپ کے مفکرین، مؤلفین اور شعراء اسلام کے خلاف مسیحی جذبات کو گدگداتے اسلام اور مسلمانوں کی تاراجی پر ابھارتے اور ان کے اندر شہادت کا جذبہ پیدا کرکے آمادۂ پیکار رہنے کی روح پھونکتے رہے، جنگ صلیبی پر اسٹیون رنسی مان (Steven Runciman) کی تین[3] جلدیں قابل مطالعہ ہیں، ہلاکو کی زوجہ خاصہ (Chief wife) ایک عیسائی خاتون تھی جو ہلاکو کی افواج کو مسلمانوں کی تاراجی پر ابھارتی رہی، بلکہ حملۂ بغداد کے موقع پر وہ خود ہلاکو کے ساتھ معرکہ میں شریک تھی، ہلاکو کا سب سے زیادہ معتمد علیہ کمانڈر (Kutabuga) بھی نسطوری عیسائی تھا اور بغداد کی مہم میں شریک تھا، جب بغداد برباد ہوا تو اسّی ہزار افراد قتل کیے گئے (ملاحظہ ہو رنسی مان کی جلد دوم، صفحات ۲۴۶ تا ۳۰۰، نیز ملاحظہ ہو راقم الحروف کی فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات باب چہارم ص ۱۷۶ تا ص ۲۰۳)

صلیبی جنگوں کی پانچ سو سالہ تاریخ (از ۱۰۹۵ء تا ۱۴۶۴ء) کے دوران یعنی گیارہویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی تک مستشرقین نے اسلام کے خلاف جو لٹریچر پیدا کیا، اس کا سرسری جائزہ لن ترصف ... کی تشریح کے لیے ضروری ہے۔

تمام صلیبی جنگوں میں یورپ کی مشترکہ عسکری قوت کا دیوالہ نکل گیا، اسی شکست فاش کی بنا پر اسلام

اور پیغمبر اسلام کے خلاف نفرت کی نئی لہر دوڑ گئی، نثری ادب کے ساتھ شعری ادب بھی پوری قوت کے ساتھ میدانِ مبارزہ میں اتر آیا، شعراء نے اسلام کی تنقیص میں پوری قوت صرف کر دی، اس میں دانتے کا نام قابل ذکر ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا، سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی تاریخ کی تمسیخ کی نئی تحریکیں چل پڑیں، ۱۱۴۱ء میں پیٹر (Peter the Venerable) نے چند عربی کتب کے تراجم لاطینی زبان میں کرائے، رابرٹ (Robert) اور ہرمن (Herman) نامی مؤلفین نے چار عربی کتب کے تراجم کیے، جن پر پیٹر نے مقدمے لکھے، یہ مقدمے خرافات سے مزین تھے، رابرٹ نے قرآن کا ترجمہ کیا اور پیٹر نے اس کی تردید کی، نیز یہ بھی ثابت کیا کہ اسلامی عقائد و تعلیمات مضحکہ خیز ہیں، پیٹر کی تحریرات اور تالیفات نے یورپ میں اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف باقاعدہ محاذ آرائی کا دور شروع کیا، یہی تالیفات مستشرقین کے معصوم مصادر بنے رہے، اب اسلام کے خلاف محاذ آرائی میں لاطینی زبان کے علاوہ یورپ کی دیگر زبانیں بھی صف آرا ہو گئیں، نثر کے ساتھ نظم بھی صف آرا ہوئی، فرانسیسی اور لاطینی نظم نے بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا، یہاں پر چند انتہا کی کتب کا ذکر کافی ہوگا۔

والٹر (Walter of Sens) نے لاطینی زبان میں اور الکزنڈر (Alexander Dupont) نے فرانسیسی زبان میں آنحضرت ؐ کے خلاف دل کھول کر لکھا، ایک شعری مرثیہ گیارہ سو بیالیس ۱۱۴۲ اشعار پر مشتمل زیرِ عنوان (Avila Muhamiti) لکھا گیا، اور اسے بارہویں صدی کے شاعر امبری کو (Embrico of Mainz) کے نام سے منسوب کر دیا گیا، اس میں آنحضرت صلعم کے خلاف نفرت امنڈتا ہوا ایک طوفان تھا، ہر قسم کے غلیظ القابات استعمال کیے گئے، بعضوں نے اسی مرثیہ کو ہلڈبرٹ (Hildebert of Tours) نامی شاعر (متوفی ۱۱۳۳ء) کی طرف منسوب کر دیا، یہ مرثیہ گویا آنحضرت ؐ کی سیرت طیبہ کا شعری مجموعہ تھا، اسی قسم کی شعری سیرت زیرِ عنوان ادیو دی محمہ

(Oti ode Machomet ۱۰۹۰ء) اشعار پر مشتمل تھی، والٹر نے وسط بارہویں صدی میں لکھی جو پہلے مرثیہ کا نقش ثانی تھا، حروب صلیبیہ پر تالیفات کا زور ہوا، معروف مولف گلبرٹ (Guilbert of Nogent) نے پہلی صلیب پر ایک کتاب زیر عنوان گیستا (Giesta Dei Der Francaos) لکھی اور ۱۱۱۲ء سے قبل ہی مکمل کر لیا، اس تالیف میں آنحضرتؐ کی سیرت پر ایک باب ہے جو ازمنۂ وسطیٰ کے خرافات کا چربہ ہے، آنحضرتؐ کے نام تک کو مسخ کرنے کی سعی کی ہے، اور محمدؐ کے بجائے ماتھومس (Mathomus) لکھا ہے، اس میں راویوں کی زبانی داستانیں نقل کی گئی ہیں، سب سے دلچسپ افسانہ جو مولف نے درج کیا ہے وہ لائق سماعت ہے،

مذہب اسلام کے وجود کے سلسلہ میں مولف رقمطراز ہے کہ الکزنڈریا (Alexandria) کے پیٹریارک (Patriarch) کا الکشن ہونے والا تھا، اس انتخاب میں حصہ لینے والا امیدوار پادری اپنے انتخاب سے مایوس ہو گیا تو اس نے چرچ کے خلاف انتقامی کارروائی کا منصوبہ تیار کیا، اس مقصد کی خاطر اس نے محمدؐ کے ساتھ ساز باز کیا اور عیسائیت میں پھوٹ ڈالنے کے لیے محمدؐ کو زبردست تربیت دی اور آپ کی شادی ایک مالدار عورت خدیجہؓ سے کروا ڈالی، پادری مذکور نے محمدؐ کی حمایت کی اور ان کی نبوت کا اعلان کیا تاکہ مسیحیت پر ضرب کاری پڑسکے، چنانچہ محمدؐ اس طرح نبی بن گئے اور مذہب اسلام کی دعوت دینی شروع کر دی، اس طرح مذہب مسیحیت میں تفرقہ پڑ گیا، جو ہنوز باقی ہے۔

اس سے زیادہ دلچسپ داستان گڑھی گئی کہ محمدؐ خود پادری (CARDINAL) تھے اور پوپ (POPE) کے مرتبہ پر ترقی پانے کے امیدوار بھی، مگر جب انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی تو وہ روم سے بھاگ کر عربیہ گئے اور وہاں نبوت کا دعویٰ کر دیا، ایک روایت کے مطابق یروشلم کے بشاپ سرگیس (SERGIUS) نے محمدؐ کو نبوت کے دعویٰ پر اکسایا اور ان کے لیے قرآن نامی کتاب لکھی

بارہویں صدی عیسوی کی خرافات نویسی میں دو ایسے مؤلفین ضرور نظر آتے ہیں جنھوں نے مستشرقین کی ڈگر سے ہٹ کر اپنی راہ متعین کرنی چاہی، مگر ان کی حیثیت آٹے میں نمک کی تھی، ولیم مؤلف (William of Malmesbury) نے اسلام اور وثنیت (Paganism) میں فرق پیدا کیا اور لکھا کہ اسلام چونکہ توحید کا دعویٰ کرتا ہے اس لیے وثنی نہیں ہو سکتا، ۱۱۲۰ء میں اس نے یہ بھی لکھا کہ مسلمان محمدؐ کو نہ تو خدا مانتے ہیں، نہ ہی ان کی پوجا کرتے ہیں، اس کے برخلاف وہ محمدؐ کو محض خدا کا نبی تسلیم کرتے ہیں، دوسرا مؤلف الفونسو (Alfonso) تھا، اصلاً یہودی تھا، مگر ۱۱۰۶ء میں مصلحۃً عیسائیت قبول کر چکا تھا، عیسائیت اور یہودیت کی باہمی رقابت و تصادم محتاج تعارف نہیں، دو ہزار سالہ رقابت کے باوجود آج وہ قرآن کی تصدیق کے مطابق بعضہم اولیاء بعض ہیں، آج یہ حقیقت جس طرح عیاں ہے شاید تاریخ کے کسی زمانہ میں اس طرح آشکارا نہ تھی، الفونسو نے یہودیت اور عیسائیت کے درمیان ایک انہامی ڈائیلاگ لکھا جس میں اسلام کے متعلق بہتر خیالات کا اظہار کیا، شاید مسیحی دنیا کو جو یہودیوں کی جانی دشمن تھی غیرت دلانا مقصود ہو، تیرہویں صدی عیسوی سابقہ ڈگر پر چلتی رہی، ۱۲۷۱ء میں ولیم (William of Tripoli) نے آنحضرتؐ کی سوانح لکھی، تاکہ مشنری اپنی تبلیغ کے لیے استعمال کر سکیں، اس سوانح میں مؤلف خرافات کے علاوہ کچھ پیش نہ کر سکا، اس نے قرآن کریم کے بارے میں ایک دلچسپ افسانہ گھڑا، اس کے خیال میں قرآن مجید کی ترتیب و تالیف آنحضرتؐ کے وصال کے پندرہ سال بعد ہوئی، اس کی تدوین کا کام ایک کمیشن کے حوالہ کیا گیا تھا، چونکہ آنحضرتؐ کی تعلیمات میں کوئی نئی اور مفید بات اراکین کمیشن کو نظر نہیں آئی، لہٰذا انھوں نے خود ہی قرآن نامی کتاب کی تدوین کر ڈالی، یہ تمام خرافات لاطینی روایات کے اجزائے ترکیبی بنتے چلے گئے، مستشرقین نے آنحضرتؐ کی کامیابی کے دو اہم راز کا انکشاف کیا، ایک تو جادو تھا اور دوسرا عیاری تھا، مؤلفین نے اصرار کیا کہ

اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، نبوت کے انکار کے لیے یہ دلیل پیش کی گئی کہ آنحضرتؐ نے خود اپنے آپ کو ایک عام آدمی قرار دیا ہے اور کوئی معجزہ نہیں دکھایا، لہٰذا وہ نبی ہو نہیں سکتے۔

ازمنۂ وسطیٰ سے نشاۃ ثانیہ تک مستشرقین کا سفر

دانتے اٹلی کا معروف شاعر، ازمنۂ وسطیٰ اور نشاۃ ثانیہ کے درمیان پُل کی حیثیت رکھتا ہے، (دانتے ۱۲۶۵ء سے ۱۳۲۱ء) نہ صرف اٹلی کی نشاۃ ثانیہ کا جد امجد ہے، بلکہ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا پیامبر بھی ہے، اس کی معروف و شہرۂ آفاق نظم (The Divine Comedy) کو نشاۃ کا چراغ راہ تصور کیا جاتا ہے، اس نظم کی تدوین و تاسیس میں دانتے نے آنحضرتؐ کی احادیث معراج سے استفادہ کیا ہے، میڈرڈ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے استاذ پلاسیوس (Plactous) نے ۲۵ سالہ ریسرچ اور جانکاہ اور دیدہ ریز محنت کے بعد یہ ثابت کر دیا کہ دانتے نے اس نظم کی تدوین میں نہ صرف معراج کی احادیث سے استفادہ کیا ہے بلکہ ابن عربی کی فتوحات مکیہ اور المعری کی رسالۃ الغفران سے بھی استفادہ کیا، دانتے نے علوم اسلامیہ اپنے اطالوی استاد برونیولو (Brunello Latini) سے جو عربی زبان کا ماہر تھا، حاصل کیے، نظم کی ترتیب میں فتوحات مکیہ کی نقل کی، یورپ میں احادیث معراج پر خاصا مواد موجود تھا، پیرس کی لائبریری میں احادیث معراج پر مخطوطات بھی موجود تھے، پروفیسر منارٹ نے اپنی کتاب زیر عنوان "بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں مطالعۂ اسلام" میں ان فرانسیسی مسودات کے نام تک گنائے ہیں جہاں تک دانتے کی رسائی ممکن تھی، غزالی کی الدرۃ الفاخرۃ اور معراج نامہ تک دانتے کی رسائی تھی کتاب المعراج کے لاطینی اور فرانسیسی تراجم اس وقت موجود تھے اور دانتے کی پیدائش (۱۲۶۵ء) سے پچاس سال قبل ۱۲۰۶ء میں شایع ہو چکے تھے، (Professor Cerulli) کا اصرار ہے کہ نظم کی تدوین میں دانتے نے ان ہی مصادر سے استفادہ کیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس مستشرق

شاعر نے جو علوم اسلامیہ میں دخل رکھتا تھا، اسلام اور آنحضرت ؐ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس نے پیغمبر اسلام کو جہنم میں مبتلائے عذاب دکھایا ہے، اس لیے کہ انھوں نے عیسائیت میں پھوٹ ڈالی، وہ تفریق مذہب کے مجرم ہے، شاعر کی دریدہ دہنی کا یہ عالم ہے کہ آنحضرت ؐ کو مثلہ کردہ زیر عذاب دکھاتا ہے، یہ اصحاب قدسیہ مسخ شدہ صورتوں میں زیر عذاب ہیں، اور ان کا جرم کبیر یہ تھا کہ انھوں نے مذہب میں افتراق پیدا کیا، انفرنو (Inferno) کے کینٹو ۲۸ Canto 28 میں دانتے رقمطراز ہے: (نقل کفر کفر نہ باشد)

Behold, how mutilated is Mahomet
In front of me the weeping Ali goes
His face cleft through from forelock to the chin
And all others that you see about
Fomenters were of discord and of schism
And that is why they are so gashed asunder

(دی ڈوائن کمیڈی، ترجمہ ال۔ گرانٹ وھائٹ۔ نیویارک ۱۹۴۸ء۔ لینیکو ۲۸)

دانتے پر صلیبی جنگوں کی ناکامی و شکست کا ایسا اثر تھا کہ اس نے سارے یورپ کو اپنی شعری قوت سے ہلا دیا، ایک طرف پیغمبر اسلام ؐ کے ساتھ بدسلوکی کا مظاہرہ کیا، دوسری طرف فاتح قدس صلاح الدین ایوبی کو بھی اس نے جہنم میں منافقین کے ساتھ مبتلائے عذاب دکھایا۔ (ملاحظہ ہو کینٹو ۴ Inferno) اسلام دشمنی کے اس مظاہرہ کے بعد دانتے نے صلیبی شہسواروں اور شہداء کو جنت میں فرحاں و شاداں دکھایا، کیونکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو فنا کرنے کے لیے شہید ہوئے تھے، جنت (Paradiso) کینٹو ۱۸ میں دانتے ان کی شادمانی کا ذکر کرتے ہوئے

نام بہ نام خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

Ansim-en myeyes saw passing on the cross
William of Orange and Stout Renoat
Duke Godfrey, de Booillon and Robert Guiserard [۱]

ان اشعار اور نظموں نے مغربی جذبات میں آگ لگا ڈالی اور نشأۃ ثانیہ کے دور میں جب رواداری، اخوت اور روشن خیالی کی تحریکات سر اٹھا رہی تھیں، دیگر مذاہب کے ساتھ انصاف کا مطالبہ ہو رہا تھا، مستشرقین کا رویہ اسلام کی جانب علیٰ حالہٖ قائم رہا، ۱۳۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک کا زمانہ نشأۃ ثانیہ کا ابتدائی زمانہ تھا، نشأۃ کے بعد دوسری طاقت ور تحریک جو یورپ میں اٹھی وہ رومانی تحریک (۱۷۵۰ء سے ۱۸۳۰ء) تھی، جس نے یورپ کی روایات کہنہ کو چیلنج کیا اور زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا، نئے خیالات پر مبنی انقلاب انگیز تحریکیں چلتی رہیں، رومی اور یونانی تہذیب سے آزادی حاصل کر کے خود مغربی تہذیب کی داغ بیل ڈالنے کی زبردست تحریک چلی، مذہبی تعصب و تعصب کے خلاف نئے مکاتب فکر وجود میں آئے، مگر اسلام کے

---

[۱] دانتے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مزید معلومات کے لیے راقم حروف کی دو[۲] کتابیں پیش نظر رہیں:

(الف) فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات (جامعہ کراچی ۱۹۶۷ء) صفحات ۵۶۱ تا ۵۹۱، اس حصہ میں دکھایا گیا ہے کہ معراج اور یروشلم جزو لاینفک ہیں، یورپ کی نشأۃ ثانیہ پر معراج کے کیا اثرات مترتب ہوئے؟ دانتے نے ابن عربی سے کیا کچھ لیا ہے؟ اس کا نصی تقابل، کامیڈی میں جنت و جہنم وغیرہ کے نقشے ابن عربی سے مستعار لیے گئے، ان کا نقشہ جاتی تقابل، وغیرہ وغیرہ۔

(ب) فکر و فن (جامعہ ڈربن) ۱۹۸۱ء۔ (اردو عربی اور فارسی مقالات کا مجموعہ) ملاحظہ ہوں صفحات ۵۱ ۵۵ تا ۷۰ زیر عنوان دانتے کی کامیڈی پر اسلامی اثرات، ص ۹۵ تا ۱۱۲ بھی ملاحظہ ہوں زیر عنوان جرمن شاعر گوئٹے کا منظوم ڈرامہ "ناتھن دانا"۔

متعلق مستشرقین کے رویہ میں بال برابر فرق نہیں آیا، نشأۃ ثانیہ کا پورا دور مڈل ایجز یعنی ازمنہ وسطیٰ کی خرافات کے زیر اثر رہا، وہی افسانوی اور دیومالائی تعبیر و تفسیر اسلام کا مقدر رہا، چونکہ نشأۃ ثانیہ کے مصادر لاطینی مصادر (Latin Chronicles) تھے اس لیے ان سے رستگاری ممکن نہ تھی، ہر روایت پر صلیبی اور بزنطینی چھاپ پڑی ہوئی تھی، یہی مصادر آخری سند کی حیثیت رکھتے تھے، سوانح محمدؐ میں یہی لکھا گیا کہ آپ الحاد اور بے دینی کے ملزم تھے، آپ نے عیسائیت میں تفرقہ پیدا کی، آپ کو کاذب قرار دے کر اسلام کو عیسائیت کا ازلی دشمن تصور کیا گیا، خود مسیحی طبقات میں کشمکش شروع ہوگئی، رومن کیتھولک چرچ نے پروٹسٹنٹ چرچ پر اسلام دوستی کا الزام لگایا، اور انھیں اسلام کا ہمدرد قرار دیا، دونوں فرقوں کے درمیان یہ مسئلہ موضوع نزاع بن گیا، اس پورے عہد میں آنحضرتؐ اور اسلام کے لیے نجس الفاظ استعمال کیے گئے، جو مڈل ایجز کا امتیازی نشان تھا، آنحضرتؐ کے لیے رذیل الفاظ مثلاً کاذب (Cunning Imposter, Lying deceiver; Blasphemous emissary of Satan) وغیرہ عام تھے، بعض مستشرقین نے علوم اسلامیہ کے مطالعہ کو تضییع اوقات قرار دیا، بعض نے لکھا کہ محمدؐ کا نام سنتے ہی خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

سترہویں صدی کے بعد مغربی استعمار کا ظہور اور مصلحت بینی کی تحریک، مستشرقین کے مصادر میں نئے اضافے

سترہویں صدی عیسوی نے مستشرقین کے سامنے نئے نئے مسائل کھڑے کر دیے، یہ صدی عروج استعمار کی صدی تھی، عالم اسلام عموماً انگریز، فرنچ، ڈچ وغیرہ کے پنجۂ استبداد میں آچکا تھا، اس طرح مغربی اقوام براہ راست عالم اسلام سے ٹکرائیں، مسلم کلچر اور علوم اسلامیہ سے ان کا سابقہ ہوا، مستشرقین سیاح ان ممالک کا دورہ کرنے لگے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ تمام لاطینی اور بزنطینی روایات کی ضد تھی، اس تضاد نے مستشرقین کے سامنے سوالیہ نشانات کھڑے کر دیے۔

اس اثنا میں استعماری قوتوں نے مثلاً برطانیہ، فرانس اور ڈچ وغیرہ نے سیاسی، معاشی لوٹ مار کے ساتھ اسلامی علوم و فنون، مسودات و مخطوطات کے نادر نسخوں کی بھی لوٹ مار کی، اور تمام عالم اسلام سے اسلامی گنجہائے گراں مایہ اور صدیوں کی علمی و فکری کاوشات کے خزینے اٹھا کر لندن اور پیرس اور ہالینڈ لے گئے اور اپنے کتب خانوں اور میوزیم کی زینت بنا ڈالی، آج بھی ان نوادرات کی نمائش یورپ میں ہو رہی ہے، جہاں ناظرین صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ گر چہ ولاد رست دزدے کہ بکف چراغ دارد۔ پیرس میں ۱۹۷۳ء کی بین الاقوامی مخطوطات کی نمائش دیکھ کر راقم سطور انگشت بدنداں تھا۔

مستشرقین اب نئے مصادر اسلامی سے دوچار ہوئے، عربی زبان پڑھنے اور پڑھانے کی تحریک چلی، کیونکہ اس کے بغیر ان مصادر تک رسائی ممکن نہ تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ کیمبرج، آکسفورڈ، پیرس اور لندن میں عربی کے شعبے کھلے، ۱۶۴۹ء میں قرآن کریم کا انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ شائع ہوا، سترہویں صدی کی سب سے طاقتور تحریک روشن خیالی کی تحریک تھی، جس میں غیر عیسائی مذاہب و عقائد کے منصفانہ مطالعہ پر زور دیا گیا، ان تحریکات کے دباؤ میں بعض مستشرقین نے بھی اسلام پر نظر ثانی یا از سر نو تجزیہ کی دعوت دی اور اسلام کو سمجھنے کی خواہش ظاہر کی، اب مستشرقین کے سامنے تین اہم مصادر تھے، (۱) ازمنۂ وسطیٰ (مڈل ایجز) کا روایتی مواد (تاریخ و سوانح وغیرہ) نیز لاطینی مصادر (کرانکل وغیرہ) (۲) اسلامی اور عربی مصادر جو استعمار کے ذریعہ دستیاب ہوئے۔ اور (۳) مغربی سیاحوں کے سفر نامے جو انھوں نے مسلم ممالک کے دورے اور سیاحت کے بعد مرتب کیے۔

مستشرقین کی تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی یہ دیکھ کر حیرت زدہ اور ششدر رہ جاتا ہے کہ ان تمام تحریکات اور نئے مصادر کا کوئی اثر مستشرقین کے رویہ پر نہیں پڑا، نہ ہی ازمنۂ وسطیٰ کی

روایات سے گلو خلاصی ہو سکی، وہ اب بھی لاطینی روایات کے اسیر رہے، یورپ میں اب مزید انتشار پھیلا، کیونکہ سیاحوں کے سفرنامے لاطینی اسکالرشپ کے خرافاتی نقشے سے بالکل مختلف تھے، آنحضرتؐ کے بارے میں ایک دوسرا اور مضحکہ خیز افسانہ گھڑا گیا، یعنی محمدؐ ہرقل کی فوج میں باغی تاجروں کے قائد تھے، اور عربوں کے باغی گروہ کے کپتان بھی تھے، مگر ایران پر حملے کے وقت محمدؐ نے ہرقل کی فوج کا ساتھ دیا، انگریز فلسفی راجر بیکن (R.Bacon) نے آنحضرتؐ کو من حیث جادوگر پیش کیا، اور اپنے مقالات بالخصوص Of Boldness میں آنحضرتؐ کے بارے میں خرافات وضع کیں۔

زمانہ سفر کرتا گیا، وقت آگے بڑھتا رہا، مگر مستشرقین رجعت قہقری کرتے رہے، یورپ میں جدید دور کا آغاز ہوا، "جاگو ہوا سویرا" کی اذان دی گئی، مارٹن لیوتھر کی قیادت میں چرچ اور خرافاتی رسم و رواج کے خلاف ایک قیامت برپا ہوئی، خیال تھا کہ جدید یورپ میں اصلاحات کا مفکر اعظم مارٹن لیوتھر اسلام کے بارے میں شاید نرم رویہ اختیار کرے، اس کے بالکل برعکس اس نے اسلام اور مسلمانوں کو حق کا دشمن گردانتے ہوئے اسلام کو ترکوں کا مذہب قرار دیدیا، چونکہ مارٹن کا سارا حملہ چرچ اور پوپ کے خلاف تھا، اس لیے اس نے آنحضرتؐ کو پوپ سے بھی زیادہ بدتر قرار دیا، اس نے مطالبہ کیا کہ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور اس امر کی تحقیق کی جائے کہ آیا اسلام اور محمدؐ حضرت عیسیٰؑ کے آخری دشمن تھے، تاکہ یہ مسئلہ حتمی طور پر طے ہو جائے کہ اسلام اور محمدؐ ہی مارٹن کے خیال میں مذہب عیسائیت کی بربادی کے ذمہ دار تھے، لیوتھر نے آنحضرتؐ کو گاگ اور میگاگ (Gog, Magog) کا خطاب دیا۔

چونکہ مستشرقین کا خانوادہ چرچ کا پروردہ تھا، یہ روایت ہنوز جاری ہے، اس لیے مذہبی نفرت ان کی اسکالرشپ کا طرۂ امتیاز تھا، اس کو اسکالرشپ کہنا اسکالرشپ کی توہین ہے،

یہ سارا ریسرچ مواد درحقیقت مشنری پروپیگنڈا تھا، چند مثالیں کافی ہیں، سترہویں صدی کے نامی مولف بڈول (Bedwell) متوفی ۱۶۳۲ء نے اپنی تالیف "محمد کاذب" —— (Mahammedl s Impostures) میں آنحضرتؐ کے ساتھ نہایت گستاخی کی، جیساکہ کتاب کے نام سے واضح ہے۔ (Genebard) نامی کیتھولک مولف کا سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ محمدؐ نے قرآن کی تالیف کسی مہذب زبان مثلاً لاطینی، عبرانی، اور یونانی میں نہیں کی، بلکہ ایک وحشی زبان میں کی، چونکہ محمد خود (العیاذ باللہ) جانور Beast تھے اس لیے قرآن کو بھی جانوروں کی زبان میں تحریر کیا۔

اینڈری (Andre du Ryer) نے چند عربی کتب کے انگریزی ترجمے کیے، ساتھ ہی ۱۶۴۹ء میں قرآن کا انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ بھی پیش کیا۔

جدید تحریکات کے زیر اثر سترہویں صدی میں اسلام کو سمجھنے کا جذبہ ضرور پیدا ہوا، مگر لاطینی، خرافاتی روایات سے گلوخلاصی کا جذبہ پیدا نہیں ہوا، بعض روشن خیال اسکالرس نے وقتاً فوقتاً روایتی ڈگر سے ہٹنے کی ناکام کوشش کی، ان میں آکسفورڈ یونیورسٹی کا پروفیسر پیکاک (Edward Peacoke) متوفی ۱۶۹۱ء تھا، موصوف نے چند عربی کتب کے ترجمے کیے، نیز حقیقت اور افسانہ یا تحریفات کے درمیان فرق پیدا کرنے کی کوشش کی، اس نے سیرت محمدؐ پر نظرثانی کی اور بعض افسانوں کو مسترد کر دیا، اٹلی کا پادری مستشرق (Abb LouisMaracci) نے قرآن کا لاطینی ترجمہ کیا اور اپنی تالیف پروڈمس (Prodomu s ad Refutationem) میں اسلام پر زبردست حملے کیے، آنحضرتؐ کو واضح الفاظ میں نبیؐ کاذب قرار دیا، سترہویں صدی میں الیگزنڈر راس (Alexander Ross) نے اپنی تالیف پنڈبلیا (Pandeblia) ۱۶۵۳ء میں جو تقابل ادیان پر

لکھی گئی تھی، لاطینی خرافات سے ہٹ کر ایک راہ نکالی اور اسلام کے بارے میں پہلی بار چند اچھے کلمات استعمال کیے، انگریزی چیپلین یا پادری (Chaplain) مسمی ایڈیسن (Lancelot Addison) نے حیات و موت محمد (Life and death of Muhammad) کے زیر عنوان اپنی کتاب ۱۶۷۹ء میں لندن سے شایع کی، مگر اس کے مصادر حسب معمول لاطینی خرافات تھے، آنحضرتؐ کے خلاف مولف کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ انھوں نے خود اپنی زندگی میں اپنی کتاب قرآن کو شایع نہیں کیا، ۱۶۹۷ء میں ناروچ کا ڈین (Dean of Norwich) مسمی ہمفری (Humphery Prideaux) نے آنحضرتؐ کی سوانح لکھی اور آپ کو نبی کاذب (Imposter) قرار دیا، مؤلف نے اعتراف کیا کہ وہ ازمنۂ وسطیٰ کے مولف رکاڈو (Ricado) سے بے حد متاثر ہوا تھا ہمفری کی کتاب تقریباً ایک صدی تک مستشرقین کے لیے حوالہ کا کام دیتی رہی، کتاب کا مرکزی مضمون اسلام کو فراڈ ثابت کرنا تھا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں سیاسی مفادات کے زیر اثر نام نہاد اسلامی لٹریچر کی افزایش

سابقہ صدیوں کے مقابلہ میں اٹھارہویں صدی میں اسلام پر زیادہ لٹریچر تیار ہوا، اس میں سیاسی مفادات کا دخل زیادہ تھا، مگر مجموعی طور پر اٹھارہویں صدی بھی لاطینی روایات اور ازمنۂ وسطیٰ کے عقائد کی زد میں رہی، سب سے پہلا ڈچ مستشرق ایچ۔ ریلان (H.Relan) نے آنحضرتؐ کی جانب رویہ میں تبدیلی پیدا کی، اپنی معروف تالیف مذہب محمدؐ" (De religione Mahommedica) ۱۷۰۴ء میں اس نے ازمنۂ وسطیٰ کے خرافات سے رہائی کی کوشش کی، اور اسلام اور محمدؐ کے ساتھ انصاف کرنے کا مطالبہ کیا، غالباً یہ پہلا مستشرق تھا جس نے رواداری (Tolerance

مطالعہ کیا، اس نے پہلی بار یہ تحریک چلائی کہ مشرق کو اس کے اپنے مصادر و مراجع کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا، یہ مطالبہ یقینی طور پر پہلا مطالبہ تھا کہ اہل مغرب کے بجائے خود مسلمانوں کو حق ہے کہ وہ اپنے مذہب و کلچر کی تفسیر و تشریح پیش کریں اور اہل مغرب کے افہام و تفہیم کا ذریعہ بنیں، مذہب کو اس کے مخالفین ہمیشہ مسخ کرتے ہیں، مولف نے واضح الفاظ میں تحریر کیا کہ یورپ میں اسلام کے علاوہ شاید ہی کوئی دوسرا مذہب اس قدر تمسیخ کا شکار رہا ہو، مؤلف نے اس امر پر بھی اصرار کیا کہ اصل اسلام کو کماحقہ سمجھنے میں خود عیسائیت کا فائدہ ہے، اور یہ افہام و تفہیم دوستی کے ذریعہ ممکن ہے، دشمنی کے ذریعہ نہیں، عیسائیوں کا غرور اسی طرح کم ہو سکتا ہے اور ان کے اندر شکر ایزدی کا جذبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ اس نے عیسائیت جیسے مذہب کی نعمت سے ہمیں سرفراز کیا، ریلان درحقیقت پہلا مستشرق تھا جس نے اسلام کے ساتھ تاریخی انصاف کا مطالبہ کیا۔

اس تحریک کا اثر دیرپا نہ تھا، بعض مولفین ان خیالات سے متاثر ضرور ہوئے، مثلاً کانٹ (Count de Boulainvilliers) نے اپنی کتاب (Vie de Mahomet) (لندن ۱۷۳۰ء) میں اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کیا، لیکن اس کے خلاف حملے شروع ہو گئے، اور اس پر مسیحیت کی تخفیف کا الزام بھی لگایا گیا، ناقدین کے مطابق یہ کتاب اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب پہلی دوستانہ کاوش تھی، جو مسیحی یورپ میں ظاہر ہوئی، مولف نے اسلام کو پہلی بار ایک عقلی مذہب (Rational Religion) قرار دیا اور آنحضرتؐ کو نبی تسلیم کر لیا، یہ اقدام تمام سابقہ مسیحی اور یہودی مستشرقین کے عقائد و مزاج کے خلاف تھا، اس میں نہ صرف مڈل ایجز اور لاطینی خرافات کی نفی تھی، بلکہ نشاۃ ثانیہ جیسے روشن خیال

دور کی اسلام دشمنی کے خلاف بھی پہلی صدائے بازگشت تھی، یہ رویہ مستشرقین کے لیے ناقابل قبول تھا، اس کے خلاف تحریک چلانے کی ضرورت پڑی تاکہ یہ خیالات یورپ میں جڑ نہ پکڑ سکیں، چنانچہ یہی ہوا، جارج سیل (George Sale) اور راڈول (J.M.Rodwell) کے معاندانہ جذبہ میں شدت پیدا ہوئی، سیل نے بڑی چستی کے ساتھ آنحضرتؐ کو نبی کاذب اور اسلام کو فاسد مذہب (False Religion) قرار دے دیا، جین گگنیر (Jean Gagnier) نے دو کتابیں تالیف کیں، ایک کتاب ۱۷۳۳ء میں اور دوسری ۱۷۴۸ء میں منظر عام پر آئی، ان دونوں کتب کا مقصد بولین ویلیر کی تالیف کی تاثیر کو کم کرنا تھا، بلکہ بولین ویلیر کی تالیف کے مقابلہ میں ایک نئی تالیف محمد (Vie de Mahomet) پیش کی جو اسٹرڈم سے ۱۷۴۸ء میں نمودار ہوئی، کتاب کے مقدمہ میں بدبخت مولف نے آنحضرتؐ کو نہ صرف انسانیت کا بدترین دشمن، بلکہ خدا کا بھی دشمن قرار دیا، چونکہ روشن خیالی، انصاف اور جدت پسندی کا دباؤ یورپ پر بڑھتا جارہا تھا، اس لیے بعض مولفین نے ان سے متاثر ہوکر چند کلمات خیر عوض کہنے میں بخل سے کام نہیں لیا، اس ضمن میں سیوری (Savery) نامی مولف کا ذکر کافی ہے، موصوف نے ۱۷۵۲ء میں قرآن کا فرانسیسی ترجمہ پیش کیا، اور اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر سوانح بھی لکھی، آنحضرتؐ کے لیے نرم الفاظ استعمال کیے، اور آپ کو تاریخ کی غیر معمولی شخصیت بھی قرار دیا، مگر وہ ازمنۂ وسطی کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہ کراسکا، اسی لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور قدیم نظریہ کی تائید کی کہ محمدؐ نے یہودیت اور عیسائیت سے عقیدۂ توحید کو مستعار لے کر مذہب اسلام کی داغ بیل ڈالی۔

اڈورڈ گبن (Edward Gibbon) کا نام محتاج تعارف نہیں، زوال روما کی تاریخ پر چھ جلدیں لکھ کر موصوف نے آفاقی شہرت حاصل کی اور انگریزی تاریخ نویسی کے معمار بن گئے، ۱۷۸۸ء میں کتاب مذکور کے پچاسویں باب میں اسلام اور محمدؐ کے بارے میں نہایت دلسوز رائے کا اظہار کیا، رواداری کے دعویٰ کے باوجود آنحضرتؐ کو نبیؑ کاذب (Imposter) کا خطاب دیتے ہوئے لکھا کہ آنحضرتؐ آخری ایام میں شہوت اور لالچ، جاہ طلبی اور بوالہوسی (lust and ambition) سے مغلوب ہوگئے، محمدؐ ظلم، فراڈ اور ناانصافی کا مجسمہ تھے، اسلام ان ہی ذرایع سے پھیلا، یہ تھی اس روشن خیال مولف اور مورخ کی رائے جس نے رومۃ الکبریٰ کی تاریخ نویسی پر ربع صدی صرف کی، اور نہ صرف روما بلکہ اس سے متعلق تمام معلوم اقوام کے احوال لکھے جن کا تعلق رومی حکومت سے رہا تھا، اس میں اسلام اور مسلمان سب سے نمایاں تھے، کیونکہ اہل روما سے ان کا ٹکراؤ ہوا تھا،

اٹھارہویں صدی کی دوسری عظیم شخصیت جو انقلاب فرانس کے بانیوں میں سے ایک ہے، وہ والٹیر (Voltaire) کی شخصیت ہے (۱۶۹۴ء ۔ ۱۷۷۸ء) والٹیر فرانسیسی آسمان فکر کا تابندہ ستارہ اور مصلحین کا پیامبر تھا، اٹھارہویں صدی پر اس کے افکار کی کارفرمائی بلکہ سلطانی قائم رہی، مگر والٹیر جیسا مفکر اسلام اور محمدؐ کے خلاف اپنی نفرت کو چھپا نہ سکا، اس نے اپنے ڈرامہ (Play) دین محمدؐ مسمّی ——— (La Fanatisme ou Mahomet Le prophete) میں جو ۱۷۴۲ء میں منظر عام پر آئی، اسلام کے خلاف نفرت و حقارت کا اظہار کیا، اس نے یورپ کے ان تمام مستشرقین کی شدت کے ساتھ مذمت کی جنھوں نے اسلام اور محمدؐ کی جانب

نرمی کا رویہ اختیار کیا، یا انصاف کا مطالبہ کیا، اس نے آنحضرت صلعم کو نبی کاذب (Impocter) اور اسلام کو وحشی اور فاسد مذہب (False barbarous religion) سے موسوم کیا، اس نے اپنے ڈرامہ کو پوپ (Pope Benedict XIV) کے نام منسوب کر دیا، اور اس کے مقدمہ میں اسلام کے خلاف خوب زہر اگلا، مسلمانوں کو درندہ، جنگلی اور وحشی قوم (Barbarous Sect) کا خطاب عطا کیا، اپنے مقالات کے مجموعہ (۱۷۵۶ء) میں بھی والیٹر نے آنحضرت صلعم اور اسلام کے خلاف نفرت کا مظاہرہ کیا، مجموعۂ مقالات (Essai Sur les Moeurs et L' des Nation) میں اس نے آنحضرت صلعم کو برطانوی سیاستداں کرام ول (Cromwell) کی عیاری سے تشبیہ دی ہے، والیٹر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم کی پوری دعوت میں اسے کوئی نئی بات نظر نہیں آئی، اس کے سوا کہ انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، والیٹر کی شخصیت اور تالیفات کا گہرا اثر مستشرقین پر پڑا، ان میں ایک ڈیڈراٹ (Diderat) ہے، جس نے آنحضرت صلعم کی گھناونی سیرت پیش کی اور آپ کو عقلیت (Reason) کا دشمن اور عورتوں کا دلدادہ ثابت کیا، فرانسیسی مستشرق رنان (۱۸۳۲ء، ۱۸۹۲ء) (Rennan) نے بھی اسلام کو عقل کا لاعلاج دشمن Incurable Enemy Of reason قرار دیا۔

اٹھارھویں صدی کی مختصر روح فرسا روداد کا سرسری جائزہ لینے کے بعد جب تاریخ انیسویں صدی کی سرحد میں قدم رکھتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ خلف اپنے سلف سے اور متبعین اپنے پیش رووں سے زیادہ متقشف، متعصب اور زہر آلود ثابت ہوئے، ان پر نہ تحریک تجدید کا کوئی اثر پڑا، نہ ہی یورپ کی روشن خیالی، رواداری اور انصاف کی تحریکات نے ان کے دل کو موم بنایا، شدت نفرت میں وہ اپنے بزرگوں اور متقدمین سے بھی بازی لے گئے۔

(باقی)

حکم اقراء کے ثقافتی پہلو اور شاہان عباسی کی عالمگیر تحریک کتب خانہ سازی کے اثرات

از۔ ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی، سینیر لائبریرین بیرو یونیورسٹی، کانو، نائجیریا

(۲)

۲۵۔ کتب خانوں کے لیے علٰحدہ عمارتیں بنوائی جاتی تھیں چنانچہ سابور بن اردشیر المتوفی ۴۱۶ھ نے ۳۸۱ھ میں محلہ کرخ بغداد میں علٰحدہ عمارت تعمیر کرا کر کتب خانہ قائم کیا تھا[1] اصفہان میں ابوالشیخ بن محمد نطنزی المعروف بذی البراعتین المتوفی ۴۹۵ھ نے دارالکتب کی نہایت عالیشان عمارت تعمیر کرائی شروع کی تھی، جو پوری بن جاتی تو اصفہان کی عمارتوں میں سب سے زیادہ خوشنما و پائیدار ہوتی، مگر ذی البراعتین کی سیاحت اور اس کے باہر رہنے کی وجہ سے ہمیشہ بنتی اور ٹوٹتی رہی تھی۔ اس واقعہ کی اتنی شہرت ہو گئی تھی کہ ابو فراس عامری المتوفی ۵۰۳ھ نے اس پر حسب ذیل شعر کہے تھے۔

دار کتب بغیر کتب و مال   من تراب انفقتہ فی تراب

یہ دارالکتب بغیر کتابوں کے ہے   مال جو زمین سے حاصل کیا تم نے زمین میں لگایا

انت فخر (عامر) بنر عمک   منھا واللھا کل ساعۃ فی خراب[2]

تم اپنے زعم میں اسے آباد کر رہے ہو   بجز اس کے تو ہر آن برباد و خراب ہوتا رہتا ہے

---

[1] المنتظم، ج ۷، ص ۱۷۲، البدایہ والنہایہ، ج ۱۱ ص ۳۱۲، الکامل فی التاریخ، ج ۹ ص ۱۰۱ [2] خریدۃ القصر وجریدۃ العصر لعماد الاصفہانی تحقیق محمد بہجۃ الاثری، بغداد مطبعۃ المجمع العلمی العراقی ۱۳۷۵ھ ج ۱ ق ۱ ص ۳۰ (مقدمہ) وق ۲، ص ۱۶

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں کو کتب خانوں کی عمارت تعمیر کرنے کا شوق بھی اسی تحریک سے پیدا ہوا تھا۔

۲۶۔ کتب خانہ کے ساتھ رصد گاہ کا سامان بھی رکھا جاتا تھا، چنانچہ ابو طاہر خاتونی ساؤجی المتوفی ۵۴۲ھ نے جامع خاتونی میں جو کتب خانہ قائم کیا تھا، اس میں تجربات کے لیے رصد گاہ کا سامان بھی محفوظ کر دیا گیا تھا[۵۱]

۲۷۔ اہل علم نہایت عسرت کی زندگی بسر کرنے کے باوجود قابل رشک کتب خانہ بناتے تھے، چنانچہ ابراہیم حربی المتوفی ۲۸۵ھ فقر و فاقہ سے بسر کرتے لیکن ذخیرۂ کتب بڑھاتے رہتے تھے، دولت مند ان کی تنگ دستی اور ان کے کتب خانے کو دیکھ کر تعجب کرتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر کسی سے نہ رہا گیا، اور اس نے موصوف سے پوچھ ہی لیا کہ آپ نے اتنی کتابیں کیسے جمع کرلیں، ان کو غصہ آگیا، وہ فرمانے لگے مجھی دمی[۵۲] خون پسینہ ایک کرکے جمع کی ہیں۔

۲۸۔ عہد عباسی میں فکری قوتوں کو پروان چڑھانے اور دماغی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کا منبع و مخزن کیف و سرور اور سیر و تفریح کا مرکز کتب و کتب خانہ بن گیا تھا، چنانچہ شیخ ابو نصر احمد ابن حسین میکالی کا بیان ہے، "ہم بیٹھے ہوئے ایک دن تفریح گاہوں کا ذکر کر رہے تھے بعض کہتے تھے کہ بہترین جگہ غوطہ دمشق ہے بعض نہر ابلہ کو اچھا بتاتے تھے بعض کا خیال تھا کہ سغد سمرقند تفریح کی اچھی جگہ ہے بعض نہروان بغداد کے قائل تھے، بعض شعب بوان کو پسند کرتے تھے اور بعض نوبہار بلخ کو ترجیح دیتے تھے۔ ابن درید بولے یہ مقامات آنکھوں کی تفریح کے لیے خوب ہیں، بتاؤ تمھارے قلوب کی تفریح کے لیے کون سے مقامات اچھے ہیں، ہم نے پوچھا ابوبکر (ابن درید) وہ کیا ہیں،

---

۵۱ آثار البلاد واخبار العباد تالیف زکریا القزوینی، بیروت، دار صادر للطباعۃ والنشر ۱۳۸۰ھ صفحہ ۳۸۰۔ ۵۲ تاریخ بغداد، ج ۶ ص ۳۳۔

تر بتایا ابن قتیبہ کی عیون الاخبار، ابن داؤد کی کتاب الزہرہ اور ابن ابی طاہر کی کتاب خلق المشتاق اور پھر یہ شعر پڑھے۔

ومن کانت نزھتہ قینۃ وکأس وکاس تصب

اور بعض وہ ہیں جنکی تفریح جام و سبو ہیں ایک جام انڈیلا جاتا اور دوسرا بھرا جاتا ہے۔

نزھتنا واستراحتنا تلاقی العیون ودرس الکتب[1]

ہماری تفریح اور آرام و راحت کا سامان آنکھوں سے دیکھنا اور کتابیں پڑھنا ہیں

ابوبکر ابن درید المتوفی ۳۲۱ھ نے تحقیق و تدقیق بحث و نظر اور دل و دماغ کی فرحت کا سامان اور فکری قوتوں اور دماغی صلاحیتوں کو نمایاں کرنے کا سرچشمہ کتابوں کو قرار دیا تھا۔

۲۹ ۔ عہد عباسی میں محققین و شائقین کتب کو فیض بخش مراکز علم درسگاہوں، علمی اداروں اور کتب خانوں سے جہاں وہ اور ان کے اساتذہ و اہل علم استفادہ و افادہ کرتے رہتے تھے، اتنی شیفتگی و دلبستگی ہو جاتی تھی کہ یہ مراکز عقیدت و محبت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور ان کی ویرانی و بربادی پر وہ آبدیدہ ہوتے بعض اوقات وفور غم سے ان کے جذبات شعر کی صورت میں ڈھلکر زبان قلم پر آتے تھے، جو عہد عباسی میں مراکز علم اور کتب خانوں سے پڑھے لکھوں کی عام دلچسپی کا بین ثبوت ہے، چنانچہ مشہور متکلم عبدالکریم شہرستانی المتوفی ۵۴۸ھ کے مندرجہ ذیل شعر اسی امر کے غماز ہیں، وہ فرماتے ہیں۔

لقد طفت فی تلک المعاہد کلھا وسیرت طرفی بین تلک معالم

میں ان تمام علمی اداروں میں گھوما پھرا اور میں نے اپنی نظریں ان درسگاہوں میں دوڑائیں

فلم ار الا واضعا کف حائر علی ذقن او قارعا سن نادم[2]

---

[1] معجم الادباء ج ۲ ص ۳۹۳ - ۳۹۴ [2] کتاب نہایۃ الاقدام فی علم الکلام تالیف عبدالکریم الشہرستانی تحقیق الفرد جیوم بغداد مکتبۃ المثنی۔

(ترجمہ، جس کو بھی دیکھا حیرت سے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے ہوئے یا شرم سار یا دانتوں سے انگلی کاٹتے ہوئے)

شارح صحیح مسلم یحییٰ بن شرف نوادی (۶۳۱-۶۷۶ھ) دارالحدیث الاشرفیہ[1] میں حدیث کا درس دیتے تھے، ان کی تعلیمی و تدریسی خدمات اور علمی عظمت و شہرت کی وجہ سے اس دارالحدیث الاشرفیہ کو بھی یہ مرتبہ مل گیا تھا کہ علامہ تاج الدین عبدالوہاب سبکی کے باپ فقیہ عصر تقی الدین عبدالکافی المتوفی ۷۵۶ھ کا جب یہاں قیام رہا تو وہ رات کو اس کے ایوان میں آتے تہجد پڑھتے، اور اس آرزو میں اس کے فرش پر جبیں سائی کرتے کہ جہاں امام نودی نے قدم رکھے ہیں، وہاں میری جبین لگ جائے اور میں ان کی برکات سے بہرہ ور ہو سکوں، چنانچہ وہ اپنے فرزند تاج الدین سبکی سے اس عقیدت و حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے حسب ذیل اشعار پڑھتے تھے

وفی دار الحدیث لطیف معنی — علی بسط لها اصبو واٰوی

دار الحدیث اشرفیہ میں ایک لطیف معنی پنہاں ہیں — میں اس کے فرش پر اٹھتا اور لیٹا رہتا ہوں

عسیٰ لی امس بحر وجهی — مکانا مسه قدم النواوی[2]

امید ہے کہ میرے چہرے کی گرمی — اس جگہ کو چھو سکے جسے نوادی کے قدم نے چھوا ہے

مذکورۂ بالا واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عہد عباسی میں فیض بخش مراکز علم کو کیسا مقام بلند حاصل تھا۔

---

[1] ب، ت ص ۱۳، یہ دارالحدیث ابوالفتح الملک الاشرف مظفرالدین موسیٰ بن الملک العادل سیف الدین ابی بکر بن ایوب المتوفی ۶۳۵ھ نے بنوایا اور ۶۳۰ھ میں اس کا افتتاح کیا تھا، موصوف نے نہایت نفیس کتابوں پر مشتمل کتب خانہ بھی وقف کر دیا تھا، (البدایۃ والنہایہ ج ۱۳ ص ۱۴۰) اس کا فرش بھی اسی زمانے کا بچھا ہوا تھا، نودیؒ اس پر قدم رکھتے ہوئے درس حدیث کے لیے آتے تھے۔

[2] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ للسبکی، مصر المطبعۃ الحسینیہ، ج ۵ ص ۱۶۶۔

۳۰۔ عہد عباسی میں ذاتی کتب خانے عوامی کتب خانوں کے تمام وظائف تحقیق، تعلیم معلومات، ذوق جمال کی تسکین اور تفریح کا سامان بھی بہم پہنچاتے، اس کی سہولتیں مہیا کرتے تھے، عجیب بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے کتب خانے فکری قوتوں کو پروان چڑھانے کے ساتھ تفریح طبع کا سامان بھی مہیا کرنے لگے تھے، چنانچہ فخر الدین مبارک شاہ بن حسین مروزی المتوفی ۶۰۲ھ کے کتب خانہ بغداد میں اہل علم کے لئے کتابیں اور جاہلوں کے لیے شطرنج رکھی گئی تھی،[۵۱] تاکہ جہلاء کو کتابوں سے قریب لاکر علمی رغبت پیدا کی جاسکے۔

۳۱۔ اس تحریک نے عوام وخواص میں معاشرتی توانائیوں میں مکمل حصہ لینے کا ذوق وشوق پیدا کیا، اور انھیں سرگرم عمل بنا یا تھا، اسی لئے ہر جگہ معاشرتی توانائیاں پروان چڑھنے لگی تھیں۔[۵۲]

۳۲۔ مسلم معاشرہ میں خواتین بھی مردوں کی طرح ذوق کتاب داری اور فروغ کتب وکتب خانوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی تھیں۔[۵۳]

۳۳۔ اس تحریک نے متمدن اقوام عالم کے ثقافتی ورثہ کی حفاظت کو تصنیف وتالیف اور ترجمہ کے ذریعہ ان کی علمی تحقیقات کے ابلاغ عام کو مسلم دانشوروں اور مفکروں کا نہایت مقدس فریضہ بنا دیا تھا۔[۵۴]

۳۴۔ بادشاہ وامیر بھی علماء وائمۂ فن کے کتب خانوں کے حاصل کرنے کے آرزومند اور کوشاں رہتے، گو وہ حاصل کرنے میں مشکل ہی سے کامیاب ہوتے تھے، چنانچہ خلیفہ المتوکل

---

[۵۱] الکامل فی التاریخ لابن الاثیر، ج ۱۲، ص ۲۲۳، العسجد المسبوک والجوہر المحکوک فی طبقات الخلفاء والملوک تالیف الملک الاشرف الغسانی تحقیق شاکر محمود عبد المنعم بغداد دار البیان ۱۳۹۵ھ ص ۳۰۵ (ذیل وفیات ۶۰۲ھ)

[۵۲] مرآۃ الزمان لسبط ابن الجوزی، ص ۲۴۲-۲۴۸، ۲۵۴، ۲۵۶، [۵۳] ایضاً ج ۸، ق ۲، ص ۴۳۲

[۵۴] کتاب الفہرست لابن الندیم مطبعۃ السعادۃ، ۱۳۴۸ھ، ص ۲۴۰، ۳۴۱، ۴۹۳

-۵۰۰

المتوفی ۲۴۰ھ نے امام احمد بن حنبل کی وفات کے بعد اپنا خاص ایلچی ان کے فرزند صالح کے پاس حصول کتب ہی کے لئے بھیجا تھا لیکن ان کے فرزند نے یہ کہلا بھیجا کہ ان کتابوں کی نقول درکار ہوں تو وہ ہمارے پاس کرائی جائیں، یہ کتابیں ہمارے ہی پاس رہنی چاہئیں، ہمیں ان کی روایت کی اجازت حاصل ہے، ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔[1] ابو عمران ہرقمیت پر ابن ابی بعرہ کا کتب خانہ حاصل کرنا چاہتے تھے، اور اس ڈر سے وہ اپنا کتب خانہ کسی کو دکھاتا نہیں تھا لیکن اس کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کا قمطر کبیر ایسا غائب ہوا کہ پھر کبھی نظر نہیں آیا۔[2]

۳۵۔ کتب خانہ جو اجتماعی و انفرادی ہر حیثیت میں بنی نوع انسان کا ایک نہایت قیمتی تمدنی و ثقافتی ورثہ ہے عہد عباسی میں اس کی حفاظت بنی نوع انسان کا نہایت مقدس فرض سمجھا جانے لگا تھا، حوادث روزگار و آسمانی آفتوں سے اس ورثہ کا بچاؤ ہر وقت پیش نظر رہتا تھا، گاہ بگاہ نقصان ہو جاتا تھا، کتابیں ضائع ہو جاتی تھیں، جب کبھی کسی عالم کو اس صورت سے دوچار ہونا پڑتا، اسے اور دوسرے علماء کو اس سے جو صدمہ ہوتا تھا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، عوام کو جیسا کچھ دکھ اس سے پہنچتا تھا، اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔

ابو موسیٰ عبد الرحمٰن بن موسیٰ استیجی، امام مالک، سفیان بن عیینہ اور اصمعی وغیرہ کے شاگرد تھے، فقہ، حدیث، لغت و ادب کے امام و حافظ تھے، موصوف نے اندلس سے مشرق کا سفر کیا۔ کتابیں جمع کیں، لے جاتے وقت وہ بحر تدمیر میں ڈوب گئیں جب استیجہ پہنچے اور لوگوں کو اس حادثہ جانکاہ کا علم ہوا تو پورا شہر تعزیت کے لئے امنڈ آیا، اہل استیجہ نے جہاں ان کی بخیر و عافیت واپسی پر مبارک باد پیش کی وہاں ان کی کتابوں کے تلف ہو جانے پر ان کی تعزیت بھی کی، یہ ان سے فرماتے تھے، ذہب الخرج وبقی الدرج، کتابوں کے بورے چلے گئے، دفینہ بہہ گیا۔

[1] ترجمۃ الامام احمد من تاریخ الاسلام للذہبی تحقیق احمد محمد شاکر، القاہرہ، دار المعارف ۱۳۶۵ھ ص ۹۲
[2] کتاب الفہرست ص ۱۶۰ [3] تاریخ العلماء والرواۃ للعلم بالاندلس تالیف عبداللہ بن محمد ابن الفرضی تحقیق عزت العطار الحسینی ... ۱۳۶۳ھ ...

جو سینہ میں تھا وہ رہ گیا۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عہد عباسی میں بنی نوع انسان کے علمی و ثقافتی ورثہ سے محبت ہر ایک کے دل میں کیسی رچ بس گئی تھی کہ ہر ایک کو اس ذخیرہ کے تلف ہو جانے کا صدمہ تھا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک سے علمی و کتابی ضرورتوں کو پورا کرنے کا شوق و ذوق معاشرہ کے ہر فرد میں کتنا فروغ پا چکا تھا، کسی کی کتابیں ضائع ہو جاتیں تو اس کے ضیاع پر لوگ اس کے گھر پہنچتے اور اس کے غم میں شریک ہوتے تھے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تحریک شاہ سے گدا تک عام ہو گئی تھی، اس تحریک نے اس دور کے مسلم معاشرہ کو اتنا حساس بنایا اور افراد کے تحت الشعور میں کتب و کتب خانوں کی قدر و منزلت اتنی بڑھا دی تھی کہ ابو موسیٰ عبد الرحمٰن کے ذخیرۂ کتب کے ضیاع کو عبد الرحمٰن کی آپ بیتی نہیں بلکہ جگ بیتی سمجھا گیا تھا۔ دنیا کی کسی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ کسی غیر مسلم معاشرہ میں بھی کتب خانہ کے فروغ کا اتنا شعور پیدا ہوا ہو جتنا عباسی دور میں پیدا ہو چکا تھا،

۳۶ - تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں بغداد کے عوامی کتب خانوں میں متمدن اقوام عالم کے علوم و فنون کے ایسے بیش بہا نوادر جمع کیے گئے تھے کہ ان علوم و فنون کا دلدادہ جب انھیں دیکھ پاتا تو وطن اور اہل و عیال ہی کو نہیں حقیقی کعبہ کو بھی بھول جاتا اور یہاں اپنا مقصود پا کر اسی کا ہو رہتا تھا، چنانچہ ابو معشر فلکی جو بلخ کا باشندہ تھا حج کے لیے جاتے ہوئے جب راستے میں بغداد سے گزرا اور علی بن یحییٰ المنجم المتوفی ۲۷۵ھ کا کتب خانہ دیکھا تو اسی کو دل دے بیٹھا، اور کعبۃ اللہ کو جانا ہی بھول گیا تھا۔[1]

---

[1] معجم الادباء ج ۵ ص ۴۶۷۔

یاقوت رومی جب مرو پہنچا اور یہاں کے عوامی کتب خانوں کو اور ان سے استفادہ کی سہولتوں کو دیکھا تو اہل و عیال کو بھول گیا، یہاں سے نکلنا ہی نہ چاہا، چنانچہ کہتا ہے کہ بلاد اسلامی پر تاتاریوں کی مسلسل یورش نے مجھے مرو شاہجہان کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا ورنہ میں مرو سے زندگی بھر نہ نکلتا، اس کی یاد میں یاقوت کی زبان و قلم سے جو درد انگیز شعر نکلے ہیں، وہ پڑھنے کے لائق ہیں، اس سے ثابت ہوگیا ہے کہ جہاں کتب و کتب خانے ہوتے تھے، اہل علم اس سرزمین کے گرویدہ رہتے، اور وہیں زندگی کے دن پورا کرنے کی آرزو کرتے تھے[1]

۷ - کتب خانوں کی ترقی اور علمی کارناموں کی وجہ سے مشرق و مغرب (یورپ اور ایشیا) کے نامور خلفاء میں باہم موازنہ و مقابلہ کیا جاتا، اور ایک کو دوسرے کا نظیر و مثیل قرار دیا جاتا تھا، چنانچہ ابن خلدون نے مشرق میں خلیفہ الناصر بن المستضفی عباسی کو حکم ثانی کا نظیر و مثیل بتایا ہے۔[2]

۸ - علم و کتاب کی اشاعت اسلام کی اشاعت سے عبارت تھی اسی لیے ارباب سیف اور اصحاب قلم میں مقابلہ رہتا تھا، چنانچہ قرطبہ کے اندر اسلام کی خدمت کرنے میں اصحاب الکتب (کتب خانے والوں) اور اصحاب الکتائب (لشکر والوں) کے اندر مقابلہ رہتا اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔[3]

۹ - عربوں کو اپنے تہذیبی و ثقافتی مرکز اور علمی سرمایہ سے بہت محبت ہوگئی تھی، وہ اپنی اولاد کو ہتھیاروں اور کتابوں کے بازاروں میں جانے کی تاکید کرتے تھے، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں سیف و قلم کے بازار ہی عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور انہی کی طرف لوگوں کو جانے کی ترغیب دی جاتی تھی یہ ترغیب کتب کتبخانوں کی نشر و اشاعت اور شہرت کا باعث رہی ہے۔[4]

---

[1] معجم البلدان لیاقوت، بیروت، دار صادر للطباعۃ والنشر ۱۳۷۴ھ ج ۵ ص ۱۱۴ [2] تاریخ ابن خلدون ط ۳ بیروت، دار الکتاب اللبنانی ۱۹۵۶ء ج ۴ ص ۳۱۰ [3] نفح الطیب للمقری، ج ۲ ص ۹ [4] رسالۃ فی مدح الکتب والحث علی جمعہا للجاحظ تحقیق ابراہیم السامرائی، مجلۃ المجمع العلمی العراقی، ج ۶ ص ۳۴۰، العقد الفرید لابن عبد ربہ تحقیق احمد امین وغیرہ، ط ۲، القاہرۃ، مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر ۱۳۷۵ھ ج ۲ ص ۲۱۰ [5] الخطط المقریزیہ القاہرۃ، دار الطباعۃ المصریۃ، بولاق ۱۲۷۰ھ ج ۲ ص ۱۰۲

۴۰ ۔ عالم، جاہل، امیر، غریب، بادشاہ اور فقیر کے کتب خانے کے ذخائر کی کمیت و کیفیت کا تذکرہ کتبِ تاریخ و تذکرہ میں کیا جانا بھی عوام و خواص میں قیامِ کتب خانہ کی ترغیب کا موجب رہا ہے۔[1]

۴۱ ۔ عہد عباسی میں عوامی کتب خانوں کا طریقہ عام ہو گیا تھا، مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں تمام ممالک اسلامیہ میں سینکڑوں ہزاروں کتب خانے قائم ہو گئے، کتب خانوں کی کثرت کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ اسی زمانہ کے قریب مدرسوں اور یونیورسٹیوں کی بنیاد پڑی اور ہر مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ ہونا ایک لازمی بات قرار پائی۔[2]

۴۲ ۔ اہل علم اس لیے بھی اپنی کتب و نگارشات وقف کرنے پر آمادہ ہوتے تھے کہ اس سے وہ محفوظ ہو جاتی تھیں، انھیں ان کے ضائع نہ ہونے اور آیندہ نسلوں تک بحفاظت پہنچتے رہنے کا اطمینان ہو جاتا تھا۔[3]

۴۳ ۔ مسلمانوں کو کتب و کتب خانوں سے عقیدے کی سی والہانہ محبت تھی، انھوں نے ان کو اسی طرح حرزِ جان بنائے رکھا، جس طرح انسان عقیدے کو حرزِ جان بنائے رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اس حقیقت کا ذکر ڈاکٹر زاولگا نے Cult Of Books (کتابی تہذیب) کے الفاظ سے کیا ہے۔[4]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ للذہبی ج ۳ ص ۱۰۳۵، نفح الطیب للمقری ج ۲ ص ۱۰ و ۱۱ [2] مقالات شبلی اعظم گڑھ مطبع معارف ۱۳۷۱ھ ج ۶ ص ۱۴۷ [3] Four great libraries of Medieval Baghdad by Ruth Slellhorn Mackensen library Quarterly Vol.II,1932

The libraries of the Arabs during the time of the Abbassides Pakistan library Review

۴۴۔ وزراء، امراء اور کتابوں کے شوقین دولت مند کتابوں کے ملنے پر کتاب پیش کرنے والے کو انعام وخلعت سے سرفراز کرتے تھے[۱]، چنانچہ وزیر کمال الدین ابن الدولہ دمشقی المتوفی ۶۳۳ھ نے ابن ابی اصیبعہ کو طبقات الاطباء کے پہنچانے پر انعام وخلعت سے سرفراز کیا تھا[۲]۔

۴۵۔ بادشاہوں کی ریس میں وزراء امیر بھی اپنے کتب خانوں میں محققین وشائقین کتب کی سہولت واستفادہ کی خاطر دوسری صدی ہجری سے کتب خانہ میں کتاب کے تین تین نسخے رکھنے لگے تھے، تاکہ تحقیق، تصحیح ونقل میں ان مختلف نسخوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکے، چنانچہ وزیر ابوالفضل یحییٰ بن خالد برمکی المتوفی ۱۹۰ھ کے خزانۃ الکتب وبیت المدارسہ میں اس امر کا لحاظ رکھا جاتا تھا[۳]۔ محمد بن عبدالملک الزیات کے کتب خانہ میں بھی کتابوں کے متعدد اور اہم نسخے رکھے جانے کا اہتمام کیا جاتا تھا[۴]۔

۴۶۔ اوائل عہد عباسی سے اہل ثروت کتب خانوں میں ذخائر کے اندر اضافہ کی خاطر دراق رکھتے تھے، اہل علم کو ان کے کتب خانوں سے استفادہ کی سہولت حاصل ہوتی تھی، بایں ہمہ نادار اہل علم اپنا کتب خانہ بنانے اور اپنے ذخائر کتب میں تنوع وکثرت کے لئے خود اہل ثروت کے کتب خانوں سے کتابیں نقل کرتے تھے، چنانچہ عامر بن ابراہیم بن واقد مولیٰ ابوموسیٰ اشعری المتوفی ۲۰۱ھ یا ۲۰۰ھ ہیزم فروش علم وکتب کے شیدائی تھے، موصوف نے یعقوب قمی کے پاس ایک ماہ قیام کیا اور ان کے کتب خانے سے کتابیں نقل کیں، پھر نعمان بن عبدالسلام کے کتب خانے میں جاکر ان کی کتابیں نقل کیں۔ لوگوں نے ان سے

---

[۱] کتاب الفہرست لابن الندیم ص ۵-۶، [۲] عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ بیروت، دارالفکر ۱۳۷۶ھ ج ۳ ص ۲۰۶-۲۰۸، [۳] کتاب الحیوان، ج ۱ ص ۲۰۔

[۴] انباہ الرواۃ للقفطی، ج ۲ ص ۱۵۱، معجم الادباء ج ۲ ص ۸۵-۸۶۔

پوچھا آپ کتابیں کیوں نقل کرتے ہیں، جواب دیا میں جن کے ذخیرۂ کتب سے کتابیں نقل کرتا ہوں، ان کے پاس (کتب خانہ، وزراق ہیں) میرے پاس وراق نہیں، میں اپنے لیے خود کتابیں نقل کرکے ذخیرہ کرتا اور کتب خانہ بناتا ہوں، اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اندر اہل علم کو ذاتی کتب خانوں سے نقل واستفادہ کی سہولت حاصل تھی۔[1]

۷۴ - تعلیم، کتابت وقرأت اور کتابوں میں انہماک کو ریاست وسیاست اور زہد وپرہیزگاری کی اصل سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ابوعلی صالح بن محمد المتوفی ۲۹۳ھ کا بیان ہے "بغداد میں محدث اور معتزلی دو شاعر تھے، معتزلی میرے پاس سے گزرا اور مجھے لکھتے ہوئے دیکھکر کہنے لگا، صاحبزادے کتنا لکھوگے آنکھیں جاتی رہیں گی، کبڑے ہوجاؤگے اور وقت سے پہلے جل بسوگے پھر اس نے مجھ سے کتاب لیکر اس پر حسب ذیل شعر لکھے۔

ان القراءة والتفقه والتشاغل بالعلوم

پڑھنا تفقہ حاصل کرنا اور تحصیل علوم میں لگے رہنا۔

اصل المذلة والاضافة والمعاندة والهموم

ذلت، فقر وفاقہ، مشقت اور غموں کی جڑ ہے۔

اس کے بعد محدث کا گزر ہوا، اور اس نے یہ شعر پڑھا، تو فوراً کہا اس دشمن جاں نے غلط کہا ہے۔

"بل یرتفع ذکرک، وینشر علمک، ویبقی اسمک مع اسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی یوم القیامة" بلکہ یہ انہماک علمی اور لکھنا پڑھنا تمہاری شہرت کا، تمہارے علم کی نشر واشاعت کا، اور تمہارے نام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کے ساتھ

---

[1] ذکر اخبار اصبہان تالیف ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصفہانی، لندن مطبعہ بریل ۱۹۳۲ء ج ۲ ص ۳۶

تاقیامت باقی رکھنے کا باعث ہے، پھر اس نے یہ شعر لکھے۔

ان التشاغل بالدفا تر والکتابۃ والدراسۃ

بلاشبہ کتابوں میں، نقل وکتابت مین اور تعلیم وتعلم میں انہاک و سرگرمی

اصل التقیۃ والتنز ہد والریاسۃ والسیاسۃ[1]

زہد وپرہیزگاری اور ریاست وسیاست کی اصل وبنیاد ہے۔

۴۸۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں علماء واہل ثروت کی حویلیوں اور محلسراؤں نے عارضی علمی اداروں کی صورت اختیار کر لی تھی، وہ علوم وکتب کی نشر واشاعت میں اہم کردار ادا کرتے تھے، ان میں اہل علم اور وراقوں کے شب میں قیام کے واسطے چالیس پچاس بستر تیار رکھے جاتے تھے، چنانچہ حافظ ابو یوسف یعقوب بن شیبہ سدوسی نزیل بغداد (۱۸۲-۲۶۲ھ / ۷۹۸-۸۷۵ء) کے یہاں چالیس بستر صرف وراقوں کے واسطے رات میں استعمال کے لیے مخصوص تھے[2]، نامور مصنف وادیب ابو عبید محمد بن عمران مرزبانی (۲۹۶-۳۸۱ھ / ۹۰۹-۹۹۲ء) نے اپنی حویلی میں پچاس بستر اہل علم کے واسطے رات میں قیام کے لیے رکھے تھے۔[3]

مورخ صفدی نے اس تفصیل میں پڑے بغیر موصوف کی حویلی کے متعلق اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے، "کان دارہ مجمع الفضلاء"[4] مرزبانی کی حویلی اہل علم کی اکیڈمی تھی، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تذکرہ نگار ومورخین اس قسم کے عارضی علمی اداروں کیلئے جو علوم وکتب کی نشر واشاعت میں سرگرم عمل تھے اور جہاں شب گذاری کے لیے بستر بھی

---

[1] تاریخ بغداد، ج ۹ ص ۲۲۳ [2] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۲۸۱، کتاب المنتظم ج ۵ ص ۳۴
[3] ایضاً ج ۳ ص ۱۳۶، میزان الاعتدال فی نقد الرجال للذہبی تحقیق علی محمد البجاوی، مصر عیسی البابی الحلبی، ۱۳۸۲ھ ج ۳ ص ۶۷۲ [4] کتاب الوافی بالوفیات تالیف صلاح الدین خلیل الصفدی، فیسبادن دار النشر فرانز شتاینر ۱۳۸۱ھ ج ۴ ص ۲۳۶

کثیر تعداد میں رکھے جاتے تھے، "دارہ مجمع الفضلاء"، "دارہ مجمع العلماء"[1] کے الفاظ سے ذکر کرتے تھے،

نامور فقیہ ابوالفرج احمد بن محمد بن عمر بن الحسن بغدادی حنفی المعروف بابن المسلمہ ۳۳۷ھ ۴۱۵ھ کا مکان جو شرقی بغداد میں درب سلیم کے اندر واقع تھا کے متعلق مورخ خطیب بغدادی کا بیان ہے، "کان دارہ مألفاً لاہل العلم"، موصوف کا مکان اہل علم کی اکیڈمی تھا،[2]

۴۹۔ تیسری صدی ہجری میں جو علماء و قضاۃ پرورش لوح و قلم کرتے، اہل علم و مصنفین کی اعانت و حاجت روائی کر کے فروغ کتب و کتب خانوں کی راہ ہموار کرتے ان کے لیے بھی "مألف" کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا، چنانچہ قاضی ابوعبداللہ احمد بن ابی دواد بن جریر ایادی بصری ثم بغدادی معتزلی المتوفی ۲۴۰ھ کا شمار اسی قسم کی معارف پرور شخصیات میں تھا، ابوبکر بن درید المتوفی ۳۲۱ھ حسن بن خضر سے ناقل ہیں۔

کان ابن ابی دواد مألفاً لاھل	ابن ابی دواد اہل ادب کی محبت و
الادب من ای بلد کانوا	الفت کا مرکز تھا خواہ وہ کسی شہر
وکان قد ضم الیہ جماعۃ	اور کسی دبستان فکر سے تعلق رکھتے
یعولھم ویمونھم،[3]	ہوں، ایک جماعت اس سے وابستہ
	تھی اور وہ ان کی حاجت روائی و کفالت

۵۰۔ عہد عباسی میں تصنیف و تالیف اور کتابت و وراقت، ذخیرۂ کتب و کتب خانہ سازی میں

---

[1] کتاب منتظم، ج ۷ ص ۲۸۸ [2] تاریخ بغداد ج ۵ ص ... النجوم الزاہرہ ج ۴ ص ۳۰، ذیل وفیات ۴۱۵ھ [3] تاریخ بغداد ج ۴ ص ... الطبقات السنیۃ فی تراجم الحنفیہ تالیف عبدالقادر التمیمی تحقیق عبدالفتاح محمد الحلو، القاہرہ المجلس الاعلیٰ للشیون الاسلامیہ، ۱۳۹۰ھ ج ۱ ص ۴۴

اس سے بھی اضافہ ہو کہ ان کا شمار علوم نافعہ میں کیا گیا ہے، ان کا نفع دائمی ہے، یہ دنیا و آخرت میں اجر و ثواب کا باعث ہیں، اس لئے ان کی طرف توجہ دلائی جاتی، اور ترغیب دی جاتی تھی، عرب کا شاعر کہتا ہے

ما من کاتب الا سیبقی	کتابتہ وان فنیت یداہ
کاتب کی تحریر باقی رہ جائے گی	اگرچہ اس کے ہاتھ فنا ہو جائیں گے
فلا تکتب بکفک غیر شیء	یسرک فی القیامۃ ان تراہ[1]
اس لئے تم اپنے ہاتھ سوا ایسی چیز یاد گار چھوڑ	جسے تم قیامت کے دن دیکھ کر خوش ہو،

۵۱ - عہد عباسی میں چوتھی صدی ہجری کے اندر علم، مدرسہ، قلم دوات اور کتاب کی طرف عزیزوں اور نوجوانوں کو رغبت دلائی جاتی اور ان باتوں کی نصیحت کر کے کتب و کتب خانہ سے ان کی دلچسپی بڑھائی جاتی تھی تاکہ ان کی علمی ترقی برقرار رہے، اور کتب و کتب خانوں میں اضافہ ہوتا رہے۔ چنانچہ بدیع الزماں ہمدانی، المتوفی ۳۹۸ھ اپنے بھانجے کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

انت ولدی ما دمت والعلم شانک	تم میرے بیٹے ہو جب تک علم تمہاری
والمدرسۃ مکانک والمحبرۃ	شان اور مدرسہ تمہارا مکان ہے،
حلیفک والدفتر الیفک فان	دوات و قلم تمہارا ساتھی اور کتاب تمہاری
قصرت ولا اخالک[2]	دوست ہے، تم اس میں کوتاہی کرو تو
	پھر تمہارا کوئی مددگار نہ ہو۔

عہد عباسی میں علمی و کتابی ضرورت کی تحریک کے فروغ اور اس کے بنیادی عوامل کو

---

[1] کتاب العقد الفرید ج ۲ ص ۲۰۸ [2] الرسائل لبدیع الزماں الہمدانی، ص ۳۰۱ القاہرۃ مطبعۃ ہندیہ سنہ ۱۳۲۹ھ ص ۱۵۲۔

مندرجہ بالا سطور میں پیش کیا گیا ہے یہ ایک ایسا جام جم ہے جسکے اندر عہد عباسی کی پوری علمی زندگی صاف صاف نظر آتی ہے کتبخانوں کی
تاریخ میں اسلامی دور سے پہلے اس طرح کے عوامل نہ کہیں رومیوں میں نظر آتے ہیں نہ ایرانیوں میں، نہ یہ ہند و سندھ میں کارفرما
دکھائی دیتے ہیں نہ ان کی روشنی سے یونان و مصر روشن ہوا ہے نہ نینوا و بابل میں یہ عوامل کبھی سرگرم عمل دیکھے گئے
ہیں، اگر ایسا ہوتا تو کتب خانے (CiAYTAbtatec) گلی گلی
(STReeTS) نظر نہ آتے، یہ فخر اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے ابلاغ کو اتنا
عام کیا اور علم کی ایسی اشاعت کی کہ گلی گلی تو کیا گھر گھر کتب خانہ نظر آنے لگا، چنانچہ کتبخانہ سازی عہد عباسی میں ایک
عالمگیر تحریک کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، امیر غریب، چھوٹا بڑا، عورت مرد ہر ایک اس تحریک سے متاثر ہوا اور اس نے اپنی
استطاعت کے مطابق اس کے پروان چڑھانے میں حصہ لیا، براعظم ایشیا، افریقہ اور یورپ
تک یہ تحریک بارآور ہوئی، ہر جگہ پھولی پھلی، شاہی محلات میں بسیرا کیا، وزیروں کے ایوانوں میں
رہی، امیروں کے محلوں میں پروان چڑھی، فقیروں کے جھونپڑیوں میں پلی بڑھی، عالم، ادیب،
فقیہ، مفسر، شاعر، مفکر، حکیم، صوفی، لغوی، نجومی، مورخ، مہندس، خطاط، وراق، فنکار،
صنعت کار، تاجر، مسلمان، عیسائی، یہودی، دیندار، دنیادار، دہریہ، زندیق، پڑھے
لکھے، حتی کہ بعض بے پڑھے لکھے کے ٹھکانے میں اپنا ٹھکانا بنایا، نظریاتی طور پر مخالف و
برسرپیکار گروہوں کو اپنا گرویدہ بنائے رکھا، ہر ایک کے دل و دماغ کو اس تحریک نے
شعوری و غیر شعوری طور پر متاثر کیا، عہد عباسی میں ہر شہر، قریہ، بستی، محلہ، گلی، کوچہ، معبد،
مسجد، تکیہ، سرائے، محل سرا، مہمان خانہ، خانقاہ، سیرگاہ، گلستان، قبرستان، دریا
کے کنارے، مدرسے، ادارے، بازار، دکان، ہر چھوٹی بڑی مرکزی جگہ میں اس نے اپنا
علمی مظاہرہ کیا، اور کتبخانہ قائم کر دکھایا، بادشاہ سے فقیر تک ہر ایک کے یہاں ہمہ گیر ہوکر مانا گیا،
اسی لئے مذکورہ بالا ہمہ اقسام کے کتب خانوں کا تذکرہ ہم نے اپنے تحقیقی مقالہ اسلامی کتبخانے عہد عباسی میں

اس لیے بھی اضافہ ہوکہ ان کا شمار علوم نافعہ میں کیا گیا ہے، ان کا نفع دائمی ہے، یہ دنیا و آخرت میں اجر و ثواب کا باعث ہیں، اس لئے ان کی طرف توجہ دلائی جاتی، اور ترغیب دی جاتی تھی، عرب کا شاعر کہتا ہے

ما من کاتب الا سیبقی	کتابتہ وان فنیت یداہ
کاتب کی تحریر باقی رہ جائے گی	اگرچہ اس کے ہاتھ فنا ہو جائیں گے
فلا تکتب بکفک غیر شیٔ	یسرک فی القیامۃ ان تراہ[1]
اس لئے تم اپنے ہاتھ سوا ایسی چیز یاد لکھو ڑ	جسے تم قیامت کے دن دیکھ کر خوش ہو،

۵۱ - عہد عباسی میں چوتھی صدی ہجری کے اندر علم، مدرسہ، قلم دوات اور کتاب کی طرف عزیزوں اور نوجوانوں کو رغبت دلائی جاتی اور ان باتوں کی نصیحت کرکے کتب و کتب خانہ سے ان کی دلچسپی بڑھائی جاتی تھی تاکہ ان کی علمی ترقی برقرار رہے، اور کتب و کتب خانوں میں اضافہ ہوتا رہے۔ چنانچہ بدیع الزماں ہمدانی المتوفی ۳۹۸ھ اپنے بھانجے کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

انت ولدی ما دمت والعلم شانک	تم میرے بیٹے ہو جب تک علم تمہاری
والمدرسۃ مکانک والمحبرۃ	شان اور مدرسہ تمہارا مکان ہے،
حلیفک والدفتر الیفک فان	دوات و قلم تمہارا ساتھی اور کتاب تمہاری
قصرت ولا اخالک[2]	دوست ہے، تم اس میں کوتاہی کرو تو
	پھر تمہارا کوئی رشتہ دار نہ ہو۔

عہد عباسی میں علمی و کتابی ضرورت کی تحریک کے فروغ اور اس کے بنیادی عوامل کو

---

[1] کتاب العقد الفرید ج ۲ ص ۲۰۸ [2] الرسائل لبدیع الزماں الہمدانی ۵، ۳ والقاہرۃ مطبعۃ ہندیہ، ۱۳۲۹ھ ص ۱۵۲۔

مندرجہ بالا سطور میں پیش کیا گیا ہے یہ ایک ایسا عام جم ہے جسکے اندر عہد عباسی کی پوری علمی زندگی صاف صاف نظر آتی ہے کتب خانوں کی
تاریخ میں اسلامی دور سے پہلے اس طرح کے عوامل نہ کہیں رومیوں میں نظر آتے ہیں نہ ایرانیوں میں، نہ یہ ہند و سندھ میں کارفرما
دکھائی دیتے ہیں نہ ان کی روشنی سے یونان و مصر روشن ہوئے نہ نینوا و بابل میں یہ عوامل کبھی سرگرم عمل دیکھے گئے
ہیں، اگر ایسا ہوتا تو کتب خانے (CiAYTAbIAtec) گلی گلی
(STK eeTS) نظر نہ آتے، یہ فخر اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے علم کو اتنا
عام کیا اور علم کی ایسی اشاعت کی کہ گلی گلی تو کیا گھر گھر کتب خانہ نظر آنے لگا، چنانچہ کتب خانہ سازی عہد عباسی میں ایک
عالمگیر تحریک کی صورت میں جلوہ گر ہوئی امیر غریب چھوٹا بڑا عورت مرد ہر ایک اس تحریک سے متاثر ہوا اور اس نے اپنی
استطاعت کے مطابق اس کے پروان چڑھانے میں حصہ لیا، بر اعظم ایشیا افریقہ اور یورپ
تک یہ تحریک بار آور ہوئی، ہر جگہ پھولی پھلی، شاہی محلات میں بسیرا کیا، وزیروں کے ایوانوں میں
رہی، امیروں کے محلوں میں پروان چڑھی، فقیروں کے جھونپڑوں میں پلی بڑھی، عالم، ادیب،
فقیہ، مفسر، شاعر، مفکر، حکیم، صوفی، لغوی، نجومی، مورخ، مہندس، خطاط، وراق، فنکار،
صنعت کار، تاجر، مسلمان، عیسائی، یہودی، دیندار، دنیادار، دہریہ، زندیق، پڑھے
لکھے، حتی کہ بعض بے پڑھے لکھے کے ٹھکانے میں اپنا ٹھکانا بنایا، نظریاتی طور پر مخالف و
برسرپیکار گروہوں کو اپنا گرویدہ بنائے رکھا، ہر ایک کے دل و دماغ کو اس تحریک نے
شعوری و غیر شعوری طور پر متاثر کیا، عہد عباسی میں ہر شہر، قریہ، بستی، محلہ، گلی، کوچہ، معبد،
مسجد، تکیہ، سرائے، محل سرا، مہمان خانہ، خانقاہ، سیرگاہ، گلستاں، قبرستان، دریا
کے کنارے، مدرسے، ادارے، بازار، دکان، ہر چھوٹی بڑی مرکزی جگہ میں اس نے اپنا
علمی مظاہرہ کیا، اور کتب خانہ قائم کر دکھایا، بادشاہ سے فقیر تک ہر ایک کے یہاں اس کا بول بالا رہا،
اسی لئے مذکورہ بالا ہمہ اقسام کے کتب خانوں کا تذکرہ ہم نے اپنے تحقیقی مقالہ اسلامی کتب خانے عہد عباسی میں کیا،

علّامہ محمدانور شاہ کشمیریؒ کی قرآن فہمی

از

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری شعبۂ عربی امر سنگھ سری نگر

علامہ محمد انور شاہ اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ قرآن میں دنیا بھر کا رطب و یابس موجود ہے، وہ زور دار الفاظ میں ان لوگوں کی تردید کرتے ہیں جو کتاب اللہ میں نیوٹن کا نظریۂ تجاذب، ڈارون کا نظریۂ ارتقاء، آئنسٹائن کا نظریۂ اضافیت وغیرہ ٹٹولتے ہیں، اُن کے نزدیک یہ قرآن کی خدمت نہیں ہے بلکہ اس سے زیادتی ہے، وہ جانتے تھے کہ سائنسی انکشافات میں کوئی دوام و ثبات نہیں ہے، بلکہ روز بروز بدلتے رہتے ہیں، آج جن باتوں کو بڑھ چڑھ کر پیش کیا جاتا ہے کل انھیں مسترد کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں ان کی رائے عصر حاضر کے نامور علماء کی آراء سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے، آیت شریفہ :-
وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ۔ (یٰسین) پر تقریر فرماتے ہوئے فرماتے ہیں :-

لو كان الشرع مبني كلامه في	اگر شریعت نے اپنا کلام علوم کائنات
الكونيات على الواقع حقيقة	کی حقیقت واقعی پر قائم کیا ہوتا تو
لبقي القرآن مكذباً عندهم	ہمیشہ قرآن اُن کے نزدیک ناقابلِ
الى ان يظهر لهم الواقع	اعتبار ٹھہرتا، جیسا کہ اسی مسئلہ حرکت
ايضاً، كما هو عندهم	کے بارے میں ان کے متضاد خیالات

الیٰ ان یظھرلھم الواقع ایضًا
کما ھو عندھم لمسئلۃ الحرکۃ
ھذہ، فانہ لو کان القرآن
صدع بحرکۃ الارض مثلاً
لبقی مکذّبًا فیمن مضوا من
الفلاسفۃ لعدم ثبوتھا
عندھم وان صدّقہ
الناس الیوم، وکذلک لوصرّح
بحرکۃ الفلک لصدّقہ القدماء
البتۃ ولکن صار الیوم مکذّبًا
لا یعتقد بہ احدٌ لثبوتھا
عندھم بخلافہ۔ فاغمض
القرآن عن نحو تلک الکونیات
التی تتعلق لہ بہا غرض فی
اعمالنا الیسوی امرہ عند
ھؤلاء ولا تحول تلک المباحث
بینہ وبین ایمانہم، ولعمری
ھذہ ھو الاحسن۔[1]

اگر شریعت نے اپنا کلام علوم کائنات
کی حقیقت واقعی پر قائم کیا ہوتا، تو
ہمیشہ قرآن اُن کے (یعنی فلاسفہ اور
سائنسدانوں کے) نزدیک ناقابلِ
اعتبار ٹھہرتا، جیسا کہ اسی مسئلہ حرکت
کے بارے میں ان کے متضاد خیالات
سے ظاہر ہوتا ہے، مثلاً اگر قرآن
نے زمین کے متحرک ہونے کا اعلان
کیا ہوتا تو وہ فلاسفہ اس کو جھٹلاتے
جو زمین کی حرکت کے قائل نہیں تھے،
اس کے برخلاف آج اس کی کھلی تصدیق
ہوتی، اسی طرح اگر قرآن نے حرکت
فلک کی بحث چھیڑی ہوتی، تو فلاسفہ
متاخرین اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے،
جبکہ عصر حاضر کے محققین اس کی تکذیب
کرتے، کیونکہ ان کی تحقیق قدما کی
تحقیق کے خلاف ہے، اسی لئے قرآن
نے کونیاتی مباحث نہیں چھیڑے ہیں۔

---

[1] فیض الباری: ج ۳ ص ۲۲۴،

"تاکہ ان کا معاملہ ہر دور کے لوگوں کیساں

رہے اور یہ مباحث لوگوں اور ان کے ایمان

کے درمیان حائل ہو جائیں اپنی عمر کی

قسم یہی بہترین طریقہ ہے،

ان کی اس رائے کو عصر حاضر کے نامور مفسر مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"قرآن کا بہت بڑا اعجاز (کہنا چاہئے کہ شاید سب سے بڑا اعجاز) یہ ہے کہ اس نے عقلی علوم اور ترقی پذیر علوم کے مسائل کے باب میں طرحی ہی لچک روا رکھی ہے کہ جو مسئلہ جس طرح اس کے نزول کے وقت علوم عصری کے عین مطابق نظر آتا تھا، اسی طرح آج چودہ سو سال کے بعد بھی معاصر تحقیق کے عین مطابق ہے،......... اس صورت حال کا راز صرف یہ ہے کہ قرآن نے مغیبات کا تو پورا اور کافی علم دیدیا ہے، ..... باقی جتنے علوم و فنون کا تعلق انسان کے عقل، ذہن اور دماغ سے ہے، اور ان کے مجموعے کا نام خواہ فلسفہ رکھیے یا سائنس، اُن کی جزئی تفصیلات کی طرف تو قرآن گیا ہی نہیں، بلکہ صرف مجمل اشارات ان کے متعلق کر دیئے ہیں، .... یہ بنیادی حقیقتیں اگر پیش نظر رہیں، تو انشاء اللہ تفہیم قرآن میں بڑی سہولتیں پیدا ہو جائیں گی، اور تفسیر قرآن بجائے ایک "خشک" سے موضوع کے ہم دنیا والوں کے لئے بھی بڑا دلچسپ بن جائے گا،"[۵]

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ بھی قرآن میں سائنس و فلسفہ کے مضامین ڈھونڈ ڈھونڈ کر

---

[۵] تفسیر ماجدی ج ۲ ص ۷ (افتتاحیہ)

نکالنے کے سخت خلاف ہیں، یہاں تک کہ وہ اضافی حد تک بھی اس قسم کا استفادہ کرنے سے
روکتے ہیں[1] مولانا عبدالباری ندوی نے حکیم الامت حضرت تھانوی سے بھی یہی خیال نقل کیا ہے[2]
مولانا آزاد مرحوم بھی اپنے ایک مکتوب میں اسی قسم کی رائے ظاہر کرتے ہیں[3] گو افسوس یہ ہے کہ
ترجمان القرآن میں وہ اس رائے پر قائم نہیں رہے ہیں،

شاہ صاحب کے نزدیک قرآن کا کام یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان کو طبیعات، کیمیا،
ہیئت، ہندسہ اور تاریخ وغیرہ پر درس دے، یا ان علوم کے مسائل و قواعد پر بحث کرے، ان
کی رائے میں:-

"قرآن کے مقاصد وہ ہونے چاہئیں جن سے مبداء و معاد اور معاش نیز
فلاح و نجاحِ دنیا و آخرت وابستہ ہو"[4]

یا جیسا کہ مولانا دریابادی نے فرمایا ہے،

"قرآن وقت کے چلے ہوئے اور اصطلاحی مفہوم میں کوئی علمی "ادبی" یا
"تحقیقی" مقالہ نہیں، اصلاً وہ محض کتاب ہدایت ہے، یا انسانی زندگی کا انفرادی
یا اجتماعی دستور العمل، اس کی دنیا سرتاسر حکمت و اخلاق، روحانیت، عبدیت
اور انابت کی دنیا ہے"[5]

مولانا سید مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں کہ حضرت الاستاذ (مولانا محمد انور شاہ)
عربی کے اس شعر کے متعلق:-

---

[1] سوانح قاسمی ج ۲ ص ۲۴۵ [2] جامع المجددین مولانا عبدالباری ندوی ص ۳۵،
[3] تبرکات آزاد: مولانا غلام رسول مہر: ص ۳۵، حیدرآباد، [4] یتیمۃ البیان مقدمہ
مشکلات القرآن ص ۶۵ [5] تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۶-

جمیع العلم فی القرآن لکن تقاصر عنہ افہام الرجال

فرماتے تھے کہ کسی غبی کا شعر ہے، اور زیادہ جلال آنے پر اس شعر کے کہنے والے کو غبی الاغبیا کہتے تھے[۱]۔

ناسخ و منسوخ قرآن کے مسئلہ ناسخ و منسوخ کے بارے میں شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ ہے کہ وحی متلو میں منسوخ فی الحکم کچھ بھی نہیں ہے، ان کے نزدیک لفظ نسخ کے معنی و مفہوم مختلف زمانہ میں مختلف رہا اسی لئے آیاتِ قرآنی کے منسوخ اور غیر منسوخ کا مسئلہ بھی پیچیدہ رہا، جن علماء نے بہت سی آیتیں منسوخ قرار دی ہیں، ان کے ہاں نسخ کا معنی مطلق کو مقید اور عام کو خاص کرنا پیش نظر تھا، آگے جن علماء نے مسئلہ نسخ کی مزید تنقیح کرکے نسخ سے مشروعیت کا دور کرنا مراد لیا، ان کے یہاں منسوخ آیات کی تعداد بھی سمٹ کر رہ گئی، چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی صرف اکیس[۲۱] اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی چھ آیات کے منسوخ ہونے کے قائل ہو گئے، انھوں نے بقیہ آیات کی اس طرح تفسیر بیان کی کہ وہ بھی محکم بن گئیں، جب محققین نے نسخ سے مختلف معنی مراد لئے تو وہ منسوخ اور غیر منسوخ آیات کی تعیین اور تعداد میں بھی مختلف الرائے ہوئے، اس مدنظر رکھ کر علامہ فرماتے ہیں:

انکرت النسخ راسًا وادعیت	میں نسخ سے مطلق انکار کرتا ہوں اور
ان النسخ لم یرد فی القرآن	دعوی کرتا ہوں کہ نسخ قرآن پر وارد
راسًا۔ اعنی بالنسخ کون	ہی نہیں ہوتا ہے، نسخ سے میں یہ معنی
الآیۃ منسوخۃ فی جمیع ما	لیتا ہوں کہ کوئی آیت اپنے تمام جزئیات
حوتہ بحیث لا تبقی معمولۃ	کے ساتھ منسوخ ہوا ور اس کا کوئی پہلو

[۱] حیات انور، مقالہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی،

فی جزئی من جزئیاتھا، فذلک عندی غیر واقع وما من آیة منسوخة الا وھی معمولة بوجه من الوجوہ وجھة من الجھات[۱]

قابل عمل نہیں رہا ہو، اور یہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ قرآن میں ایسی تمام آیتیں جو منسوخ کہلائی جاتی ہیں کسی نہ کسی پہلو اور کسی نہ کسی جہت سے (اب بھی اور ہر وقت) قابل عمل ہیں

ناسخ و منسوخ کی بحث اور امام سیوطی اور محدث دہلوی کی تنقیح و تفسیر سے مولانا محمد انور شاہ کشمیری ایک اور چیز اخذ کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اس بحث و تنقیح سے تفسیر بالرائے کی حقیقت کی طرف بھی رہنمائی ملتی ہے، وہ یہ کہ ہمارے قدیم مفسرین کرام نے اپنی آرا اور تحقیقات سے قرآنی آیات کی تفسیر بیان کی، بعض علما نے ایسی آیتیں منسوخ سمجھ لی ہیں جنھیں دوسرے علما نے اپنی تحقیق کے مطابق محکم قرار دیا، مگر اس کے باوجود کوئی اسے تفسیر بالرائے نہیں سمجھا جس پر حدیث میں وعید آئی ہو، تو جب یہ حقیقت ہے کہ

فان کنت عارفا باللغة وبالادوات التی لا بد منھا لبیان مراد القرآن فلک ان تفسرہ بما رأیت ما لم یؤد الی تغییر فی عقیدة او تبدیل فی مسئلة مسلمة[۲]

قرآن کے مدعا کی وضاحت کے لئے زبان اور تفسیری علوم و قواعد سے واقفیت ضروری ہے، اگر تم ان سے واقف ہو تو قرآن کی تفسیر و تشریح کر سکتے ہو، مگر اس طرح کہ اسلامی عقائد اور مسلمہ مسائل میں کوئی تحریف و تغییر واقع نہ ہونے پائے۔

چند مفسرین کرام اور ان کی تفسیروں کے بارے میں رائے | مشکلات القرآن دیکھتے ہی نظر آتا ہے کہ اُن کی نظر

۱؎ فیض الباری ج ۳ ص ۱۴۹ ۲؎ ایضاً

تفسیر کا ذخائر پر کس قدر وسیع اور عمیق تھی، متقدمین کی جو تفسیریں مشہور و مقبول ہیں، مشکلات القرآن میں ان کا حوالہ ملتا ہے، اور جس تفسیر سے جو مواد حاصل کرنا ہوتا ہے اسے فخر کے ساتھ لیتے ہیں، تفسیروں میں سب سے زیادہ متاثر حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی نامکمل نامی تفسیر فتح العزیز سے تھے، ان کی رائے میں اگر شاہ صاحب دہلوی یہ تفسیر مکمل کی ہوتی تو ذخیرۂ تفاسیر میں اس کا وہی مقام و مرتبہ ہوتا جو شرح بخاری میں حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری کو حاصل ہے، اسی وجہ سے ان کی رائے میں امت محمدیہ میں سے کسی نے بھی قرآنی مشکلات کے ساتھ اس طرح اعتنا نہیں کیا ہے جس طرح علم حدیث کے ساتھ کیا گیا ہے، محدث نوری نقل کرتے ہیں،

وکان یقول ان مشکلات القرآن	فرماتے تھے قرآن کی مشکلات
تربوا علیٰ مشکلات الحدیث بید	حدیث کی مشکلات سے زیادہ ہیں
ان الاسف علیٰ ان الامۃ المرحومۃ	مگر افسوس یہ ہے کہ امت محمدیہ
لم تخدم القرآن مثل خدمۃ الحدیث	نے حدیث کی جتنی خدمت انجام
وکانت الاعتناء بہ اھم منہ	دی، اتنی قرآن کی نہیں دی ہے
بالحدیث . . . وانہ لیس فی	حالانکہ حدیث سے زیادہ قرآن سے
ذخیرۃ التفاسیر المطبوعۃ تفسیر	اعتنا کرنا اہم اور ضروری تھا...
للقرآن لیوازی فی الرتبۃ	.. .. مطبوعہ ذخیرۂ تفاسیر میں ایسی
فتح الباری لصحیح البخاری	کوئی تفسیر نہیں ہے، جو علم حدیث میں ابن حجر
حاویاً لمزایاہ وصادعاً	کی فتح الباری کے برابر ہو، اور جو قرآن کے
بغوامضہ[۱]	تمام پہلوؤں پر محیط اور اس کے غوامض کو کھول

[۱] فیض الباری ج ۳ ص ۱۴۹،

تفسیر عزیزی کے بعد وہ زیادہ اعتماد تفسیر ابن کثیر اور تفسیر البحر المحیط پر کرتے ہیں، بالخصوص جہاں عقائد کی تائید و توثیق کی ضرورت ہوتی ہے تو انہی دو تفسیروں پر نظر پڑتی ہے، قرآن کے نحوی مباحث اور ادبی خوبیاں بیان کرتے وقت علامہ ابو القاسم جار اللہ زمخشری کے اقوال کو حرفِ آخر کی حیثیت دیتے ہیں، وہ تفسیر کشاف پر اس طرح مٹے ہوئے نظر آتے ہیں کہ مصنف کے اعتزال پر رحم کھانے کے لیے بھی تیار ہوئے ہیں، جن آیات کا تعلق معارف و حقائق کے ساتھ ہوتا ہے، وہاں شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی الفتوحات المکیہ کو بار بار اپنی پناہ گاہ بناتے ہیں، آیت وعلّم آدم الاسماء کلھا تقریباً سارے مفسرین نے اسماء اشیاء سے حقائق اشیاء مراد لیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرتِ آدمؑ کو نہ صرف اشیاء کے نام سکھائے، بلکہ ان ناموں کے حقائق سے بھی آگاہ کیا، مگر علامہ محمد انور شاہؒ لکھتے ہیں۔

لم یذکر حقائق الاشیاء[1] اشیاء کے حقائق ذکر نہیں کیے ہیں۔

---

[1] مشکلات القرآن ص ۵۔ علامہ محمد انور شاہؒ کی یہ تفسیر (حقائق اشیاء کا عدم ذکر) طبعیات کی جدید تحقیقات کے مطابق نظر آتی ہے، طبعیات کے جدید فضلاء اعتراف کرتے ہیں کہ طبعیاتی دنیا میں ان کی تحقیقات کی ساری کوششیں علامات یا اسماء تک محدود ہیں، اور ان اسماء کے حقائق کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا ہے، مشہور یورپی سائنسدان اور فلسفی پروفیسر جوڈ نے اس موضوع پر اپنی کتاب "گائڈ ٹو موڈرن فلوسفی" میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اس نے بحث کا عنوان ہی یہ رکھا ہے، "طبعیاتی دنیا بحیثیت علاماتی، نہ کہ حقیقت۔" اسی طرح پروفیسر مولانا عبد الباری ندویؒ نے بھی سائنس کے دوسرے مسلمہ محققین کے نقول پیش کرکے طبیعی دنیا ایک علاماتی دنیا کی صورت میں پیش کیا ہے اور پھر حاشیہ پر لکھا ہے "علّم آدم الاسماء کلھا سے عام طور پر مفسرین جو حقائق اشیاء کی تعلیم دیتے ہیں، وہ کہیں ایسی بات تو نہیں ہے جو قرآن کے مدعا کے خلاف ہو، آخر خدا نے صرف اسماء کا لفظ کیوں استعمال فرمایا۔" مذہب اور سائنس، ص ۱۵۶

پھر اس آیت کی چند سطروں میں عارفانہ تفسیر بیان فرمائی ہے، جس میں زیادہ تر شیخ اکبرؒ کے علوم سے استفادہ فرمایا ہے، ان کی رائے میں قرآن کے علوم مفسرین کی تفسیر تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ عرفا کی تصانیف سے بھی بہت سی گرہیں کھلی ہیں، قرآن میں جہاں احکام اور فقہیات کا ذکر ہے وہاں علامہ کشمیری فقہائے مفسرین کو ترجیح دیتے ہیں، اور عارفانہ یا متکلمانہ تفسیروں کو نہیں چھوڑتے ہیں، بلکہ کل فن رجال پر یقین رکھکر احکام القرآن (جصاص) اور احکام القرآن (ابن العربی مالکی) پر اعتماد کرتے ہیں، ملت صابی کی تحقیق میں حافظ ابن تیمیہؒ کی رائے تسلیم نہ کرتے ہوئے[1]، امام ابوبکر جصاص کی تحقیق کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔

لم اجد تحقیق الصابئین اتقن مما ذکرہ الجصاص فی احکام القرآن۔[2]

امام فخر الدین رازی کی تفسیر مَفَاتِیحُ الغَیب معروف بہ تفسیر کبیر کی تعریف و توصیف کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ امام صاحب قرآن کی مشکلات میں کھپتا ہے،[3] یہ رائے بھی رکھتے ہیں کہ امام رازی قرآن کی مشکلات اور معضلات میں غوطہ تو مارتے ہیں مگر کہیں کہیں اطمینان نہیں ہوتا ہے، مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ لکھتے ہیں، کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت الاستاذ علامہ کشمیریؒ سے عرض کیا کہ امام رازی کی تفسیر کے بارے میں علامہ سیوطی نے اتقان میں جو یہ نقل کیا ہے، فیہ کل شئی الا التفسیر، یعنی اس میں سب کچھ تو ہے مگر تفسیر ہی نہیں ہے، اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں، جواب دیا کہ یہ ریمارک ایسے شخص کا ہوگا، جس پر روایت پرستی کا غلبہ ہو، اور اخبار و آثار تک محدود رہ کر قرآن کے اسرار و معارف سے غافل ہو،[4] ایک اور موقعہ پر اس ریمارک کے

---

[1] فیض الباری ۱۲، قاموس القرآن مولانا زین العابدین سجاد، لفظ صابی" [2] مشکلات القرآن ص ۱۲ [3] نفحۃ العنبر من ھدی الشیخ الانور، ص ۴۸۔ ۴۹۔

[4] نفحۃ العنبر من ھدی الشیخ الانور ص ۴۸۔ ۴۹

بارے میں یہ بھی فرمایا :-

ذلک القول ظلمٌ فی حق الإمام [1] — امام صاحب کے حق میں یہ بات ظلم و زیاتی ہے۔

روح المعانی کی قدر و اہمیت کے دل سے معترف ہیں، اور فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ مجھے صاحب روح المعانی سے دو واسطوں سے شرف تلمذ حاصل ہے، تفسیر بیضاوی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس میں علامہ بیضاوی نے اپنی کوئی تحقیق پیش نہیں کی ہے۔

واعلم ان البیضاوی لم یصنف کتابہ علیٰ طور المحدثین، بل اخذ کثیراً من الکشاف یأتی فی کتابہ [2] الفائق بالموضوعات ایضاً — یاد رکھنا چاہئے کہ قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر محدثین کے طرز پر نہیں لکھی ہے، بلکہ قاضی صاحب نے کشاف سے بہت کچھ اخذ کیا ہے، اور کشاف کے مصنف اپنی قابل قدر کتاب میں موضوع احادیث بھی لاتے ہیں۔

نواب صدیق حسن خاںؒ کی تفسیر فتح البیان کو علامہ شوکانی کی تفسیر کا دوسرا نام سمجھتے ہیں، ابو محمد عبد الحق حقانی کی مشہور اردو تفسیر کی اہمیت و عظمت کے قائل ہیں، عقیدۃ الاسلام میں اسکے مقدمہ کا حوالہ دیا ہے، بلکہ دوسرے ایڈیشن میں چند سطروں میں اس پر تقریظ بھی لکھی ہے، جو مطبوعہ تفسیر حقانی میں شامل ہے، اردو تراجم میں حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اردو ترجمہ موضح القرآن کو بھی اہم سمجھتے ہیں۔ مشکلات القرآن میں بھی کئی غوامض موضح القرآن کی روشنی میں ہی حل کئے ہیں، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی

---

[1] نفحۃ العنبر من ھدی الشیخ الانور ص ۸۰-۷۹ [2] فیض الباری ج ا ص۱۶۴

تفسیر بیان القرآن کا حوالہ بھی مشکلات القرآن میں دو جگہ ملتا ہے۔

آخر میں ہم علامہ محمد انور شاہؒ کے ارشادات کی روشنی میں قرآن حکیم کی صرف دو آیات کا مفہوم درج کرتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ علامہ ممدوح مشکل اور اختلافی مسائل کس خوبی کے ساتھ سہل اور قابل قبول بناتے ہیں، اگرچہ ان کے بعض تلامذہ نے کچھ تفسیری افادات اردو زبان میں بھی منتقل کیے ہیں،[ل] تاہم اس مضمون کو کسی قدر مکمل کرنے کی غرض سے ہم بھی دو آیتوں کی تفسیر مختصر طور پر درج کریں گے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ — اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں

لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (انعام۔ ۵۹) — جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

علامہ محمد انور شاہؒ فرماتے ہیں۔

"علوم کی دو قسمیں ہیں (۱) علوم تکوینیہ (۲) علوم تشریعیہ، تکوینی علوم پر کوئی بھی انسان مکمل طور پر آگاہ نہیں ہے، یہاں تک کہ انبیاءؑ بھی ان سے بے خبر ہیں، اللہ تعالٰی نے تکوینی علوم کی ساری کنجیاں اپنے قبضے میں رکھی ہیں جیسا کہ مذکورۂ بالا آیت سے ظاہر ہے، چونکہ انبیاءؑ صرف شریعت قائم و نافذ کرنے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں، اس لیے انھیں تکوینی علوم کو چھوڑ کر صرف تشریعی علوم سے آگاہ کرنا ہی مناسب تھا، اور تکوینی علوم کے تمام کے اصول محفوظ رکھے گئے" البتہ ان اصول کے جزئیات میں انبیاءؑ کو کچھ سے باخبر رکھا گیا، بلکہ اولیاء اللہ کو بھی کچھ جزئیات کا علم دیا گیا، اسی مقام پر امام فخرالدین رازی کو اشتباہ

[ل] اس سلسلے میں مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی کی قاموس القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی کی قصص القرآن، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ کی ترجمان السنۃ (بحث ختم نبوت) اور پروفیسر مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی وحی الٰہی ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

لاحق ہوا، جس کی بنا پر وہ کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دے سکے۔ اس پر قاضی شوکانی صاحبؒ نے امام رازی کی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ رازی کی فلسفیانہ کج روی ہے (کیونکہ بقول قاضی شوکانی کسی بھی انسان کو خواہ وہ پیغمبر یا ولی ہی کیوں نہ ہو) تکوینی علوم میں کسی جز کا کوئی علم بھی عطا نہیں کیا جاتا ہے، مگر میں (محمد انور شاہ) کہتا ہوں کہ اس طرح کا دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے، جو دنیا میں گزرنے والے واقعات سے بے خبر ہو۔[1] اگر علامہ شوکانیؒ نے بھی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا تو وہ جانتے کہ غیب کی خبریں دینا ایک فن ہے، علامہ ابن خلدون نے اسے فنون ہی میں شمار کیا ہے۔[2] یہ جانی پہچانی بات ہے کہ جب کاہنوں نے کبھی کسی چیز کے واقع ہونے کی خبر دی تو وہ ان کی پیشینگوئی کے مطابق ہو کر رہی، اس لئے یہ امام رازیؒ کی کجروی نہیں، بلکہ خود قاضی شوکانی کی حقیقت سے ناواقف ہونے کی دلیل ہے، .... علم غیب کی جزئیات کا علم درحقیقت کوئی علم ہی نہیں ہے، کیونکہ جزئیات ہمیشہ تغیر پذیر ہوتے ہیں اور ایک جزء کا علم دوسرے جز کے ساتھ کوئی ربط بھی نہیں رکھتا ہے، اس لئے یہ کوئی علم ہی نہیں ہوا، علم صحیح معنوں میں وہ ہوا جو اس نوع کے سارے افراد پر مشتمل ہو، کیا تم نہیں دیکھتے کہ یورپ سے ہزاروں مصنوعات ہمارے پاس آتے ہیں، ہم انھیں دیکھتے بھی ہیں، اور جانتے بھی، مگر اس کے باوجود ہم ان کے اصول سے ناواقف ہیں،

---

[1] فیض الباری ج ۱ ص ۱۵۱ [2] مصر کے نامور فاضل اور ادیب محمد عبد اللہ العنان لکھتے ہیں۔ التنجیم والسحر والکیمیاء وأسرار الحروف والکیمیا والانفعال الروحانی والأسرار الخفیۃ والإستدلال علی الضمائر... ھی جمیعاً عندہ من انواع العلوم وممّا یلحق بہا (ابن خلدون: حیاتہ وتراثہ الفکری) ص ۱۱۶، قاھرہ ۱۹۳۹ء۔

علم کے معنوں میں وہ علم ہے کہ جاننے والا اس کے جاننے سے اس نوع کے تمام اصول واجزا اور ان کے حقائق سے مطلع ہو جائے، اللہ نے اس آیت قرآنی میں مَفَاتِح کا لفظ استعمال کرکے دراصل اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، ظاہر ہے جب تمہیں چابی دے دی جائے گی تو تم تمام تالوں کو جب چاہو کھول سکتے ہو، مگر یہ حالت علم کلی ہی کے ساتھ مختص ہے، جو صرف حق تعالیٰ ہی سے مخصوص اور اسی تک محدود ہے، اس نے اپنے بندوں کو حسب استعداد بکھرے ہوئے اجزا عطا کئے ہیں، کلیدی اہمیت ونوعیت کے علوم اسی کے پاس ہیں، یہاں لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ کا حصر بھی بغیر کسی تاویل کے سمجھ میں آجاتا ہے۔[1]

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ	جب خدا نے فرمایا کہ عیسیٰ میں تمہاری
وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ	دنیا میں رہنے کی مدت پوری کر کے
مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا........	تم کو اپنی طرف اٹھا لوں گا اور تمہیں
(آل عمران۔ ۵۵)	کافروں کی صحبت سے پاک کردوں گا۔

علامہ محمد انور شاہؒ اس آیت کی تفہیم و توضیح میں ان تین الفاظ کی طرف خاص توجہ کرتے ہیں۔

۱۔ متوفیك ۲۔ رافعك ۳۔ مطهرك

علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ عربی میں "وفات" اور "موت" علٰحدہ علٰحدہ معنیٰ کیلئے آتے ہیں، اگر موت اور وفات دو مرادف الفاظ ہوتے تو ائمۂ لغت نے اس کی تصریح کی ہوتی، بلکہ اس کے عین برعکس علمائے لغت نے تصریح کی ہے کہ وفات کے معنیٰ ہرگز حقیقی اور طبعی موت نہیں ہے، چنانچہ ازہری نے تہذیب الالفاظ اور ثعالبی نے فقہ اللغۃ میں وفات کو موت کے

---

[1] فیض الباری ج ۱ ص ۱۵۱ (مع حاشیہ)

معنیٰ میں نہیں لیا ہے، بلکہ لکھا ہے کہ اہل عرب وفات کے موت کے معنیٰ میں استعمال سے ناواقف تھے، اسی وجہ سے ابن سیدہ نے مخصص میں جب اس لفظ کو موت کے معنیٰ میں بطور کنایہ استعمال کیا تو اشعار عرب کے بدلے قرآنی آیت ہی سے استشہاد کیا۔

لفظ التوفی، اتفقت نظائرہ	توفی لفظ کے اشتقاق کی مثالیں اس پر
اشتقاقہ فی انہ استیفاء	متفق ہیں کہ اس کے معنیٰ حق کی مکمل
الحق بحیث لم یترک	وصولیابی ہے۔ اس طرح کہ حق سے
منہ شیئا۔	کوئی چیز باقی نہ رہے۔

علامہ ممدوح آگے لکھتے ہیں کہ یہ لفظ موت کے معنیٰ میں آگے اسی وجہ سے استعمال ہونے لگا کہ توفی میں تعظیم وتشریف ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کا معنیٰ موضوع لہٗ ہی ختم ہو جائے، قرآن حکیم کا ایک ایک لفظ چنا ہوا ہے، اور اس کے ایک ایک حرف کے پیچھے حقائق موجود ہوتے ہیں، مزید برآں موت اور وفات کا فرق بلغاء نے ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے، اور ہر وقت اس کی رعایت رکھی ہے، چنانچہ ابو البقاء نے کلیات میں لکھا ہے۔

قال (ابو البقاء) التوفی	توفی کا لفظ عام لوگوں کے ہاں موت
الاماتۃ وقبض الروح	دینے اور جان لینے کے معنیٰ میں استعمال
وعلیہ استعمال العامۃ	ہوتا ہے، مگر بلغاء کے ہاں اس کے معنیٰ
او الاستیفاء واخذ الحق	پورا پورا لینا اور حق وصول کرنا ہے۔
وعلیہ استعمال البلغاء[1]	

---

[1] عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام: علامہ محمد انور شاہ کشمیری، ص ۱۷

اس کے بعد علامہ کشمیری نے ابن اثیر کی المثل السائر اور علامہ سیوطی کی اتقان سے بلاغت کے کچھ اہم اصول و قواعد کی روشنی میں وفات اور موت کا فرق واضح کیا، پھر لکھتے ہیں۔

فاذا اتقنت ھذا، فالتوفی کسائر نظائرہ فی المادۃ للاخذ والتناول کوفاء العدۃ والدین اللازم و الاجل المضروب ولا دلالۃ لہ علی الموت من حیث اللفظ واستعمالہ نعم یجامعہ کثیرا لان استیفاء العمر یعقبہ الموت وھذا امر آخر.... انما شاع الآن فی الموت کنایۃ[1]

جب تمہیں اس تحقیق پر اطمینان ہو اتو جان لینا چاہئے کہ وفات اپنے ماخذ کے تمام امثال و نظائر کی طرح "لینے اور پانے" کے معنی رکھتا ہے، جیسے وفائے عدت یا واجبی قرض کی پوری وصولی، یا مقررہ مدت کی تکمیل وغیرہ، اس لئے لفظ اور اس کے استعمال کی حیثیت سے یہ لفظ قطعاً "موت" کا معنی نہیں رکھتا ہے، ہاں موت کے معنیٰ سے اکثر یہ ملتا ہے کیونکہ عمر کی رسیدگی کے بعد موت ہی ہوتی ہے، لیکن یہ دوسری بات ہے۔ .... اب یہ لفظ (وفات) موت کے ...

ملاحظہ ہو مشکلات القرآن ص ۹۴

وفات کے ایک اور معنوی خوبی بیان کرتے ہوئے علامہ کشمیری لکھتے ہیں۔

المتوفی یکون حق المتوفی۔ فلا یقال مثلا اذا اخذ الفرس من الصحراء توفیت

متوفّٰی حق ہوتا ہے متوفی کا مثلاً میدان میں گھوڑے کو پکڑ کر یہ نہیں کہہ سکتے ہیں "توفیت الفرس"

---

[1] عقیدۃ الاسلام۔ ص ۵۴۔

الفرس وانما یقال توفیت	بلکہ ہم یہ کہیں گے " توفیت "
حقی ای حصلتہ ویقال	حتی معنی میں نے اپنے حق کو پالیا فارسی میں
فی معناہ بالفارسیۃ	ہم اس معنی کو یوں ادا کر سکتے ہیں،
" وصول کردم حق خویش را "	" وصول کردم حق خویش را "
واذا کان لتحصیل حقہ ولحق	یعنی یہ لفظ اس حق کے حاصل کرنے
لایکون عند الغیر الاعاریۃ	کے وقت بول سکتے ہیں جو وہ دوسرے
لمدۃ مضروبۃ[1]	کے پاس ایک مقررہ مدت کے لئے
	عاریۃً ہو۔

علامہ ممدوح کے نزدیک موت اور وفات حقیقی اور وضعی اعتبار سے دو مختلف معانی کے حامل ہیں، قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کے لئے جہاں وفات کا لفظ استعمال ہوا ہے، وہاں اس کے حقیقی اور وضعی معنیٰ ہی مقصود ہے، نہ کہ کنایہ۔ اس سلسلے میں علامہ کشمیری یہ بھی فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم کی معجزانہ بلاغت آنکھیں کھول دیتی ہے، غور کی بات ہے کہ قرآن نے حضرتِ عیسیٰؑ کے لیے وفات ہی کا لفظ استعمال کیا، جس سے ان کے رفع و نزول کی مکمل تائید و توضیح ہوتی ہے، ہاں ایک آیت ایسی بھی ہے، جہاں موت ہی کا لفظ وارد ہوا ہے اور علامہ ممدوح اذعان و اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں کہ یہاں موت کا لفظ لانا ہی لازمی تھا کیونکہ اس آیت کا تعلق حضرت عیسیٰؑ کی حیات بعدِ نزول سے ہے جب وہ اصلاح و تجدید کریں گے اور پھر عام طبعی موت پائیں گے۔ آیت یہ ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اِلَّا — اور کوئی اہل کتاب نہیں ہوگا مگر ان کی

---

[1] تحیۃ الاسلام۔ ص ۳۲، مجلس علمی ڈابھیل۔

لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَ	موت سے پہلے ان پر ایمان لے آئے گا
يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ	اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہ
شَهِيْدًا (نساء - ۱۵۹)	ہوں گے۔

اس آیت میں موتہٖ میں ہ حضرت عیسیٰؑ کی طرف راجع ہے یعنی قرب قیامت میں حضرت عیسیٰؑ کا نزول ہوگا تو اپنی طبعی موت پانے سے پہلے پہلے تمام اہل کتاب ان پر ایمان لائیں گے، تو صاف معلوم ہوا کہ قرآن موت کا لفظ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے اس دَور کے ذکر میں لایا ہے، جو نزول کے بعد ہوگا۔

بعض مفسّرین نے موتہٖ میں ہ کا مرجع اہل کتاب ٹھہرایا ہے، مگر علامہ کشمیریؒ نے احادیث سے ثابت کیا ہے کہ کبار صحابہؓ نے بھی یہاں حضرت عیسیٰؑ کی ذات مقدسہ مراد لی ہے، حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی الجواب الصحیح لِمَن بدل دین المسیح میں اسی کو مسلک جمہور رکھا ہے،

مطہرک:۔ آیت میں یہ الفاظ دیکھیں وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اے عیسیٰؑ ہم کفار کے ہاتھوں سے تم کو بالکل پاک وصاف رکھیں گے، اس قرآنی تصریح کے بعد جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا، یہاں ان کے جسم کو مارا گیا، اور وہ بے ہوش ہوئے، لوگ سمجھے کہ وہ انتقال کر گئے، تو انھیں تختۂ دار سے اتار کر دفن کیا، مگر آپ درحقیقت زندہ تھے، چند دن بعد افاقہ ہوا اور کچھ ہمدردوں نے آپ کو قبر سے نکالا، علاج ومعالجہ کے بعد آپ روپوشی کی حالت میں مادر وطن سے بھاگ گئے؛

یہ تاویلات باردہ اُس سے کہیں زیادہ مستبعد ہیں، جو ممات مسیح کے قائلین کو عقیدۂ رفع ونزول میں محسوس ہوتی ہے، علامہ کشمیری فرماتے ہیں کہ اگر ان رکیک باتوں پر

غور کیا جائے تو اس اولو العزم پیغمبر کی طہارت و تطہیر جس کا قرآن کی مذکورہ آیت کے مطابق اللہ نے وعدہ فرمایا ہے، بالکل بے معنی ہوتا ہے۔ صحیح بخاری میں وارد ہوا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے رب سے ارض مقدس ہی میں آخری آرام گاہ نصیب کرنے کی دعا کی تھی اسی طرح دوسرے انبیاءؑ بھی پاک مقامات ہی کی تمنا کرتے تھے، یہاں خود اللہ تعالےٰ حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کو بشارت دیتا ہے کہ میں تم کو کفار سے محفوظ رکھوں گا اِن صاف و صریح الفاظ کے بعد دعویٰ کرنے والوں کا یہ دعویٰ کتنا کھو کھلا اور خلافِ قرآن نظر آتا ہے، جو کشمیر میں قبر مسیح کا دعویٰ کرتے ہیں، مرزائے قادیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ محمد انور شاہ فرماتے ہیں:۔

و عواہ ان عیسیٰ علیہ السلام	وہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے
توفی بکشمیر وقد کانت	کشمیر میں وفات پائی، حالانکہ کشمیر
داس کفر و وثنیۃ اذذاک	اس زمانے میں کفر اور بت پرستی کا
وکان اللہ قال لہ ومطہرک	گھر تھا، ادھر خدا نے ان سے وعدہ
من الذین کفروا، وقد	کیا تھا کہ میں تجھے کفار سے پاک اور
جاء اذالم تستحی فاصنع	محفوظ رکھوں گا۔ سچ ہے، ع
ماشئت [1]	بے حیا باش ہرچہ خواہی کن۔

غرض تطہیر کے لیے یہ لازم تھا کہ کفار اور بدباطن لوگوں سے آپ کو محفوظ رکھا جائے اور "رفع" اس کا اہم جز تھا۔

"رفع": اس آیت کا تیسرا قابل تحقیق لفظ "رفع" ہے، جو لوگ حضرت عیسیٰؑ کی حیات کے قائل ہیں، وہ یہاں رفع سے رفع درجات مراد لیتے ہیں نہ کہ جسمانی رفع، ان کے جواب میں

---

[1] عقیدۃ الاسلام ص ۲۰۲

محدث کشمیریؒ فرماتے ہیں۔

اولاً - ہر ایسے شخص پر وہ جو قرآن و حدیث پر ایمان رکھتا ہے اور اسے یقین ہے کہ امت محمدیہ باطل پر کبھی بھی اکٹھا نہیں ہو سکتی ہے، واجب ہے کہ وہ یہاں جسمانی رفع ہی تسلیم کرے، اسی پر قرآن قطعی الثبوت اور اجماع امت قطعی لدلالہ ہے۔[1]

ثانیاً۔ حضرت عیسٰیؑ کا یہ رفع ان کے لئے اسی طرح بمنزلہ معراج تھا جس طرح دوسرے انبیاء علیہم السلام اس عطیہ خداوندی سے سرفراز ہوئے، امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں یہی مراد لیا ہے، جیسا کہ تفسیر البحر المحیط میں ان سے منقول ہے۔

ثالثاً۔ سورہ نساء کی رفع و نزول مسیحؑ سے متعلق آیات وفد نجران کے سامنے تلاوت کی گئی، جیسا کہ ائمہ متقدمین نے متفقہ طور پر نقل کیا ہے کہ یہ ان کے عقیدہ کی اصلاح کے لیے نازل ہوئیں، ان کا عقیدہ تھا کہ عیسٰیؑ روح و جسد کے ساتھ اٹھائے گئے، اگر اسلام کا عقیدہ اور قرآن کی تعلیم اس کے برخلاف ہوتی تو ضرور تھا کہ نظم قرآن میں ایسا لفظ لایا جاتا جو نصاریٰ کی تکذیب کرتا، اس کے برخلاف قرآن نے ان کے عقیدۂ رفع سے اتفاق و تائید کر کے صرف قتل، صلیب اور کفارہ کا ابطال کیا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے، کہ جن اکابر علمائے نصاریٰ نے اسلام قبول کیا ان سے بھی منقولات کی کتابوں میں ایسے بہت سے آثار منقول ہیں

---

[1] ممات مسیح کے بعض قائلین نے اپنی رائے امام مالکؒ، امام فخرالدین رازیؒ، علامہ ابن حزم اندلسیؒ، امام ابن تیمیہؒ، علامہ ابن قیم اور معتزلہ کی طرف بھی منسوب کی تھی، علامہ محمد انور شاہ نے یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ثابت کیا، اور ان تمام اکابر کی تصانیف سے نقول پیش کر کے دعویٰ کرنے والوں کی علمی خیانت نمایاں کر دی، اس سلسلے میں علامہ کشمیریؒ کا ایک دوسرا تحقیقی رسالہ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح بھی قابل مطالعہ ہے جس کے بارے میں علامہ محمد زاہد الکوثری لکھتے ہیں، للمولانا المحدث الکشمیری کتاب التصریح بما تواتر فی نزول المسیح یسوق فیہ

جو حضرت عیسیٰؑ کے رفع جسمانی پر دلالت کرتے ہیں، مثلاً عبداللہ بن سلامؓ، کعب الاحبارؓ، وہب بن منبہؒ وغیرہ۔ ان کے یہ آثار درِ منثور، اور جامع ترمذی میں محفوظ و مندرج ہیں۔

رابعاً:- ممات مسیح کے قائلین رفع سے رفعِ روح مراد لیتے ہیں یعنی روح ہی کو خدا نے مقعد صدق کی طرف اٹھایا، اور بلند مقام عطا کیا، علامہ محمد انور شاہ فرماتے ہیں کہ یہود در اصل حضرت عیسیٰؑ کو جسمانی اذیت پہنچانے اور قتل کرنے کے درپے تھے، قرآن بھی اسی جسمانی اذیت اور قتل یا صلیب جسد کی نفی کرتا ہے، روح یہاں داخل کرنا بے معنیٰ ہے۔ اسی طرح رفع جسد کی نفی کرکے رفع درجات پر زور دینا بھی نظم قرآن کے خلاف ہے، یہاں رفع خاص نوعیت و اہمیت کا حامل ہے، رفعِ درجات کو حضرتِ عیسیٰؑ کے ساتھ خاص کرنا بے معنیٰ ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۶) سبعون حدیثا تدل علی نزوله علیه السلام (مقالات الکوثری، مطبوعہ مصر، ص ۳۵۵) یعنی مولانا محدث کشمیریؒ نے التصریح بما تواتر فی نزول المسیح کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں ایسی ستر احادیث جمع کی گئی ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے نزول پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اسی طرح یہ رسالہ جب علامہ کوثری کے توسط سے جلیل القدر فلسفی عالم علامہ مصطفیٰ صبری کو پہنچا تو انھوں نے بھی تعجب کے ساتھ لکھا۔ سبعون حدیثا مرویا عن الرسول صلی اللہ علیہ وسلم بالسند رواہ مختلفون من الصحابۃ والتابعین ومن بعدھم لابد ان تکون لھا قیمتھا۔ موقف العقل والعلم والعالم (ج ۴ ص ۷۱ احیاء الکتب العربیہ ۱۹۵۰ء) یعنی رسول اللہ صلعم سے ستر احادیث کا صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی زبانوں سے مروی ہونا یقیناً قدر و اہمیت کا حامل ہے، التصریح کا دوسرا ایڈیشن دمشق سے طبع ہوا ہے۔ عبدالفتاح ابو غدہ نے اس پر فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے۔

کیونکہ قرآن حکیم کی تصریح کے مطابق رفع درجات عارفین اور مومنین پر بھی مشتمل اور محیط ہے قرآن کہتا ہے:۔

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں
وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ	اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے، اللہ
دَرَجٰتٍ (مجادلہ : ۱۱)	ان کے درجے بلند کرے گا۔

اس آیت میں تمام مقربین داخل ہیں۔ اس لئے حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ رفع بمعنی رفع درجات لانے کی کیا ضرورت تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کے درجات ہر حال میں بلند اور ارفع ہیں۔ غرض یہ رفع غیر معمولی اہمیت اور نوعیت کا حامل ہے[1]

---

[1] عقیدۃ الاسلام ص ۴۰ تا ۷۶ — علامہ کشمیریؒ نے اس تصنیف اور اس کے حاشیہ (تحیۃ الاسلام) میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق آیات کی ایسی فاضلانہ تشریح و تفسیر کی ہے، جو مطالعہ سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ نقل ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ اپنے تلامذہ کو اس تصنیف کا مطالعہ کرنے کی ہدایت فرماتے تھے، جن میں مولانا محمد ادریس ندوی نگرامی صاحب شامل تھے، (خطوط انور، مولانا احمد رضا صاحب بجنوری حصہ اول صفحہ ۱۲، نیز ملاحظہ ہو معارف سلیمان نمبر (۱۹۵۵ء) صفحہ ۲۴۷ - ۲۴۸)

تفسیر ابی مسلم الاصفہانی (عربی)

ابو مسلم اصفہانی کے تفسیری اقوال تفسیر کی دوسری کتابوں میں منتشر تھے انکو مولانا سعید انصاری سابق رفیق دارالمصنفین نے نہایت محنت اور دیدہ ریزی سے اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔

اسلام اور مستشرقین کی بیرونی ڈاک

پیرس ۲۶ جمادی الآخر ۱۴۰۳ھ

مخدوم و محترم زاد مجدکم۔　　السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

ابھی ابھی شام کی ڈاک میں نوازش نامہ ملا، اور سرفراز کیا، چالیس پینتالیس سال ہوگئے، آپ سے دارالمصنفین میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، اور آپ کی نوازش اور مہمان نوازی بھولی نہیں، آپ کی ملنساری ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ہر دقت کی ہے، حفظکم اللہ

دعا فاکم،

آپ کی فرمایش سر آنکھوں پر، لیکن مستشرقین کی شکایت کے ارادے سے اس ناچیز کو بالکل اتفاق نہیں، اگر محترم علی میاں نے مجھ سے اس پر پیشگی گفتگو کی ہوتی تو میں ادب سے عرض کرتا کہ ایسا نہ کریں! ان میں سے ہر فرد پیشہ ور عناد اور دشمنی نہیں رکھتا، وہ جو اکا دکا رکھتا ہے، وہ اس طرح کی کانفرنسوں اور شکایت ناموں سے شدید تر دشمنی کرنے لگتا ہے، (جیسا کہ کچھ دنوں سے یہاں نظر آرہا ہے)

ہم اپنے بچوں کو انہی کے ہاں بھیجتے ہیں، اور ان کے پرزۂ کاغذ (ڈاکٹری کی سند) پر اتراتے ہیں، پھر انہی کی شکایت کریں؟ اخلاق تو اس کی اجازت نہیں دیتے،

وہ مسلمان نہیں ہیں، ان سے توقع کرنا کہ وہ سو فی صد ہماری باتوں کی داد دیں، یہ عبث ہے، ان کے دین اور ان کی دنیا کے متعلق کیا ہم بھی مبالغہ آمیز شکایتیں، اور

تنقیدیں نہیں کرتے ؟

میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ وہ عام طور پر عمداً اسلامی چیزوں پر اعتراض نہیں کرتے، وہ مخلص ہوتے ہیں یعنی اپنے علم اور اپنی فہم کے مطابق تاثر لیتے اور بتاتے ہیں، اور گالی گلوچ کے ساتھ نہیں، خالص علمی انداز میں ان کو ان کی غلطیاں بتائیں تو عام طور پر فوراً مان لیتے ہیں ایک تجربہ عرض کرتا ہوں، شاخت، آنجہانی سے آپ ناواقف نہیں، ایک مرتبہ انقرہ میں امام سرخسی کا جشن منایا گیا، پہلے شاخت صاحب کی تقریر تھی، پھر میری باری آئی، انھوں نے اپنی رائے بیان کی، اس سے پیشگی واقف ہوئے بغیر میں نے ان چیزوں کی تردید کی، جشن کے صدر نے بعد میں مجھ سے بیان کیا کہ شاخت نے اپنی پڑھی ہوئی تقریر واپس مانگ لی، اور بہت سی ترمیموں کے بعد دی، کہ آپ اسے چھاپ سکتے ہیں، یہی تجربہ مجھے اٹلی کے سب سے بڑے مستشرق "لیوی دلا ویدا" سے رہا۔ جزیہ اور ذمیوں سے دگنی چنگی کی وجہ سے میری بحث پڑھ کر مجھے خط لکھا کہ تمھاری ان دلیلوں پر تو کوئی یہودی ربی بھی زبان نہیں کھول سکے گا،

غرض اس ناچیز کی رائے میں ان کی چیزوں کو کھلے دل سے پڑھ کر ان کی غلط فہمیوں کو خالص علمی انداز میں دور کریں، ہو سکے تو ان کا نام بھی نہ لے کر زیر بحث مسئلہ کو اس طرح پیش کریں کہ اعتراض خود ہی دور ہو جائے، اور ظاہر ہے کہ یہ چیز محنت چاہتی ہے تو زیادہ صحیح اور زیادہ مفید ہوگا،

معارف میں خطبات بہاول پور کی تحلیل دیکھی، تمنا تو تنقید و تصحیح کی تھی، معلوم نہیں اس کا ۲۲ صفحوں کا غلط نامہ آپ کو ملا یا نہیں کئی دفعہ کا فردوں کو بھی "حضرت .... رضی اللہ عنہ" لکھ ڈالا ہے،

خدا کرے آپ خیر و عافیت سے ہوں، حال میں سلمان صاحب یہاں آئے تھے، دعوت دی ہے، شاید آیندہ ماہ ڈربن جا کر دوبارہ ملاقات کر سکوں،

نیاز مند

حمید اللہ

فرانس

۲۲؍۳؍۸۳ ۱۹ء مکرمی و محترمی! السلام علیکم

آپ کو فرانس کے ڈاکٹر (سرجن) موریس بوکائی (Maurice Bucaille) کی

کتاب "he Bible, the an and Science" کا یقیناً علم ہوگا اور

اس کا انگریزی ترجمہ آپ کی نظر سے گذرا ہوگا، ڈاکٹر بوکائی نے بھی اپنی اس بے نظیر کتاب میں اپنی تحقیق

کے نتیجہ میں لکھا ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے، اس کتاب کو نہ محمدؐ کی کتاب کہنا چاہئے اور نہ اسلام کو محمڈن دین، اس کے

ساتھ یہ بھی کہ یہ مغربی مستشرقین کی سازش تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کو محمڈنز (mohammadans)

اور اسلام کو محمڈنزم کہنا شروع کر دیا اور حیرت ہے کہ مسلمان بھی اس فریب میں آگئے لیکن ہمارے یہاں اب بھی

پڑھے لکھے مسلمان موجود ہیں، (جیسا کہ آپکے سیمینار سے معلوم ہوا) جو اس قابل نفرت اور غلط اصطلاح کے

استعمال کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے متعلق ع:۔

بدیں عقل و دانش بباید گریست

کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے؟

پچھلے ہفتہ حکیم محمد سعید صاحب چار دن کے لئے پیرس یونیسکو کی ایک میٹنگ میں شمولیت

کے لئے تشریف لائے تھے، آپ کا اور معارف کا ذکر خیر بھی آیا۔

والسلام

نیازمند طفیل محمد

طہران ۱۵؍اپریل

مکرمی، سلام مسنون

امید کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوگا، آپ کے متعدد نوازش نامے موصول ہوئے اور کئی جواب

ایک ہی کا دے سکے ایک طویل خط ادھورا لکھا پڑا ہے تکمیل کے لئے فرصت کی تلاش ابھی تک ہے معافی کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں، سمینار کے موقع پر آپ نے وہی کرم اور وہی شفقت برتی، جو میرے والد یا میرے خسر صاحب برتتے ہیں، آپ کے گھر میں ہم دونوں رہے، اور گھر کی طرح بے تکلفی رہی، آپ کے اخلاص کا گہرا اثر لے کر وہاں سے روانہ ہوئے، وہ نقش اب تک اسی طرح تازہ ہے،

آپ کے خطوط کے موصول ہونے کے بعد، یوسف قرضاوی صاحب سے برابر رابطہ قائم رکھا، تاکہ سمینار کے آگے بڑھانے کی کوئی سبیل ہو سکے، بہت امید ہے الیکن آج کل پٹرول کی دولت میں اچانک جو کمی واقع ہوئی، اس سے ذمہ داروں کے حوصلے کچھ سرد پڑ گئے ہیں، یوسف قرضاوی صاحب کا یہ تاثر ہی ہے تاثر میرا بھی ہے، اس سمینار کو جوش بڑھانے کی سعی سے پرہیز کرنا ہے، اس کا معیار خالص علمی اور بہت بلند ہو اور میرا اور قرضاوی صاحب کا خیال ہے کہ اگلی کانفرنس کی تیاری ٹھوس طرح سے ہو اور صرف معیاری مقالات ہی پڑھے جائیں، اس کے لئے ضروری ہے کہ سمینار کے انعقاد سے بہت پہلے مقالات کی ایک کمیٹی جائزہ لے کر رد و قبول کا فیصلہ کرے، میری تجویز ہے اور اس سے قرضاوی صاحب نے اتفاق کیا کہ کانفرنس کا ایک موضوع پہلے سے طے کر دیا جائے اور اس کے لئے علیحدہ علیحدہ عنوانات بھی بنا دیے جائیں، اسی دائرے میں لوگ مقالات لکھیں، میری تجویز ہے کہ اگلے سمینار کا موضوع "مستشرقین اور قرآن پاک" ہو اگر آپ چاہیں تو میں دوسرے افراد سے مل کر اس کے علاحدہ علاحدہ عنوانات مرتب کرلوں، سمینار میں سیٹی بہت لمبی چوڑی بنالی گئی ہے، ورنہ اس کا امکان تھا کہ ملاقات کی سبیل نکال جاتی،

والسلام

ظفر اسحاق انصاری

ٹرولیم یونیورسٹی ظہران"

مطبوعات جدیدہ

اقبال اور تصوف:- مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۵۵، قیمت ۱۶ روپیہ پتہ (۱) اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، سری نگر ۶ (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی۔

ڈاکٹر محمد اقبال کے افکار اور دلچسپی کے موضوعات پر بحث، مطالعہ اور تحقیق کے لئے کشمیر یونیورسٹی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی اور ان پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے، جو اکتوبر سنہ۱۹۸۱ء میں "اقبال اور تصوف" کے موضوع پر ہونے والے سمینار میں پڑھے گئے تھے، اس میں کشمیر سے تعلق رکھنے والے فضلائے علاوہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ڈاکٹر عالم خوندمیری (حیدرآباد) جناب میکش اکبرآبادی اور ڈاکٹر فصیح احمد کمالی علی گڑھ کے مقالات بھی ہیں، اکثر مضامین اقبال اور تصوف کے موضوع پر ہیں اور ان میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اقبال حقیقی تصوف کے خلاف نہ تھے، اس سلسلہ میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا مضمون خاص طور پر لائق مطالعہ ہے، ان کے نزدیک اقبال کا سارا کلام تصوف ہے، مگر انھیں اس کا مخالف اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ انھوں نے تصوف پر تنقید کی ہے، اور اسے مسلمانوں کے زوال کا ذمہ دار قرار دیا ہے، اس تضاد کو دور کرنے کے لئے مولانا نے تصوف کا اصل مقصد اور اس کی مختصر تاریخ بیان کرکے دکھایا ہے کہ اس کا سارا تار و پود کتاب و سنت سے تیار کیا گیا ہے، مگر بعد میں اس پر اشراقیت، مزدکیت، رہبانیت اور ویدانت کے اثرات پڑے، جس سے اس کی روح اور اصلی خصوصیات

ختم ہو گئیں، اور وہ عرس، قوالی، بدعات، تعطل اور فرائض و واجبات سے گریز کا نام رہ گیا ہے، اقبال اس رسمی تصوف کے اسی طرح خلاف تھے جس طرح یہی اسلام کے خلاف تھے، اس کے مقابلہ میں وہ اس اصلی تصوف کے منکر تو کجا ہمیشہ داعی رہے جس کی حقیقت تزکیۂ نفس، اخلاص فی العمل، فقر، درویشی اور اقبال کے مردِ مومن کے وہ اوصاف ہیں جو قرآن نے محسنین کے بیان کیے ہیں، اس کے ثبوت کے لیے مولانا نے مثنوی اسرار خودی اور رموز بیخودی کا خلاصہ پیش کیا ہے، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے فاضلانہ مقالہ میں ایک دلچسپ نکتہ کی بات یہ کہی گئی ہے، کہ اقبال کا کلام ایک صوفی شاعر کا کلام نہ ہوتے ہوئے بھی تصوف کی کیفیت اور سرشاری سے لبریز ہے، اور ان کا فلسفہ تصوف کے کیف میں ڈوبا ہوا ہے، رومی، عطار اور سنائی کے مطالعہ نے ان کے دل میں تصوف کا ایک نکھرا ہوا ذوق پیدا کر دیا، انھوں نے تصوف میں سے زندہ و پائندہ عناصر چن چن کر اسلام کو واپس لوٹائے، اسلامی اور غیر اسلامی تصوف میں ایک واضح لکیر کھینچی، آزاد صاحب نے بھی اسرار خودی کے مضامین کا تجزیہ کرکے دکھایا ہے کہ اسلامی دنیا میں تصوف کیا ہے، اور اقبال کس کے موافق اور کس کے مخالف تھے، ملکش اکبر آبادی اور رشید نازکی کے مضامین بھی قابل ذکر ہیں، اول الذکر نے اس پر زور دیا ہے کہ شروع میں اقبال وحدۃ الوجود کے مخالف تھے، مگر آخر میں اس کے قائل ہو گئے تھے، یہی خیال جگن ناتھ آزاد کا بھی ہے، اور دونوں نے اسے مدلل طور پر ثابت کیا ہے، مگر نازکی صاحب کے خیال میں وہ آخر آخر تک اس کے مخالف اور وحدۃ الشہود کے قائل تھے، لیکن شاہ ولی اللہ کی اس رائے کو تسلیم کر لیا جائے کہ اہل وجود اور اہل شہود کے درمیان محض نزاع لفظی اور فرق تعبیری ہے، حقیقی اور واقعی نہیں تو پھر اس قسم کی بحث کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نازکی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن عربی کے وجودی مسلک کا سلسلہ باطنیت تک پہنچتا ہے، ان کے اس نظریہ اور

ولایت کی نبوت پر برتری، قدیم ارواح اور حلول وغیرہ پر اقبال کو سخت اعتراض تھا مگر وہ ابن عربی کے صوفیانہ مقام کے منکر نہیں تھے، البتہ ان کے فلسفیانہ انداز فکر کے سخت نکتہ چیں تھے، ابن عربی کی طرح غالب، حافظ اور رومی سے اقبال کے تعلق و اختلاف پر بھی مضامین درج ہیں، پروفیسر پی این پشپ کے مضمون "طریق خانقاہی اور اقبال" میں تصوف پر اقبال کی بعض سخت رائیں نقل کر کے ان کے خانقاہی نظام کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو نمایاں کرنے کا ذکر ہے، مگر یہ اعتراف بھی کیا گیا ہے کہ اقبال تصوف کی انسان دوستی اور عملی قدروں کے قائل تھے، فاضل مرتب کے مقالہ کا دلکش طرز و اسلوب بھی اپنی جانب متوجہ کرتا ہے، اس میں تصوف کے اس فیضان کا ذکر ہے جو انسان دوستی، اخلاقی بلندی، قلبی طہارت، خدمت خلق، رواداری، وسیع المشربی، زہد، توکل اور استغنا کی صورت میں اردو شاعری پر ہوا، اس ضمن میں اقبال کا تذکرہ بھی ہے، اس میں بھی تصوف کی نکتہ چینی کی بنا پر اقبال کو تصوف کا مخالف قرار دینے کی تردید کی ہے، مولانا روم اقبال کے روحانی مرشد ضرور تھے، مگر اس کی وجہ سے ان کی شاعری کو تمام تر مولانا کی صدائے بازگشت نہیں کہا جاسکتا، جیسا کہ مفتی جلال الدین کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے، عالم خوند میری اور رحمان راہی کے بعض خیالات بھی محل بحث ہیں، ان کے مضامین میں قدرے ژولیدہ بیانی بھی ہے، یہ مجموعہ اقبال کے شیدائیوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔

مقام صحابہ کتاب و سنت کی روشنی میں اور مولانا مودودی } مرتبہ، مولوی محمد ابوبکر صاحب غازیپوری، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۵۰، قیمت۔ پندرہ روپیے، پتہ مکتبہ اثریہ، قاسمی منزل، سیدواڑہ غازیپور۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی کتاب "خلافت و ملوکیت" کے جواب میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں

اس کتاب میں مصنف کے بقول، پہلے صحابۂ کرام کی وہ تصویر پیش کی گئی ہے، جو کتاب وسنت اور سلف کے ارشادات سے نمایاں ہوتی ہے، پھر وہ تصویر پیش کی گئی ہے، جو مولانا مودودی کی تحریروں سے سامنے آتی ہے، اس سلسلہ میں صحابہ کی تعریف، ان کے جنتی، عادل اور معیار حق ہونے کی وضاحت بیس آیتوں اور حدیثوں سے کی گئی ہے، پھر مولانا مودودی کے موقف کو پیش کرکے لکھا ہے کہ پہلے بھی صحابۂ کرام پر سب و شتم کرنے والے اشخاص اور فرقے موجود تھے جو مولانا کے پیش رو ہیں، آخر میں ان تین صحابہ کے حالات و مناقب درج ہیں، جن کو مصنف کے خیال میں مولانا مودودی نے خاص طور پر مجروح کیا ہے، یعنی حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ مولانا کے موقف سے قطع نظر اس نوعیت کی اکثر کتابوں میں صحابۂ کرام کی عظمت، فضیلت اور عدالت کو ان کی عصمت میں گڈمڈ کر دیا جاتا ہے، اس خلط مبحث سے یہ کتاب بھی خالی نہیں ہے، اس کے علاوہ اس کے بعض مندرجات اور آیتوں سے اخذ کردہ نتائج بھی محل نظر ہیں، صحابۂ کرام کے معیار حق ہونے اور اس کے ضمن میں تغیر بالرائے وغیرہ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ تشفی بخش نہیں ہے، اس پر لکھنے کے لیے مزید مطالعہ اور وسعت نظر کی ضرورت ہے، کتاب میں بعض مباحث کا تکرار اور کہیں کہیں زبان و بیان کی ناہمواری بھی ہے، نوجوان مصنف کو لکھنے پڑھنے کا اچھا ذوق ہے، اگر اس قسم کے پامال اور نزاعی مسائل کے بجائے سنجیدہ اور مفید علمی موضوعات کا انتخاب کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

اسلامی مزاج و ماحول کی تشکیل وحفاظت میں حدیث کا بنیادی کردار — مرتبہ، مولانا سید ابوالحسن ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۵۰، قیمت تین روپے

پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ لکھنؤ۔

یہ رسالہ رابطہ عالم اسلامی مکہ کے توسیعی خطبات کی ایک کڑی ہے جسے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

نے اس کی دعوت پر ۲۰۰۱ء میں لکھا تھا، اس میں حدیث کی حجیت، ضرورت اور اہمیت پر شائستہ انداز سے بحث وگفتگو کی گئی ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی ذوق و ذہن اور مزاج و ماحول کی تشکیل وحفاظت ممکن نہیں ہے، اس سلسلہ میں بعثت محمدیؐ کے مقاصد چہارگانہ تلاوت، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ نفس کی تشریح کر کے اسلامی معاشرہ اور امت کی تشکیل میں احادیث کا کردار واضح کیا گیا ہے، فاضل مصنف نے احادیث سے انحراف کو دین اور اس کے مزاج وخصوصیات سے محرومی اور عظیم خسارہ بتایا ہے، اور ان کے نزدیک دنیا کے عام مذاہب کے مفلوج ہو جانے اور ان کی خصوصیات باقی نہ رہنے کا سبب یہ ہے کہ ان کے پیغمبروں کے حالات زندگی اور ایمان آفریں کلام کے مجموعے محفوظ نہیں رہے، اور انھوں نے بزرگوں کی حکایات وملفوظات سے اس کمی کو پورا کرنا چاہا جس کے نتیجہ میں وہ بدعات وخرافات کا مجموعہ بن گئے، مولانا نے امت کے مجددین ومصلحین کی تحریکوں میں بھی احادیث کا نمایاں حصہ بتایا ہے، اور لکھا ہے کہ ان کے ذریعہ انھوں نے اصلاح وتجدید کا کام انجام دیا، اور بدعات وجاہلیت کا مقابلہ کیا، وہ فرماتے ہیں کہ حدیث ہی کی بدولت عہد نبویؐ وعہد صحابہ کا معاشرہ وماحول محفوظ رہا اور اس کی خصوصیات نسلاً بعد نسل امت میں منتقل ہوئیں اور جب اس سے تعلق کمزور ہوا تو بدعتوں کا دور دورہ ہوا، آخر میں انکار حدیث کے نئے محرکات کی نشان دہی کی ہے اور اس ضمن میں یہ قیمتی بات تحریر کی ہے کہ مغربی تہذیب وطرز زندگی اور سنت نبویؐ سے میل نہیں ہو سکتا، یہ رسالہ مختصر ہونے کے باوجود انکار حدیث کے جواب میں لکھی جانے والی کتابوں میں ایک بہت مفید اور نمایاں اضافہ ہے، اس کے جو حصے مصنف نے عربی میں لکھے تھے ان کے سلیس وشگفتہ اردو ترجمہ کی سعادت مولوی سید سلمان ندوی کے حصہ میں آئی، ہونہار مترجم نے فاضل مصنف کی عبارت کی سلاست اور شگفتگی کو حتی الوسع قائم رکھا ہے۔

علم حدیث اور چند اہم محدثین : مرتبہ ڈاکٹر محمد سالم قدوائی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۷۰، مجلد قیمت ۱۵ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی ہمارے مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کے فرزند اکبر ہیں، درس و تدریس کے علاوہ ان کو تحریر و تصنیف کا بھی اچھا ذوق ہے، "ہندوستانی مفسرین اور ان کی اہم تفسیریں" کے عنوان سے انھوں نے ڈاکٹریٹ کا جو مقالہ لکھا تھا، وہ کئی برس قبل کتابی صورت میں چھپ چکا ہے، زیر نظر کتاب میں انھوں نے پہلے حدیث کی جمع و تدوین پر بحث کی ہے، اس سلسلہ میں عہد نبوی اور پھر صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ اسلام کے دور میں احادیث کے جمع و حفظ کی کوششوں کا جائزہ لیا ہے پھر حدیث کے اصول مصطلحات اور اقسام کے علاوہ جرح و تعدیل اور روایت و درایت کی اہمیت واضح کی ہے، اور رواۃ کے ضروری اوصاف و شرائط بھی قلمبند کئے ہیں، اور علوم حدیث اور اسماء الرجال کی اہم کتابوں کی فہرست بھی دی ہے، آخر میں ائمہ اربعہ اور صحاح ستہ کے مصنفین کے واقعات و حالات اور علم حدیث میں ان کے کارنامے بیان کئے ہیں، یہ کتاب سلیقہ اور محنت سے مرتب کی گئی ہے، اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کیلئے خصوصیت سے مفید ہے، اسکی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ نہ زیادہ مختصر ہے، اور نہ بہت طویل، امام مالک کے متعلق لکھتے ہیں "امام مالک کبار تابعین میں سے ہیں... حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت طلحہؓ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ سے انھوں نے کسب فیض کیا تھا" یہ سہو قلم ہے، دراصل امام مالک کے بجائے انکے دادا مالک بن ابی عامر کبار تابعین میں تھے اور انھوں نے مذکورۂ بالا صحابہ سے کسب فیض کیا تھا

اقلیم ادب کے تاجدار: مرتبہ، جناب بشر علی صدیقی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۳۰ قیمت دس روپیہ، پتہ: سلیم مبشر اردو سوسائٹی، گلی وحید بخش، محلہ سوتھ، بدایوں،

جناب مبشر علی صدیقی کی اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کا ان صفحات میں کئی بار ذکر آچکا ہے سلیم مبشر اردو میڈیم ماڈل اسکول انکا بڑا کارنامہ ہے جسکے لئے انکی حیثیت خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ کی ہے، وہ ایک اچھے اہل قلم اور مصنف بھی ہیں، ادھر چند برسوں میں انکی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں، یہ نئی کتاب ایک دلچسپ

مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں اردو شعر و ادب کی ممتاز شخصیتوں کے بارہ میں اظہار خیال کیا گیا ہے، پہلے مضمون میں مرزا غالب کی قدر و قیمت اور مختلف حیثیتوں سے انکی اہمیت بیان کی گئی ہے، دوسرے میں سرسید کے طرز تحریر کی خصوصیات کا ذکر ہے، ان دونوں مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ اردو نثر کو سادگی، اصلیت اور حقیقت پسندی سے قریب کرنے میں غالب اور سرسید کا کس قدر حصہ تھا، غالب سے متعلق ایک اور مضمون میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہونے والے انکے دیوان کے چھ ایڈیشنوں کی خصوصیات بتائی ہیں، ایک مضمون میں حالی کو اردو کا پہلا سوانح نگار بتا کر حیات جاوید کی اہمیت واضح کی ہے، ایک اور مضمون میں نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار قرار دیا ہے اور انکی ناول نگاری کی خصوصیات دکھائی ہیں، مولانا شبلی کے اہم مقالات کا تعارف اچھے انداز میں کرایا ہے، مولوی ذکاء اللہ دہلوی اور مولوی عبد الحلیم شرر کے ادبی و تحریری کارناموں کا تذکرہ بھی کیا ہے، ایک مضمون میں اردو کے ممتاز مزاح نگار اور مولانا محمد علی مرحوم کے رفیق و ہمدم سید محفوظ علی بدایونی کے مجموعہ مضامین طنزیات و مقالات پر تبصرہ کیا ہے، یہ مجموعہ چند برس قبل پاکستان سے شائع ہوا تھا، جگر بریلوی اور حفیظ جالندھری کا ذکر بھی ہے، مصنف نے اکثر ادیبوں کی شخصیت اور کارناموں کے کسی خاص پہلو ہی کو موضوع بحث بنایا ہے مگر اس کے باوجود ہر ایک کی مجموعی اہمیت اور مختلف النوع خدمات پر بھی مناسب انداز میں روشنی ڈالی ہے، یہ سب مضامین ادبی حیثیت سے مفید اور دلچسپ معلومات پر مشتمل ہیں۔

دولت اور رغبت اسلام کی نظر میں:- مرتبہ۔ مولوی جمیل احمد نذیری صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۰۲، قیمت ۹ر نو روپے پچاس پیسے، پتہ۔ مکتبہ صداقت مبارک پور، اعظم گڈھ، یو۔پی

اس کتاب میں مال و دولت اور رغبت کے بارہ میں اسلامی نظریہ بیان کیا گیا ہے، یہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں مال و دولت پر گفتگو کی ہے، اس میں دکھایا ہے کہ اسلام رہبانیت اور ترکِ دنیا کا مخالف ہے اس کے نزدیک دولت اور اس کا حصول دنیا داری نہیں بلکہ حبِ مال اور محبتِ دنیا میں مستغرق ہو جانا دنیا داری ہے، وہ حلال کمائی کی تلقین کرتا ہے، اور حرام کمائی

اور زراندوزی کی ممانعت کرتا ہے، اس سلسلہ میں انفاق کی فضیلت و برکت واضح کی ہے اور اسراف اور فضول خرچی کی کراہت و شناعت دکھائی ہے، دوسرے حصہ میں غربت و ناداری کی بحث ہے اس میں یہ بتایا ہے کہ انبیاء کرام کی دعوت پر عموماً پہلے فقراء نے لبیک کہا ہے، پھر دنیا کی تحقیر، ہوس کی مذمت، زہد فی الدنیا اور قناعت و توکل کی فضیلت بیان کی ہے، اور مال و زر کی کمی کو موجب راحت اور کثرت کو باعث فتنہ و فساد بتایا ہے، اس سلسلہ میں رسول اکرمؐ اور صحابۂ کرام کی سادگی اور فقر کے واقعات بھی لکھے ہیں اور فقیروں کی تذلیل و اہانت کو خدا کی ناراضگی کا سبب قرار دیا ہے، اس کتاب کا لب لباب یہ ہے کہ دولت بذات خود قبیح نہیں ہے بلکہ اس کا غلط استعمال قبیح ہے، اور گو اسلام نے معاشی مسئلہ سے صرف نظر نہیں کیا ہے تاہم اس کے نزدیک انسان کا اصل مسئلہ معاد کا ہے اسلئے آخرت کی فکر، عقائد و اعمال کی درستگی اور دینی و ایمانی تشخص کو برقرار رکھنے پر مسلمانوں کو مکمل دھیان دینا ضروری ہے۔

تاریخ ادبیات گورکھپور :- مرتبہ، ڈاکٹر سلام سندیلوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۰۶، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۰ روپیے پتہ، ڈاکٹر سلام سندیلوی امام باڑہ پورب پھاٹک محلہ میاں بازار، گورکھپور۔

گورکھپور لکھنؤ اور دلی جیسا ادبی مرکز تو نہیں تھا، مگر جو ادیب و شاعر یہاں پیدا ہوئے یا اس سے مدتوں وابستہ رہے، انکی خدمات ادب کم اور غیر اہم نہیں ہیں علاوہ ازیں کئی اردو اخبار و رسالے بھی یہاں سے نکلے، زیر نظر کتاب کے پانچ ابواب میں گورکھپور کی ادبی سرگرمیوں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے پہلے اس کا تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے، پھر فارسی نظم و نثر میں گورکھپور کی مختصر خدمات دکھائی گئی ہیں تیسرے اور چوتھے باب میں بالترتیب گورکھپور کی اردو شاعری اور نثر نگاری کا حال اور ان شاعروں اور ادیبوں کا مختصر تذکرہ ہے جو ۱۹۲۵ء میں یا اس سے قبل پیدا ہوئے اور جو شاعر و ادیب اسکے بعد پیدا ہوئے انکا صرف نام گنایا ہے، آخری باب گورکھپور کی اردو صحافت کیلئے خاص ہے اس میں تقریباً تیس اردو اخبار اور رسالوں کے متعلق معلومات درج ہیں، جو وہاں سے وقتاً فوقتاً شائع ہوئے، یہ کتاب گورکھپور کی ادبی سرگرمیوں کا مختصر خاکہ بھی ہے، اور وہاں کے معروف و غیر معروف اصحاب شعر و ادب کا مختصر تذکرہ بھی، لائق مصنف نے شاعروں کے اشعار اور نثر نگاروں کی تحریریں بھی نمونۃً نقل کی ہیں تاکہ انکے ادبی درجہ و مرتبہ کا اندازہ کیا جاسکے، ڈاکٹر سلام

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی چند کتابوں کے جدید اڈیشن

نقوشِ سلیمانی

سید صاحب کے ہندوستانی، اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبۂ صدارت

ان کی دوسری تقریروں، تحریروں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ، جن کا انتخاب خود فاضل مصنف نے

اپنی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستان کی

نسبت سے ہندوستانی کا نام دیکر ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ ان کا یہ خواب

شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پاگئی، طبع دوم عکسی،

قیمت:- ۲۵ روپے،

خیّام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رُباعی گو شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہے، اور

اس کی رباعیات کا یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے، لیکن اس کے علاوہ وہ

اور بھی بہت کچھ تھا، وہ فلسفی تھا، منجم تھا، ریاضی داں تھا، ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا،

جس کی طرف شعر العجم میں خیام کے تذکرہ میں مولانا شبلیؒ نے بھی اشارہ کیا ہے، اس کتاب میں پہلی

مرتبہ اس کے سوانح و حالات کے ساتھ اس کی ان ہی حیثیات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی

ڈالی گئی ہے، آخر میں اس کے چند نایاب فارسی و عربی کے فلسفیانہ رسائل اور اس کی مستند رباعیات

بھی شامل کر دی گئی ہیں، طبع دوم عکسی، قیمت: ۲۵ روپے،

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد میں چند خطبے

دیے تھے یہ انہی کا مجموعہ ہے، طبع دوم عکسی، قیمت ۳۰ روپیہ

منیجر

بزمِ تیموریہ

بزمِ تیموریہ کا پہلا ایڈیشن تمام عظیم مغل سلاطین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق، علم دوستی اور علم پروری، اور ان سب کے درباروں کے اہلِ ذوق امراء، علماء، فضلاء اور شعراء کے تذکرے اور ان کے علمی و ادبی و شعری کمالات اور ان کے نثر و نظم کے بہترین اقتباسات پر مشتمل تھا، اس کے دوسرے ایڈیشن میں اتنی اصلاح و ترمیم، تغیر و تبدل اور اس کثرت سے اضافے ہوئے، کہ اس کا حجم بہت بڑھ گیا، اس لئے قدردانوں اور مستفیدین کی سہولت کے لئے اس کو تین جلدوں میں کر دیا گیا، اس میں بعض نئے ماخذ کی مدد سے ان سلاطین، شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور علم پروری کی تفصیلات دلچسپ اور دلنشیں انداز میں درج کی گئی ہیں کہ بانی سلطنت تیموریہ شہنشاہ بابر سے لیکر آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تک کے عہد کے علم و ادب اور شعر و سخن کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، پہلی جلد میں پہلے تین مغل سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسری جلد جہانگیر و شاہجہاں اور ان کے دربار کے امراء کی علم دوستی اور ان کے دور کے شعراء، ادباء، فضلاء اور اربابِ کمال کے تذکرہ اور ان کے علمی کمالات پر مشتمل ہے، تیسری جلد صاحبِ رقعات اورنگزیب عالمگیر اور آخری دور کے مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر وغیرہ اور تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں مثلاً گلبدن بیگم، نورجہاں بیگم، جہاں آرا صاحبِ مونس الارواح اور زیب النساء بیگم وغیرہ اور ان کے متوسل اربابِ کمال کے حالات اور کارناموں پر مشتمل ہے، جلد اول قیمت ۲۰ روپے، دوم ۱۲ روپے، سوم ۱۳ روپے۔

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن (ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ)

جون ۱۹۶۳ء
معارف
مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ
مرتبہ
سید صباح الدین عبد الرحمن
قیمت بیس روپے سالانہ
دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

جلد ۱۳۱ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۳ء عدد ۶

مضامین

کاتب کی ضرورت

شذرات

قومی یک جہتی کے فروغ کے سلسلہ میں ہماری حکومت کی طرف سے اس کی بھی خواہش ظاہر کی گئی کہ ملک میں ہندو مسلمان کا پرسنل لا یکساں ہو،

عام مسلمانوں نے اس کو پسند نہیں کیا، ہمارے علماء بھی اس کی مخالفت میں متحرک ہوئے تو حکومت کو اعلان کرنا پڑا کہ مسلمانوں کی مرضی کے خلاف ان کے پرسنل لا میں مداخلت نہیں کی جائیگی، جب مسلمان بڑی حد تک مطمئن تھے تو ادھر پھر آواز بلند ہونے لگی ہے کہ ملک کا پرسنل لا ایک کر دیا جائے، اس کی حمایت میں کچھ ایسے مسلمانوں کے نام بھی لیے جا رہے ہیں جو عام طور سے جمہور مسلمانوں کی رائے کے خلاف حکومت یا یہاں کی اکثریت کی ہمنوائی کیا کرتے ہیں حکومت کی حکمت عملی اور زیرکی اس میں بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مطلب کے کچھ افراد کو عہدوں اور دوسرے الطاف و اکرام سے نواز کر کے اس طرح تیار کرے کہ وہ اس کے ہمنوا ہو کر اس کی مطلب برآری میں مدد دیتے رہیں، حکومت کی حکمرانی کا تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں جو اس کے ہم خیال نہ ہوں پھوٹ، اختلاف اور نفاق پیدا کرتی رہے تاکہ وہ خود کامیابی کی شاہراہ پر گامزن رہے،

حکومت کو اپنی مطلب برآری کے لئے ایسے حربے کو استعمال کرنے کا پورا حق ہے مگر جو ایسے حربے کی زد میں آرہے ہیں ان کو بھی یہ حق ہے کہ وہ اپنی قوت مدافعت کو برقرار رکھ کر آسانی سے سپر انداز نہ ہو جائیں ہماری حکومت کو یہ تلخ تجربہ بھی ہوتا رہا ہے کہ محض چند افراد کو سر آنکھوں پر بٹھا کر ان کے ہم مذہبوں کو رام کرنا ضروری نہیں یہ چند افراد اپنی ظاہری حب الوطنی کا ثبوت دیکر ذاتی فائدے تو ضرور اٹھاتے رہے مگر ہوا وہی جو ان کے ہم مذہبوں کے سواد اعظم نے چاہا، مسلمانوں کے پرسنل لا کے سلسلہ میں حکومت کے ہوا خواہ اور نمک خوار اپنی نام نہاد روشن خیالی، تجدد پسندی اور بظاہر جذباتی ہم آہنگی کا طبل بجا کر ایک مشترکہ پرسنل لا کی وکالت چاہے جتنی بھی کریں مسلمانوں کی رائے عامہ کو نظرانداز کرنا حکومت کے لئے بالکل مناسب نہیں اگر یہ اپنی طاقت یا خوش فہمی میں لیا کر بیٹھی تو یہ آگ سے کھیلنا ہوگا،

مسلمانوں کے پرسنل لا کے جن احکام کی صراحت قرآن اور سنت میں موجود ہے، ان میں تو ہمارے علماء بھی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے، بعض دنیا دار، جاہ طلب، اور ضمیر فروش مسلمان حکومت کی خوشنودی کی خاطر ایسا کرنا چاہیں تو ان کی جگہ حکومت کے ایوان میں بن سکتی ہو، عام مسلمانوں کے دلوں کے نہاں خانوں میں وہ کوئی جگہ نہیں پا سکتے، اسلامی ممالک کے کسی دانشور یا مدبر کی ذاتی رائے بھی اس سلسلہ میں قابل اعتنا نہیں، البتہ پرسنل لا کے ان فقہی احکام میں جس کی صریح سند قرآن اور حدیث میں نہیں ہے، اور وہ فقہا اور ائمہ کے قیاس اور اجتہاد پر مبنی ہیں، ان میں ضرورت زمانہ اور وقتی مصالح کے مطابق ترمیم کی گنجائش ہے، اس ترمیم کا حق علماء، فقہاء اور مجتہدین ہی اپنے اجتماعی فیصلے کے ذریعہ سے استعمال کر سکتے ہیں، اسلامی حکومت بھی ان کے اس حق کو سلب نہیں کر سکتی، وہ انہی کے فیصلے کی پابند ہو کر کوئی قانون بنا سکتی ہے، مثلاً حالات کے تقاضے اور ضرورت کی بنا پر علماء و فقہاء تعدد ازدواج کو مناسب نہیں سمجھتے، تو اسلامی حکومت اس کو روک سکتی ہو، مگر کسی حال میں علماء اور نہ اسلامی حکومت اس کو مستقل طور پر ممنوع قرار دے سکتی ہے، اسی طرح علماء و فقہاء معاشرہ کی خاص خاص برائیوں کے انسداد کے لئے تعدد ازدواج کو زیادہ سے زیادہ رواج دینا ضروری سمجھتے ہوں، تو اسلامی حکومت اس کے لئے ان کی معاون ہو سکتی ہے،

مگر ہندوستان میں ہماری حکومت کو یہ حق حاصل نہیں، یہ بڑی روادار، اعلیٰ قسم کی سیکولر، اور مسلمانوں کی خیر خواہ کیوں نہ ہو کسی لحاظ سے اسلامی حکومت نہیں، اس کی رواداری، فراخ دلی، اور ملک کی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان مسائل میں مداخلت کر کے ان کے جذبات کو مجروح نہ کرے،

۱۹۴۷ء سے اب تک کل چھبیس[۲۶] برس گذرے ہیں، اس تھوڑی سی مدت میں مسلمانوں کو شعوری، یا غیر شعوری، جا یا بیجا، طریقہ پر کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ کہیں ان کا ملی اور مذہبی وجود ختم نہ ہو جائے حالانکہ

مسلمانوں نے یہاں صدیوں حکومت کی، ہندوؤں کو یہ خطرہ کبھی نہیں ہوا کہ ان کا وجود ختم ہو جائیگا،
اس حقیقت کا اعتراف یہاں کے غیر جانب دار مورخوں نے بھی کیا ہے، کے۔ ایم پنیکر نے اپنی کتاب "اے
سروے آف انڈیا" میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے زمانہ میں ہندوؤں کی سوسائٹی جوں کی توں رہی، یہ
اس لئے کہ مسلمانوں نے ان کے پرسنل لا، اور مذہبی مراسم و عقائد میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی، رام پرشاد
کھوسلا نے اپنی کتاب کنگ شپ اینڈ نوبیلیٹی ان مڈ ردی مو غلز میں تو یہاں تک رقمطراز ہیں کہ عدل و
انصاف میں اہتمام اور مذہبی رواداری کی پالیسی کی وجہ سے مغلوں کی حکومت میں عوام ہمیشہ مطمئن رہے
اسلامی ریاستوں میں سیاست اور مذہب کا گہرا لگاؤ رہا ہے لیکن مغلوں کی مذہبی رواداری کی وجہ
سے کوئی سیاسی خطرہ نہیں ہونے پایا، اور کسی زمانہ میں یہ کوشش نہیں کی گئی کہ حکمراں قوم کا مذہب محکوموں
کا بھی مذہب بنایا جائے، حتی کہ اورنگزیب نے بھی ملازمت کے لئے اسلام کی شرط نہیں رکھی تھیں،
مغلوں کے عہد میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ لوگوں کے ضمیر کے خلاف کوئی قانون بنایا گیا"
سی۔ اف۔ اینڈ ریو گاندھی جی کے قدر دانوں اور دوستوں میں تھے، انھوں نے منشی ذکاء اللہ
پر ایک کتاب لکھی ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ جب کبھی میں دلی کے قدیم باشندوں کے پاس گیا انھوں نے کسی
پس و پیش کے بغیر یہ بات بیان کی کہ آخری مغل بادشاہوں کا برتاؤ ان کے ساتھ بہت اچھا تھا ان سے کبھی کوئی شکایت
پیدا نہیں ہوئی، یہ ساری باتیں صدیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھیں، دوسرے امور میں مغل شاہنشاہوں کے
خلاف بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن وہ بجا طور پر اس نیک نامی کے مستحق ہیں کہ مذہبی تعصب ان پر غالب نہیں تھا
اس بنا پر وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنی ہندو رعایا کے ساتھ مہربانی کا سلوک اور غیر جانبدارانہ انصاف کریں انھوں
نے شاہی دربار کے امراء پر بھی اچھی طرح ذہن نشین کر دیا تھا کہ وہ ہندوؤں کے احساسات و جذبات کا خیال انہی کی طرح کریں،
موجودہ حکومت اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کرے گی اس کی نیک نامی کا معیار چند مفاد پرست
افراد کے بیانات یا صحافت نگاروں کی کالم نویسی یا سرکاری ذرائع ابلاغ کے پروپیگنڈہ پر قائم نہیں کیا جاسکتا ہے آئندہ
کے غیر جانبدار مورخین کے قلم کے ذریعہ کوئی سند ہی بندی ہو گی آج کی وقتی انصاف پسندی اور فراخدلی کے فیصلہ کا حق انہی کو ہو گا،

مقالات

اسلام اور مستشرقین

از: پروفیسر سید حبیب الحق ندوی، ڈربن یونیورسٹی، جنوبی افریقہ،

(۲)

انیسویں صدی عیسوی کے مستشرقین اور ان کے اسکالرشپ کی نیرنگیاں

انیسویں صدی کی جھولی میں جو میراث آئی وہ بھی اسلام دشمنی کی میراث تھی، سابقہ رویہ میں مطلق تبدیلی نہیں آئی سنہ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۰ء تک تقریباً نصف صدی میں متعدد کتب اسلام اور محمدؐ پر شائع ہوئیں، ان میں سب سے اہم اور قابل ذکر ڈیوڈ پرائس کی تالیف Chronological Retrospect of Mahommedan تھی، جو ۱۸۱۱ء سے ۱۸۲۱ء تک شائع ہوئی۔ مولف نے اپنی تاریخ میں آنحضرت کے عہد سے لیکر ہند کے مغل شہنشاہ اکبر تک کے تاریخی وقائع درج کئے ہیں، دوسری اہم قابل ذکر تالیف ایڈورڈ اپہام Edward Upham کی ہے، موصوف نے ترکی کی تاریخ History of Ottomon Empire لکھی جو ۱۸۲۹ء میں شائع ہوئی، مولف نے آنحضرتؐ کو حسب معمول نبی کاذب کے لقب سے یاد کیا۔

یہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ صلیب کے بعد سے نثری ادب کے دوش بدوش نظم نے بھی اسلام دشمنی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، چیش رو شعراء کا ذکر مختصراً گذر چکا ہے، یہاں پر انیسویں صدی کے

شہرہ آفاق جرمن شاعر گیٹے کا ذکر لازمی ہے۔ گیٹے (۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۲ء) نے اٹھارہویں
صدی کے نصف آخر، اور انیسویں صدی کے نصف اول پر گہرے اثرات چھوڑے۔ شاعر نے
بظاہر دراسات اسلامیہ اور شرق اوسط سے بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا، مگر درحقیقت اسلام کے
خلاف اپنے پیش روقائدین کے نقش قدم سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹا بلکہ آگے نکل گیا۔ ۱۷۷۳ء
میں اس نے آنحضرتؐ پر ایک نظم ترانہ محمد Mahomet is Gesang لکھی آنحضرتؐ کو ایک
چشمہ سے تعبیر کیا، اور وحدۃ الوجود کا درس بتاتے ہوئے احترام کے چند کلمات استعمال کئے۔ گیٹے کے
اسی بیان پر کارلائل کو اس قدر حیرت ہوئی کہ اس نے اس پر نقد کرتے ہوئے لکھا کہ اگر واقعتاً گیٹے کا
تبصرہ صحیح ہے تو ہم سارے عیسائی دراصل مسلمان ہیں، گیٹے نے ۱۷۷۰ء سے ۱۷۷۲ء تک اپنی
نامکمل نظم لکھی، شاعر نے ثابت کیا کہ محمدؐ ابتداء میں مخلص تھے، بعد میں وہ مادیت اور بوالہوسی
کے شکار ہو گئے۔ اور ان کا روحانی حصہ ضائع ہو گیا، یہ وہی کلاسیکی مضمون ہے جو آج تک
مستشرقین کی اسکالرشپ کا طرۂ امتیاز ہے، شاعر نے یہ بھی ثابت کیا کہ محمدؐ کی شخصیت مبہم اور
غیر واضح تھی، ایکٹ اوّل میں اس نے آنحضرتؐ کو چاند تاروں کا پوجاری ثابت کیا ہے بعد میں
ایک خدا کی عبادت کی طرف مائل ہوتے ہوئے دکھایا ہے، ایکٹ دوم کا مرکزی موضوع
اسلام کی اشاعت اور پیروان اسلام کی کثرت ہے، ایکٹ سوم میں شاعر بتاتا ہے کہ محمدؐ نے
فتح مکہ کے بعد کس طرح اپنی گرفت کو مستحکم کیا اور مذہب اسلام کو پھیلایا، آنحضرتؐ نے اسی مقصد
کے لیے قوت اور عیاری دونوں کو استعمال کیا، ایکٹ پنجم میں شاعر آنحضرتؐ کو مادیت سے
مغلوب ہو کر ایک سلطنت کی داغ بیل ڈالتے ہوئے دکھاتا ہے، ان نظریات سے گیٹے کے
عقائد ونفسیات جھلک کر سامنے آجاتے ہیں، یورپ کی فضا ہمیشہ مکدر رہی، دو ایک مستشرقین
نے اگر انصاف کا مطالبہ کیا تو وہ ملعون ومعتوب ہوئے۔ انیسویں صدی کی ممتاز شخصیات میں

کارلائل کا نام محتاج تعارف نہیں ہے، درحقیقت پوری صدی اس کی ذات میں ڈوب گئی،
۱۷۹۵ء سے ۱۸۸۱ء تک کارلائل کا نام نامی زندہ رہا، انیسویں صدی کے نصف اول
تک فضا مسموم رہی۔ مگر نصف ثانی میں پھر اسلام اور محمدؐ کی جانب رواداری اور انصاف
پسندی کے مطالبے شروع ہوئے، اس تحریک کے قائدین میں کارلائل کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ
مطالبہ بربنائے اخلاص نہیں تھا، بلکہ یورپ کی بدلتی ہوئی فضا تھی، سیاسی تبدیلیاں تھیں
اور شبانہ روز جدت پسند اور سائنسی ترقیات کے چیلنج کی کشمکش تھی، تعصب اور تقشف کے
خلاف عام ہر یورپ میں بڑھتی جا رہی تھی، اسی فضا (Liberal climate) نے
بعض مستشرقین کو اسلام کے خلاف سابقہ موقف پر نظرثانی کے لیے مجبور کیا۔ تبدیلی کا یہ پہلا ہوا تھا
کی سب سے طاقتور رومانی تحریک (Romantic Movement) کے سر ہے، جس نے یورپ کے
تمام فرسودہ نظام حیات۔ کلاسیکی عقائد، تقشف اور تعصب کو ایسا چیلنج کیا کہ سارا یورپ
ہل گیا، سیاست ہو یا ثقافت ادب و کلچر ہو یا دین و مذہب ہر میدان پر اسکا زوردار
اثر پڑا، یہ تحریک دراصل کلاسیکی نظریات کے خلاف ایک بغاوت تھی، اس سے ٹکرانا مشکل تھا،
کارلائل ان ہی تحریکات سے متاثر ہوا، اس تحریک کا عظیم کارنامہ یہ تھا کہ نوجیز نسل
کے اندر اپنے پیش رو متقدمین کو چیلنج کرنے کی جراءت مندانہ ہمت پیدا کر دی، تمام رسم
و رواج کا قلع قمع ہو گیا، نقلی اور بناوٹی زندگی کے بجائے اصلی اور فطری زندگی گذارنے کی دعوت
دی گئی، اس نے مشرق کے حقیقی مطالعہ اور افہام و تفہیم کا دروازہ بھی کھول دیا۔ اسی کا
اثر تھا کہ کارلائل نے اپنے دیگر موضوعات کے ساتھ، اسلام کو بھی موضوع بحث بنا لیا۔ یہ امر
واضح رہے کہ انیسویں صدی تک مستشرقین کلیۃً اسلامی اسکالر نہیں تھے، جیسا کہ آج ہیں، بلکہ
ہر فن مولیٰ تھے، اسلام کا مطالعہ اسی کا ایک حصہ تھا۔

کارلائل اسلامی رویہ میں ہرگز مخلص نہیں تھا، اس نے اسلام اور محمدؐ کو موضوع بحث محض اس لئے بنایا کہ اب اسلام قبول کرنے کا خطرہ ٹل گیا تھا، اس لئے واضح الفاظ میں لکھا کہ محمدؐ پر اس لیے بحث اس سے نہیں کی ہے کہ وہ ممتاز نبی تھے، بلکہ محض اس لئے کہ اب ارتداد کا مطلق خطرہ نہیں تھا، اب کوئی عیسائی اسلام قبول کرنے کو تیار نہ تھا، اب ہم آزادی کے ساتھ اسلام کے بارے میں لکھ سکتے ہیں، اور محمدؐ کے بارے میں چند اچھے کلمات بھی استعمال کر سکتے ہیں یعنی اسلام اور محمدؐ کی مخالفت اس لئے کی جارہی تھی کہ اسلام کی عالمی قبولیت کو چیلنج کیا جائے ملاحظہ ہو" The Hero as Prophet نیویارک ۱۹۵۲ء ص ۱۱) ....

..... اس مقدمہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ایک بیدار مغز ناقد کارلائل کی ... کے تحسینی کلمات کو جو اس نے اسلام یا محمدؐ کے بارے میں لکھا پڑھتا ہے تو اس کے قلب پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

کارلائل کی تعریفیں ملاحظہ ہوں۔ وہ رقمطراز ہے کہ اسلام اور محمدؐ کے خلاف افترا اور کذب کا جو پلندہ یورپ میں جمع کیا گیا ہے وہ ہم عیسائیوں کے لیے باعث شرم ہے، یہ باتیں کہ محمدؐ کاذب تھے، یا مذہب اسلام مجموعہ خرافات ہے، اس روشن دور میں قابل قبول نہیں، محمدؐ کی تعلیم ۱۸۰ ملین انسانوں کی زندگی کا مشعل ہے، بارہ صدیوں سے انسانی ارواح اسلام کی گرفت میں ہیں، کیا یہ سب کذب اور جھوٹ ہے؟ یہ نظریات خرافات کا مجموعہ ہیں، (ص ۱۲)، اس نے بطور خلاصہ لکھا کہ محمدؐ نے عرب کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لا کھڑا کیا، کارلائل پر سیل کے ترجمۂ قرآن کے واضح اثرات موجود ہیں، اس کے خیالات اور تحریر بھی اسکے چھاپ ہیں، بلکہ یہی ترجمہ اس کے لکچرز کی اساس ہے، ان خوبصورت تعریفی کلمات کے باوجود کارلائل نے آنحضرتؐ کی شخصیت کو ایک نبی برحق کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس نے آپ کو

تاریخ کی عظیم شخصیت، ایک بڑا ہیرو اور قائد Great Human Person کی حیثیت سے ابھارنے کی سعی کی، مگر پھر اسی کارلائل کے دیگر کلمات کو پڑھکر قاری ششدر رہ جاتا ہے جب وہ آنحضرتؐ کو جنگلی اور بادیہ نشین Son of the wilderness غیر مہذب حیوانی اور وحشیانہ آغوش فطرت کا پروردہ Uncultured semi-barbarous son of nature قرار دیتا ہے، یہ بیانات تاریخی حقائق کے خلاف ہیں، آنحضرتؐ قریش مکہ میں تھے جو مصر تہذیب، دولت دتجارت کی قیادت کر رہے تھے، نہ تو وہ بادیہ نشین تھے نہ ہی صحرائی جانور تھے، کارلائل کی نیت جو بھی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کی تحریریں مذیادل دور کے تعصب اور خرافات سے پہلی بار بغاوت تھی، یہ تبدیلی رواداری اور انصاف پسندی کی جانب ایک نیا قدم ضرور تھا، مگر کارلائل کی ان تحریرات کو دیگر مستشرقین نے بے حد ناپسند کیا، اور کارلائل کی تالیفات پر رومانی تعبیرات کا ٹھپہ لگا دیا، قدیم روش سے سرتابی کو معصیت تصور کیا!

انیسویں صدی کے وسط تک آنحضرتؐ کی سوانح کے عربی مصادر مثلاً ابن ہشام کی سیرت واقدی اور ابن سعد اور طبری کی تالیفات یورپ میں عام طور پر رائج نہیں ہوئی تھیں، یہ سب مسودات اور مخطوطات کی صورت میں پڑے ہوئے تھے لیکن رینکے نے جب تاریخی تنقید کی تحریک چلائی اور مصادر کی سراغرسانی کا زور ہوا تو تاریخ فہمی میں نیا انقلاب برپا ہوا، عربی مصادر کے مطالعہ پر زور دیا گیا، جرمنی کے مستشرقین نے مسلم شرق اوسط، برعظم ہند وپاک کے دورے شروع کئے، کتب خانوں کی تاریکیوں میں پڑے محتاج توجہ مسودات ومخطوطات کو روشنی میں لایا، کریمر (Alfred van Kremer) نے دمشق سے واقدی کی کتاب المغازی کا نسخہ برآمد کیا، ہندوستان سے تین قیمتی مخطوطات برآمد ہوئے، اسپرنگر اور دیگر مستشرقین نے دہلی سے آنحضرتؐ کی سوانح پر تین قیمتی مخطوطات حاصل کئے ۱۸۵۰ء

کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں سے بھی مخطوطات برآمد ہونے شروع ہوئے۔
ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے قدیم نسخے ہندوستان سے بھی برآمد ہوئے۔ اور آخر انیسویں صدی تک یہ مخطوطات یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی منتقل ہونے لگے، اور اس طرح مستشرقین یورپ کی رسائی اصل مصادر تک عام ہو گئی۔ ان ہی بنیادوں پر نئی کتب کا ظہور ہونے لگا۔

گسٹاو ویل Gustaw WeiI نے آنحضرتؐ کی زندگی اور تعلیمات پر ایک کتاب

Mohammad der Prophet sein Leben und seine Lebre

لکھی، مولف کے پاس ابن ہشام کا قدیم نسخہ موجود تھا، اس کے مطالعہ اور تحلیل وتفرید میں اس نے تاریخی تنقید کے نئے اصول اور قواعد وضوابط اختیار کئے۔ اور آنحضرتؐ کے ساتھ انصاف پسندی کا رویہ اختیار کیا، مگر قدیم مکتب فکر سے آزاد نہ ہو سکا۔ اس کا موقف قدیم اور فرسودہ خیالات کے مدار سے ہٹ نہیں سکا۔ اس کے خیال میں چونکہ محمدؐ نے قدیم اور جدید بائبل کا خوبصورت درس توحید اس قوم میں واپس لائے جو ایمان کھو چکی تھی۔ اس لئے محمدؐ کو غیر مسلم بھی خدا کا پیامبر تسلیم کر سکتے ہیں، بالفاظ دیگر اسلام کو عیسائی الاصل اور یہودی الاصل ثابت کیا۔ بہرحال ان تحریرات نے رواداری کی فضاء کو تقویت بخشی، اور دیگر مستشرقین پر بھی اسکا اثر پڑا۔

فرانسیسی مستشرق کاسن دی پرسی ول Goussin de Perceval نے ۱۸۴۷ء میں تاریخ عرب Essai Sur Li Histoire Arabes لکھی اور اپنے رویہ میں نرمی کا مظاہرہ کیا، ولیم میور اپنی زہر افشانیوں کے لیے معروف ہے، مگر وہ نئی تحریکات سے متاثر ہو کر کم از کم اپنے آپ کو روشن خیال ثابت کرنے کا دعویٰ ضرور کرنے لگا، فرانسیسی مستشرق نے بڑی ہمت سے کام لے کر لکھا کہ محمدؐ کو محض کاذب کہنا ناانصافی ہے وہ اخلاص کے ساتھ

اپنی قوم کو جہالت سے نکالکر روشنی کی طرف لائے

تاریخی مصادر کی نصی تنقیدات اور تنقید تاریخ کے نئے اصول و ضوابط نے مزید نت نئے مسائل اٹھ کھڑے کئے، سب سے پہلا مسئلہ آنحضرتؐ کی سیرت کے اصلی مصادر کی ثقاہت کے متعلق اٹھایا گیا، مستشرقین تحقیقات کے بعد پھر اپنے اصلی موقف پر پہنچ گئے یعنی اسلام اور محمدؐ کی دعوت یہودی اور عیسائی روایات کی مسخ شدہ صورت ہے، اس میں کوئی نیا پن نہ تھا یہ تو وہی قرون وسطیٰ زمانہ کی بازگشت تھی، البتہ اس پورے موضوع کا ایک نیا علمی نام وضع کیا گیا جسے ہم اسلام کی اصلیت کے نام سے جانتے ہیں، اور جو آج مغربی جامعات کا محبوب موضوع درس و تدریس ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا۔

۱۸۳۳ء میں ابراہام گیگر Abraham Geiger نے ایک مقالہ زیر عنوان محمدؐ کے یہودی مصادر و مآخذ What did Muhammad take from Judaism پیش کیا اور بہت سے نئے نظریات کی داغ بیل ڈال دی، اب ایک نئی تحریک چل پڑی کہ یہودیت و نصرانیت اور اسلام کے درمیان قریبی ربط و ضبط ثابت کیا جائے، تاکہ محمدؐ کے یہودی و عیسائی مآخذ کو حتمی طور پر ثابت کر دیا جائے۔ یہاں پر اس کتاب کا ذکر کر دینا قاری کی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جو ۱۹۲۷ء میں نیویارک سے زیر عنوان "اسلام کی یہودی بنیاد" The Jewish Foundation of Islam شائع ہوئی، اور اس کے مولف ییل یونیورسٹی Yale University میں سامی زبانوں کے پروفیسر چارلز کٹلر توری Charles Cutler Torrey ہیں اس پر مقدمہ معروف مستشرق روزنتھال Franz Rosenthal کا ہے جس نے ابن خلدون کا ترجمہ کیا ہے، اور اسلامی تاریخ نویسی پر مبسوط کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کتاب پر مبسوط نقد راقم الحروف کی کتاب پیغمبر اسلام اور مستشرقین میں ملاحظہ ہو۔

اسلام کی اصلیت اب مستشرقین کا محبوب موضوع بن گیا ہے اور تین معروف مستشرقین ولیم میور اسپرنگر اور نالدیکے، اس تحریک کے سرخیل بن گئے، اسپرنگر نے آنحضرتؐ کے مطالعہ کا ایک نیا اسکول قائم کیا جسے بائیلوجی یا علم الامراض یا اسباب امراض کا اسکول کہا جا سکتا ہے۔
یہ واضح رہے کہ میور کی طرح اسپرنگر بھی برطانوی سول سروس کا ملازم تھا، اس نے اسلام اور آنحضرتؐ پر متعدد کتب لکھیں ان میں حسب ذیل تین تالیفات قابل ذکر ہیں۔

۱۔ حیات محمدؐ اصل مصادر کی روشنی میں الٰہ آباد ۱۸۴۸ء۔ 1. Life of

Muhammad from Original Sources, Allahabad 1848

۲۔ حیات اور تعلیم محمدؐ (۳ جلدیں، مطبوعہ برلن از ۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۵ء۔

2. Das Leben and Lehre des Muhammes (Berlin 1861. 1865 3 vols)

۳۔ محمدؐ اور قرآن ایک نفسیاتی مطالعہ۔ (ہیمبرگ ۱۸۸۹ء)

3. Mohammad under Koran: Eine Psychologische Studies (Hamburg 1889)

[illegible] نے، جنہیں اسلام کی اصلیت کے اثبات پر پوری قوت صرف کی گئی تھی، نقد و نظر کا ایک نیا طوفان برپا کر دیا، اسپرنگر چونکہ خود ڈاکٹر تھا، اس لیے اس نے چودہ سو سالوں کے بعد بھی اسلام اور محمدؐ کا طبی معائنہ کرنا ضروری سمجھا، طبی معائنہ کی رپورٹ میں اس نے ثابت کیا کہ آنحضرتؐ اعصابی مریض، یا مصروع (Epileptic) تھے،
طبی معائنہ نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ آنحضرتؐ کا نروس سسٹم چونکہ خراب تھا، اس لیے ہذیان اور بدحواسی کے دورہ میں انھوں نے قرآن کی تصنیف گڑھ لی، نیز اسلام نامی مذہب کو

گڑھ لیا۔ اب اسلام ہذیان الاصل قرار پایا، محمدؐ پر چونکہ ہذیان یا اختلاس (Hallu-
cination) اور اعصابی اضطراب جو محض ہنسنے اور رونے کا سبب بنتا ہے Hysteric
Frenzy کے دورے پڑتے تھے، اس لیے اسلام وجود میں آگیا۔

اسلام کی اصلیت کی یہ بالکل نئی اور اچھوتی تعبیر سامنے آئی اب آنحضرتؐ کی سیرت وسوانح کو طبی نقطۂ نظر سے Pathological Approach دیکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی، اور اسے مستقل ایک اسکول کی حیثیت دیدی گئی۔ فرائڈ اور دیگر علمائے نفسیات کے دور میں یہ اسکول جنسی آسیب کی زد میں آگیا، جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

سر ولیم میور برطانوی سول سروس کا ملازم اور اسکوٹش اصلیت کا متقشف کیتھولک عیسائی تھا، اس نے چار جلد دن مین حیات محمد لکھی، جو لندن سے ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۱ء کے درمیان شائع ہوئی، یہ بات ذہن مین رکھنے کی ہے کہ برطانیہ اسلام کے ازلی دشمنوں میں رہا ہے صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں رچارڈ کی شکست کا غم ہنوز باقی ہے، اس کا انتقام برطانیہ نے تاسیس اسرائیل کے بعد لے لیا ہے، مگر نفرت کی آگ سلگ رہی ہے، ولیم میور کی حیات محمد (Life of Muhammad) دراصل دریدہ دہنی اور ازمنۂ وسطی کے خرافات کا مجموعہ ہے۔ خالص ایک نقطۂ نظر سے یہ کتاب لکھی گئی ہے، مگر انگریزی خوان عوام کیلئے مستند مصدر رہے، ولیم میور نے آنحضرتؐ کو نبی کاذب کا خطاب دیکر یورپ کے ان مستشرقین کے خلاف سخت برہمی کا مظاہرہ کیا، جو اسلام اور محمدؐ کے ساتھ رواداری کا مطالبہ کر رہے تھے، اور اعلان کر دیا کہ اہل یورپ اپنے روایتی موقف میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے۔ ولیم میور کی شدت نفرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اسلام اور محمدؐ اور قرآن کریم کو تہذیب، آزادی اور حق کا بدترین دشمن قرار دیا، ایسا دشمن جو آج تک

انسانی تاریخ میں پیدا نہیں ہوا، اس کا عقیدہ تھا کہ محمدؐ (العیاذ باللہ) شیطان کے آلۂ کار تھے۔ ولیم میور یہ تمنا اور آرزو لیکر دنیا سے رخصت ہو گیا کہ ایک دن اہل اسلام توبہ کریں گے اور عیسائیت قبول کر کے جہل و ضلالت سے نجات حاصل کریں گے۔

تاریخی تنقید کا مکتب فکر جو نالدیکے نے قائم کیا تھا، اس کے اثرات ختم نہیں ہوئے، نالدیکے اسپرنگر اور ولیم میور سے زیادہ دریدہ دہن ثابت ہوا، اس نے تاریخ قرآن (Geschichte des Qorans) لکھی جو برلن سے ۱۸۶۰ء میں طبع ہوئی۔ آج تک یعنی سو سالوں سے مستشرقین کی رہنمائی کے لیے یہ تاریخ مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے اس نے اپنے پیش رو کے طبی معائنہ سے مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ محمدؐ ہذیان کے مریض نہیں تھے، بلکہ وہ انتہائی اور جذباتی دورے (Fits of emotion) کے مریض تھے، اسی دورے کے زیر اثر انکو اس بات کا یقین آگیا کہ اپر وحی نازل ہوتی ہے، اسی میں انھوں نے قرآن کی تالیف کر ڈالی ساتھ ہی اسلام نامی مذہب کی داغ بیل ڈال دی، یہ تمام تالیفات ان کے مرکزی خیالات اور عمودی مضامین از منۂ وسطی یا لاطینی خرافات سے کسی طرح مختلف نہ تھے۔

بیسویں صدی عیسوی کے مستشرقین اور اسلام کا تحلیلی اور سائنسی مطالعہ

انیسویں صدی کے اواخر سے مستشرقین، نقد اسلام کے نئے مکاتب فکر کی تاسیس میں لگے ہوئے تھے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا قاری کا مذاق بدلتا گیا اسیاسی اور معاشی احوال میں تغیر آتا گیا، مستشرقین کی اسکالرشپ چولے بدلتی گئی پرانی شراب نئے جام میں ڈھالی جانے لگی۔

جیسے جیسے یورپ کی فضا بدلی مستشرقین کی اسکالرشپ بھی بدلی، ایک زمانہ تھا جب آنحضرتؐ کی مذہبی حیثیت کو ختم کرنے کی امکانی سعی کی گئی، جنس و جنگ کے تمامات لگائے گئے۔ اسلام کو بزور شمشیر پھیلانے یا یہودیت و مسیحیت کی بگڑی ہوئی شکل قرار دینے کا چرچا تھا، وغیرہ وغیرہ

جب یورپ پر نفسیات کا بھوت سوار ہوا تو اسلام اور محمدؐ کے مطالعہ میں نفسیاتی اور طبی قوانین نافذ کیے گئے، اور سعی کی گئی کہ نفسیاتی امکانیات اور جوہر دتوانائی (Psycho dynamics) کی روشنی میں آنحضرتؐ اور اسلام کا معائنہ کیا جائے، چنانچہ محمدؐ کے مطالعہ میں علم الامراض کے اصول نافذ کیے گئے، آسٹریا کا معروف عالم نفسیات فرائڈ (Freud) متوفی ۱۹۳۹ء حیات انسانی پر جنس کا آسیب بنکر سوار ہو گیا اور آخر انیسویں صدی آنحضرتؐ کی سیرت وسوانح کے مصادر پر نقد اور جرح و تعدیل کا سلسلہ شروع ہوا، اب نقد کا سارا زور قرآن کریم، احادیث نبویہ اور سیرۃ نبی کی تحلیل و تعزیر پر تھا، قرآن کریم کو غیر مرتب اور مبہم توہمات کا مجموعہ قرار دیا گیا، غیر مہذب اور غیر متواز ہونے کی وجہ سے غیر تدیجی سمجھا گیا، یعنی قرآن، اسلام اور محمدؐ کی تحریکات کی واضح صورت پیش کرنے سے قاصر ہے، قرآن پر سنگین حملوں کے بعد نزلہ احادیث نبویہ پر اترا، چونکہ احادیث قرآن کے بعد مصدر ثانی کی حیثیت رکھتی تھیں لہذا انکو منہدم کرنا مستشرقین کا اولین فریضہ تھا، اب احادیث کے کذب و افتراء کے افسانے گھڑے گئے، یوں تو نالدیکے نقد حدیث کے اسکول کا سرخیل تھا لیکن انکار حدیث کے اسکول کی داغ بیل گولڈ زیہر (Innac Goldziher) نے ڈالی اور اپنی تالیف دراسات محمدیہ (Muhammedanisch Studien) میں اپنے نظریہ کی اساس ڈالی اس نے اس سوال کے ذریعہ کہ کیا سیرت نگاری کے لیے احادیث پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟ سب سے عظیم فتنہ کھڑا کیا، بیسویں صدی میں مستشرقین کی اسکالرشپ زمانہ کے ساتھ دو حصوں میں بٹ گئی، ایک تو انکار حدیث کے مکتب فکر سے منسلک رہی اور دوسری نئی ابھرتی ہوئی اشتراکی یا کمیونسٹ تحریک کی گود میں پرورش پانے لگی، اول الذکر مکتب فکر نے غیر یقینی کردار کے احادیث کی فہرست مرتب کی اور ان احادیث کو خوب اچھالا جو مذہبی اور سیاسی فرقوں نے ذاتی مفادات کے پیش نظر گڑھی تھیں، یا جو خاص قبائل، افراد اور حکام

[ت]ائید میں تھے، گولڈ زیہر نے ان تمام احادیث کو مسترد کر دیا، انکار حدیث کے بعد گولڈ زیہر نے
[س]یرت کے مصادر پر جرح شروع کر دی، اور انکو بھی اس نے بیانیہ احادیث (Narrative
Ahadith) کے زمرہ میں ڈال دیا، اسلامی اسناد کے پورے سلسلہ کو چیلنج کرنے کے بعد اس نے
[ا]علان کر دیا کہ یہ مصادر ثقاہت کی ضمانت نہیں دے سکتے، یعنی ہم دین اسلام کی آخری
[...]رہی تھی، نامی مستشرق ہنری لامینس (Henri Lammens) نے مقالات کا ایک سلسلہ
[ش]روع کیا، اور یہ ثابت کرنے کی پیہم کوشش کی کہ ہجرت مدینہ سے قبل اسلامی روایات کا سارا
[ڈھ]انچہ جس پر آنحضرتؐ کی سوانح کھڑی کی گئی ہے، بے بنیاد اور غیر ثقہ ہے، اور محمدؐ کی مدنی زندگی
[کی] ساری روایات داستان و افسانہ سے زیادہ درجہ نہیں رکھتیں، اسلام اس کی نظر میں ایک
[تا]ریخی المیہ تھا، سب سے دلچسپ تحقیق مولف نے یہ پیش کی کہ آنحضرتؐ کثیر خوری کے مریض تھے، اور
[یہ]ی انکی موت کا سبب بھی بنا۔ کثیر خوری کی وجہ سے انپر لقوہ و مرگی کے دورے پڑے، ان ہی
[د]وروں میں وہ جاں بحق ہو گئے، ہنری ابتدا بیسویں صدی میں شام اور لبنان کا مشنری مبلغ
[تھ]ا، اسلام اور آنحضرتؐ کے خلاف شدت نفرت کے اظہار میں اس نے کوئی کمی نہیں کی، البتہ
[اس]ں پر ریسرچ، تحقیق اور اسکالرشپ کا غلاف ڈال دیا، اور اس کا نام سائنسی طرز تنقید رکھدیا،
[اس] نے آنحضرتؐ پر وحشیانہ حملے کئے، اور آپ کے اخلاص کو تسلیم کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔

یورپ میں اچانک معاشی تحریکات کا طوفان اٹھا، جس کے نتیجہ میں کمیونسٹ یا شوسلسٹ
[تح]ریک نے سر اٹھایا، اور یورپ کی پوری سیاست کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، چونکہ سامعین و قارئین
[او]ر زمانہ کا مزاج بدل گیا تھا، اسلام اور آنحضرتؐ پر نقد و نظر کا اسلوب بھی بدل گیا، کارلائل کا
[ن]ظریہ یعنی دنیا کی تاریخ عظیم انسانوں کی سوانح حیات کا نام ہے، بدل گیا، اس کی جگہ
[کار]ل مارکس کے نظریہ نے لے لی، جس میں انسان معاشیات کا خلیہ ہے، یعنی تاریخ معاشی عوا[مل]

سماجی حرکات کا نام ہے، چونکہ یورپ کا سارا تنقیدی نظام کمیونسٹ کے پنجۂ استبداد میں آگیا تھا، اس لئے اسلامی اسکالرشپ اور مستشرقین دونوں اس کی گرفت میں جکڑ گئے۔

جرمنی کے یہودی اور عیسائی مستشرقین دراسات، سلامیہ میں پیش پیش رہے، ہیوبرٹ گریمی (Huber Grimme) نامی جرمن مستشرق نے جو عربی کا اسکالر تھا، اسلام اور آنحضرتؐ پر دو کتابیں لکھیں جو ۱۸۹۲ء تا ۱۸۹۵ء تک طبع ہوئیں اسی نے آنحضرتؐ کی مذہبی حیثیت کو بالکل ہی ختم کر ڈالا، اور پہلی بار واضح انداز میں مطالبہ کیا کہ ساتویں صدی عیسوی کے عربیہ کا جہان اسلام ظاہر ہوا، سماجی، معاشی اور سیاسی مطالعہ اسلام اور محمدؐ کو کما حقہ سمجھنے کے لئے لازمی ہے، اشتراکی تحریک کے ظہور سے پہلے ہی اس نے اس مکتب فکر کی بنیاد ڈال دی، اور اعلان کر دیا کہ اسلام کا ظہور عروج محض ایک سوشلزم (Socialistic phenomenon) کا ایسا مظہر تھا، جس پر معاشی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا، یعنی اسلام پوری تاریخ مکہ کی طبقاتی جنگ کے اندر پوشیدہ ہے، ایک طرف سرمایہ اور محنت کی کشمکش تھی مالدار تجار کا ظالمانہ رویہ، ملکی معیشت اور بنک پر اس کا تسلط، قبائلی قائدین کا جابرانہ سلوک تھا، دوسری طرف محنت کشوں، مزدوروں اور حرفت پیشہ لوگوں کی روز افزوں عدم قناعت و نامرادی، مایوسی تھی، انہی دونوں کے تصادم کا عکس یا مظہر اسلام ہے، یعنی اسلام امراء کے خلاف غرباء کی بغاوت تھی، اس طرح اسلام ایک دینی و مذہبی تحریک نہیں بلکہ ایک سوشل سسٹم تھا، اور محمدؐ نبی کے بجائے ایک سماجی مصلح تھے۔

معاشی، سماجی تحریک میں مارگولیوتھ ۱۸۵۸ء تا ۱۹۴۰ء نے سیاسی مصالحہ لگا کر ایک نیا مثلث تیار کیا، مارکسی تحریکات کے ساتھ ساتھ جمہوریت اور آزادی کی تحریک بھی یورپ میں چل رہی تھی، لہذا اس نے اس میں سیاسی اچار کا اضافہ بھی کر دیا، یعنی محمدؐ کی

دینی و مذہبی شخصیت کو ختم کر کے اس نے آپ کو محض ایک سیاسی مبصر اور قائد کی حیثیت دیدی،
مارگولیوتھ کے خیال میں محمدؐ نے نبوت کا دعوی محض اس لیے کیا کہ وہ عرب پر بآسانی حکومت
کر سکیں، اسی لیے وہ ایک عظیم سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ نیشنل ہیرو بن گئے اور
ایک مملکت کے بانی مبانی بھی اس کی تالیف محمدؐ اور عروج اسلام ان ہی خیالات کا مجموعہ
ہے، مقدمہ میں وہ رقمطراز ہے کہ دین محمدؐ کی عظیم شخصیت کو تسلیم کرتا ہوں، باہم متصادم
قبائل عربیہ کو ایک متحدہ ریاست میں منتقل کر دینا تھا، مشکلات کا حل، ۲۳ سالہ کی
جدوجہد کے بعد ایک سلطنت کا قائم کرنا، پھر تخت و تاج کا مالک بن جانا، اور ایسی
وسیع سلطنت کی داغ بیل ڈالنا جس کی لپیٹ میں سارا عالم آجائے، وغیرہ وغیرہ صفات
غیر معمولی صلاحیت کی متقاضی تھیں، انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں مارگیولتھ
کا مقالہ بھی انہی خطوط کا عکس ہے، مگر مولف کی دریدہ دہنی حسب معمول قائم رہی۔
اپنے تحسینی کلمات کو اس نے کافور بنا دیا، جب آنحضرتؐ کو قزاق اور ڈاکو قرار دیا، مولف
نے لکھا کہ مدینہ میں آنحضرتؐ کا کردار محض لیٹرے قزاق کا تھا، مدینہ کی معیشت کا مدار ہی
تجارتی قافلوں کے لوٹ مار پر تھا۔ مال غنیمت کی تقسیم میں بھی ناانصافی عام تھی، مولف
آنحضرتؐ کی صداقت واخلاص دونوں کا منکر ہے، وہ آپ کو محض ایک قانون دان جج یا
ڈپلومیٹ سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہیں ہے۔

(اٹلی کا معروف مستشرق نیلون کیتانی ۱۸۶۷ء سے ۱۹۳۴ء Prince Leone
Caetani) بھی اسی مکتب فکر سے منسلک تھا، اس نے بھی آنحضرتؐ کی دینی شخصیت کو
ختم کرنے کی سعی کی اور عربیہ کے سیاسی، سماجی اور معاشی احوال کے مطالعہ پر زور دیا جس کا
منظر اسلام تھا، اس نے اپنی تالیف اسلام Annali dell Islamo میں ۲۲ء

کے بعد سے واقعات کو تاریخ وار درج کیا ہے، اور اسلام کی ابتدائی تاریخ سے بحث کی[۱۳]
اپنی تالیف دراسات شرقیہ (Studi Distoria Orrentale) کی تیسری جلد
میں اس نے آنحضرتؐ کو محض ایک سیاسی قائد (Stateman) کی حیثیت دی ہے، اور
ظہور اسلام کو عرب کے سیاسی معاشی اور سماجی اضطراب کا مظہر ثابت کیا ہے اس کے خیال
میں آنحضرتؐ محض معاشی بدحالی کی بنا پر ہجرت پر مجبور ہوئے اور تحریک ہجرت کے قائد
بن گئے، بطور خلاصہ مولف آنحضرتؐ کو عظیم موقع پرست سے زیادہ درجہ دینے کو تیار نہیں،
اس لیے اس امر کا خاص اہتمام کیا ہے کہ محمدؐ کی دینی شخصیت کسی طرح ابھرنے نہ پائے، بلکہ اس سے
ہر ممکن صرف نظر کیا جائے۔

نکار مصادر اسلامیہ اور اشتراکی تنقید کے پہلو بہلو ایک نئی تحریک نے جنم لیا، یعنی
مذہبیات یا دینیات کے مطالعہ میں علم النفس کے اصول کا استعمال اور مذہبی شخصیات کا خالص
نفسیاتی مطالعہ، اس کے مطابق حضرت عیسٰیؑ محض[۱۴] ایک انسانی ڈھانچہ بنکر رہ گئے، دینی شخصیت
کی کشش جاتی رہی، دینی تحریکات کے عوامل و محرکات کا امتحان نفسیاتی اصول کے مطابق
لیا جانے لگا، دراسات اسلامیہ میں جب علم النفس (سائکالوجی) اور اس کے اصول و مبادی کو
نافذ کیا گیا تو اسلام کی سیاسی و معاشی تعبیرات بھی کمزور پڑنے لگیں، چونکہ اسکالر اور قاری
دونوں کے منہ کا مزہ پھیکا پڑنے لگا اس لئے کسی نئے اچار یا مصالحہ کی ضرورت پڑی اور وہ مصالحہ
علم النفس کا مصالحہ تھا، اسی نظریہ کو پورے اہتمام کے ساتھ آگے بڑھایا گیا، اور ظہور اسلام
کے نفسیاتی عوامل و محرکات کے مطالعہ پر زور دیا گیا، اس تحریک کے سرخیل دین فرانز بھل
(Dane Frantz Buhl) اور طور انیڈرے (Tor Andrae) تھے، ان دونوں نے
مذہب اور علم النفس یا مذہبی نفسیات (Religious Psychology) کی تازہ ترین

تعلیمات کو اسلام اور محمدؐ کے مطالعہ پر منطبق کر دیا، آنحضرتؐ کی نفسیاتی تکوینیات (Psycho mechanism) کا گہرا مطالعہ کیا گیا، بیل نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں متعدد مقالات لکھے۔

آنحضرتؐ کے اعصابی نظام (نروس سسٹم) کے گہرے مطالعہ کے بعد بیل اس نتیجہ پر پہنچا کہ غیر معمولی اعصابی (Abnormal Nervous System) سسٹم کی وجہ سے محمدؐ اپنے آپ کو دھوکہ دینے یا مغالطہ میں پڑ جانے کے عادی ہو گئے تھے، اسی دھوکہ کا نتیجہ تھا کہ محمدؐ نے یقین کر لیا کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، محمدؐ ایک نہایت مشکوک اور مبہم (Ambiguous) کردار کے فرد تھے، جس کا سمجھنا مشکل ہے، وہ epileptic نہیں بلکہ hysterical تھے، وہ حقیقی مفکر تو ہرگز نہیں تھے۔

تور اینڈرے نے اسلام اور محمدؐ پر متعدد کتب لکھیں، اور سیرت و سوانح محمدؐ کے مطالعہ میں اس نے اپنے گہرے علم النفس کے تجارب کا استعمال کیا، بلکہ آنحضرت کی شخصیت کی نفسیاتی تحلیل و تعریف میں اس نے تحلیلی نفسیات کی تکنیک Technique of Analytical Psychology استعمال کی، مولف کی نظر میں آنحضرتؐ کی عظمت کی صرف ایک دلیل ہے، وہ یہ کہ انھوں نے قدیم ادیان اور سابقہ مذاہب یعنی یہود و نصاریٰ کے مذاہب کا خلاصہ یا معجون مرکب (Synthesis) پیش کیا، چونکہ عرب کا سماجی اور معاشی نظام فرسودہ ہو چکا تھا، اس لئے روایت سے بغاوت ایک فطری ردعمل تھا، محمدؐ نے اس سے فائدہ اٹھایا، مولف اس بات پر مصر ہے کہ آنحضرتؐ اپنے اس عقیدہ میں بالکل راسخ تھے، کہ واقعی ان پر وحی نازل ہوتی ہے، عروج اسلام کا راز مولف کی رائے میں، محمدؐ کی ذہنی قوت اور صلاحیت میں مضمر تھا، مولف موصوف اسی نتیجہ پر پہنچے جو ان کے پیشرو اروں کا محبوب موقف تھا، یعنی محمدؐ نے اسلام کی بنیاد عیسائیوں کے زیر اثر ڈالی، بیسویں صدی کے متقدمین میں یہی لوگ اساطین مستشرقین تصور کئے جاتے ہیں، ان کی پوری فہرست میں دو ایک ہی اسکالر ایسے ہیں جنھوں نے خواہ مصلحتاً ہی صحیح اسلام یا محمدؐ کا دفاع

کیا ہو یا نرم الفاظ استعمال کئے ہوں، ان میں چند اسماء مثلاً کارلائل اور بوسورتھ اسمتھ قابلِ ذکر ہیں، آخر الذکر نے اپنی کتاب محمدؐ اور محمدؐ ازم میں آنحضرتؐ کے خلاف یورپ کے وحشیانہ حملوں کی مذمت کرتے ہوئے آپؐ کو ایک عظیم فرد تسلیم کیا ہے، الفونسی (Alphonse Etienne Dinet) نے ۱۹۲۰ء میں پیرس سے اپنی کتاب اللہ کے نبی محمدؐ کی حیات (The Life of Muhammad: The Prophet of Allah) شائع کی اور رواداری کا ثبوت دیا، لاتینی خرافاتی مصادر کے بجائے ابن ہشام کی سیرت رسول اللہ اور ابن سعد کی طبقات وغیرہ کا مطالعہ کیا، اسی طرح جے سی، آرچر (J. C. Archer) نے اسپرنگر کے اسباب الامراض (Pathological School) کی مذمت کی اور کم از کم آپؐ کو ایک صوفی (Mystic) کی حیثیت سے تسلیم کیا، غرض مدافعت میں اسی قسم کی دو چار مثالیں مشکل سے ملتی ہیں، مگر ان میں سے کسی نے آنحضرتؐ کو دل سے نبیؐ تسلیم نہیں کیا۔

جوں جوں ہم بیسویں صدی کے اختتام یا آخری ربع کی طرف بڑھتے ہیں مستشرقین کے رویہ میں نرمی کے بجائے شدت محسوس کرتے جاتے ہیں، بالشتی مستشرقین کا ذکر ممکن نہیں، البتہ ممتاز اساطین مستشرقین کا طائرانہ جائزہ یورپ کے اسی ذہن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے جو اسلام کے خلاف ۱۴ صدیوں سے برسرپیکار ہے، اور لن ترضی عنك الیھود ولا النصاری کی نوع بہ نوع اور گوناگوں تفسیر کے مواد فراہم کرتا جارہا ہے۔

ارنلڈ جے ٹوائن بی (۱۸۸۹-۱۹۷۵ء) (Arnold J. Toynbee) کا نام علمی حلقوں کے لیے محتاج تعارف نہیں، یہی معروف مورخ نے دنیا کے ۲۰ سے زیادہ مذاہب اور کلچر کا مطالعہ کرکے۔۔۔ چالیس سالہ دیدہ ریز محنت کے بعد مطالعہ تاریخ (Study of History) کی بارہ جلدیں تحریر کیں جن میں تین ملین حروف استعمال کئے گئے ہیں مولف کے

خیال میں تہذیب نزی خاتمہ کے مرحلہ پہنچ چکی ہے، اب صرف وقت کا انتظار ہے، شاید
تیسری عالمی جنگ وقت محدود ہو، اشتراکی نقطۂ نظر کی شدت کے ساتھ مخالفت کرتے ہوئے،
مولف رقمطراز ہے کہ انسان صرف معاش یا سماج کا خلیہ نہیں، اس کی روحانی زندگی بھی ہے، اخلاقی
اقدار بھی ہیں، جس کے بغیر انسان اور کیڑے میں فرق نہیں، اشتراکی مکتب فکر میں انسان محض
سماج کا خلیہ (Cell) بنکر رہ جاتا ہے، اور اخلاقی اقدار کو روحانیات نہیں معاشیات
متعین کرتی ہیں، مولف نے ثابت کیا کہ اخلاقی اقدار کا خاتمہ
خدا کے ساتھ رابطہ کے اختتام کے مترادف ہے، مورخ موصوف نے اپنا نظریہ چیلنج اور
رسپانس (Challenge and Response) پیش کیا، یعنی جس درجہ کا چیلنج ہو اسی درجہ کا
رسپانس ہونا چاہئے، اس تناسب کی برہمی ہی زوال امت کا سبب بنا ہے۔
یورپ میں تاریخ کا جدلیاتی نظریہ پیش کیا گیا، یعنی ارتقا اور نمو کے لئے باہمی کشمکش
ضروری ہے، اس نظریہ نے توافق للبقاء کے بجائے تنازع للبقاء کی روح پھونک ڈالی اور
رقابت و حسد اور بین الاقوامی جنگوں کی بنیاد ڈال دی، بے رحمی اور سنگ دلی کا جذبہ پیدا کیا
جس کی زندہ مثالیں دو عالمی جنگیں ہیں، ٹوائن بی نے دراسات اسلامیہ اور محمدؐ کے مطالعہ
میں فلسفیانہ اصول و قواعد کو کام میں لایا، مولف کے تجزیہ کے مطابق آنحضرتؐ کا رول مکہ میں
روحانی رہا، مگر مدینہ میں انھوں نے روح کے ساتھ مادہ کی ایسی آمیزش کی کہ خود سکولر حاکم
Secular Ruler بن بیٹھے، اور ریاست اور مذہب کو مدغم کردیا، مورخ نے آنحضرتؐ
کی سیاسی شخصیت کو ابھارنے کی سعی کی ہے، جو اس کی نظر میں اعلیٰ درجہ (First Rate)
کی تھی، حکمت کے بارے میں مولف نے مڈیول دور کے نظریہ دغاباز یا ڈھونگی اور کذاب و مکار
(Impostor) کا انکار کیا ہے، مگر بطور تخمین جو باتیں آنحضرتؐ کے بارے میں مولف مذکور نے

بیٹی کی اس سے اپنے تمام تحسینی کلمات پر پانی پھیر دیا، مولف رقمطراز ہے کہ محمد کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ وہ ملک عرب کے پیغمبر بن گئے" (جلد سوم آکسفورڈ ۱۹۳۹ء-۴۴۹) کہاں مکار پیغمبر اور کہاں پیغمبر اسلام؟ دونوں میں کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ یہ اس عظیم ذہن کی تخلیق ہے، جس نے عالمی مذاہب وثقافت کا مطالعہ کیا، اور جس کی شخصیت میں بیسویں صدی کے دو ربع حصے ڈوب گئے، اور جو عالمی حوالجات کا مصدر بن گیا۔

دوسرا عظیم نامی گرامی مستشرق بلاشیر اس نے ایک نیا فتنہ کھڑا کیا، یعنی آنحضرت کی سوانح پر بحث کرنے کے بجائے، مصادر سیرت پر بحث شروع کی اور اعلان کر دیا کہ ان مصادر کو اسوقت تک استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے، جب تک جدید تنقید کے تکنیکی اصول ان پر منطبق نہ کر لئے جائیں یہ سازش واضح طور پر اس بات کی دعوت تھی کہ مصادر اسلامیہ جدید تنقیدی اصولوں پر نہ پورا اتریں گے نہ انکی ثقاہت ثابت ہو سکے گی، یہ وہی پرانی شراب نئے جام میں ڈھالی گئی۔

نصف آخر بیسویں صدی کی اہم خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہمہ وقت وہمہ دم (Full time) اسلامی اسکالر وجود میں آگئے یعنی ان مستشرقین نے دراسات اسلامیہ ہی کو اپنا پیشہ career بنا لیا، اس لئے کہ مغربی جامعات، انسٹی ٹیوٹ اور مراکز بحث وتحقیق میں اسلام کے مختلف سیاسی معاشی دینی وثقافتی پہلوؤں پر تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع ہوا، اور بڑے بڑے مطابع اور اشاعتی ادارے (Publishers) ہر چھ ماہ کے وقفہ پر مستشرقین کے دروازوں پر دستک دینے لگے کہ آیا اسلام کے متعلق (یعنی اسلام کے خلاف) کوئی تازہ ترین تالیف برائے اشاعت تیار ہے۔؟

(یہ بات راقم الحروف سے ایک عالمی شہرت کے نامی گرامی مستشرق نے امریکہ میں بتائی اور یہ بھی بتایا کہ وہ اس روش سے نالاں ہیں، آخر ہر چھ ماہ پر کوئی مولف کیسے کتاب لکھ سکتا ہے")

یعنی تجارتی اور کمرشیل مفادات نے بھی، اسلام کے خلاف لٹریچر کی اشاعت میں بڑا حصہ لیا، عالمی مواصلات بڑھتے گئے، دنیا سمٹتی گئی، اور سارا عالم جام جمشید کی طرح کوزہ میں بند ہو گیا، دوسری عالمی جنگ کے بعد عالم اسلام استعمار کے پنجہ استبداد سے آزاد ہوا، آزادی کی نئی لہر پھیلی ایک طرف اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لئے مفکرین اسلام مثلاً سید قطب، مولانا مودودی، اور مولانا سید ابوالحسن ندوی وغیرہ کے قلم کے تیر برسنے لگے، دوسری طرف مستشرقین کو اپنی بساط کے الٹ جانے کا اندیشہ ہونے لگا۔

مغربی جامعات میں یہودیت و نصاریٰ کا بڑا گروہ جو درحقیقت مشنری اسکولوں کا پروردہ اور تربیت یافتہ تھا، قلم لیکر اسکالرشپ کے میدان میں کود پڑا، فرداً فرداً سب کا ذکر محال ہے۔ البتہ ممتاز نمائندوں کا سرسری جائزہ نفسیات غرب اور استشراق کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہو تاکہ ان سرخیوں کی تفسیر مزید واضح ہو سکے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر کا عظیم ترین مستشرق سر ملٹن گب ......

کو سمجھا جاتا ہے، جنکا نام مسلمان اور مستشرقین دونوں بڑے احترام کے ساتھ لیتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ ان کی لیاقت، وسعت نظر مطالعہ اور طرز نگارش میں کوئی دوسرا سبقت نہیں لے جا سکا، موصوف امریکی جامعہ میں راقم الحروف کے شعبہ کے صدر الصدور بھی تھے، وصال سے پہلے آکسفورڈ میں سنہ ۱۹۷۱ء کی آخری ملاقات میں راقم سطور نے کافی وقت مرحوم کے ساتھ صرف کیا، علالت کے باوجود جس محبت اور جوش و خروش کے ساتھ وہ پیش آئے، لائق صد تحسین و ستائش ہے، خاصکر بیگم قدسیہ کے ساتھ حسن سلوک کا نادر نمونہ پیش کیا اس مرض کی حالت میں اپنے علمی کارناموں تحریری نسخوں اور خاصکر عربی خوشخطی کے جو نمونے دکھائے اور دوسری عالمی جنگ کے دوران لکھے ہوئے عربی مقالات و مضامین کا جو مجموعہ دکھایا وہ

لائق حیرت ضرور تھا، ان تمام اخلاقی محاسن کا ہر فرد معترف ہوگا خواہ وہ کسی بھی مذہب اور مسلک کا ہو، مگر اسلام کے بارے میں ایک ایسے روشن خیال عالم اور مستشرق نے کیا کیا تھا اس کا جواب نفی میں ہی دیا جا سکتا ہے، صرف دو ایک مثالیں کافی ہیں، موصوف کی کتاب محمڈنزم (۱۹۶۲ء) خود بدذاقی کا عظیم ثبوت ہے، اگرچہ اب اس کا نام اسلام رکھدیا گیا ہے، مگر مولف کے مضامین اظہر من الشمس ہیں، اپنی معروف تالیف اسلام میں جدید رجحانات ۱۹۴۷ء modern trends in Islam میں اسلام کے بارے میں بے حد دلسوز باتیں تحریر کی ہیں، چھٹے باب میں اسلام اور اس کے عالمی اثرات سے بحث کرتے ہوئے موصوف رقمطراز ہیں کہ اسلام درحقیقت محمدؐ کے جذباتی مغلوبیت کا ایک ہیجانی دین (Emotional Cult) تھا، جدید رجحانات کے اثرات سے بحث کرتے ہوئے مولف نے لکھا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ

جدید معقول دینیات Rational Theology اب محمدؐ کے ہیجانی دین (Emotional cult) پر غالب آگئی ہے یعنی جدت قدامت پر اور بغاوت روایت پر غالب آگئی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ عالم اسلام میں مسلم حکمرانوں اور روشن خیال مغربی تعلیم یافتہ افسران کے ہاتھوں جو اسلام کشی کی تحریک ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محمدؐ کا جذباتی مذہب اب عقلیت سے تبدیل ہوتا جا رہا ہے، مولف یورپ کی بدقسمتی پر نوحہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یورپ کی روحانی تحریک اسی جذباتی مذہب کے زیر اثر عربی ادبیات کے ذریعہ میڈیول دور میں یورپ پہنچی پھر اٹھارویں صدی میں الف لیلہ وغیرہ کے ذریعہ جذباتیت کا آسیب یورپ کے سر پر سوار ہوگیا، برّاعظم ہند و پاک کی اسلامی تحریکات اور تحریک تجدید سے بحث کرتے ہوئے مولف علی گڈھ اسکول اور سر سید کی تعریف کرتے ہیں، ساتھ ہی غلام احمد بانی قادیانیت اور قادیانی تحریک کی زوردار حمایت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ اسلام میں احمدیہ تحریک نے ہی

تحریک تجدید کو آگے بڑھایا، ایک نئے مذہب کو وجود میں لایا، اور رواداری کے ساتھ تحریک اصلاحات پر زور دیا، جو لوگ قدیم اسلام میں عقیدہ کھو چکے تھے، ان میں تازہ ایمان پیدا ہوا۔ علامہ محمد اقبال کسی بھی مسلم قاری کے لیے محتاج تعارف نہیں ہیں، نہ ہی کوئی تعلیم یافتہ علامہ کی اسلام دوستی یا فکر و نظر اور مغربی تہذیب پر نقد و جراحت سے ناواقف۔

پروفیسر گب علامہ اقبال کو مجموعۂ اضداد قرار دیتے ہوئے ان کی معروف تصنیف کو دھجی اڑاتے ہیں اور اقبال کو مجموعہ تضاد mass of Contradiction قرار دیتے ہیں، معروف فرانسیسی مستشرق رینان (Rennan) نے اسلام کو معقولیت یا عقلیت کا ناقابل علاج دشمن Incurable enemy of Islam بتایا تھا، پروفیسر گب نے اسلام کو تاریخی افسانہ یا جھوٹ Historical Romance سے تعبیر کیا جس میں معقولیت کا عنصر کم ہے اور تخیل کا عنصر زیادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ تخیل کی زندگی عقلیت کے مقابلہ میں مختصر ہوتی ہے، اسی لئے اسلام جلد زوال پذیر ہوا۔

(باقی)

مقالات سلیمان جلد دوم

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے دینی و علمی اور تحقیقی و تاریخی مضامین کی اب تک تین جلدیں شائع ہوئی ہیں، اس سلسلہ کی دوسری جلد نہایت اہم اور معرکۃ الآرا مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں حدیث و سنت پر مستشرقین یورپ کے اعتراضات کے نہایت عالمانہ اور مدلل جواب دئے گئے ہیں، اور حدیث و رجال حدیث کے بارہ میں ان کی ہرزہ سرائیوں اور اغلاط و مسامحات کی نشاندہی کی گئی ہے اور ان کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے،

قیمت :- ۱۷ سترہ روپیے ۔ منیجر

سعدی شیرازی کی ولادت کے سلسلے کی چند داخلی شہادتوں کا تجزیہ

از پروفیسر نذیر احمد، علی گڑھ

شیخ سعدی شیرازی باوجود اپنے فضل و کمال کے اس لحاظ سے بڑے بدقسمت تھے کہ انکے اجزاے زندگی کی بیشتر کڑیاں ہنوز غیر مربوط ہیں، اگرچہ خود ان کے کلام میں ایسے اشارے موجود ہیں، جن کی مدد سے ان کے حالات زندگی مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن بعض اشارے مبہم ہیں، چنانچہ ان سے غلط نتیجے پر پہنچنے کا بخوبی امکان ہے، اور تو اور خود ان کے نام کا مسئلہ مورد اختلاف آرا ہے[1]، انکی پیدائش کی تاریخ ایک مسئلہ ونیحل بن کر رہ گئی ہے، اس سلسلے میں سیکڑوں محققین نے کوششیں کیں لیکن ہنوز کسی خاص نتیجے پر پہنچنے میں کامیابی نہیں ہوسکی ہے۔ راقم الحروف کا یہ مقالہ سعدی کی ولادت کے سلسلے کے بعض داخلی اشارات پر تحقیقی نظر ڈالنے کی ایک کوشش ہے۔

شیخ کی ولادت کے تعلق سے داخلی شہادتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، اوّل وہ شہادتیں ہیں، جن سے سعدی کی پیدائش ساتویں صدی کے اوائل (یعنی پہلے دہے) میں قیاس کی جاسکتی ہے، دوسری وہ شہادتیں ہیں، جن سے ان کی ولادت کا زمانہ چھٹی صدی کے آخری ربع کے قریب فرض کیا جاتا ہے، پہلے سلسلے کی شہادتیں یہ ہیں۔

۱۔ گلستان و بوستان میں بعض اشارے ہیں، جن سے ان کتابوں کی تالیف کے وقت شیخ کی عمر پچاس سال کے قریب ہوگی۔

۲۔ سعدی کے کلام میں بعض ایسے سلاطین و امرا وغیرہ کی مدح ہے، جو وسط ساتویں صدی کے ہیں، چھٹی صدی کے امرا و صدور و سلاطین کی مدح سے ان کا کلام عاری ہے۔

---

[1] مختلف منابع میں سعدی کے یہ نام ملتے ہیں: مصلح الدین ابو عبد اللہ بن مشرف بن مصلح بن مشرف، مشرف الدین مصلح، مشرف الدین مصلح الدین بن مشرف، مشرف بن مصلح، مصلح الدین سعدی وغیرہ۔

۳۔ اتابک تکلا بن زنگی (۵۷۱ھ تا ۵۹۴ھ) کا شمار شاہان پیشینہ میں کیا گیا ہے۔

۴۔ شیخ جمال الدین ابوالفرج بن الجوزی کی نصیحت و تربیت جس کا ذکر گلستان کی ایک حکایت میں ہے۔

دوسرے سلسلے کی شہادتیں یہ ہیں۔

۱۔ خوارزمشاہ اور خان ختائی صلح کے موقع پر سعدی کی جامع کاشغر میں موجودگی۔

۲۔ اغلمش فرماں روائے بلاد جبال (یعنی رے، ہمدان، اصفہان مع ان کے مضافات کے) عہد حکومت میں سعدی کی ہمدان یا اصفہان میں موجودگی۔

ان داخلی شہادتوں کے علاوہ کچھ شہادتیں ایسی ہیں، جن پر ان کی تاریخ ولادت کا کوئی اثر نہیں پڑتا، مثلاً ان کی ملاقات شیخ شہاب الدین ابو حفص سہروردی صاحب عوارف المعارف (م۔ ۶۳۲ھ) سے بوستان کی ایک حکایت کے اشعار[1] ملاحظہ ہوں۔

مقامات مردان بمردی شنو	نه از سعدی از سهروردی شنو
مرا شیخ دانای مرشد شهاب	دو اندرز فرمود بر روی آب
یکی آنکه در جمع بدبین مباش	دوم آنکه در نفس خودبین مباش
شنیدم که بگریستی شیخ زار	چو برخواندی آیاتِ اصحاب ناز
شبی دانم از هولِ دوزخ نخفت	بگوشم آمد صبحگاهی که گفت
چه بودی که دوزخ ز من پر شدی	مگر دیگران را رهائی بدی
کسی گوی دولت ز میدان ربود	که در بند آسایش خلق بود

شیخ شہاب الدین سہروردی کی وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی، واضحاً اس تاریخ سے

---

[1] کلیات سعدی ص ۲۰۳۔

کافی پہلے سعدی شیخ کی صحبت میں رہ چکے تھے، لیکن اشعار کا تقاضا ہے کہ سعدی اس موقع پر بالکل نوجوان نہ ہوں گے، بلکہ اگر عمر رسیدہ بھی ہوں تو بھی اس کی تکذیب ان اشعار سے نہیں ہو سکتی، بہر حال یہ واقعہ ایک جوان کی طرف منسوب ہو سکتا ہے، اور ایک عمر رسیدہ کی طرف بھی، اس سے سعدی کی عمر کا قیاس درست نہ ہوگا۔

دوسری دو اور شہادتوں کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ گلستان کی ایک حکایت سے بعض جگہ استدلال کیا گیا ہے کہ سعدی شیخ عبد القادر جیلانی سے مکہ میں مل چکے تھے، شیخ کی وفات ۵۶۱ھ میں ہوئی، اس بنا پر سعدی کی ان سے ملاقات مستبعد نظر آتی ہے، در اصل اس قیاس کی بنیاد گلستان کی غلط قرأت پر ہے "عبد القادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ را دیدم" درست نہیں ہے۔ دیدند درست ہے، اس سے اس واقعہ کا انتساب سعدی سے نہیں ہو سکتا۔

و بوستاں کے مطبوعہ نسخوں میں ایک اور واقعہ اس طرح درج ہوا ہے۔

اگر گوش دار د خداوند ہوش	سخنہای پیر عقل خوش آید بگوش
سفر کرده بودم ز بیت الحرام	در ایام ناصر بدار السلام
شبی رفتہ بودم بکنجی فراز	بچشم در آمد سیاہی دراز
در آغوش او دختری چون قمر	فرو برده دنداں بلبہاش در
مرا امر معروف دامن گرفت	فضول آتشی گشت و در من گرفت
طلب کردم از پیش و پس چوب و سنگ	بران ناخدا ترس بی نام و ننگ
ز لاحولم آن دیو ہیکل بجست	پری پیکر اندر من آویخت دست
کای زرق سجاده و دلق پوش	سیہ کار دنیا خر دین فروش

۱؎ کلیات ص ۱۱۰ ۲؎ کلیات ص ۳۸۰، ۳۸۸

مرا سالها دل ز کف رفته بود — بر این شخص وجان بروی آشفته بود

کنون پخته شد لقمۂ خام من — که گردش برون کردی از کام من

تظلم بر آورد و فریاد خواند — که شفقت بر افتاد و رحمت نماند

نماند از جوانان کسی دستگیر — که بستاندم داد ازین مرد پیر

که شرمش نیاید ز پیری همی — زند دست در ستر نامحرمی

پہلے دو اشعار سے واضح ہے کہ اس حکایت کا تعلق سعدی سے ہے، اور وہ خلیفہ ناصر باللہ متوفی سنہ ۶۲۲ھ کے دور میں بیت الحرام سے دار السلام یعنی بغداد گئے تھے، اور اس وقت وہ خاصے سن رسیدہ پیر ہو چکے تھے، اگر ان کی عمر اس وقت ۵۰ سال کی بھی فرض کی جائے تو ان کی پیدائش سنہ ۶۰۵ھ سے کافی قبل قرار پاتی ہے، لیکن ان دونوں اشعار کی صورت بعض نسخوں میں مختلف ہے، مثلاً کلیات سعدی کے پیرس کے نسخے میں (کتب خانہ ملی (Supp. Per 1778) جو سنہ ۷۶۶ھ کا مکتوبہ ہے) یہ اشعار اس طرح منقول ہیں،

چنین گفت پیری پسندیده هوش — سخنهای پیران خوش آید بگوش

سفر کرده بودم ز بیت الحرام — در ایام ناصر بدار السلام

شبی رفته بودم بکنجی فراز — بچشمم در آمد سیاهی دراز

مسلم یونیورسٹی کے ایک نسخہ میں جس کی کتابت سنہ ۱۰۱۲ھ کی ہے صرف دو اشعار اس طرح پر ہیں،

چنین گفت پیری پسندیده هوش — خوش آید سخنهای پیران بگوش

که در مصر رفتم بکنجی فراز — چه دیدم در آنجا سیاهی دراز

کلیات سعدی، مطبوعہ تہران سنہ ۱۳۲۶ھ میں بھی دو ہی شعر ہیں،

چنین گفت پیری پسندیده هوش — خوش آید سخنهای پیران بگوش

که در هند رفتم بکنجی فراز — چه دیدم چو یلدا سیاهی دراز

گویا آخری دونوں نسخوں میں پیرس کے نسخے کی دوسری اور تیسری بیت کو ملا کر

ایک ہی بیت کر لیا گیا ہے، تہران والے نسخے میں ہندوستان جانے کا ذکر ہے، جب کہ علی گڑھ کے قلمی نسخے میں مصر جانے کا گو ناصر خلیفہ کا نام نہیں آیا، بہر حال ان تینوں نسخوں سے اس بات کا تعین ہو جاتا ہے، کہ اس حکایت کا تعلق سعدی کی ذات سے نہیں ہے، اس بنا پر اس سے ان کی تاریخ پیدائش کا استدلال نہیں ہو سکتا۔

اب میں ان شہادتوں کا ذکر کروں گا جن سے سعدی کی ولادت اوائل قرن ہفتم قرار پائیگی،

گلستان کے دیباچے میں ہے۔

یک شب تأمل ایام گذشتہ می کردم و بر عمر تلف کردہ تأسف می خوردم و سنگ سراچۂ دل بہ الماس آب دیدہ می سفتم و این بیتہا مناسب حال خود میگفتم:

ہر دم از عمر می رود نفسی	چونکہ میگرم نماند بسی
ای کہ پنجاہ رفت و در خوابی	مگر این پنج روز دریابی

اگرچہ عباس اقبال آشتیانی ان اشعار کو بعینہٖ سعدی کی زندگی سے مربوط نہیں مانتے، مگر ذبیح اللہ صفا کا خیال ہے کہ چونکہ خود سعدی نے ان اشعار کو مناسب حال کہا ہے اس لئے ان سے ان کی ولادت کا قیاس کیا جا سکتا ہے، اس اعتبار سے انکی پیدائش ۶۰۶ھ کے قریب ہوگی، اس لئے گلستان کی تاریخ تالیف ۶۵۶ھ ہے۔[1]

بوستان میں باب نہم اس طرح شروع ہوتا ہے۔

بیا ای کہ عمرت بہفتاد رفت	مگر خفتہ بودی کہ برباد رفت
ہمہ برگ بودن ہمی ساختی	بتدبیر رفتن نپرداختی
قیامت کہ بازار مینو نہند	منازل باعمال نیکو دہند

---

[1] کلیات ص ۳۰۴۔

بضاعت بچندانکہ آری بری وگر مفلسی شرم ساری بری
کہ بازار چندانکہ آگندہ تر تہیدست را دل پراگندہ تر
نہ پنجہ درم پنج اگر کم شود دلت ریش سرپنجۂ غم شود
چو پنجاہ سالت برون شد ز دست غنیمت شمر پنج روزی کہ ہست
اگر مردہ مسکین زبان داشتی بفریاد و زاری فغان داشتی
کہ اے زندہ چون ہست امکان گفت لب از ذکر چون مردہ برہم مخفت
چو مارا بغفلت بشد روزگار تو باری دمی چند فرصت شمار

اگرچہ اکثر لوگوں نے۔۔۔۔۔ ان اشعار کو سعدی کی زندگی سے مربوط نہیں بتایا ہے لیکن اگر ابتدائی اشعار کو محض ناصحانہ سمجھا جائے، جن میں ایک ستر سالہ سن رسیدہ آدمی کو خطاب کیا گیا ہے، تو اس کا دوسرا جز جس میں پچاس سال بے توجہی و بے عملی میں گذر جانے پر عمر کا جو مختصر حصہ بچا ہے، اس میں عمل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، سعدی کی طرف منسوب ہو سکتا ہے، اس لئے کہ بوستان گلستان سے ایک ہی سال قبل یعنی ۶۵۵ھ میں نظم ہوئی اس وقت وہ اپنی عمر کے پچاسویں سال میں ہوں گے۔

ان امور کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رکھنے کی ہے کہ سعدی نے ان دونوں تصانیف میں کہیں بھی ان کی پیرانہ سالی کا ذکر نہیں کیا گلستان باب ششم ضعف و پیری پر ہے، مگر اس میں انھوں نے اپنی پیری کا ذکر نہیں کیا، اسکے برخلاف اسکی بعض حکایتوں میں انکی جوانی کا واقعہ درج ہے، مثلاً

وقتی بجہل جوانی بانگ بر مادر زدم الخ (کلیات ص ۱۰۶)

روزے بغرور جوانی سخت راندہ بودم۔ الخ (ص ۱۰۵)

جوانی چست و لطیف خندان و شیرین زبان در حلقۂ عشرت ما بود الخ (ص ۱۰۴)

خلاصہ یہ کہ گلستان یا بوستان کی تالیف کے وقت سعدی کی پیرانہ سالی ثابت نہیں۔

سعدی کے کلام میں کسی ایسے ممدوح کی مدح نہیں جو ساتویں صدی ہجری[1] کے قبل کا ہو۔ ان کے مخصوص ممدوحین میں شیراز کے فرماں روا تھے، ان میں اتابک ابوبکر بن سعد بن زنگی (م ۶۵۸)، اتابک سعد بن ابوبکر بن سعد (م ۶۵۸)، محمد بن سعد بن ابوبکر (۶۵۸ تا ۶۶۰)، سلجوق شاہ ابن سلغر (۶۶۱ - ۶۶۲)، آبش خاتون دختر سعد بن ابوبکر منکوحۂ منکوتیمور بن ہلاکو (۶۶۲-۶۶۳) قابل ذکر ہیں، اور تعجب یہ ہے کہ اتابک سعد[2] بن زنگی (۵۹۹ تا ۶۲۳) کی مدح سے سعدی کا کلام خالی ہے، البتہ بوستان[3] میں ایک دوسرے شخص کے حوالے سے اس کی وفات کے بعد کا ایک واقعہ درج کیا ہے، جو اس طرح ہے۔

---

[1] ذبیح اللہ صفا (تاریخ ادبیات ج ۳ ص ۵۹۰) لکھتے ہیں، درحالیکہ سعدی از رجال دورۂ آخر خود یاد کردہ و با آنہا ارتباط داشتہ کہ در اواسط قرن ہفتم می زیستہ اند و چنانکہ در متن گفتہ ایم در ہیچیک از آثار منظوم و منثور و ستایشی از سعد بن زنگی و اشارہ ای دیدہ نمی شود کہ حاکی از ارتباط او با آن اتابک در حال حیات وی باشد۔

اسی طرح عباس اقبال آشتیانی، مقدمۂ گلستان میں فرماتے ہیں۔

در سراسر کلیات سعدی نام و مدح ہیچیک از امرا و حکام و سلاطین فارس یا غیر فارس قبل از دورۂ اخیر سلطنت اتابک مظفر الدین ابوبکر بن سعد بن زنگی، (۶۲۳ - ۶۵۸) نیست در عوض تا بخواہی بر خلاف بعد از این تاریخ یعنی بعد از ۶۵۰ یعنی قریب دو سال پیش از وفات شیخ نام تمام اتابکان سلغری و اکثر امرا و حکام مغول در کلیات دیدہ می شود۔ [2] اتابک سعد، اتابک تکلہ بن زنگی کے بعد تخت نشین ہوا، اس کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے، شیراز نامہ میں ۶۲۸ھ ہے لیکن صحیح ۶۲۳ھ ہے اس لئے کہ خود شیراز نامہ میں اس کی مدت حکومت ۲۴ سال درج ہے جو ۶۲۳ھ میں پوری ہوتی ہے۔ امیر محمد قزوینی نے شد الازار کی تعلیقات و حواشی میں یہی تاریخ یعنی ۶۲۳ درج کی ہے لیکن صفا نے ۶۲۸ھ لکھی ہے۔ [3] کلیات سعدی مطبوعہ تہران ۱۳۲۶ ص ۱۳۰۳

ثنا گفت بر سعد زنگی کسی | که بر تربتش باد رحمت بسی
درم داد و تشریف و بنواختش | بمقدار خود منزلت ساختش
چو الله بس دید بر نقش زر | بشورید و برکند خلعت ز بر
ز سوزش چنان شعله در جان گرفت | که برجست و راه بیابان گرفت
یکی گفتش از هم نشینان دشت | چه دیدی که حالت دگرگونه گشت
تو اوّل زمین بوسه دادی بجائے | نبایستی آخر زدن پشت پای
بخندید کاوّل ز بیم و امید | همی لرزد ورتن فتادم چو بید
بآخر ز تمکین الله بس | نه چیزم بچشم اندر آمد نه کس

سلسلۂ اوّل کی شہادتوں میں ایک نہایت اہم شہادت یہ ہے کہ بوستان میں سعدی نے اتابک تکلہ کو شاہان پیشین میں شمار کیا ہے، اور اس کے متعلق جو قول نقل کیا ہے، اس کی بنیاد "اخبار پیشینہ"[1] ہے،

در اخبار شاہان پیشینہ ہست | کہ چون تکلہ بر تخت زنگی نشست
بدورانش از کس نیازرد کس | سبق برد اگر خود ہمین بود و بس
چنین گفت یک ره بصاحب دلی | کہ عمرم بسر رفت بی حاصلی
بخواہم بکنج عبادت نشست | کہ دریابم این پنج روزی کہ ہست
چو می بگذرد جاہ و ملک و سریر | نبرد از جہان دولت الا فقیر
چو بشنید دانای روشن نفس | بتندی برآشفت کی تکلہ بس
طریقت بجز خدمت خلق نیست | بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

[1] کلیات سعدی، مطبوعہ ۱۳۳۲، ص ۲۴۰

تو بر تختِ سلطانیِ خویش باش — بہ اخلاق پاکیزہ درویش باش

بصدق و ارادت میان بستہ دار — ز طاعت و دعویٰ زبان بستہ دار

قدم باید اندر طریقت نہ دم — کہ اصلی ندارد دمِ بی قدم

بزرگان کہ نقد صفا داشتند — چنیں خرقہ زیرِ قبا داشتند

اتابک تکلہ اپنے باپ اتابک زنگی کی وفات[1] پر ۵۷۱ھ میں تخت نشین ہوا، اور ۲۰ سال حکومت کرنے کے بعد ۵۹۱ھ میں فوت ہوا، غور طلب بات ہے کہ جو بادشاہ شیراز کے تخت پر ۵۷۱ھ تا ۵۹۱ھ متمکن رہا ہو، اس کا شمار شاہانِ پیشینہ میں ہو، اور اس کے احوال کے ماخذ اخبار شاہانِ پیشینہ ہوں، اس سے واضح ہے کہ سعدی نے اس کا زمانہ نہیں پایا تھا۔

شیخ سعدی نے گلستان کی ایک حکایت[2] میں شیخ اجل ابو الفرج بن جوزی کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

چندانکہ مرا شیخ اجل ابو الفرج بن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ ترک سماع فرمودی و بخلوت و عزلت اشارت کردی عنفوان شبابم غالب آمدی و ہوا و ہوس طالب ناچار بخلاف رائے مربی قدمی برفتمی، و از سماع و مجالست حظی برگرفتمی و چوں نصیحت شیخم یاد آمدی گفتمی۔

قاضی ار با ما نشیند بر فشاند دست را — محتسب گر می خورد معذور دارد مست را الخ

اس سے بعض محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شیخ ابو الفرج ابن جوزی سے مراد شیخ جمال الدین ابو الفرج عبد الرحمٰن بن الجوزی صاحب کتاب المنتظم و کتاب الاذکیا

---

[1] شیراز نامہ ص ۴۷، [2] کلیات سعدی، ص ۱۱۰

وتلبیس ابلیس وغیرہ ہیں، اور اس لحاظ سے سعدی کی پیدائش قرن ششم کے وسط میں ہوئی ہوگی لیکن بعض اہم محققین[1] کے نزدیک اس حکایت میں شیخ ابو الفرج بن الجوزی کے پوتے مراد ہیں، جن کا لقب کنیت اور نام سب دادا ہی کے ہیں، یعنی وہ بھی ابو الفرج عبد الرحمٰن بن الجوزی تھے، جو اپنے والد یعنی محی الدین یوسف بن جمال الدین عبد الرحمٰن بن الجوزی اول، اور بھائیوں یعنی شرف الدین عبد اللہ وتاج الدین عبد الکریم کے ساتھ فتح بغداد کے موقع میں یعنی ۶۵۶ھ میں قتل کر دئے گئے، گلستاں بھی عین ان ہی تاریخوں میں یعنی ۶۵۶ھ میں تالیف ہوئی، ان لوگوں کا یہ استدلال چند امور پر مبنی ہے، اول یہ کہ سعدی کی پیدائش اواسط چھٹی صدی میں قیاس کرنے سے اس بات کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی کہ ان کے کلام میں چھٹی صدی کے امراء وصدور کی مدح کیوں نہیں، دوم یہ کہ اس سے سعدی کی عمر سَو سال سے کافی زیادہ ہو جاتی ہے، جس کے لئے کوئی قوی قرینہ نہیں، سوم یہ کہ حکایت مذکور میں سعدی نے محتسب کی تعریف کی ہے، یہ شیخ کے محتسب ہونے پر دلالت کرتا ہے، اور شیخ ابو الفرج بن الجوزی دوم ۶۳۳ھ سے بغداد کے عہدۂ احتساب پر فائز تھے، اور المحتسب کے لقب سے بھی اکثر پکارے جاتے تھے، چنانچہ حوادث الجامعہ ص ۵۵، ۳۲۰ میں کئی بار ان کا لقب المحتسب ذکر ہوا ہے۔[2]

اب میں چند ایسے امور کا ذکر کروں گا جن سے سعدی کی پیدائش اواسط چھٹی صدی یا اس کے کچھ ہی بعد پر بخوبی استدلال ہو سکتا ہے،

---

[1] مثلاً میرزا محمد قزوینی (دیکھئے نامہ ہائے قزوینی دحواشی جہانگشائے جوینی ج ۳ ص ۳۹۳ حاشیہ ۳) وعباس اقبال (روزنامۂ ایران سال ۱۳۱۱، ومقدمہ کلیات سعدی، گلستان ہدیۂ ۱ شرصفا (تاریخ ادبیات در ایران ۳۹-۴۰ ۵۹) [2] ابو الفرج عبد الرحمٰن بن الجوزی کے حیات کے مآخذ کے لئے دیکھئے تعلیقات جہانگشائی جوینی ج ۳ ص ۴۶۳ تا ۴۶۶۔

سعدی نے گلستان کے باب پنجم میں[1] ایک حکایت لکھی ہے کہ جس سال محمد خوارزم شاہ اور خان ختان میں صلح ہوئی، وہ کاشغر کی مسجد جامع میں تھے، وہاں ایک خوبصورت لڑکا مقدمہ نحو زمخشری پڑھتا تھا، اور اس میں سے اس ٹکڑے کی تکرار کرتا تھا۔

ضرب زیدٌ عمرواً و کان المتعدی عمراً

سعدی بول اٹھے کہ خوارزم شاہ اور خان ختا میں صلح ہو گئی، اور زید و عمر کی دشمنی برقرار ہے، لڑکا مسکرایا اور ان کا وطن دریافت کیا، سعدی کے شیراز بتانے پر وہ بول اٹھا کہ ان کو سعدی کے کچھ اشعار یاد ہوں گے، اس پر انھوں نے عربی کے دو شعر پڑھے، لڑکا بولا سعدی کے اکثر اشعار فارسی کے ہیں، پھر سعدی نے یہ دو شعر پڑھے

طبع ترا تا ہوس نحو کرد		صورت صبر از دل ما محو کرد
اے دل عشاق بدام تو صید		ما بتو مشغول و تو با عمرو و زید

سلطان محمد خوارزم شاہ سے مراد سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ بن تکش ہے[2] جو بڑا فاتح جوانمرد اور صاحب حوصلہ حکمران تھا، وہ ۵۹۶ھ میں تخت نشین ہوا، اور چند ہی دنوں میں سارے ایران، توران کے حکمرانوں کو اپنا مطیع بنا لیا، ۶۱۵ھ میں اس کی فتوحات کا دائرہ قطب شمالی تک پہنچ گیا، لیکن ان ہی ایام میں چنگیز خاں اس پر حملہ آور ہوا، سلطان محمد اس کا مقابلہ نہ کر سکا، اور ۶۱۷ھ میں جزیرہ آسکون میں فوت ہو گیا۔

سعدی نے اپنی حکایت میں محمد خوارزم شاہ کی خان ختا سے صلح کا ذکر کیا ہے، تاریخوں سے ثابت ہے کہ خوارزم شاہ نے ۶۰۶ھ میں ختا کے فرمانروا قوریخ خان پر حملہ کیا، ختا کے لشکر کا سردار تاینکو طراز تھا، وہ بڑا دلیر تھا، کہتے ہیں اس نے ۴۵ لڑائیاں سر کی تھیں، مگر خوارزم شاہ سے

---

[1] کلیات ص ۱۶۵-۱۶۶ [2] مزید تفصیل کے لیے دیکھیے طبقات ناصری مطبوعہ کالج ۱۸۶۴ء جلد دوم ترجمہ انگریزی راورٹی صفحہ ۲۷۹-۲۹۳

شکست کھا گیا، گرفتار ہوا، اور سلطان محمد کے ہاتھ پر مسلمان ہوا، دوسرے سال سلطان محمد پھر خطا کی طرف متوجہ ہوا، گورخاں جو خاقان اعظم تھا، اس کے مقابلے کے لئے آیا، مگر اس نے شکست کھائی، اس طرح خطا کا پورا علاقہ محمد خوارزم شاہ[1] کے قبضۂ اقتدار میں آگیا، اس تفصیل سے واضح ہے کہ سعدی سنہ ۶۰۶ھ اور ۶۰۷ھ کے نزدیک کاشغر میں تھے، اس وقت وہ اتنے کہنہ مشق شاعر ہو چکے تھے کہ بلاد اسلامیہ کے دور دراز علاقوں تک میں بچہ بچہ ان سے واقف ہو چکا تھا، اس حقیقت کے پیش نظر ان کی عمر ۴۰ سال سے کم نہ ہونی چاہئے، اس طرح ان کی تاریخ پیدائش سنہ ۵۶۶ھ کے حدود میں ثابت ہوتی ہے،

ایک دوسرا واقعہ جو گلستاں[2] باب اول میں مذکور ہے وہ سلطان اغلمش سے تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ حسب ذیل حکایت مظہر ہے۔

سرہنگ زادۂ را بر در سرائے اغلمش دیدم کہ عقل و کیاستی و فہم فراستے زاید الوصف داشت، ہم از عہد خردی آثار بزرگی در ناصیۂ او پیدا

بالائے سرش ز ہوشمندی می تافت ستارۂ بلندی

بالآخر وہ بادشاہ کا پسندیدہ ہوا، اس لئے کہ وہ ظاہری و باطنی کمال کا مجموعہ تھا، کچھ ہی دن بعد حاسدوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا، اس کو خیانت سے منسوب کیا لیکن وہ بچ گیا، بادشاہ نے پوچھا کہ اس جماعت کی دشمنی کا کیا سبب ہے، اس نے کہا کہ آپ کے اقبال کے سایہ میں سب کو راضی کر دیا، مگر حسود تو سوائے میرے عزت و حرمت کے ختم کئے کسی اور وجہ سے خوش ہو سکتے ہیں۔

اس حکایت میں جس بادشاہ کا ذکر ہے، وہ سلطان اغلمش ہی ہے، اور واضح ہے

---

[1] سعدی نے تاریخ ربیع اول سنہ ۶۱۶ھ لکھی ہے۔ ۲۶۰-۲۶۱ ج نمبر، [2] کلیات مطبوعہ تہران ۱۳۳۲ ص ۵۸۔

خود سعدی اس کے نہ صرف ہم عصر تھے، بلکہ اس کے مستقر حکومت میں موجود تھے، ہمدان اصفہان و رے سب پر اس کا قبضہ تھا،

اغلمش اتابکان آذربائیجان کے آخری بادشاہ اتابک اوزبک (۶۰۷ - ۶۲۲) کا غلام تھا، رفتہ رفتہ اس کی ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ جب اوزبک نے خلیفہ بغداد اور اسماعیلی حکمران کی مدد سے محمد بن منکلی[1] کو شکست دی بعد بلاد جبال کے اکثر حصوں پر قابض ہو گیا، تو اتابک اوزبک نے اغلمش کو نئے مقبوضات کا حکمران بنا دیا، محمد بن منکلی سے جنگ کی تاریخ جمادی الاول ۶۱۲ھ دی ہے، لیکن جہانگشا ج ۲ ص ۲۱۵ - ۲۱۶ میں ۶۱۱ھ ہجری بہرحال اغلمش کی فرمانروائی ۶۱۲ھ سے شروع ہوئی ۶۱۴ھ میں وہ حجاج کے قافلے کے استقبال کے لیے نکلا تو چند فدائی جو حجاج کے مجمع میں بھیس بدل کر شامل ہو گئے، اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کا کام تمام کر دیا، (جہانگشا ج ۲ ص ۱۲۱، روضۃ الصفا ج ۴ ص ۱۳۹)

گلستان کی حکایت میں صاف طور پر ہے کہ سعدی نے اغلمش کے محل کے دروازے پر (جیسا کہ بعض روایت میں محل میں) سرہنگ زادے کو دیکھا تھا، پھر وہ اسی بادشاہ کا بہت پسندیدہ درباری ہوا، اس پر حاسدوں نے جب اس کے خلاف ناکام سازش کی تو بادشاہ نے اس سے سازش کا سبب پوچھا تھا، یہ تمام باتیں خود سعدی کو براہ راست معلوم ہوئی تھیں اور اسی بنا پر میرزا محمد قزوینی کا یہ درست قیاس ہے کہ شیخ ان دنوں اغلمش

---

[1] عجیب بات ہے کہ ۵۹۰ھ سے ۶۱۴ھ تک بلاد جبال کی حکومت اتابکان آذربائیجان و خوارزم شاہ کے پانچ نوکروں کے سپرد رہی ہے، (۱) کوکجہ مملوک اتابک پہلوان محمد ایلدگز (۵۹۱-۶۰۰ھ) (۲) میاجق مملوک خوارزم شاہ تکش (۵۹۱-۵۹۵ھ)۔ (۳) ایتغمش مملوک اتابک پہلوان (۶۰۰-۶۰۸ھ) (۴) محمد منکلی مملوک اتابک ازبک بن ایلدگز (۶۰۸-۶۱۱ھ) (۵) اغلمش مملوک اتابک ازبک (۶۱۱ یا ۶۱۳ یا ۶۱۴ھ)

کے مستقر ہمدان میں موجود تھے، یہ واقعہ سنہ ۶۱۳ھ کے قبل کا ہے، اور اس وقت سعدی ایسے بالغ نظر ہو چکے تھے، کہ ایک نوجوان کو دیکھ کر اس کے مستقبل کے بارے میں حکم لگا سکتے تھے، اس لحاظ سے اُن کی عمر ۳۰ - ۳۵ سال سے کم نہ ہونا چاہیئے، اور اس طرح ان کی تاریخ پیدائش سنہ ۵۸۰ھ کے حدود میں قرار دی جاسکتی ہے۔

یہ مختصر گزارش ہے، ان داخلی امور کی جن سے سعدی کی تاریخ پیدائش پر استدلال کیا جاسکتا ہے، لیکن جیسا کہ شروع میں عرض ہو چکا ہے دو قسم کی شہادتیں ہیں پہلی قسم کی رو سے ان کی پیدائش ساتویں صدی ہجری سے قبل قیاس نہیں کی جاسکتی، گلستان کی تالیف کے وقت ان کی عمر ۵۰ سال کے ارد گرد رہی ہو گی، لیکن دوسری قسم کی شہادت سے یہ واضح ہے کہ ان کی ولادت سنہ ۵۶۶ھ تا سنہ ۵۹۰ھ کے درمیان قرار دی جاسکتی ہے، لیکن اس قیاس کی صحت میں یہ امر مانع ہے کہ گلستان یا بوستان کی تالیف کے وقت شیخ نے اپنی پیرانہ سالی کا کہیں ذکر نہیں کیا، حالانکہ دوسرے قسم کی شہادتوں سے اس وقت ان کی عمر ۶۶، اور ۹۰ سال کے درمیان ہوتی ہے، اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ سنہ ۶۲۰ھ میں کاشغر کی موجودگی خود شیخ نے واضحاً لکھی ہے، اب ایسی واضح بات کو شیخ کی یادداشت کی کمزوری پر کیونکر محمول کیا جائے، اس میں شبہ نہیں کہ خود بعض باتیں شیخ کے یہاں ایسی ہیں کہ جن کو بادی النظر میں قبول کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے، خصوصاً شیخ کی سومنات میں موجودگی، مگر جو بات خود شیخ نے لکھ دی اس کو غلط قرار دینے کا حق کسی کو مشکل سے حاصل ہو گا، لیکن بعض محققین نے ان کو غلط بتایا ہے، مثلاً صفا لکھتے ہیں۔

علت دیگر حکایتی است کہ سعدی در بارہ سیری یا مع کاشغر گفتار او با نو آموزی در آن جامع در سالے کہ محمد خوارزم شاہ تا خا برا اے مصلحتی صالح اختیار کردہ

"و اگر ہر این حکایت را از واقعیات محض گرفتہ باشیم بایست سعدی در آن تاریخ
یعنی در حدود ۶۲۰ھ لااقل بیست و اند سال داشتہ و در حدود ۵۹۵ھ
ولادت یافتہ باشد، اما در حقیقت این گونہ حکایات و حتی ہمزبانی سعدی در شکستن
بت سومنات را قبال انہار تردید است و با قرائن مختلف دیگری کہ از ماجرای
احوال او بدست داریم وفق نمی دہد و قاعدۃً از جملہ حکایاتی بنظر می آید کہ از من
باے تمثیل و برای نکات اخلاقی ساختہ و پرداختہ باشند نہ از باب ذکر حکایت تاریخی"

اس قول کے سلسلے میں مجھے چند باتیں عرض کرنا ہیں . . . . اول
۶۲۰ھ میں سعدی کی عمر بیس سال سے کچھ زیادہ فرض کی گئی ہے، حالانکہ حکایت
میں ہے کہ اس وقت تک سعدی کی شہرت عالمگیر ہو چکی تھی، ۳۰-۳۵ سال سے کم عمر میں
یہ شہرت ممکن نہیں، دوم یہ کہ اگرچہ ان حکایات میں حقایق تاریخی کا ذکر مقصود نہ تھا، لیکن
جب کسی واقعہ کا ضمنی ذکر آ گیا ہو تو اس کو یہ کہہ کر رد کر دینا کہ اس پر بطور تمثیل کے ہے یا اس لئے
محض اخلاقی نکتہ پیدا کرنا مقصود ہے، قابل قبول نہ ہوگا۔

میرے خیال میں سعدی کی تاریخ پیدائش کے سلسلے کی دو مختلف آراء کے درمیان مفاہمت
بغیر مزید شواہد کے ممکن نہیں، موجودہ شہادت کی روشنی میں یہ مسئلہ حل پذیر نہیں ہو سکتا اور
اب تک اسی سلسلے کی ساری کوششوں میں کوئی کوشش قابل قبول نہیں قرار دی جا سکتی ہے۔

ل ۵۸۵ ص ۱۹۵ [illegible]

شعر العجم، حصہ دوم، اس میں حضرت سعدی کے سوانح و حالات کے ساتھ ان کی
شاعری پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت :- ۱۳

کتب خانۂ رام پور کا ایک معالجاتی قلمی تذکرہ

جناب حکیم محمد حسین خاں شفا کیٹلاگر رضا لائبریری، رام پور،

رام پور کے طبی ذخیرہ میں ایک کتاب "اقتباس العلاج عرف فضول فیض اللہ خانی" ہے اس کا کوئی دوسرا نسخہ میرے علم میں نہیں ہے، ناظم کتب خانۂ سرکاری جناب احمد علی خاں شوق م ۱۹۳۲ء نے اس کے بارے میں تحریر کیا ہے۔

"فن طب میں اس جامعیت کی کتاب کم ہوگی، علاج معالجہ کے ساتھ واقعات مطب وحکایات بھی لکھے گئے ہیں"

اس کتاب کے مصنف حکیم محمد بایزید ہیں، جن کی عمر تالیف کے وقت تقریباً ستر سال کی تھی انھوں نے اپنی زندگی کے طبی تجربات اس میں تحریر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس مخطوطہ کے فہرست مضامین کے الگ ۵۸۹ اوراق ہیں، ہر صفحے پر اکیس ۲۱ سے تیس ۳۰ تک سطریں ہیں، تقطیع ½۱۸، ½۱۲ انچ ہے، بخط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے، وجہ تصنیف حکیم بایزید نے یہ تحریر کی ہے کہ جب میں نے اپنے لڑکے میاں سعید احمد اور دیگر شاگردوں میں معالجات کی طرف رغبت دیکھی تو خیال ہوا کہ اس فن میں بھی ایک ایسی کتاب مرتب کردوں جو نہ صرف میری حیات بلکہ میرے بعد بھی فن معالجات میں ان لوگوں کے کام آئے، اور بہت سی کتابوں سے بے نیاز کردے۔ (حکیم بایزید اس کتاب کی تالیف سے ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۸ء میں فارغ ہوئے، اس میں آخری واقعہ جس کی بایزید نے سند بھی تحریر کی ہے ۱۲۲۳ھ اور ۱۸۰۸ء

لکھا ہے، ورق ۳۶۴ پر لکھتے ہیں: میں ملک محمد عزیز خاں خٹک کے ایک عزیز کی شادی میں قصبہ بڑاپورا میں گیا، جہاں دعوت کا کھانا کھا کر میرا بھائی اور کچھ لوگ اسہال میں مبتلا ہو گئے، جن کا میں نے علاج کیا، بایزید نے اس علاج کی پوری تفصیل بھی درج کی ہے، زیر بحث نسخہ مصنف کے کسی شاگرد نے ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں اصل مسودہ سے نقل کیا ہے، یہ داخل کتب خانہ ہونے سے قبل مختلف حضرات کی ملکیت رہ چکا ہے، چنانچہ اس پر دست غیر سے کچھ حواشی و نسخہ جات کا اندراج ہے، ورق ۹، ۲، ۱۱ر دسمبر ۱۹۰۰ء کو یہ کتاب داخل کتب خانہ ہوئی، صفحۂ اول پر تحویلدار مہدی علی خاں کا نوٹ ہے، شروع میں ۶ صفحات پر مشتمل فہرست مضامین ہے، جو اصل مخطوطہ میں نہیں تھی، یہ کارکنان کتب خانہ کی بنائی ہوئی ہے، اس قسم کے مخطوطات پر فہرست مضامین لگانے کا کام علامہ شبلی کی تحریک پر کتب خانہ سرکاری میں شروع کیا گیا تھا، حمد و نعت کے بعد ۱۲۵ کتابوں پر مشتمل فہرست ماخذ ہے، جس سے حکیم بایزید کی علمیت اور اس مخطوطے کی جامعیت کا پتہ چلتا ہے، فصول کے متن میں کچھ ایسی کتابوں کے نام بھی آتے ہیں جو فہرست ماخذ میں نہیں ہیں، ان میں کئی قدیم و جدید ایسی کتابوں کے حوالے بھی آئے ہیں جو اب نادر و نایاب ہیں، جدید کتابوں میں قوانین العلاج حکیم کبیر علی انصاری، دستور العلاج حکیم اکمل خاں، معالجات حکیم ساجد خاں رام پوری اور کئی بیاضیں شامل ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم بایزید کے پاس خود طبی کتابوں کا وسیع ذخیرہ تھا۔

حکیم بایزید طب قدیم کے ساتھ طب جدید کے عصری رجحانات سے بھی واقف تھے، انھوں نے فصول میں ایک باب ادویۂ جدیدہ مغربیہ افرنجیہ کے عنوان سے قائم کیا ہے، دیباچہ میں مصنف نے اپنی ۶ دیگر تصنیفات کا بھی تذکرہ کیا ہے، فصول سے پتہ چلتا ہے کہ حکیم بایزید کو مختلف طبی مسائل مرتب کرنے کا شوق تھا، جن کا انھوں نے مختلف امراض کے ذیل میں حوالہ دیا ہے،

چونکہ بایزید کے عہد میں علوم شرقیہ کا زوال اور ممالک اسلامیہ بحران میں مبتلا تھے، عربی زبان علوم طورسے فن بسرحری سے بے رغبتی عام تھی، قوم پہ بڑھاپا طاری تھا، ایسے ماحول میں حکیم بایزید ایک مجدد طب کی حیثیت سے میدان میں آئے، اور انھوں نے فارسی زبان میں خود نصاب تعلیم طب مرتب کیا، اور برسوں اپنی درسگاہ میں پڑھایا، اس نصاب کی جن کتابوں کا فصول میں حوالہ آیا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ جرائب النعمت، یہ کتاب حکیم بایزید نے بقول خود اپنے بھائی اور دیگر شاگردوں کو علم جراحی یعنی سرجری کی تعلیم دینے کے واسطے ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ء میں مرتب کی تھی، جو اب ان کی دیگر تصانیف کی طرح نایاب ہے۔

۲۔ فوائد نعمت نامی کتاب امراض متعدیہ وغیرہ سے متعلق ہے، اس کا ذکر دیباچہ اور دوسرے باب میں کیا گیا ہے، سنہ تصنیف ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء ہے۔

۳۔ ایک رسالہ در معالجات حاملہ حل ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء کا مرتب ہے۔

۴۔ خزنۃ العلاج کے نام سے مقالات طب کو مرتب کیا، جس میں طب کے اختلافی مسائل پر محاکمہ ہے سنہ تالیف ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۸ء ہے۔

۵۔ ریاض الصل نامی رسالہ رموز نسخہ و عملیات طب سے متعلق ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۸ء میں مرتب کیا۔

۶۔ مرکبات قرابادین" نافع الامراض" بہت معرکہ کی کتاب ہے۔

علامہ نجم الغنی خان نے اس سے استفادہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

اس قرابادین میں نسخہ ہائے مرکب جن جن لوگوں کیلئے تجویز کئے ہیں انکے نام ہر نسخے کے ساتھ درج کر دیئے ہیں اسلئے یہ رسالہ سوادوں کے امراض گوناگوں کا کچا چٹھا اور دلچسپ مرقع ہے سنہ تالیف ۱۱۶۹ھ/۱۷۵۶ء

حکیم بایزید کی تصانیف میں سے صرف فصول ہی میرے مطالعہ میں رہی ہے، تلاش کے باوجود کوئی اور کتاب ابھی نہیں مل سکی فصول کے نام اور سنہ تالیف کے بارے میں حکیم بایزید لکھتے ہیں۔

" چونکہ میں اس کتاب کی ترتیب سے جناب نواب فیض اللہ خاں کے عہد ۱۲۰۲ھ میں فارغ ہوا ہوں، اس وجہ سے ان کے اسم گرامی پر اس کا نام رکھا ہے۔"

اس مخطوطہ کا کاتب حکیم صاحب کا ایک عقیدت مند شاگرد ہے، وہ ترقیمہ میں تحریر کرتا ہے،
تمت الکتاب من مسودۃ المصنف قدس سرہ العزیز تصنیف مولانا ہادینا مولوی
محمد بایزید ساکن بلدہ مصطفیٰ آباد عرف رام پور۔

فصول کتب طبیہ میں کئی اعتبار سے ممتاز ہے، اس کے طبی اندراجات کی جامعیت تاریخی واقعات کی صداقت اور علمی و ادبی حکایات کی ندرت اہل ذوق حضرات سے خراج تحسین وصول کرتی رہے گی، اس مخطوطہ کی تدوین طب کی عام معالجاتی کتابوں کی طرح ترتیب اعضا پر ہے، جو امراض راس سے شروع ہو کر قدم پر ختم ہوتی ہے، لیکن بلحاظ مواد وہ اس فن کی دیگر کتابوں سے ممتاز ہے، بایزید نے جن اعضا کے امراض سے بحث کی ہے، پہلے ان اعضا کی مختصر تشریح، اس کے بعد کچھ مفید معلومات اور مبادیات علاج، امراض، علامات، عام معمولات اور خاص تجربات کا تذکرہ ہے، پیچیدہ امراض کے سلسلے میں "فوائد" کا عنوان قائم کر کے اہم نکات اور خاص تشخیص رموز بیان کئے ہیں، کہیں کہیں دستور العلاج کا عنوان قائم کر کے اطبائے قدیم و جدید کا طریقۂ علاج تحریر کیا ہے، جس میں خاص طور پر دہلوی اسکول اور حکیم علوی خاں کا تفصیلی تذکرہ ہے، حکیم علوی خاں کے بارے میں اس مخطوطہ میں کافی اہم معلومات ہیں، حکیم بایزید نے پہلے علوی خاں سے طب پڑھی، اس کے بعد علوی خاں کے کچھ شاگردوں سے بھی استفادہ کیا، وہ بحث بخار میں ورق ۳۴ پر تحریر کرتے ہیں:

"دربرلی مطب قاضی ثناء اللہ صاحب مرحوم کہ استاذ فقیر بود ند زن را دیدم"

علوی خاں کے ہمعصر ایسے اطبا کے نام بھی فصول میں آتے ہیں، جن کا دیگر تذکروں میں ذکر نہیں ہے، عموماً نسخے قلیل الاجزاء مفردات پر مشتمل ہیں، مرکبات کے سلسلہ میں اپنی تصنیف "قرابادین نافع الامراض" اور دیگر قرابادینوں کے حوالے دیئے ہیں۔

امراض وبائیہ میں کہیں کہیں سنہ، موسم اور مقام کا تعین بھی کر دیا ہے۔ آخر میں رموز تشخیص،

..... طبی مشکلات اور ان کے جوابات، علامات و احوال اموات، وصایا، تحقیق اسمار، جمیع امراض اور یات بطور اہل لغت فہرست ادویہ مفردہ مع خواص اور ورق ۱۰۵ ب سے حکیم ارزانی کی عربی تصنیف حدود الامراض کا بایزید نے خود فارسی ترجمہ کرکے شامل کتاب کر دیا ہے،

فن معالجات سے متعلق حکیم بایزید نے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی کوشش کی ہے، اور قدیم متون کو سامنے رکھا ہے، اس وجہ سے بہت سی بحثیں تشنہ رہ گئی ہیں، کچھ عنوانات کا حق چند سطروں میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

حکیم بایزید نے فصول میں اکثر امراض کی بحث میں ایک باب قصص و حکایات کا قائم کیا ہے، جو غیر طبیب اہل علم کے واسطے بھی بہت کارآمد ہے، اس باب میں آخری عہد مغلیہ سے متعلق سوانحی، سماجی، تاریخی اور علمی و ادبی معلومات ہیں چونکہ فنی طبی کتابوں کا عام طور پر تاریخی ماخذ کے بطور مطالعہ نہیں کیا جاتا، اس وجہ سے اس کتاب کا یہ اہم حصہ اہل علم کی نظر سے پوشیدہ ہے، اور پوری کتاب میں موتیوں کی طرح بکھرا ہوا ہے، مصنف نے اپنے حسب و نسب کے بارے میں دیباچہ میں صراحت کی ہے۔

حکیم محمد بایزید خلعت حقیقت آگاہ معرفت دستگاہ شاہ رحمت اللہ گنگوہی ابن شاہ حافظ برخوردار از اولاد قطب عالم شاہ عبدالقدوس گنگوہی۔

بایزید کا خاندان کئی صدیوں تک تصوف و طب میں بہت ممتاز رہا جن کا مختلف کتابوں میں ذکر ملتا ہے، خاص طور سے بایزید کے نواسے ڈاکٹر شاہ محمد حسن صابری اٹھائیس کتابوں کے مصنف تھے، ان کی تصانیف میں تاریخ آئینہ تصوف[؟] اور حقیقت گلزار صابری بہت مشہور رہیں، شاہ محمد حسن صاحب غیر ثقہ راوی اور عجوبہ پسند مصنف تھے، ڈاکٹر محمد اسلم لاہوری[؟] نے ان کی تصانیف کو داستان امیر حمزہ، الف لیلیٰ اور طلسم ہوش ربا، کی طرح محض افسانوی

قرار دیا ہے، پھر بھی ان کی تالیفات سے بایزید اور ان کے خاندان کے بارے میں کچھ مفید معلومات کا اضافہ ہوتا ہے۔

محمد حسن صاحب لکھتے ہیں[۵]

"حضرت آدم سے پہلے نظام عالم باطنی اجنہ کے سپرد تھا، اور اس کے احکام ایک سنگ زبرجد پر کندہ تھے، حضرت آدمؑ نے اجنہ سے یہ احکام لے کر اپنے لڑکے ستروطو کے حوالے کر دیئے، جو سلسلہ بسلسلہ حضرت امام ابوحنیفہؒ تک پہنچے اور انھوں نے اسکو باقاعدہ ایک دستاویز کی شکل دے کر حضرت امام احمد عطا کے سپرد کئے، جس میں خاندانی حالات اور نظام عالم باطنی سے متعلق احکام، حکمران عرب و عجم کا عزل و نصب عروج و زوال بھی شامل ہے، اس دستاویز کا نام و نقشہ حنفیہ قدسیہ سے ہے جس کو ہمارے سلسلہ کا بزرگ بھرتا ہے

شاہ محمد حسن صاحب کی اکثر تصانیف اس نقشہ اور بزرگان کے مکاتیب سے ماخوذ ہیں[۶]

محمد حسن صاحب لکھتے ہیں۔

"پنجاب کے علاقہ گجرات میں شاہ دولہ نامی بزرگ تھے، جن کی لڑکی قمر النساء بیگم کا عقد حافظ برخوردار سے ہوا، جن سے شاہ رحمت اللہ پیدا ہوئے"

حافظ صاحب نقشہ قدسیہ میں تحریر کرتے ہیں"

(میرے فرزند شاہ رحمت اللہ کی شادی بی بی اختر فاطمہ بنت حضرت سید احمد آنولہ والے سے ہوئی، جن کے بطن سے ۱۱۳۲ھ / ۱۷۱۹ء میں حکیم بایزید تولد ہوئے۔ صاحب اولاد ہیں انکی اولاد رام پور میں ہے۔)

محمد حسن صاحب اپنے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

حافظ محمد عبداللہ بن حضرت شاہ نعمت اللہ کا نکاح سنہ ۱۲۰۱ھ میں خدیجہ بیگم بنت حکیم بایزید سے ہوا، جن سے فقیر محمد حسن مولف تاریخ آئینۂ تصوف پیدا ہوا۔

حکیم بایزید ایک صوفی خاندان میں عملی طبیب تھے، ان کی پوری زندگی خدمتِ طب میں گزری غالباً اسی وجہ سے کسی تذکرۂ صوفیہ میں ان کا ذکر نہیں آتا اور نہ ان کے نواسے شاہ محمد حسن صابری نے دیگر ہزاروں اہل طریقت کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے، جب کہ فصول سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم بایزید بھی تصوف سے متاثر تھے، انھوں نے ورق ۳۶۴ ب پر امراض نسواں میں ایک تعویذ یہ لکھ کر تحریر کیا ہے کہ اس مرض میں ہمارے مشایخ یہ نقش دیا کرتے تھے،

خاندان بایزید کی طبی خدمات کو سراہتے ہوئے مفتی عبدالقادر خاں م ۱۲۶۹ھ / ۱۸۴۸ء نے روزنامچہ میں تحریر کیا ہے:

"اس شہر رام پور میں فن طب میں ملا فقیر اخوند کا خاندان سب پر سبقت لے گیا ہے۔ ملا بایزید نے عمل جراحی کو کہ عرصے سے اطبا اس سے عاجز تھے، اور ابلہ فریبی سے اس کام کو ذلیل بناتے تھے، باوجود طبیب ہونے کے اس نے تو اس فن کو حاصل کیا۔ اب ان کا بھائی نعمت اللہ اس طرح اس فن میں یکتائے زمانہ مشہور ہے، اب بھی اس گھرانے میں بیمارداری جاری ہے، ملا مرحوم کے جانشین اس کے لڑکے ملا احمد سعید ہیں۔"

علامہ نجم الغنی خاں نے اخبار الصنادید میں نواب فیض اللہ خاں کے عہد کے مشائخ و علما کے ضمن میں حکیم بایزید کا بھی ذکر کیا ہے، جس کو حکیم کوثر چاند پوری نے اطبائے عہدِ مغلیہ میں کچھ معلومات کے اضافے کے ساتھ نقل کر دیا ہے۔

چونکہ حکیم بایزید نے اپنے بھائی ملا فقیر اخوند ولادت ۱۱۴۳ھ، کو ان کے زہد و تقویٰ کی

ودھ سے ہر جگہ تعظیمی کلمات سرکار صاحب سرتاج وغیرہ الفاظ سے یاد کیا ہے، جب کہ ملا صاحب بایزید سے ۱۱ سال چھوٹے تھے۔ اس وجہ سے نجم الغنی خاں نے حکیم بایزید کو چھوٹا بھائی تصور کیا ہے۔

کوثر صاحب تحریر کرتے ہیں۔

حکیم بایزید حکیم کبیر علی انصاری سنبھلی کا بیٹا تھا۔

کوثر صاحب کا یہ خیال بھی غلط ہے، حکیم کبیر علی انصاری بایزید کے استاد تھے، ان سے نسبی تعلق کچھ نہیں تھا، تذکرۂ کاملان رام پور اور حقیقت گلزار صابری وغیرہ میں خاندان بایزید کا جو شجرہ ہے، وہ حکیم کبیر علی انصاری کے خاندان سے نہیں ملتا، حکیم بایزید کو غالباً روزنامچہ نویسی کا شوق تھا، یا ان کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا، جو انھوں نے آخری عمر میں ابتدائے شباب کے واقعات تفصیل سے تحریر کر دیئے ہیں، تاریخی اعتبار سے فصول میں ربیع ۱۱۶۱ھ سے ۱۲۱۲ھ تک کے واقعات کہیں کہیں تعین سنہ کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں، یہ منتشر واقعات بھی تاریخ طب کا بیش قیمت ذخیرہ ہیں۔

واقعات طاعون میں بایزید تحریر کرتے ہیں۔ جب میں نواب فیض اللہ خاں کے ساتھ سرہند میں مقیم تھا، اس دوران وہاں طاعون پھیلا جس میں سیکڑوں افراد مرگئے، میں نے کچھ مریضوں کا جدوار، سرکہ، پیاز وغیرہ سے علاج کیا، وہ ٹھیک ہوگئے، چنانچہ ورق ۲۲۰ پر کچھ مجربات طاعون تحریر کئے ہیں، بحث سیمات میں مزید لکھتے ہیں۔

سرہند میں میں نے ایک فقیر کو دیکھا، جو سیماب خام کھاتا تھا، اس نے پارا کھانے کا مظاہرہ میرے اور نواب فیض اللہ خاں کے سامنے کیا۔"

ایک جگہ احمد شاہ درانی کی غیر معمولی توانائی کا تذکرہ ہے، ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ حکیم بایزید ۱۱۶۱ھ سے ۱۱۶۶ھ تک پنجاب اور افغانستان میں نواب فیض اللہ خاں کے

ساتھ سے، تاریخی مقامات کے ذیل میں بایزید نے ملتان، سرہند، افغانستان، الموڑہ، سنبھل امروہہ اور چلی بھیت وغیرہ کا ذکر کثرت سے کیا ہے جس سے ان مقامات پر بایزید کی آمد و رفت ثابت ہوتی ہے، بایزید روہیل کھنڈ کی پہلی جنگ آزادی میں حافظ رحمت خاں علیہ کے ساتھ تھے جس میں اپریل ۱۷۷۴ء کو حافظ رحمت خاں شہید ہوئے، اس کے بعد اکتوبر ۱۷۷۴ء میں نواب فیض اللہ خاں نے رام پور کو پایہ تخت قرار دیا، اور دیگر مشاہیر کے ساتھ حکیم بایزید بھی رام پور میں آگئے، اور یہیں انتقال کیا، وہ مرض خناق میں استعمال چائے کا ایک دلچسپ واقعہ تحریر کرتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ :-

ابتدائے تشکیل رام پور میں نواب فیض اللہ خان اطبائے دربار سے چائے کے مزاج اور نقصان کی بابت استفسار کیا جس کے بارے میں شدید اختلاف رائے ہوا، اور حکیم میرزا ابو علی اپنی اس رائے پر اڑ گئے، کہ چائے درجۂ سوم میں گرم و خشک ہے، نواب صاحب کو اس کا ہرگز استعمال نہ کرنا چاہئے، یہ زہر کا کام کرے گی جب کہ نواب صاحب انگریزوں میں متعدد بار چائے نوشی کر چکے تھے، نواب صاحب نے انچارج دواخانہ شاہی حکیم عطاء اللہ عمی، کاشمیری کو حکم دیا کہ وہ اپنی والدہ سے چائے بنوا کر لائیں، میرزا ابو علی کو اپنی بات خراب ہونے کا احساس ہوا اور انھوں نے چائے میں خربق سیاہ (کٹکی) شامل کرا دی، جس کے پینے سے نواب صاحب کو خناق ہو گیا، دوسرے روز حالت بہت بگڑ گئی، اطبائے دربار کو جمع کیا گیا جن کے نام حکیم بایزید نے یہ تحریر کئے ہیں، حکیم کبیر علی انصاری سنبھلی، حکیم احمد علی انصاری، حکیم محسن خان شاگرد حکیم شریف خاں، حکیم دیوکی نندن، حکیم عزالدین میرٹھی، حکیم حافظ محمد یار خان شاہ جہاں پوری، حکیم محمد زماں خاں، حکیم واجد علی خاں، حکیم صغیر علی، حکیم حافظ محمد یار خان

حکیم عطاء اللہ غنی

حکیم بایزید لکھتے ہیں۔

اطبا نے چائے میں زہر کی آمیزش کا شبہ ظاہر کیا، نواب محمد علی خاں کی تفتیش سے لالہ دیپ چند عطار نے یہ بتایا کہ والدہ حکیم غنی نے خربق سیاہ منگائی تھی، جو حکیم مرزا ابو علی کے اشارے پر چائے میں ڈال دی گئی، اس انکشاف کے بعد میرزا ابو علی تو فرار ہو گئے، فصد کھول کر اور تبرید سے فیض اللہ خاں کا علاج کیا گیا، نواب صاحب نے ٹھیک ہو کر سارے معالجین کو انعامات سے نوازا۔

اس کی تفصیل فصول میں بایزید نے تحریر فرمائی ہے۔

اس ایک واقعہ کے ذیل میں بایزید نے دربار رام پور سے وابستہ ۴ اطبا کا ذکر کیا ہے فصول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ہر چھوٹا اور بڑا رئیس کسی نہ کسی طبیب کا کفیل تھا جس کی وجہ سے عوام کو طبی سہولت مفت حاصل تھی، بایزید نے کئی دولت مند خواتین کا ذکر بھی جس میں بیگم نواب سعد اللہ خاں بھی شامل ہیں، جو طبیبوں کو تنخواہ دیا کرتی تھیں، بایزید نے کامیاب معالجہ پر ملنے والے انعامات اور اس عہد کے رئیسوں کی علمی دوستی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے وہ پیچش بحث میں لکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ نواب محمد علی خاں کو پیچش ہو گئی، میں نے اور حکیم اصد علی نے علاج کیا، جب وہ صحت یاب ہو گئے تو نواب فیض اللہ خاں نے دونوں کو نقد انعام و جاگیر سے نوازا جس میں ۵۰۰ روپے اور ۵۰۰ بیگھہ پختہ اراضی بشارت نگر میں حکیم بایزید کے حصہ میں آئی"

بایزید اپنے ہم عمر اطبا میں حکیم اصد علی انصاری سے بہت متاثر ہیں، انھوں نے اپنے اور خاندان کے معالج کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے، فصول سے اطبا کے آپس میں خوش گوار

اور مشترکہ علاج و معالجہ کے بہت سے واقعات کا پتہ چلتا ہے، اس میں کئی غیر مسلم معالجین کا بھی ذکر ہے، وہ لکھتے ہیں کہ نواب مصطفےٰ خاں ولد حافظ رحمت خان کی بیوی حکیم بھاگیرت مصرا اور حکیم منوہر مصرا کے زیر علاج رہتی تھیں، ایک مرتبہ ان کے علاج سے طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی تو نواب فیض اللہ خان نے مجھے ان کا علاج کرنے کا حکم دیا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بایزید کو امراض وبائیہ اور سرجری میں خصوصی مہارت تھی، انھوں نے ان امراض میں اپنے جوہر زیادہ دکھائے ہیں، اور قدرے تفصیل سے بحث کی ہے

فصول میں بایزید نے اپنے چند شاگردوں کا بھی ذکر کیا ہے، جن میں حکیم شاہ نواز خاں بھی شامل ہیں، یہ اپنی والدہ کے علاج کے سلسلہ میں بایزید کے پاس گئے، جوان زیرک اور ذہین تھے، بایزید نے جوہر قابل کو پرکھ لیا، اور ان کو خدمت خلق اور تعلیم طب کی طرف متوجہ کیا، اور تھوڑے ہی عرصہ میں شاہ نواز خان کو ایک ماہر طبیب بنادیا، یہ ایک دولت مند گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد ملا نظام والد یہ ولایتی یوسف زئی سالارخیل بہت با اثر رئیس تھے۔ کاملان رام پور وغیرہ میں مذکور ہے کہ جب شاہ نواز خان نے مطلب شروع کیا تو والد اور استاد نے ان کو نصیحت کی تھی کہ اللہ کا دیا معاش تمھارے پاس کافی ہے، طب خدمتِ خلق کا ذریعہ ہے، دنیاوی فوائد حاصل کرنے کا وسیلہ نہیں، اگر اتفاقِ زمانہ سے دنیاوی مصائب آجائیں تو وقار فن کا خیال رکھنا، علما، سادات اور اہل خدمت سے کوئی رقم مت لینا، حکیم شاہ نواز خاں کا ساری عمر استاد کی اس نصیحت پر عمل رہا۔ اور ان کی نسل سے قدرت نے ہر دور میں کامیاب معالجین پیدا کیے جن میں حکیم عبدالرحمٰن خاں، ان کے بھائی حکیم عبدالرحیم خاں، اور حکیم عبدالرحیم خاں کے لڑکے ڈاکٹر عبدالحکیم خاں اور ان کے لڑکے ڈاکٹر خالد خاں ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالحفیظ اور ڈاکٹر عبدالرشید بھی اسی خاندان سے تعلق ہے۔

رامپور کے اکثر اطبا کا سلسلہ حکیم بایزید تک پہونچتا ہے، جس میں حکیم محمد اعظم خاں اور حکیم نجم الغنی خاں بھی شامل ہیں۔ بایزید خدمتِ خلق تزکیہ نفس اور اخلاقی اقدار کی پابندی کو طبیب کیلئے ضروری قرار دیتے ہیں، انھوں نے (وصایائے طبیب) میں ان اصولوں پر زور دیا ہے، تاریخی وتہذیبی واقعات کے ساتھ فصول بہت سے مشاہیر کا بھی تذکرہ ہے، جن میں ملا فقیر اخوند، ملا احمد سید اعظم شاہ گنگوہی، مولوی مغل، ملا عبدالرحمٰن قوہستانی، قاری نسیم، حافظ رحمت خاں، حکیم غلام رسول حکمت، حکیم میرزا عاشور بیگ، حکیم بھولا ناتھ، حکیم محمد افضل خاں، حکیم دوست محمد خاں، حکیم عبدالرسول، حکیم محسن خاں کاشمیری، حکیم محمد ساجد خاں رامپوری، حکیم شاہ باز خان، حکیم محمد اماں خاں حکیم اللہ داد خاں وغیرہ شامل ہیں،

بہت سے رئیسوں کے آپس کے تعلقات اور ان کے مصاحبین کی تفصیل بھی فصول سے معلوم ہوتی ہے، بایزید نے جہاں کامیاب معالجات کا تذکرہ کیا ہے، وہاں بعض امراض میں اطبا کی ناکامیوں کا بھی ذکر کیا ہے، وہ بحثِ سوزاک میں لکھتے ہیں۔

> جناب قاضی سنہ صاحب کو ایک موذی مرض ہو گیا تھا، یہ نواب فیض اللہ خاں کے مصاحب خاص تھے، ان کے علاج کے سلسلہ میں نواب صاحب نے خود دلچسپی لی اور حکیم غلام رسول حکمت سے علاج کرایا لیکن قاضی صاحب اس مرض سے جانبر نہ ہو سکے، [۱] احمد ان کا انتقال ہو گیا۔

قاضی سنہ صاحب کا تذکرہ سوانح حافظ جمال اللہ صاحب مجمع الکرامات [۲] میں امام الدین خاں اور فرزند غوث الاعظم [۳] میں میکش اکبرآبادی صاحب نے کیا ہے، قاضی صاحب کو حافظ شاہ جمال اللہ اور شاہ عبداللہ بغدادی صاحب کے درمیان ایک جھگڑے کا بانی قرار دیا ہے۔ جس میں دونوں بزرگوں کے خوانیش میں خون ریز تصادم ہوا تھا۔

فصول سے بعض مشاہیر کے ایسے واقعات بھی معلوم ہوتے ہیں، جن کا کسی اور نے تذکرہ نہیں کیا ہے، بایزید نے بحث درد سر اور افیون میں شاہ عبداللہ صاحب بغدادی کے بارے میں لکھا ہے، کہ حضرت شاہ عبداللہ بغدادی نبیرۂ حضرت غوث الاعظم عرف بنے میاں صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے شہر بھوپال میں ایک جوان صحت مند خوش خوراک فقیر کو دیکھا، جو بہت بڑا افیون کا گولہ دونوں وقت کھاتا تھا، اور سانپ سے کٹواتا تھا لیکن اس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

تاریخ ہند میں اورنگ زیب کے بعد کا عہد کافی پیچیدہ ہے، اس دور میں مختلف گروہوں نے خاندان مغلیہ کی جانشینی کی جدوجہد کی، جن میں روہیلے بھی شامل ہیں، بدقسمتی سے روہیلوں کو مغل سید، مرہٹوں، اور انگریزوں نے ہدف ملامت بنالیا ہے، بایزید نے روہیلہ عوام اور خواص کی صحیح نباضی کی ہے، وہ روہیلکھنڈ کی دوسری جنگ آزادی کے سپہ سالار مصطفےٰ خاں عرف بجو خاں علیؒ شہید (۲۴ اکتوبر ۱۷۹۴ء) کے خاندانی معالج تھے، انھوں نے بجو خاں کے خاندان کے کئی افراد کا ذکر کیا ہے بحث حمیات میں لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ بجو خاں کو بخار آگیا، جو حکیم دوست محمد خاں کے علاج کے باوجود کافی عرصہ چلتا رہا، ایک روز بجو خاں کے مصاحبین جمع تھے، جن میں محمد خاں جمعدار، بخشی مرتضیٰ خاں، قلندر خاں جمعدار، ماندی خاں جمعدار، بشارت اللہ امروہی، میر محمد قائم، میاں تفضل حسن خاں، اور حکیم سید ضیاء الدین عبرت بھی شامل تھے، حکیم عبرت نے کہا کیا شہر میں اور کوئی طبیب نہیں ہے، جو خاں صاحب کا علاج کرسکے، اس پر حکیم دوست محمد خاں نے فرمایا خاں صاحب کے ٹھیک نہ ہونے کا سبب علاج کی خرابی نہیں، خاں صاحب کی بدپرہیزی اور علاج میں تساہلی ہے۔

بایزید کا خیال ہے کہ روہیلوں کو دوا تو پلائی جاسکتی ہے لیکن پابند پرہیز کرانا آسان نہیں،

فصول کے ادبی لطائف میں نواب محمد یار خاں امیر اور حکیم کبیر علی کبیر انصاری سنبھلی کا واقعہ بہت دلچسپ ہے، امیر اپنے عہد کے بہت بڑے رئیس تھے، اور ان کی دولت کا بڑا حصہ اہل علم و فنکاروں کی خدمت میں صرف ہوتا تھا، سودا، مصحفی، قائم چاند پوری بھی ان کی دولت سے مستفید ہوتے رہتے تھے، بایزید امراض چشم میں لکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ امیر کی آنکھ میں سال کی لکڑی کا ایک ریزہ پڑ گیا، چونکہ حکیم کبیر مستقل تنخواہ دار ملازم تھے، انھوں نے علاج شروع کیا، پہلے محمد حیات جراح سے ریزہ نکلوایا پھر زخم و ورم اور دیگر تکلیفوں کی دوا دی، جب امیر ٹھیک ہو گئے تو انھوں نے اس خوشی میں جشن صحت منعقد کیا، اور اپنے اکثر مصاحبین کو جن میں سید حسن شاہ میر ضیاء الدین عبرت، میر محمد قاسم شاہ، میاں عزالدین وغیرہ کو خلعت اور نقد وجنس سے نوازا۔

لیکن حکیم کبیر کو بالکل نظرانداز کر دیا، ممکن ہے اس کی وجہ ان کی مستقل ملازمت ہو۔ حکیم صاحب نے اس بات کو محسوس کیا، اور ذیل کی رباعی لکھ کر نوازی نامی خیاط کے ہاتھ نواب محمد یار خاں امیر کو بھیج دی۔

جناب عالی کرا آج غسل صحت کا	ہر اک ندیم کے تئیں عطر اور پان ملے
بجائے خلعت بست پارچہ اسپ عراق	حکیم جی کو بھی کہتے ہیں تین تھان ملے

فصول کا یہ مخطوطہ تاریخ طب آخری عہد مغلیہ کی تہذیب اور حالات روہیلکھنڈ سے دلچسپی لینے والوں کے لیے بہت کارآمد ہے، اس قسم کے فنی مخطوطات کی اشاعت ہر طبقہ کے لئے مفید ہے، رام پور کے طبی ذخیرے میں اس قسم کے جواہر پارے اور بہت سی بیاضیں محفوظ ہیں۔

حوالے

فصول فیض اللہ خانی فہرست فارسی مخطوطات فن طب نمبر ۱۳۸۶

تذکرۂ کاملان رامپور، از حافظ احمد علی شوق مطبوعہ ۱۹۲۹ء ص ۶۷

فہرست زرد فارسی قلمی صفحہ ۱۵۴ مرتبہ مولوی عبید اللہ بسمل رضا علی خاں طب نمبر ۲۲۰ سابق

تاریخ آئینہ تصوف مولفہ شاہ محمد حسن صابری مطبوعہ ۱۳۱۱ھ صفحہ ۴۹۴۔

حقیقت گلزار صابری " " مطبوعہ ۱۹۳۶ء صفحہ ۹۴۳

پروفیسر محمد اسلم لاہوری کا تبصرہ شریف التواریخ نوشاہی پر برہان دہلی جنوری ۱۹۶۳ء

شاہ دولہ کا تذکرہ رسالہ صاحبیہ مؤلف شہزادی جہاں آرا، مرتبہ محمد اسلم لاہوری صفحہ ۶۱

وقائع عبد القادر خانی مخطوطہ ______ مطبوعہ علم و عمل ۱۹۶۰ء مرتبہ ایوب قادری، صفحہ ۴۳

اخبار الصنادید ج اول مطبوعہ ۱۹۱۸ء مؤلف نجم الغنی خاں صفحہ ۶۰۱

اطبائے عہد مغلیہ از حکیم سید کوثر چاند پوری، مطبوعہ ۱۹۵۵ء صفحہ ۵۰

حیات حافظ رحمت خاں مؤلفہ الطاف حسین بریلوی مطبوعہ ۱۹۳۳ء صفحہ ۲۸۵

مجمع الکرامات رضیہ امام الدین خاں، صفحہ ۴۵

فرزند غوث الاعظم از میکش اکبر آبادی، مطبوعہ ۱۹۶۶ء صفحہ ۱۵۶

منظومات جنگ در جونا، مخطوطات فارسی

الواحُ الصَّنادید

از

جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب استاد شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

(۲)

بھاٹی دروازے سے باہر سرکلر روڈ اور گنج بخش روڈ کے اتصال پر لاہور کا مرکزی امام باڑہ واقع ہے جو "کربلائے گامے شاہ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس امام باڑے کے احاطے میں اردو زبان کے عظیم انشاء پرداز، سخندان فارس، آب حیات اور دربار اکبری کے مصنف مولوی محمد حسین آزاد کی قبر ہے۔ ان کے فرزند آغا محمد ابراہیم نے قبر پر ایک قبہ تعمیر کروا دیا تھا، قبے کی پیشانی پر "مقبرۂ آزاد" اور "کاترنیات آغا محمد ابراہیم بن شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد رحمۃ اللہ علیہ" ۱۳۲۸ھ مرقوم ہے، آزاد کی قبر کے سرہانے لوح نصب نہیں کی گئی البتہ تعویذ پر یہ عبارت درج ہے:

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

علی ولی اللہ وصی رسول اللہ

مرقد شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کہ بتاریخ ہژدہم ذی الحج ۱۲۴۵ھ تولد شدہ و بشب نہم محرم الحرام ۱۳۲۸ھ ازیں دار فانی رحلت فرمود، قطعۂ تاریخ وفات و بنائے مزار جناب شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی نور اللہ مرقدہٗ

جناب قبلہ محمد حسین آزاد آہ — کہ بود عالم استاد نثر و نظم نگار

بہ بے نظیر تصانیف نامی دوراں — بعلم و فضل چو پدرش شہیر و مشہور دیار

بشعر شعرے شمارش فزا ہمہ شعرا — بہ نثر نثرہ شمارش نشا مہر نثار

یگانہ موجد نو طرز اردو لٹریچر — کہ گشت خاتمہ آں زر علمش یکبار

وفات مرحب تا سوئے حرم یافت — شد از غروب چناں مہر تیرہ و تار

رشید پسرش آغا محمد ابراہیم — بساخت در لاہور ایں مزار پُر انوار

پئے وفات دنیائے مزار اقدس باد — بجز اسم تاریخ اے متین دل افگار

بہ تیر تعمیہ و تخرجہ سر دش گفت

وفات استاد آزاد و ہم بنائے مزار — سنہ ۱۳۲۵ھ

از ہیچداں اندوہگیں خلیفہ سید محمد محسن متینؔ،

حضرت میاں میر لاہوریؒ کے احاطۂ مزار کے اندر باؤنڈری وال کے ساتھ مشہور ادیب اور مورخ شیخ محمد اکرام کی قبر ہے، ان کی تصانیف میں سے آب کوثر، رود کوثر، موج کوثر، ارمغان غالب اور نوائے پاک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے :-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

شیخ محمد اکرام

تاریخ پیدائش — ۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۰۸ء

تاریخ وفات — ۱۷ جنوری سنہ ۱۹۷۳ء

انا للہ و انا الیہ راجعون

شیخ محمد اکرام مرحوم کی قبر سے اندازاً پندرہ میٹر جانب جنوب مشرق لاہور کے ایک

نامور شاعر اکبر لاہوری جو خواب ابدی ہیں، اُن کی لوحِ مزار پر جو عبارت کندہ ہے، وہ اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھی گئی ہے، وہو ہذا:-

یا اللہ یا محمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اکبر یار ملنگ علی دا

پنجاب دے منّے پرمنّے[۱] شاعر، ادیب، مقرر، وکیل تے[۲] درویش

بابے لاہور چوہدری محمد اکبر خان بھٹی (اکبر لاہوری) دی

آخری آرامگاہ

بزمِ احباب کو چمکایا ہے میں نے برسوں
کم ہوئی تھوڑی سی دنیا کی ضیا میرے بعد
اپنی اردو کے استاد ہیں میر و غالب
میں نے اکبر وہ کہا جو کہ ہوا میرے بعد

(اکبر لاہوری)

تریخ[۳] پیدایش : ۵ر جولائی ۱۹۱۰ء

تریخ وفات : ۲۲ر ستمبر ۱۹۷۲ء

بروز جمعۃ الوداع

بمطابق ۲۸ر رمضان المبارک ۱۳۹۲ھ

۱؎ منّے پرمنّے بمعنی مسلّمہ ۲؎ تے ۔ بمعنی کے،

۳؎ پنجابی زبان میں تاریخ کی املا تریخ ہے،

نمونہ دلیس پنجاب محاذ - سابجهان پبلی کیشنز
۹ - اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

اکبر لاہوری اردو اور پنجابی کے بڑے بلند پایہ شاعر تھے، راقم الحروف نے انھیں کئی با
اعروں میں سُنا ہے، انھوں نے "اکبر کہانیاں" کے عنوان سے ایک کتاب اپنی یادگار
ڑی ہے،

اسی احاطہ قبور کے جنوب مشرقی گوشے میں ایک پختہ مقبرہ کے اندر خواجہ حسن نظامی
دی کی صاحبزادی حور بانو ابدی نیند سو رہی ہیں، ان کے مقبرہ کی دیواروں پر بڑی
چوڑی عبارتیں درج ہیں، جو خواجہ حسن نظامی کے قلم کا شاہکار ہیں، مقبرہ کی غربی
ار پر یہ عبارات کندہ ہیں،

قبر سیدہ حور بانو بنت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی

۳۵ ویں پشت میں اولاد علی — اٹھارہویں پشت میں جانشین
۱۰ ویں پشت میں بابا فرید گنج شکرؒ — محبوب الٰہی خواجہ سید محمد امام
کی نواسی، — کی پوتی

عمر ۴۹ سال ولادت دہلی وفات لاہور
مرض مصائب انقلاب، پیکر صبر بے اولاد خوش تقریر خوش تحریر
سلوک درویشی میں کاملہ، حضرت میاں میرؒ کی مہمان

تربت خاموش

ہو قبر لب اس جگہ وہ عفت خاموش — آغوش میں ہو جس کو لئے رحمت خاموش
تربت یہ زیارت گہ حوران جہاں ہو — آسودۂ خواب اس میں ہو اک عصمت خاموش

آتے ہیں ملائک جہاں نظروں کو جھکا کر　یہ خواب گہ حور ہے اک جنت خاموش
نام اپنے اب جد کا کیا جس نے درخشاں　آسودہ ہے اس قبر میں یہ طلعت خاموش
مدفون یہاں آل نبی کا ہے خزانہ　یہ پیکر خاموشی کی ہے تربت خاموش"
(از نازش رضوی مرحوم)　۱۹۴۹ء

مقبرہ کی غربی دیوار پر یہ عبارت مرقوم ہے :-

"اس خاک کی چھپرکھٹ میں خواجہ حسن نظامی دہلوی کی بیٹی حور بانو ابدی نیند سو رہی ہے،
پانچ سال کی عمر تھی کہ اس کی ماں حبیب بانو نے وفات پائی، باپ نے جوانی تک پالا،
۱۹۴۷ء کے انقلاب دہلی کے مصائب برداشت کرکے باپ کے ساتھ حیدرآباد
میں ایک سال رہی، پھر شوہر کے ساتھ پنجاب میں گئی ۱۱ ذی قعدہ ۱۳۶۸ھ
۴ ستمبر ۱۹۴۹ء کو لاہور کے ہسپتال میں وفات پائی،
چھوٹے بھائی خواجہ حسین نظامی اور مرید پاک دل محمد حسین نظامی اور حکیم منزل
شاہ نظامی اور سید مبارک علی نظامی نے تیمارداری کی، باپ دہلی میں نظر بند تھے
آخر وقت بیٹی کو نہ دیکھ سکے، پیر سید علی شاہ صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت
میاں میر صاحب نے اس بیکس پردیسی کو قیامت تک سونے کے لئے گھر دیا، باپ نے
"بیٹی کی کہانی باپ کی زبانی" کتاب شائع کی،

پاک پٹن شریف میں اس کے دادا حضرت مولانا بدرالدین اسحٰق اور نانا حضرت
بابا فریدالدین گنج شکرؒ اور دہلی میں سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین
اولیاء محبوب الٰہیؒ اور ان کے فرزند معنوی اور جانشین حضرت مولانا خواجہ
سید محمد امام اور اس کی ماں حبیب بانو (اور اب حور بانو مرحومہ کو بھی) سے
پالنے والے اور اس کے باپ استاد اور مرشد کے فرائض انجام دینے والے حضرت

خواجہ حسن نظامی (حسن ثانی نظامی) کی ارواح ان کی مونس ہیں۔ لکھنے والا حسن نظامی

...... ۸۰ برس کا بڈھا بیٹی کے ہجر میں بیقرار ہے، مگر اپنی صابر
بیٹی کی بہادری پر فخر کرنے والا ہے، ۱۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو دہلی درگاہ کی بستی
میں جب فوج کے سپاہی اور بانو کے گھر میں ہتھیاروں کی تلاشی لینے آئے تو
اس نے مردانہ ہمت سے اپنے ہاتھ کی تسبیح دکھا کر کہا کہ ہمارا ہتھیار خدا کی یاد
اور یہ تسبیح ہے، باہر جاؤ، میں تمھاری بندوقوں سے نہیں ڈرتی، دکھیا بیٹی
تو ساری عمر شوہر کے گھر میں آرام سے رہی اور تو نے صبر کرکے مجھے صبر سکھایا،
اب حشر تک آرام سے سوتی رہ، زندگی اک خواب ہے، اور موت بڑی بیداری ہے"

حسن نظامی دہلوی بقلم پاک دل محمد حسین محرم شاہ نظامی عید میلاد
۱۳۶۹ھ مقام حجرہ خواجہ نظام الدین اولیا، محبوب الہیؒ دہلی،

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے جنوبی دروازے سے باہر نکلیں تو دائیں
ہاتھ ایک چبوترے پر گنتی کی چند قبریں ہیں، ان قبروں میں سب سے نمایاں قبر مشہور مزاح نگار
اور ناولسٹ شوکت تھانوی کی ہے،

شوکت مرحوم بڑے زود نویس تھے، ان کی تصانیف میں سے منشی جی، مولانا، قاضی جی،
بڑے بھیا، بقراط، قاعدہ بے قاعدہ، بکواس وغیرہ وغیرہ جی ہاں بیٹے ہیں خبطی، سودیا یا
مجھے خرید لو، داماد، سودیشی ریل، کبھی کبھی، کچھ یادیں، کچھ باتیں، مکرر ارشاد، شیش محل
راجہ صاحب، بگلی، خانم خاں، انشا اللہ، الٹ پھیر، کارٹون، ہمہ خاتون، شوکتیات،
نیلو فر، مسٹرہ ۵، برق تبسم، سپنے، چار سو بیس، لاہوریات ...... غالب
ڈرامے، سسرال، دل پھینک، دنیائے تبسم، بیگم صاحبہ اور بار خاطر خاص طور پر قابل ذکر ہیں

شوکت تھانوی کی لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ،

شہنشاہ ظرافت ادیب و صحافی

محمد عمر شوکت تھانوی تمغۂ امتیاز

بعمر ۵۹ سال ۴ مئی ۱۹۶۳ء مطابق ۹ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ

کو لاہور میں رحلت فرما گئے،

قطعۂ تاریخ وفات

از ظریف جبل پوری

بذلہ سنج و مرد خوش اطوار شوکت تھانوی　　اب کہاں وہ ابر گوہر بار شوکت تھانوی
عیسوی ہجری ہوا اک مصرع تاریخ وفات　　"شہنشاہ سخن نثار شوکت تھانوی"

۱۹۶۳ء + ۱۳۸۲ھ = ۳۳۴۵ ۳۳۴۵

شوکت تھانوی کی آخری آرامگاہ سے جانب مشرق اندازاً چالیس میٹر کے فاصلہ پر لاہور کے نامور حکیم محمد موسیٰ امرتسری سکریٹری مجلس رضا کے والد بزرگوار حکیم فقیر محمد چشتی کی قبر ہے، مرحوم بڑے اونچے پایہ کے طبیب تھے ان کے فرزند حکیم محمد موسیٰ نے ان کی بیاض شائع کر دی ہے جس میں بڑی مجرب اور بے شمار نسخے درج ہیں حکیم صاحب کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ

فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

مزارِ پُر انوار

فخر الاطبا عالی جناب حکیم فقیر محمد چشتی نظامی امرتسری نوراللہ مرقدہ ثم لاہوری

بتاریخ ۲۲ اپریل ۱۹۵۲ء مطابق ۲۷ رجب المرجب ۱۳۷۱ھ

در شبِ معراج جان بجان آفرین تسلیم نمود

قطعۂ تاریخ

رفت از جہاں فقیر محمد کہ بیگماں | در ہر دو علم ماہر و وہاج آمدہ
گر گینہ پوش ماند مثال عمر بعمر | در دستش ارچہ سندس و دیباج آمدہ
شیخ المعالجات کہ بُد عارف الہ | ہر گام او بجادۂ منہاج آمدہ

تاریخ رحلتش بدل ناجی حزیں

حضرت نجیب در شبِ معراج آمدہ

۱۳۷۱ھ

یہ قطعۂ تاریخ لاہور کے مشہور تاریخ گو پیر غلام دستگیر نامی صاحب "تاریخ جلیلہ" کا لکھا ہوا ہے۔ پیر صاحب درگاہ حضرت عبدالجلیل چوہڑ بندگی (م ۹۱۰ھ / ۱۵۰۵ء) کے سجادہ نشین اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔

حضرت میاں میرؒ کی درگاہ سے جانب مشرق چند قدم کے فاصلہ پر ایک وسیع و عریض تالاب کے وسط میں شاہزادہ داراشکوہ کی اہلیہ نادرہ بیگم بنت شہزادہ پرویز بن جہانگیر کا عالیشان مقبرہ ہنوز بڑی اچھی حالت میں موجود ہے۔ سہسرام میں شیر شاہ سوری کا مقبرہ، شیخوپورہ میں ہرن مینار، سیالکوٹ متصل بارہ دری اور امرتسر میں ہر مندر نادرہ بیگم کے مقبرہ کی طرح تالابوں کے وسط میں تعمیر کئے گئے ہیں۔

نادرہ بیگم کا انتقال سفر کے دوران میں بلوچستان میں ہوا تھا، داراشکوہ نے گل محمد بلوچ کی نگرانی میں اس کی میت تدفین کے لئے لاہور روانہ کی، اس سانحہ کے چند روز بعد داراشکوہ کو ملک جیون نے گرفتار کرکے دہلی بھیج دیا،

نادرہ بیگم کے مزار پر لوح نصب نہیں ہے، قبر کے تعویذ کے سرہانے بسم اللہ الرحمن الرحیم اور کلمۂ طیبہ منقوش ہے، اور پائنتی کی طرف یہ عبارت مرقوم ہے،

نادرہ بیگم

زوجہ

شہزادہ داراشکوہ

سنہ وفات ۱۰۶۹ھ ۱۶۵۹ء

نادرہ بیگم کے تالاب سے جانب جنوب ایک وسیع قبرستان ہے، اور اس کے وسط میں ایک بلند چبوترے پر حضرت میاں میرؒ کے خادم خاص اور محرم راز میاں نتھا کا مرقد [1] ... داراشکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں خاص طور پر ان کا ذکر کیا ہے، اور حضرت میاں میرؒ کے بارے میں کئی روایات ان کی زبانی نقل کی ہیں،

حضرت میاں میر کی رہائش انارکلی بازار میں پنجاب یونیورسٹی پریس کے قریب تھی، حضرت میاں نتھا، میاں میرؒ صاحب کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے، تو انھیں خانی پورہ میں دفن کیا گیا، حضرت میاں میرؒ نے اپنی وفات سے قبل میاں نتھا کی قبر سے قریب دفن ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، میاں میر کو بھی میاں نتھا کے ساتھ بڑی محبت تھی، میاں فنافی الشیخ ہو چکے تھے، اور میاں میرؒ کی وفات کے بعد انھیں نتھا کی بجائے

---

[1] اب یہ جگہ "میانمیر" کہلاتی ہے،

"ننھا" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ میاں ننھا کی لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مرکز تجلیات

حضرت میاں ننھا رحمۃ اللہ علیہ

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کے قابل فخر مرید

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو

ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

تاریخ وفات ۲۶ شعبان ۱۰۲۰ھ ۱۶۱۱ء بروز پنجشنبہ[1]

۱۴ اپریل سنہ ۱۹۷۶ء کو پتھر نصب ہوا

میاں میر سے ریلوے اسٹیشن کی طرف آتے ہوئے گڑھی شاہو کے چوک میں جامعہ نعیمیہ کے عقب میں ایک بڑا قبرستان ہے، جو قبرستان بی بیاں پاکدامناں" کے نام سے موسوم ہے، یہ بی بیاں حضرت سید احمد توختہ ترمذی (م ۶۰۲ھ) کی صاحبزادیاں تھیں، اور ان کے نام بی بی تاج، بی بی حاج، اور بی بی گوہر بتائے جاتے ہیں، آج بھی اکبری دروازہ کے اندر ایک محلہ چلہ بی بیاں کے نام سے موجود ہے جس میں ان کی چلہ گاہ اور اس سے قریب میر غلام دستگیر نامی مرحوم کے مکان کے عقبی صحن میں حضرت توختہ ترمذیؒ کا مزار محفوظ ہے، برطانوی عہد میں شیعہ حضرات نے بی بیاں پاکدامناں کے مزار پر قبضہ کر کے یہ مشہور کر دیا کہ یہ بی بیاں

---

[1] سال ۱۰۲۰ھ مطابق ۱۶۱۱ء ہونا چاہیے، لیکن سنگ تراش نے غلطی سے ۱۶۰۷ء کندہ کر دیا ہے، جو صحیح نہیں ہے، میں نے صحیح سنہ لکھ دیا ہے،

میدانِ کربلا سے ساتوں رات یہاں چلی آئیں اور جب پہنچیں تو انھوں نے بارگاہِ خداوندی میں التجا کی کہ نامحرموں کی نظریں ان پر پڑیں گی، اس لئے انھیں زندہ درگور کر دے چنانچہ زمین پھٹی اور وہ اس کے اندر سما گئیں، اب ان کے مزارات سے متصل ایک امام بارہ تعمیر ہوگیا کسی زمانہ میں یہ قبرستان بہت وسیع تھا اب لوگوں نے قبریں صاف کرکے مکانات بنالئے ہیں، اور قبرستان کئی حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے، ایک مکان کے باہر۔ احاطہ قبرستان شیخ غلام محمد شیخ غلام علی قوم ککے زئی کی تختی نصب ہے، اس مکان کے عقبی صحن میں لاہور کے معروف پبلشر شیخ محمد اشرف کی قبر ہے، اُن کی کچی قبر کے سرہانے لوہے کی ایک پلیٹ پر یہ عبارت مرقوم ہے،

۷۸۶

شیخ محمد اشرف مرحوم ولد غلام محمد

تاریخ پیدائش ۱۹۰۳ء، تاریخ وفات بروز جمعہ ۹ رمئی ۱۹۸۰ء

۹ بجے شب

شیخ محمد اشرف مسلکاً اہلحدیث تھے، ان کے دو فرزند ان کی زندگی ہی میں فوت ہوگئے تھے، ان کی بیٹی اور ایک پوتی سے اولاد کا سلسلہ چلا ہے،

قبرستان بی بیاں پاکدامناں میں ایک ٹیلہ چاروں طرف سے مکانوں میں گھر کر رہ گیا ہے، اس ٹیلے کے شمال مشرقی گوشے میں علامہ اقبال کی اہلیہ اور جاوید اقبال کی والدہ کی قبر ہے، شروع میں اس قبر کے گرد سیمنٹ کی جالیاں لگوائی تھیں، جو اب ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں،

اس قبر کے سرہانے لوح نصب نہیں ہے، تعویذ پر یہ عبارت مرقوم ہے:

ھوالباقی

سردار بیگم

اہلیہ

علامہ محمد اقبال

تاریخ وفات

۲۳ رمئی ۱۹۳۵ء

راہی سوئے فردوس ہوئی مادر جاوید
لالے کا خیاباں ہے میرا سینۂ پرداغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار
اقبال نے تاریخ کہی "سرمہ مازاغ"

سنہ ۱۳۵۴ھ

قبرستان بی بی جان پاکدامنان میں جنازہ گاہ سے باہر نواب زادہ لیاقت علی خاں کے برادر بزرگ نواب سجاد علی خاں کی قبر ہے، ان کا ذکر اور تصویر تذکرۂ رؤسائے پنجاب موجود ہے، ان کی شکل و صورت حیرت انگیز حد تک نواب زادہ لیاقت علی خاں سے ملتی ہے، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے :-

یا اللہ　　　　یا محمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

آخری آرامگاہ

نواب محمد سجاد علی خاں

رکن الدولہ شمشیر جنگ آف کرنال

برادر بزرگ نواب زادہ لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان

تاریخ پیدائش ۱۸۹۲ء بمقام کرنال

تاریخ وفات ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء بمطابق ۹ ربیع الاول ۱۳۹۸ھ

انا للہ وانا الیہ راجعون

چونگی سے جو سڑک لٹن روڈ کی طرف جاتی ہے اسے بہاول شیر روڈ کہتے ہیں اس سڑک کے بائیں جانب آبادی ہے اور دائیں جانب قبرستان میانی کا ایک خطہ ہے اس خطے میں سڑک سے اندازاً سو میٹر کے فاصلہ پر ایک چاردیواری کے اندر سابق ریاست حیدرآباد دکن کے وزیر خزانہ نواب فخر یار جنگ محو خواب ابدی ہیں،

نواب صاحب کا اصل وطن دھوگڑی ضلع جالندھر تھا، لیکن وہ ملازمت کے سلسلہ میں مدتوں حیدرآباد میں رہے، ان کے فرزند نواب مشتاق احمد خاں بھی نظام ریلوے میں بڑے اونچے عہدے پر فائز رہے، اور قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصہ تک نظام کے سفارتی نمایندے کے طور پر کراچی میں مقیم رہے، انھوں نے اپنے والد کے احوال و آثار "حیات فخر" کے عنوان سے شائع کئے ہیں، اس کتاب سے اس عہد کے حیدرآباد کی معاشرت اور درباری سازشوں پر روشنی پڑتی ہے، نواب فخر یار جنگ کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

فخر الدین احمد خاں فخر یار جنگ

ختم المغفور

سنہ ۱۳۷۵ھ

اگرچہ بود در دنیا امیرے	ولیکن پیش حق ہر دم فقیرے
ازاں تاریخ فخر الدین فقیرے	بود از فضل در جنت امیرے

سنہ ۱۳۷۵ھ

روز جمعہ ۱۱ ذی الحجہ سنہ ۱۳۷۵ھ

میکلوڈ روڈ لاہور کی بڑی معروف شاہراہ ہے، جو ابتدائی برطانوی دور کے اس انگریز گورنر کے نام منسوب ہے، جس کے بارے میں مرزا غالب نے کہا تھا:

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام	فرمانروائے کشور پنجاب کو سلام
حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس	نواب مستطاب امیر شہ احتشام
جم مرتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقت رزم	ترک فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حسام

اسی میکلوڈ روڈ پر صنوبر سینما کے سامنے شیعہ حضرات کا قبرستان ہے، جو "مومن پورہ" کے نام سے موسوم ہے، اس قبرستان کے صدر دروازہ سے اندر داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ چند قدم کے فاصلہ پر مشہور تاریخ داں سید عبدالقادر کی قبر ہے، موصوف نے اپنے شاگرد رشید پروفیسر شجاع الدین مرحوم کے ساتھ مل کر تاریخ اسلام اور تاریخ ہند و پاکستان لکھی ہیں، ان کے علاوہ تاریخ انگلستان بھی ان کی تصنیف ہے، اپنے موضوع پر اردو زبان میں یہ بہترین کتاب ہے، سید عبدالقادر کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آخری آرامگاہ

سید عبدالقادر ایم اے

پروفیسر تاریخ و پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور

وفات

اتوار ۲۲ جنوری ۱۹۵۶ء ۸ جمادی الثانی ۱۳۷۵ھ

فکر و تحقیق کا وہ حاصل تھے مخزن علم صاحب دل تھے

ان سے قائم تھا وقار ملت کا آبروئے وطن کے حامل تھے

رہگذار حیات شاہد ہے ہر قدم پر وہ شمع منزل تھے

بزم ہستی سے اٹھ گئے صد حیف

فن تاریخ میں وہ کامل تھے

۱۹۵۶ء

سید عبدالقادر کی قبر سے پندرہ بیس قدم کے فاصلہ پر جانب مشرق قبرستان کی شمالی دیوار کے قریب سید امتیاز علی تاج محو خواب ابدی ہیں، اُن کے ڈرامے انارکلی کو شہرت دوام ملی ہے، انھوں نے آرام، حباب، رونق، عزیز، مراد کے ڈرامے مرتب کر کے طبع کئے تھے، وہ بڑے اچھے مترجم تھے، ان کے تراجم میں سے محاصرہ، غرناطہ، آزاد، آرا اور شاہکار، تصادیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں تاج صاحب نے بھارت سپوت کے عنوان سے گاندھی جی کی سوانح حیات بھی لکھی تھی، قرطبہ کا قاضی اور خورشید بھی ان کی مشہور کتابیں ہیں،

تاج کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے، اس پر یہ عبارت مرقوم ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یاایتھا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضیة مرضیة

مرقد

سید امتیاز علی تاج

ولادت :- ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء

شہادت ۱۹ اپریل ۱۹۷۰ء

باغ جنت میں شگفتہ ہو ترے دل کی کلی

تجھ کو عقبیٰ میں ملے قرب حسین ابن علی

۱۳۹۰ھ

تاج صاحب کی قبر سے متصل جانب مشرق ان کی والدہ محمدی بیگم کا مزار ہے، مرحومہ تہذیب نسواں کی مدیرہ تھیں، ان کی تصانیف میں سے خانہ داری، انمول موتی اور نعمت خانہ قابل ذکر ہیں۔ محمدی بیگم کی لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کل من علیھا فان

این است خوابگاہ محمدی بیگم اہلیہ سید ممتاز علی کہ خیلے جذبہ ہمدردی در دل داشت و درسود و بہبود دختران ہند محنتے بسیار کشید و برائے افادہ ایشاں صحیفہ ہفت روزہ تہذیب نسواں اجرا نمود پس از رنجوری شدید و علالت ... بعمر ۳۰ سال بمقام شملہ بتاریخ ۲ نومبر ۱۹۰۸ء رحلت کرد و حسب وصیت جسدش بہ لاہور آوردہ سپرد خاک نمودند

انا للہ وانا الیہ راجعون

مومن پورہ کی جنوبی دیوار کے ساتھ مشہور شاعر و ماہر تعلیم سید عابد علی عابد کی قبر ہے

سید صاحب کی تصانیف میں سے ان کا مجموعۂ کلام شب نگار بندوں، دکھ سکھ، اور سہاگ (ناول) شمع (ناول) طلسمات (افسانے) ید بیضا، (ڈرامے) یوسف شمالی افریقہ (جان گنتھر کی کتاب کا ترجمہ) بریشم عود، انتقاد، تلمیحات، اقبال، تنقیدی مضامین اور شعر اقبال خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

سید عابد علی عابد کی ایک غزل پیش خدمت ہے،

چپ بھی ہے ناگوار دنیا کو — کون سنتا جو بات ہم کرتے
ضبط غم پر ہیں لوگ ہم سے خفا — کیا گذرتی جو عرض غم کرتے
کس نے سیکھی صنم گری کی ادا — مر گئے ہم صنم صنم کرتے
یہی حسرت رہی کہ بدنام کہ ہم — سر کسی آستاں پہ خم کرتے
میرے شکووں پہ اس نے ہنس کے کہا — کس نے کی تھی وفا جو ہم کرتے
کچھ نہیں ان سے رسم و راہ نہیں — مدتیں ہو گئی ہیں غم کرتے

عابد کی ایک اور غزل کے تین شعر حاضر ہیں

آپ کو پاکئ داماں کا بڑا دعویٰ ہے — نہ دھلے خونِ شہیداں تو مزا آ جائے
نقش بندوں کو ہے یہ ناز کہ جیتی ہے تصویر — بول اٹھے صورتِ بے جاں تو مزا آ جائے
ساقیا تیری محفل میں تجھ اوں کا ہجوم — محفل افروز ہو انساں تو مزا آ جائے

عابد مرحوم کا یہ شعر زبان زد خلائق ہے،

آشنا سا نظر آیا رہزن — آپ کی راہ بڑی یاد آئی

مجھے خوب یاد ہے کہ ان کی وفات پر اخبارات نے صفحۂ اول پر ان کے یہ دو شعر جلی حروف میں شائع کیے تھے،

بات نرمی سے یوں وہ کرتے ہیں		جیسے لہرائے ریشمی آنچل
دم رخصت وہ چپ رہے عابد		آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

عابد کی لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے :۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرقد

سید عابد علی عابد

تاریخ وفات

۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء

ہم زباں چپ ہو گئے ہم داستاں چپ ہو گئے
کیسے کیسے نغمہ آرا ناگہاں چپ ہو گئے

اسی قبرستان کی مغربی دیوار کے قریب، سید عابد علی عابد کی قبر سے اندازاً بیس میٹر جانب شمال مغرب مشہور شاعر ناصر کاظمی کی قبر ہے، ناصر کاظمی کا مجموعۂ کلام "نشاط خواب" "پہلی بارش"، "برگ نے"، اور دیوان کی صورت میں طبع ہو چکا ہے۔ موصوف انبالہ کے رہنے والے تھے، اور اس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے،

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے،
میں ہوں اس لٹے ہوئے قریے کی روشنی

تقسیم ملک کے موقع پر رونما ہونے والے حادثات کا ان کے ذہن پر بڑا اثر تھا۔ قتل و غارت کے واقعات سے متاثر ہو کر انھوں نے کہا تھا :-

شہر در شہر گھر جلائے گئے،		یوں بھی جشن طرب منائے گئے

ناصر کا یہ شعر تو دل میں رکھ لینے کے لائق ہے،۔

یادوں کی سیڑھی سے ناصر رات اک سایہ سا اترا تھا،

ناصر کی ایک غزل کے تین شعر پیش خدمت ہیں:

وہ میکدے کو جگانے والا وہ رات کی نیند اڑانے والا
یہ آج کیا اس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ

وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

وہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ

ناصر کی لوح مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علی محمد فاطمہ

حسن دائم آباد رہے گی دنیا، حسین

ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

ناصر کاظمی

ولد

سید محمد سلطان کاظمی مرحوم

تاریخ پیدائش : ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء انبالہ

تاریخ وفات : ۲ مارچ ۱۹۷۲ء لاہور

میں جس وقت ناصر کی قبر کا کتبہ نقل کر رہا تھا، تو کئی بار میری زبان پر ان کا یہ شعر آیا،

گہری نیند سے جاگو ناصر

وہ دیکھو سورج نکلا ہے

مطبوعات جدیدہ

مسلمانوں کی جدوجہد آزادی:۔ مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۴۰۲، قیمت ۲۰ روپیہ، پتہ مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار، لاہور،

یہ کتاب دراصل تحریک پاکستان کی سرگزشت ہے، جس کی جڑیں گذشتہ کئی صدیوں تک پھیلی ہوئی ہیں، اس لئے مصنف نے اس کا آغاز اکبری دور کے فتنہ دین الٰہی سے کیا ہے جو مسلمانوں کو دوسری قوموں میں خلط ملط کر دیتا، اگر حضرت مجدد الف ثانی ہند میں سراپا ملت کے نگہباں بن کر نمودار نہ ہوئے ہوتے، پھر مغلوں کا چراغ ٹمٹمانے لگا اور انگریزوں کا تسلط بڑھا تو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی علمی، دینی اور سیاسی تحریک نے مسلمانوں کو بڑا سہارا دیا، ان کے اور ان کی اولاد کے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقا کی جدوجہد کا آغاز ہوا، اس کے علاوہ بنگال میں بھی بعض اسلامی تحریکیں وجود میں آئیں، مصنف نے ان سب کا جائزہ لیکر ان کے سیاسی مقاصد اور اثرات کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے، انھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ پلاسی، ٹیپو سلطان کی جدوجہد اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ذکر کیا ہے اور ان کے اثرات ونتائج نیز ان میں مسلمانوں کی سرگرمی دکھائی ہے، سرسید کی تحریک کی مختلف نوعیتوں تعلیمی، ادبی، سیاسی وغیرہ پر بھی اچھی بحث کی ہے، آخر میں بیسویں صدی کی ابتدا سے پاکستان کے وجود میں آنے تک کی مسلمانوں کی قومی و سیاسی جدوجہد کا مرقع پیش کیا گیا ہے،

اور ملک کے عام سیاسی میلانات و رجحانات کے علاوہ عالمِ اسلام کی صورتِ حال اور علمائے ہند کی سیاسی و دینی تحریکوں، رد عیسائیت، ریشمی رومال اور خلافت وغیرہ کا پس منظر بھی بیان کیا ہے اس کتاب میں جہاں مسلمانوں کی جدوجہد اور ان کی بیداری میں اقبال کا حصہ، مسلم لیگ کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں، وہاں ان واقعات اور ہندوؤں کی تحریکوں کا بھی ذکر آیا ہے جو مسلمانوں کے خلاف نفرت و اشتعال کا باعث ہوئیں اور جن کی وجہ سے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان خلیج بڑھتی گئی، اور مسلمان کانگریس سے دور اور مسلم لیگ سے قریب ہوتے گئے، اس قسم کے بعض عنوانات سے کتاب کی نوعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اردو ہندی تنازعہ، تقسیمِ بنگال، جداگانہ انتخابات، مسلم لیگ کا قیام، میثاقِ لکھنؤ، نہرو رپورٹ، گول میز کانفرنس، ۱۹۳۵ء کا قانون اور مسلم لیگ کا ردِ عمل، مسلم لیگ کی تشکیلِ نو، ۱۹۳۷ء کے انتخابات، کرپس مشن کی تجاویز، ہندوستان چھوڑ دو، جناح گاندھی گفت و شنید، شملہ کانفرنس، عام انتخابات، کیبنٹ مشن کی تجاویز، عبوری حکومت، دستور ساز اسمبلی، لندن کانفرنس سے مسلم لیگ کا بائیکاٹ، مسلم کش فسادات وغیرہ، مصنف نے قیامِ پاکستان کے بعد پیدا ہونے والے جن اہم مسائل کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں، بھارت کی مسلم اقلیتیں، مسئلہ کشمیر، سقوطِ حیدرآباد، جوناگڑھ اور دیگر مسلم ریاستیں، قراردادِ مقاصد، تحریکِ پاکستان بطور تحریکِ اتحادِ اسلامی، قیامِ پاکستان کا اثر عالمِ اسلام پر، کتاب کے آخر میں ان مختلف عناصر کا تذکرہ ہے، جنھوں نے پاکستان کی تحریک میں حصہ لیا تھا، ان میں صحافیوں، شاعروں، ادیبوں، افسانہ نگاروں، طلبہ، خواتین اور دوزبان کے علاوہ مندرجہ ذیل علما کا علیحدہ تذکرہ ہے۔ (۱) مولانا اشرف علی تھانوی (۲) مولانا شبیر احمد عثمانی (۳) مولانا ظفر احمد عثمانی اور (۴) مولانا مفتی محمد شفیع اور سب کے آخر میں ستائیس قائدین کا مختصر حال دیا ہے اور قیامِ پاکستان میں ان کی مساعی بھی دکھائی ہیں، کتاب کے نقطۂ نظر سے چاہے کسی کو اتفاق نہ ہو مگر یہ گذشتہ سو برس کے واقعات کا اچھا ماخذ ہے، اور اس سے بہت سی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں، مگر چونکہ یہ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے اس لئے اس میں بڑے اختصار سے کام لیا گیا ہے، اس کی ترتیب میں بھی کچھ خامیاں ہیں، مصنف اسے ابواب پر مرتب کرتے تو اس سے افادیت زیادہ بڑھ جاتی۔

مخطوطات کتب خانہ ہمدرد (جلد اول) مرتبہ جناب فضل اللہ فاروقی ندوی،
تقطیع کلاں کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۴۸، مجلد مع گرد پوش،
قیمت:- ۳۰ روپیہ، پتہ:- ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی، نمبر ۱۸

ہندوستان میں حکیم عبدالحمید کی طرح پاکستان میں ان کے برادر خورد حکیم حافظ محمد سعید دہلوی طب یونانی کا چراغ مخالف ہواؤں میں روشن کئے ہوئے ہیں جس کی لو ان کی مساعی جمیلہ سے روز بروز تیز ہو رہی ہے، حکیم محمد سعید بڑے علم دوست بھی ہیں، اور اچھا علمی ذوق رکھنے کے علاوہ تصنیف و تالیف کا عمدہ سلیقہ رکھتے ہیں، خدمت خلق، نفع رسانی اور فیض بخشی ان کی عادت ثانیہ بن گئی ہے، ان کی علمی دلچسپی کا ایک مظہر ان کا شاندار کتبخانہ بھی ہے، جو مختلف الفنون مطبوعات اور بیش قیمت نوادرات اور مخطوطات پر مشتمل ہے حکیم صاحب کو مختلف ملکوں میں تشریف لیجانے اور وہاں کے کتبخانوں کو دیکھنے کا برابر موقع ملتا رہتا ہے، اس لئے انھیں بھی کتب خانوں کے بارہ میں مفید تجربے، اور جدید معلومات ہو گئے ہیں، اور وہ اپنے کتبخانہ کو بھی جدید طرز پر آراستہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ مطالعہ و تحقیق کرنے والوں کو پوری سہولت بہم پہنچا سکیں، اسی غرض سے انھوں نے اپنے کتبخانہ کے مشمولات کی مختلف فہرستیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، جس کے تحت مخطوطات کی توضیحی فہرستوں پر کام شروع کر دیا گیا، زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، جو کتبخانہ کے صرف طبی مخطوطات کی فہرست ہے، یہ بھی حکیم کی خوش مذاقی ہے کہ اس کام کے لئے انھوں نے مولوی فضل اللہ ندوی کا انتخاب کیا جو گذشتہ کئی برس سے مختلف کتبخانوں سے وابستہ رہے ہیں، اور مخطوطات شناسی اور فہرست سازی کے کام میں مہارت اور تجربہ رکھتے ہیں، انھوں نے محنت اور سلیقہ سے مندرجہ ذیل پانچ عنوانات کے تحت حروف تہجی کی ترتیب سے مخطوطات کے بارہ میں ضروری معلومات تحریر کی ہیں (۱) کلیات طب (۲)

(۲) علم الادویہ قرابادین (۳) امراض و معالجات (۴) مجموعات (۵) ما سلوم الاسم۔ سائنس کے اصول
ہر ہر کتاب کا نام لکھ کر نیچے جدول میں مصنف و کاتب کا نام، مخطوطہ کی زبان، خط کی قسم، ورقوں اور
سطروں کی تعداد، تقطیع، لوح اور جدول کی وضاحت کی ہے، اس کے بعد مصنف اور کتاب
کے بارہ میں اہم معلومات، کتاب کے مندرجات اور ابتدا، خاتمہ اور ترقیمہ کی عبارت دی ہے،
ہر کتاب کا نام انگریزی میں بھی لکھا ہے، اور جن پر مہریں ہیں ان کی صراحت بھی کی ہے، فہرست کے
کے علاوہ کتاب کے اندر بھی کہیں کہیں اہم مخطوطات کا عکس دیا گیا ہے، شروع میں مرتب کے
قلم سے ایک مختصر دیباچہ بھی ہے، اس میں مسلمانوں کی علوم و فنون سے دلچسپی اور ان میں
ان کے اجتہادی کارنامے، حکیم صاحب کی ادب نوازی، اور کتب خانوں اور کتابوں سے
شغف کے علاوہ اہم مخطوطات کا تعارف کرایا ہے، پیش لفظ خود حکیم صاحب کے شگفتہ نگار قلم سے
ہے، اس فہرست کی اشاعت ایک مفید علمی خدمت ہے، جو خاص طور پر علم الابدان کا ذوق
رکھنے والوں کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہے۔

اعلام و افکار: ۔ مرتبہ، جناب سبط محمد نقوی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت
و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۵، مجلد مع رنگین گردپوش، قیمت بیس روپے، پتہ (۱) دانش محل
امین الدولہ پارک لکھنؤ وغیرہ۔

یہ گیارہ ادبی، تنقیدی اور سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے مضمون "امیر فتح اللہ شیرازی"
میں مولوی محمد حسین آزاد کے یہاں سے چلے ہوئے ایک غلط بیان کی تصحیح کر کے تفسیر منہج الصادقین
کو ان کے بجائے ان کے ہم نام ملا فتح اللہ کاشانی کا کارنامہ کمال قرار دیا ہے، اور ان التباسات
کو رفع کیا ہے، جن کی بنا پر دونوں کو ایک ہی شخصیت سمجھا گیا ہے، شیرازی کو ہندوستان بلانے کا
سہرا خواجہ وہ ارفانی کے سر ہے، ان کی اصل شہرت فارسی شاعر کی حیثیت سے ہے اکبر نے جب جا

پہلی بار انھیں اردو سخن سرا ثابت کیا ہے، نقوی صاحب کا دوسرا مضمون اس کی مزید شرح و توضیح
ایک مضمون ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی مرحوم کے مضمون کی شرح و تفصیل پر مبنی ہے، اس میں ذوالفقار
ماجھ درگا پرشاد مہر سندیلوی کے خاندانی حالات، ریاست و امارت اور مملکت علم و فن پر فرماں
کا ذکر ہے، دکنی اور ہندو فضلاء سے متعلق مفید مضامین درج ہیں، ایک میں منشی رام سہائے تمنا
لکھنوی کی سرگذشت حیات، تاریخ نگاری اور دوسرے علمی کمالات بیان کئے گئے ہیں، اور دو
میں اقلیتوں اور اردو زبان کے سرگرم محافظ پنڈت سندر لال کے حالات اور قومی، سیاسی او
علمی خدمات قلمبند کئے گئے ہیں، ایک اور مفید مضمون میں مفتی میر عباس شوستری سے مرزا غال
کی عقیدت مندی اور روابط کا ذکر ہے، میر ضمیر اور مرزا دبیر مرثیہ نگاری میں مشہور روزگار
مصنف نے استاد و شاگرد کے مراج ناموں کا جائزہ لیا ہے، مگر موازنہ و مقابلہ کے بغیر دونوں
منحول الموضوع اشعار پیش کر دئے ہیں، اور ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے اس بیان کو غلط اور خلاف واقعہ
کہ مرزا دبیر نے محمدؐ و آل محمدؐ کے علاوہ عام لوگوں کی مدح سے اپنی زبان آلودہ نہیں کی، تاجدار او
واجد علی شاہ اختر کی مثنوی حزن اختر کا تیسرا اڈیشن چند برس پہلے شائع ہوا تھا، مصنف نے اس
مرتب کے بعض اغلاط و مسامحات کی نشاندہی کی ہے، ایک مضمون فراق گورکھپوری کے ا
پر مشتمل ہے یہ ہندی سے ترجمہ کیا گیا اور دلچسپ ہے اس سے اردو اور ہندی کے بارہ میں ان
نقطۂ نظر کے علاوہ ان کی شاعری اور سیاسی زندگی کے بارہ میں بھی واقفیت ہوتی ہے، ایک
میں دار المصنفین کا ذکر خیر ہے، مگر اسکی حیثیت بھی انٹرویو کی ہے، اور اس سے موجودہ ناظم دار المصنفین
جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی یہاں سے وابستگی، تصنیفی زندگی اور دار المصنفین
سلسلۂ تاریخ ہند کے بارہ میں مفید اور دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں یہ سب مضامین
تحریر اور رعنائی بیان کے لحاظ سے بھی دلکش ہیں، تاہم مقامات "آہ و فغاں" سے یکسر خالی نہیں،

[illegible] کی چند کتابوں کے عکسی ایڈیشن

[illegible]

[illegible] ہندوستانی [illegible] میں مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبے جو صدارت [illegible] اور [illegible] تقریریں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ جس کا انتخاب خود فاضل مصنف نے اپنی زندگی میں کیا تھا اور نہایت اہتمام سے عمدہ [illegible] میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی کا نام دے کر ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پا گئی، طبع دوم عکسی،

قیمت:- ۲۵ روپے،

خیام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رباعی گو شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہے اور اس کی رباعیات کا یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ اور بھی بہت کچھ تھا، وہ فلسفی تھا، منجم تھا، ریاضی داں تھا، ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا، جس کی طرف شعر العجم میں خیام کے تذکرہ میں مولانا شبلی نے بھی اشارہ کیا ہے، اس کتاب میں پہلی مرتبہ اس کے سوانح و حالات کے ساتھ اس کی ان ہی حیثیات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں اس کے چند نایاب فارسی و عربی کے فلسفیانہ رسائل اور اس کی مستند رباعیات بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ طبع دوم عکسی، قیمت: [illegible] روپے۔

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈمی الٰہ آباد میں چند خطبے دیئے تھے یہ انہی کا مجموعہ ہے، طبع دوم عکسی، قیمت: ۳۰ روپیہ

منیجر